# حقائق و معارف

از افادات

ترجمانِ حقیقت حضرت صاحبزادہ محمد عمر بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل سالک

# حقائقِ و معارف

# حقائق و معارف

ترجمانِ حقیقت صاحبزادہ محمد عمر بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
بصیرت افروز اور انسان ساز مضامین کا مجموعہ' قدیم و جدید
علوم سے آراستہ دانا و بینا شخصیت کی دانشِ نورانی کا مرقع'

از افادات

ترجمانِ حقیقت حضرت صاحبزادہ محمد عمر بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل سالک
صدر شعبۂ فلسفہ گورنمنٹ کالج ○ لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

زیر اہتمام :

محمد رضاءُ الدین صدیقی
نجابت علی تارڑ

زاویہ

۸۔سی دربار مارکیٹ ، لاہور
۷۱۱۳۵۵۳

۲۰۰۰ء

بار اوّل ــــ ایک ہزار
ہدیہ ــــ = ۱۶۰ روپے

مرکز ترسیل

مکتبہ زاویہ

۹۔ مرکز اولایس ، دربار مارکیٹ ، لاہور
۷۳۲۴۹۴۸

# فہرست

| مضامین | نمبر شمار |
|---|---|

## (حصہ اول)

### (مقالات)


| مضامین | نمبر شمار |
|---|---|
| میری تحریریں | 25 |
| **مذہب کی بنیاد** | 26 |
| مذہب | " " |
| فقر و تصوف کیا ہے؟ | 33 |
| حواشی | 36 |
| **اعتقادیات** | 38 |
| مذہب اور عقیدہ | 39 |
| سرچشمہ غیب | " " |
| انبیاء ورسل | 40 |
| غیب ہے کہ ظاہر | 41 |
| امانت | " " |
| غیبیت عدم موجودیت کی دلیل نہیں | 42 |
| پہلا عقیدہ | 43 |
| مذہب کی جان | 44 |
| پختگی عقیدہ | 45 |
| دوسرا عقیدہ "کتب سماویہ" | 46 |

| | |
|---|---|
| تیسرا عقیدہ "انبیاء ورسل" | " " |
| چوتھا عقیدہ "ملائکہ" | " " |
| پانچواں عقیدہ "آخرت" | 47 |
| عارفین کا قول | 48 |
| معرفت اور شناخت کے مدارج | 49 |
| یقین اور معرفت کا تلازم | 49 |
| مدارج عرفان | 50 |
| معیار شناخت و معرفت | 52 |
| واقفیت عامہ | 53 |
| گھڑی | " " |
| مذہبی معلومات اور مشاہدات | 54 |
| ضروری | 55 |
| محافظتِ مذہب | " " |
| غیب و ظہور کی ایک مثال | 56 |
| بعینہٖ یہی حال غیب مطلق کا ہے | 57 |
| **طبقات** | 58 |
| معاشرتی طبقات | 60 |
| کردار مذہب | 61 |
| اختلاف کو ذہن پیدا کرتا ہے | 62 |
| حواشی | 64 |
| وحدت و کثرت | 65 |

| | |
|---|---|
| ظاہر و باطن | 67 |
| دین یا مذہب | 69 |
| حواشی | 72 |
| **حقیقت تصوف** | 73 |
| مذہب | 74 |
| نبوت ورسالت تکمیل اخلاق کے لیے ہیں | 77 |
| شرائع | 80 |
| دوسرا حصہ | " " |
| اعتقادیات | 81 |
| تیسرا حصہ | " " |
| چوتھا حصہ | 82 |
| بت پرست | 83 |
| زکوٰۃ | " " |
| تحمل وبرداشت | 84 |
| اخلاق فاضلہ | 85 |
| عدل | " " |
| کفر | " " |
| ایک اور آیۃ شریفہ | 86 |
| فلسفہ اختلاف اقوام | 88 |
| فرض | " " |
| تصوف وفقر | 84 |


Marfat.com

| | |
|---|---|
| ریاست کے قیام کے بعد | " " |
| بغاوت | " " |
| یکسانیت | 90 |
| تزکیہ | " " |
| غرض | 91 |
| کمال | 92 |
| خلاصہ اور مقصد | " " |
| تصوف اور اس کی بنیاد | 94 |
| ٹھنڈے گناہ اور ان کا علاج | " " |
| سورۃ مدثر پارہ ۲۹ | 97 |
| توضیح الفاظ | 98 |
| پس منظر | " " |
| فقر کی بنیاد | 105 |
| فکر | " " |
| کیفیات | 107 |
| مسند فقر وارشاد | 108 |
| فہم فقر و تصوف | 109 |
| مقاصد | 111 |
| قرآن اور تصوف | 112 |
| اسلام | 113 |
| صوفی | 114 |

| | |
|---|---|
| روحانیت | 115 |
| تصوف کیا چاہتا ہے | " " |
| ہر مذہب اپنے خدوخال اپنے ساتھ لاتا ہے | 116 |
| قرآن حکیم | " " |
| تزکیہ | 120 |
| دنیا دھوکہ ہے | " " |
| خانقاہی تصوف | 121 |
| سورہ نور | " " |
| اختلاف کی جگہ اتحاد | 122 |
| اصحاب کہف | " " |
| **تصوف اور مقام تصوف** | 123 |
| مقام تصوف | 126 |
| ذکر | " " |
| نماز | " " |
| روزہ | " " |
| زکوٰۃ | " " |
| حج | 127 |
| ظاہر وباطن | " " |
| افادیت نظریہ حیات قرآنی | 130 |
| اہل تصوف | 132 |
| کیفیات | 133 |


Marfat.com

| | |
|---|---|
| ذکر | 139 |
| حواشی | 144 |
| مرعوبیت | 145 |
| ولی را ولی شناسد | 151 |
| حواشی | 154 |
| حال و قال | 155 |
| علمی توحید | 158 |
| حالی توحید | " " |
| فطرتی توحید | 159 |
| ہر توحید اپنے ذوق، عمل، اثر اور تشخص میں منفرد ہے | 160 |
| اعمال صالحہ وغیرہ | 161 |
| مراتب اور مدارج کا فرق بدیہی ہے | " " |
| توحید کی فطرت صحیح کیا ہے؟ | 165 |
| وحدت الوجود | 187 |
| تلاش اور مشاہدہ | " " |
| حواشی | 184 |
| وحدت وجود یعنی ہمہ اوست کی حقیقت | 190 |
| وحدت وجود اور وحدت شہود کے مغالطہ کی حقیقت | 193 |
| خیر وشر کا مغالطہ | 195 |
| فنا وبقا کا معیار حقیقی | 198 |
| شان غفاری | 200 |

| | |
|---|---|
| ایک حدیث پاک اور اس کا مفہوم | " " |
| سوال | " " |
| جواب | 202 |
| حدیث پاک | 203 |
| گناہ | 204 |
| مجھے گناہ زندہ کیے ہوئے ہیں | 205 |
| واہمہ | 206 |
| جذبات | 207 |
| **نسبت موسوی، نسبت عیسوی اور نسبت محمدی** | 210 |
| سوال | " " |
| جواب | 212 |
| نسبت | 213 |
| فطرتی نتائج | 215 |
| اختلاف نسبت | 217 |
| تتمہ توضحیی | 220 |
| **حقیقت الحقائق کا تخیل** | 224 |
| سوال | 225 |
| جواب | 225 |
| تدبیر اور تقدیر کے غلط سہارے | 230 |
| تدبیر و تقدیر کی آویزش | " " |

| | |
|---|---|
| حواشی | 240 |
| الھویٰ | 241 |
| خواہش کے متعلق قرانی نظریہ | 243 |
| خواہش کی دو قسمیں ہیں | 246 |
| فیصلہ آپ خود دیجئے | " . " |
| تقاضائے فطرت اور "خواہش میں فرق" | 254 |
| ہمت بلند دار | 256 |
| حواشی | 258 |
| القصاص | 259 |
| قتل کا بنیادی تخم | " " |
| کثرت قتل | " " |
| حکومت اور پبلک کا فرض | 260 |
| لاپروائی | 261 |
| مذہب سے بیگانگی | 262 |
| تصورِ الہٰ (خدائی تصور) | 263 |
| فرد جرم قتل | 269 |
| سزا گناہ کے برابر | " " |
| قتل کیوں زیادہ ہوتے ہیں | 271 |
| عدالت | 272 |
| عدالت سیشن جج | 274 |
| تہی دستی قانون | 276 |


Marfat.com

| | |
|---|---|
| مثال | " " |
| امن عامہ | 277 |
| تفتیش | 278 |
| عدالت سیشن جج | 280 |
| وکلاء | " " |
| فیصلہ | " " |
| سزا | " " |
| بریت | 281 |
| قصاص | " " |
| خلاصہ | 282 |
| **حصہ دوم (مشاہدات و تاثرات)** | 284 |
| اچھا قاری | 285 |
| اچھا نغمہ | 289 |
| سماع پر ایک لطیف تبصرہ | " " |
| غزل نمبر ۱ | 299 |
| غزل نمبر ۲ | 300 |
| غزل نمبر ۳ | 301 |
| ایک دعا | 302 |
| اے اللہ مجھے مسلمان بنا | " " |
| ضرورت تحریر | 308 |

Marfat.com

| | |
|---|---|
| حقیقت ایمان | 310 |
| حواشی | 316 |
| اعلائے کلمۃ الحق | 317 |
| سستا سودا | 320 |
| محبت اور قربانی | " " |
| خاموش بے صبری | 323 |
| احتیاط | " " |
| اعتدال | 324 |
| ربط مرشد | " " |
| علمی تربیت | " " |
| صحت مذاج کا خیال | 325 |
| سننا سنانا | " " |
| گناہ | " " |
| نوجوان انیس کا انجام | " " |
| ایک اہم بات | 326 |
| کامل بزرگ | 327 |
| احساس | 328 |
| حال و مقام | 329 |
| قرب و بعد | 330 |
| زندگی احساس ہے | 331 |
| خودی | 335 |

Marfat.com

اقبال کا ایک شعر اور میرے تاثرات "
خودی کیا ہے؟ 338
اقسام خودی 339
انسانی خودی کا بلند مقام 341


## حصہ سوم
## (اشارات) 352


سیرت کا مطالعہ 353
مکتوبات امام ربانی کی تحقیق 362
حضرت میاں شیر محمد شرقپوری اور آپ کا مشرب 365
حضرت مولانا محبوب عالم سیدوی اور ان کا مقام 388
محبت کی حقیقت "
ولی اللہ کیا ہوتے ہیں؟ 389
حضرت توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ 391
سالک مجذوب کی تربیت "
حضرت محبوب عالم اور سلوک مجددی "
قیام سید اشریف 393
ظل اور عکس 394
سوانح حیات کی ضرورت 395
سجادہ نشین صاحب کی اہلیت و قابلیت 396
مسلک طریقت 398
شکایت "


Marfat.com

| | |
|---|---|
| مقصد | 400 |
| مسلک | 405 |
| حواشی | 409 |
| **طریقت کا بنیادی تصور** | 411 |
| **طریقت اور اجتماعی جدوجہد** | 419 |
| تبدیلی اور نقل مکانی | 420 |
| نظامی تبدیلی | 424 |
| مشورے اور تجاویز | 426 |
| اخبار، رسالہ اور کتاب کا فرق | 427 |
| مالی حالت | 429 |
| **مشائخ طریقت کا اصل فریضہ** | 431 |
| جمعیت مشائخ پاکستان | 433 |
| ناظرین | 437 |
| **طریقت کا بنیادی پہلو** | 438 |
| **اہل طریقت کے کرنے کا کام** | 440 |
| مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور | 443 |
| طریقت کا زوال اور مشائخ | 445 |
| یادش بخیر | " " |
| ادارۂ تصوف | 450 |
| جمعیت کا فرض | " " |
| ترقی پاکستان | " " |


Marfat.com

ہمارا خیال 451
خلاصہ کلام 452
حافظ عطر صاحب " "
تصوف کی اپنے مقام سے گرنے کی بعض وجوہ 453
اسرائیل کا غلبہ اور عرب کی مغلوبیت طریقت کی نظر میں 455

## حصہ چہارم

(شزارات) 458
قصور 459
معجزات کے جنازے 472
معجزہ " "
ضرورت معجزہ 473
استدراک 490
توحید اور احکام توحید 500
وضاحت احکامی 501
توحیدی وضاحت 502
حال و قال کی جنگ 506
ایک بہت بھاری مغالطہ " "
اپنے سے وہابی کہلانا پسند نہیں کرتے
اور دوسروں کو مشرک کہنا ایمان ہے 508

Marfat.com

# میری تحریریں

عنوان بالا پر کچھ لکھنے کا ارادہ تھا، کیونکہ جب تک میری تحریرات کا پس منظر سامنے نہ ہو، میری تحریرات کے اصل نقطۂ نظر پر سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ ناظرین کی توجہ بھی کم ہو۔ حلقۂ صوفیت فطرتاً گونگا بہرا ہونا چاہیے۔ کیونکہ چشم بندی اور لب بندی کے بغیر جادۂ سلوک طے نہیں ہوتا۔ یہ آسمانی جلوے گھپ اندھیرے میں اپنے چہرہائے درخشانی دکھانے کے عادی چلے آتے ہیں۔ لیکن موجودہ وقت صوفیت ختم ہو رہی ہے اور نشانِ منزل گم ہو رہے ہیں اور علمی دور کی چستی و چالاکی متواتر حملہ آور ہو رہی ہے، مٹتے نقوش کے مٹانے کی پوری فکر ملت و قوم پر غالب ہے۔ تو ایسے حال میں جب کوئی پرانے نقوش کو ابھارنے کی کوشش بھی کرے تو کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کہ خود اہل تصوف اپنی روایات اور اپنے حالات سے بے خبر ہو چکے ہوں اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف اور نابلد ہوں۔

تقریباً ایک صدی سے تصوف بالکلیہ خاموش ہو چکا ہے اور علمی میدان میں کوئی شاہکار پیش نہیں ہو سکا۔ گو صوفیت خود بعض مقامات پر اپنی نیم جانی کے ساتھ

Marfat.com

زندہ ہے، لیکن اتنی جان نہیں کہ اپنی زندگی سے دنیا کو زندہ کر سکے۔ ایسے حال میں میری مدھم آواز کہاں تک اپنی بے کس حقیقت سے تصوف کی حقیقت کی طرف توجہ دلانے میں کامیاب ہو سکتی ہے اور اپنی آواز پر کسی کو راغب کر سکتی ہے۔

جب کبھی سوزِ اندرونی نے مجبور کیا، چند اوراق قلم سے نکل گئے۔ پھر کسی طاق میں پڑے پڑے سیاہ ہو کر خاکستر میں مل گئے۔ گاہے کوئی مل گیا، تو اس کے سامنے کر دیئے گئے۔ لیکن ظاہری نظر سے ورق الٹتے گئے اور میں چہرے پر نظر رکھے دیکھتا رہا، کہ کہاں تک میری تحریر کی حقیقت پر پہنچے۔ لیکن ہر چہرے نے یہ ہی ظاہر کیا کہ اس نے حقیقت نہیں پائی۔ کیونکہ جب کوئی کسی اچھنے کو دیکھ پاتا ہے، تو مسرت سے اس کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور پیشانی کھل جاتی ہے۔

تاہم بعض آدمیوں کو میری تحریرات پڑھنے کا موقع ملا اور وہ اُس حقیقت پر پہنچے، جس حقیقت کے انکشاف کے لیے وہ تحریر لکھی گئی تھی، تو بے ساختہ ان کی قلم سے وہ کچھ نکل گیا جس کے نکلنے کی توقعات میری تحریر لیے بیٹھی تھی۔

آج کی صحبت میں ایک ایسی ہی تحریر حضرت قبلہ جناب صاحبزادہ محبوب الرسول للّٰہی کی پیش کی جاتی ہے، جو علمی ذوق کے ساتھ طبع سلیم اور معلومات وسیع رکھتے ہیں اور ہر مکتبِ فکر کی کتب کے مطالعہ سے ان کا علمی استفادہ لبریز ہے اور تصوف خاندانی ورثہ ہونے کے علاوہ خود جادۂ سلوک کے رہنما ہیں اور ایک خلق اللہ کے پیشوا۔

میری تحریرات سے آپ کو بڑا شغف ہے اور ہر تحریر کو کئی بار پڑھتے ہیں اور بار بار نیا لطف اٹھاتے ہیں۔ غرض ان کا تاثر آپ کے سامنے ہے اور آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ کس اندازِ فکر سے وہ میری تحریرات کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ اس تاثر کے پیش کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ ناظرینِ کرام غور سے میری تحریریں پڑھا کریں اور اس نقطۂ نظر پر پہنچنے کے لیے دماغ کو لڑائیں، جس کے لیے وہ تحریر وجود میں آئی۔ انشاء اللہ گاہ گاہ میں بھی ان کی چہرہ کشائی اور ان کے بے نقاب کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ عرض کرتا رہوں گا۔

متن تقریظ حضرت قبلہ صاحبزادہ صاحب بہ پیرایہ مکتوب شریف

Marfat.com

پیمان وفا بہ یار بستم
غافل ز مآلِ عشقِ خوباں
عیبم مکن ارچہ خود پرستم
چوں نیست بچشم غیر جاناں
اے یار رُخ ترا پرستم
اما بہ تصورات پنہاں
چوں دست نہ مے دہد وصالت
دست من و دامن خیالت

حضرت مولیٰ الجلیل الاعز متع اللہ المسلمین بطول حیاتکم

السلام علیک ورحمۃ اللہ برکاتہ، آپ کے تشریف لے جانے کے بعد رسالوں (۲) کا مطالعہ کیا۔ ستمبر اور اکتوبر کے رسالے آپ کے مضامین سے لبریز تھے ان کو بنظرِ غائر پڑھا اِنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ کی تفسیر (۳) جب خاص انداز میں پڑھی تو کیا عرض کروں کہ کیا کیفیت طاری ہوئی۔ بار بار پڑھتا اور جس انداز اور انوکھے نقطۂ خیال سے لکھی گئی، وہ دل میں پیوست ہو رہی تھی۔ زبان پر بے ساختہ جاری ہوا؎

یارب کجاست محرم راز کہ یک زماں
دل شرح آں دہد کہ چہ دید وچہ شنید

یہ انداز اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخصوص ہے۔ لکھنا تو در کنار، ابناء زمانہ اس کے سمجھنے اور اس کی تہ تک پہنچنے سے بھی قاصر ہیں مگر یہاں طلبِ عمل واستفادہ ہے دادو تحسین نہیں؎

از رو و ہم قبول تو فارغ نشستہ ایم
اے آں کہ خوب مانہ شناسی ززشت ما

بار بار خیال آیا کہ جناب نے مکاتیب و مقالات اور مضامین کی شکل میں اپنے خیالات کے انبار لگادیئے اور جس وادی میں رہوارِ قلم چلا اپنے جدا راستہ اور جدا اسلوب کے ان مٹ نقوش چھوڑتا گیا۔ کہاں ہیں وہ قدر دان جو ان کو محفوظ رکھیں؟ زمانہ کے ناقدر

Marfat.com

شناس ہاتھوں سے وہ ضائع ہو رہے ہیں اور ہو جائیں گے۔ زباں پر بے ساختہ آرہا ہے ؎

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

پھر جب آگے بڑھا تو "قصور" کا عنوان اور آپ کا اسم گرامی پڑھا۔ جب وہ مضمون پڑھا تو عرض نہیں کر سکتا کہ کیا کیفیت طاری ہوئی۔ جس خاص ذوق میں لکھا گیا تھا اس خاص ذوق میں کئی بار پڑھا۔ قصور کے نام نے کئی بھولی ہوئی داستانیں سامنے کھول دیں۔ جیسے آپ قصور کا نام ایک کتابچہ پر دیکھ کر وارفتہ ہو گئے، اسی طرح اس عاجز پر کیفیت طاری ہوئی۔ طائر تصور نے قصور کی تاریخ کے کئی ورق سامنے الٹ دیئے وہ حال کا قصور اور اب قال کا قصور۔ سبحان اللہ! اس دنیا نابکار میں کسی چیز کو بقاء نہیں۔ مگر اول ایام کی سنۃ اللہ ہر جگہ کام کر رہی ہے۔ اس مضمون نے تو مجھے بالکل ہی مخمور کر دیا۔ معلوم نہیں کیسا وقت تھا، جس میں یہ لکھا گیا۔ ایک فقرہ بعینہٖ ایسا آیا جیسے میاں فیض محمد صاحب (للّٰہی) (۴) روایت کیا کرتے تھے کہ ایک زمانہ تھا کہ اللہ کی ہر مجلس میں قصور شریف کا تذکرہ ہوتا، اور اس تذکرہ سے کوئی وقت خالی نہ تھا، مگر اب کوئی نام لیوا نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ذوق کو مع صحت بر قرار رکھے تا کہ کچھ اور جواہرات رول سکیں ؎

مشاطہ بگو کہ بر اسبابِ حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

اب معلوم نہیں کہ جناب کس قدر اس طرف متوجہ رہ سکتے ہیں اور قدرت کو کیا منظور ہے ؎

فرصت دیدنِ گل آہ بسیار کم است
و آرزوئے دلِ مرغانِ چمن بسیار است

مجھے تو ان مضامین میں اس قدر حظ آیا اور اس سے افراط و تفریط کے حدود ایسے نمایاں ہوئے جو قیدِ تحریر میں نہیں لا سکتا۔

آں کس ست اہل بصارت کہ اشارت داند
نکتہ ہاست بسے محرم اسرار کجاست

(جولائی ۱۹۷۰)

Marfat.com

# حصہ اول

# مقالات

Marfat.com

# مذہب کی بنیاد

## مذہب

ہر مذہب کی بنیاد غیب پر ہے۔ یعنی ظاہر پر نہیں بلکہ باطن پر ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ ایمان بالغیب (یُؤمِنُونَ بالْغَیْبِ) ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس جو سراسر غیب (پوشیدہ) ہے، اس کی ذات حقہ کو تسلیم کرنا اور اس کے احکامِ غیب (مذہبی کتب) پر عمل کرنا۔ وحی والہام وہ تعلیم وارشاد ہے جس کا تعلق کسی خارجی ذی شعور کے ساتھ نہیں بلکہ غیر مشاہد ذات کے ساتھ ہے، جو خود کہتی ہے لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَیُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (اسے آنکھیں نہیں پا سکتیں بلکہ وہ ذات آنکھوں کو پالیتی ہے) ایسی صورت میں یہ خلجان ضرور پیدا ہوگا کہ مذہب جو معاشرۂ انسانی کی روح رواں ہے، اس کی بنیاد ایک نادیدنی حقیقت پر رکھنے سے مذہب کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے اور کیا حیثیت ہے؟

لیکن تھوڑے سے غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کی بنیاد بھی اسی مسلمہ عقیدہ پر ہے یعنی غیب پر۔ کسی پر آج تک یہ راز نہ کھل سکا کہ کائنات کا تخمِ اول کیا ہے اور کس سے پیدا ہوئی اور کیونکر پیدا ہوئی؟ جو نظریات اس وقت کائنات کی

Marfat.com

پیدائش سے متعلق سامنے آئے، وہ کسی حقیقت اور کسی مشاہدے پر مبنی نہیں بلکہ اٹکل پچو ہیں، اور جو خود غیب کے غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں۔

آیئے ذرا تفصیل سے نظر دوڑایئے۔ زمین و آسمان کیسے پیدا ہوئے اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ جس پر بھی آپ کی نظر ہو گی۔ وہی پوشیدہ طاقت جسے دیکھ نہیں سکتے، اسے شناخت نہیں کر سکتے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن کہتے ہیں کہ ہے ضرور جس نے یہ کارخانۂ قدرت قائم کیا۔ المختصر کوئی لفظ بھی اس کے اظہار کے لیے لفظ "قدرت" کے سوا نہیں مل سکتا۔

دوسرے نمبر پر انسان ہے۔ اس کی فطری پیدائش پر بھی ابھی تک نامکمل نظریے قائم ہو رہے ہیں۔ چلو مٹی سے پیدا ہوا، لیکن ظاہراً یا باطناً۔ یعنی مشاہدۃً سامنے آیا، یا باطناً (پوشیدہ) بن کر جلوہ پذیر ہوا۔ اس کے بعد خود انسان کے قوائے ظاہرہ، آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، دماغ کو دیکھئے۔ اس کے صرف یہ مشاہد (ظاہری) قویٰ ہی کام کر رہے ہیں یا ان کے پیچھے اور قویٰ اور غیر مشاہد (باطنی) بھی کام کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ بیکار ہوں تو یہ خود بخود بیکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن الٹا دیکھو، اگر ظاہری قویٰ ناکارہ ہو جائیں تو باطن کے قویٰ ناکارہ نہیں ہوتے بلکہ ایک گونہ ان میں تیزی آجاتی ہے۔

خود انسان کی ذات بھی ظاہر و باطن سے مرکب ہے۔ ایک جسم اور دوسری روح۔ جسم ظاہر ہے لیکن روح باطن۔ باطن کے جدا ہونے سے ظاہر گل سڑ جاتا ہے، لیکن ظاہر کے جدا کر دینے سے اہل نظر کہتے ہیں کہ روح بذاتہٖ قائم رہتی ہے۔ عام جانوروں پر اسی قیاس سے دیکھ لیا جائے۔

اس کے بعد نباتات کو دیکھیے۔ ان کا ظاہر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب باطن کے اندر جڑیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر باطن کو ظاہر کر دیا جائے تو ظاہر (یعنی شاخ، پتے) مر جاتے ہیں۔ کیونکہ "باطن" باطن کے اندر بڑھتا اور پھیلتا ہے اور ظاہر ظاہر کے اندر بڑھتا اور پھیلتا ہے۔

غرض باطنی قویٰ کو ظاہر کی ہوا مخالف پڑتی ہے، اور ظاہری ہوا اور روشنی

Marfat.com

سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ظاہری قویٰ کو باطن کی ہوا راس نہیں آتی۔ کسی شاخ کو زمین کے اندر دفن کر دیا جائے اور کوئی حصہ باہر نہ رکھا جائے تو وہ بہت جلد مر جائے گی۔

مقصود یہ ہے کہ ظاہر باطن کے ساتھ اور باطن ظاہر کے ساتھ پیوستہ ہے اور ایک دوسرے کے بغیر ان ہر دو کی زندگی ناممکن۔ زندگی سے مراد یہ دنیاوی زندگی ہے، ورنہ باطنی قویٰ مرتے نہیں۔ زمین خشک مری ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن جب بارش ہوتی ہے تو اس کے قویٰ باطنی تر و تازہ ہو کر باہر نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔

اگر کائنات کا ایک ایک ذرہ فنا ہو جائے تو بھی وہ پوشیدہ قوت اور طاقت برابر جاری و ساری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی قوت سے پھر از سر نو کائنات کو پیدا کر دیتی ہے یا پیدا کرنے کے لیے مستعد، اور اس استعداد سے بھرپور ہے۔

یہی حال اعمال مذہبی کا ہے کہ ان کے اندر قوت باطنی کام کر رہی ہوتی ہے۔ اور یہ اعمال اس قوتِ باطنی سے سرسبز ہوتے ہیں اور یہ اعمال ظاہرہ اس قوت کو بڑھاتے ہیں۔ درخت کو دیکھیے اس کی جڑیں، تنا اور شاخ، ثمر کو تازہ رکھتی ہیں اور شاخ و ثمر اس کی جڑوں کو بڑھانے کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ کچھ حصہ بھی ظاہر رہے تو جڑیں مضبوط رہتی ہیں، لیکن ظاہر کا حصہ بالکل ختم کر دیا جائے تو جڑیں خشک ہو جاتی ہیں۔ اس سے زیادہ صاف مثال شلغم یا مولی کی ہے۔ پہلے پتے بڑھتے ہیں پھر شلغم یا مولی زمین کے اندر بڑھنی شروع ہو جاتی ہے اور جب وہ اپنی استعداد کے مطابق مکمل ہو جاتی ہے تو پھر شاخ برگ و ثمر بڑھنے اور پختہ ہونے پر آجاتے ہیں اور جب ثمر پختہ ہو جائے تو جڑ کمزور ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ البتہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قیاس نہیں، جزوی تبدیلیاں اور اختلاف ہے لیکن کلی طریقہ ایک ہے۔

بہر صورت مذہبی اعمال کے اندر اس عقیدے کا تخم ہے جسے توحید کہا جاتا

ہے اور جس کا مطلب وہ وحدتِ کائنات ہے، جو ہر ذرے کی خالق اور مربی ہے اور جس سے کوئی ذرۂ کائنات سر تابی نہیں کر سکتا اور جس کے سامنے فطرتاً ہر ذی شعور و بے شعور سجدۂ خالقیت اور ربوبیت کرنے پر مجبور ہے اور جس کی فطرت بول رہی ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ ۱۵ھ

یہ پاک جذبہ، مذہبِ عملی کی جان ہے۔ اگر یہ جذبہ ختم کر دیا جائے اور ان اعمال کے لیے کوئی دوسرا جذبہ پیدا کیا جائے تو اعمالِ مذہبی کی روح ختم ہو جائے گی اور اعمال بے رونق، روکھے پھیکے ہو کر ہمیشہ کے لیے بھسم ہو جائیں گے اور مذہب فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔

موجودہ دور کی مادہ پرستی اور دنیا پرستی مذہب کو دنیاوی رنگ دینے کی فکر میں ہے اور مذہب کے ہر عمل کو مادی دنیا کا آلۂ کار بنانے کے خیال میں مصروف ہے۔ روزے کے فلسفے کو اتقاء اور رضائے مولا کی بجائے ہمدردیٔ خلق تجویز کرتے ہوئے بھوک اور بھوکوں کا تصورِ محض دینے سے خشیت اور رضائے الٰہی اور کفارۂ گناہ کی جگہ صرف پیٹ خالی کا تصور دلانا ہی مقصود ہو گا تو پیٹ بھرے انسان جب چند ناداروں کو روٹی دلا دیں گے تو روزے رکھے بغیر بھی مسلم سوسائٹی کے ایک ممبر بننے کے دعویدار ہی نہ ہوں گے بلکہ مسلم معاشرے کے روحِ رواں۔ لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو سہی اس صورت میں تمام اعمال کی غرض و غایت تبدیل ہونے سے روحِ مذہب ختم ہو گی یا اس کے اندر جان پیدا ہو گی؟

آج کے دور میں عوام کو چھوڑ مذہبی رہنما بھی اسی حربے پر اتر آئے ہیں اور دنیاداروں کے ہمنوا ہو کر مذہب کی بنیاد مذہبیت کی آڑ میں ختم کر رہے ہیں۔ نماز کیا ہے؟ ایک تنظیم اور پریڈ ہے۔ قربانی کا کیا فائدہ جب محتاج گوشت نہ لیتے ہوں۔ روزے کی بھوک سے جب ہمدردی پیدا نہ ہو تو روزہ بے کار۔ لیکن اس نظریے پر چلنے والوں کی ہمدردیاں قوم کے سامنے ہیں اور ان کی تنظیموں کے انجام بھی، اپنے

قائد بننے کے سوا کچھ نہیں یا غریب آدمیوں کے پیسے ہڑپ کرنے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں۔ پاکستان موجود ہے اور اس نظریے پر چلنے والوں کی کثرت سے پاکستان بھر پور ہے لیکن انگلیوں پر گننے کے لیے چند ہستیاں سامنے نہیں آتیں۔ جب ان کی تلاش ہو۔ یہ لوگ مذہب سے بیگانے ہی نہیں بلکہ حقیقتاً مذہب کے دشمن ہیں۔ اہل مذہب کو مذہب سے عملاً ہٹانے کے لیے یہ تصورات پھیلائے جا رہے ہیں ورنہ جس مذہب کی روح ختم کر دی جائے وہ کسی دوسرے نامناسب انجکشن سے کب زندہ رہے گا۔

اب تو اچھے اچھے عالم بھی اس دنیاوی کارخانے کو اصل مقصدِ حیات[2] خیال کرتے ہیں اور اس دنیاوی زندگی کو نبھانے کے لیے مذہب مقدس کی روش اختیار کرنا مذہب خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ زندگی کے نظام، جب سے دنیا پیدا ہوئی آج تک چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ اگر نظام ہی مقصود ہے تو کوئی ایک نظام اچھا ہے یا برا۔ بہر صورت زندگی گزار دیتا ہے۔

یہ وہ بات ہے کہ کارخانہ صرف کارخانہ کے مزدوروں اور کاری گروں کے لیے تیار کیا جاتا اور چلایا جاتا ہے، اس کے سوا مالک کا کوئی دوسرا مقصود نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو کون عقل مند ہے جو اس مالک کو بے وقوف نہ کہے جو دوسروں کی روٹی کے لیے خود پریشان ہو، اور بغیر گھاٹے اور نفع کے کارخانہ چلائے۔

آپ کہیں گے حکومت کیا ہے؟ یہی دوسروں کے پیٹ کے لیے قائم نہیں کی جاتی تاکہ امن کی زندگی بسر کر کے اپنی معاش خود پیدا کریں۔ لیکن غور سے ملاحظہ ہو تو اس کی تہہ میں اقتدار کا نشہ ہے۔ اور اس نشہ کو خدمتِ خلائق کا نام دیا جاتا ہے۔ قومیں اس نشہ میں کیا کچھ کر گئیں۔ ظاہراً تو امن بحال ہے لیکن اندر جنگ کے نقشے تیار ہوتے رہتے ہیں۔

موجودہ وقت تو رسول اور نبی کو ایک دنیاوی لباس سے آراستہ کیا جاتا ہے اور ایک دنیاوی نقشہ کے رنگ اس میں بھرے جاتے ہیں۔ مثلاً: ایک اچھا جرنیل بنانے کی

تصویر اس کی بنائی جاتی ہے، دوسرا اسے تاجرانہ شکل میں پیش کرتا ہے، تیسرا اس کی اخلاقی تصویر سے روشناس کرا کے اسے ایک اخلاقی معلم بناتا ہے۔ لیکن کسی کو یہ نہیں سوجھتی کہ آخر وہ رسالت کہاں گئی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے انتخاب فرمایا تھا، اور وہ تعلقاتِ الٰہیہ کہاں گئے جن کی مٹھاس سے دنیا اس کے آبحیات پر جان دیتی ہے۔ وہ انوار الٰہیہ[3] کا نقشہ کیوں گم کیا جارہا ہے۔

یہی حال قرآن حکیم کا ہے۔ رشد وہدایت کے لیے قرآن حکیم کا نزول ہوا اور وہ بشیر ونذیر ہو کر سامنے آیا۔ لیکن اب سائنس کے مسائل (اور) معاشرتی علوم وغیرہ کی ابجد قرار دیا جاتا ہے، اور کچھ نہیں لکھا جاتا تو اس کے رشدوارشاد پر اور اس کی ہدایت ونورانیت پر۔ جتنی تفاسیر موجودہ وقت میں لکھی جارہی ہیں ذرا ان کا مطالعہ فرمایا جائے۔ ان تفاسیر کا محور کیا ہے؟ خدائے تعالیٰ کی عبودیتِ مطلقہ اور پرستش پر بھی کچھ لکھا جاتا ہے؟ یا ایک اطاعت[4] کے تصور سے دنیا کا رنگ بھرا جاتا ہے اور ریاست کے لیے خلافت الٰہیہ کا روپ بھرا جاتا ہے اور وہ بات پیش نہیں کی جاتی جو کسی وقت مسلمانوں کے اندر جوش زن تھی۔

تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَ رِضْوَانًا o
اِنْ تَكُوْنُوا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ
تَرْجُوْنَ مِنَ اللهِ مَالَا يَرْجُوْنَ o

(اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے، (اس سجدہ اور رکوع سے) وہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔

(دوسری آیت) اگر اے مسلمانو! تم (جہاد میں) دکھ درد سہتے ہو تو (تمہارے مدمقابل یعنی کفار) بھی دکھ درد اٹھاتے ہیں اور (فرق یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ سے (اس کی بخشش اور نعمت کے) امیدوار

Marfat.com

ہو اور وہ کوئی امید نہیں رکھتے)

حقیقتاً ایک مذہبی اور غیر مذہبی آدمی کا یہی فرق ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ سے امیدِ فضل و کرم رکھتا ہے اور لامذہب کو کوئی بھروسہ کسی غیر مرئی طاقت پر نہیں ہوتا۔ اور یہی اس کی پریشانی کا باعث ہے۔ آپ ہمیشہ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے مصیبت میں بھی گھبراتے نہیں اور دکھ سکھ کو بڑے اطمینان سے گزار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ موت پر بھی پریشان نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو اُس (ذاتِ وحدہٗ لاشریک) کے خوف سے۔ اور اس خوف کے اندر ایک امیدِ مغفرت بھی جھلکتی رہتی ہے۔ بخلاف لامذہب کے کہ وہ سراسر مصیبت کے تصور میں گھلا اور ہمیشہ کی موت سے گھبرایا اور مرا جارہا ہے۔

غرض ایک ایمان دار کا یہ تصور کتنا بلند ہے: مَاۤ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْۤ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا۔[5] دوسرا یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗۤ اُمُّ الْکِتَابُ[6]۔ یہ وہ ایمان ہے جس کے اندر تزلزل نہیں رہتا اور ہر آن یقین محکم ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک غیب[7] تو وہ ہے جسے بیان کیا گیا اور ایک مذہبی آدمی کے لیے ایمان یعنی یقین کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے غیب پر جب تک ایمان نہ لایا جائے، (ایمان) مکمل نہیں ہوتا۔ وہ کیا ہے قرآنی الفاظ میں یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥[8]۔ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ کہ وہ کامل یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے سامنے ضرور پیش ہوں گے۔ اور وہ اس کی طرف ضرور جائیں گے۔ اس غیب پر جب تک یقینِ کامل نہیں ہوتا، پہلا غیب بھی کمزور رہتا ہے۔ پہلا ایمان بالغیب (قدرت کاملہ) ذاتِ کبریائی پر، دوسرا ایمان بالغیب کہ زندگی کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری ضروری ہے، اور جزا و سزا ہو کر رہے گی۔

آج جتنی خرابی پیدا ہو رہی ہے پہلے اور پچھلے ایمان کی کمزوری سے پیدا ہو رہی ہے۔ لکھی پڑھی دنیا زبان سے تو اللہ کہتی ہے۔ اندر نہ تو ذاتِ کبریائی پر ذاتی اور

Marfat.com

صفاتی ایمان ہوتا ہے، اور نہ آخرت اور جزا سزا پر ایمان محکم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مذہب کے اعمال واشغال میں وہ تیقن نہیں جو ہونا چاہیے تھا اور جس کا ثمرہ کامل یقین اور محکم یقین ہونا ضروری ہے۔

غرض جب تک مذہب کے ہر بڑے چھوٹے عمل کی روح یعنی اس جذبۂ پاک (اللہ تعالیٰ کی توحید اور آخرت، حشر ونشر، جزاوسزا) پر کامل عقیدہ جاری وساری نہ ہو جائے، اس وقت تک مذہب کا کامل ثمرہ حاصل نہیں ہوتا۔ جتنا یہ عقیدۂ غیبی پختہ ہوگا، اتنا ہی ایمان (یقین) پختہ اور بلند ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ مشاہداتِ روحی کے جلوے شروع ہو جائیں گے، اور مذہب کی بنیاد غیب سے شہود پر آجائیگی، اور ہر وہ پردہ جو مذہب کے اعمال پر ظاہری صورت میں آکر حقیقت کو چھپائے ہوئے ہو خود بخود اس شہود سے اٹھ جائے گا اور ہر عمل کی روشنی اور اس کی قدر مشاہدۂ سامنے آجائے گی۔ اس وقت مذہب اپنی کامل صورت اور اپنی کامل حقیقت سے دل پر منعکس ہونا شروع ہو جائے گا اور کوئی شک ایمان و آخرت میں نہ رہ جائے گا، اور دنیا و آخرت کے ثمرے جو مذہب کے ذریعے دنیائے حقیقت/ظہور میں نمودار ہونے فطرت میں تھے وہ ہو کر رہیں گے، اور ساری دنیا ان ثمرات کو دل اور آنکھوں سے دیکھ پائے گی۔

## فقر و تصوف کیا ہے؟

یہ کوشش کہ ایمان غیب سے شہود میں آجائے اور ایمان و یقین کے اندر پختگی پیدا کرنے کے لیے مذہب کو بلند ترین معیار پر پہنچائے، اسی کا نام دوسرے لفظوں میں فقر و تصوف ہے، اور اس طریقہ اور جدو جہد کو ہی اہل طریقت نے تصوف کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے سوا تصوف کچھ نہیں۔ اور یہی منشائے اسلام ہے کہ سب سے پہلے ایمان و آخرت پر یقین کامل (پیدا) کرنے کی کوشش کی جائے خواہ وہ جس طریقے سے ہو۔ کیونکہ ایمان (یقینی نظریہ) اعمال پر مقدم ہے۔ پہلے نظریہ قائم کیا جاتا ہے اور پھر اس قائم شدہ نظریے میں جب یقین پختہ ہو جاتا

Marfat.com

ہے تو اس نظریے کے مطابق عمل شروع ہوتا ہے۔ اور کوئی ایک عمل نہیں ہوتا بلکہ قائم شدہ نظریے کے لیے لاکھوں عمل کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جو عمل بھی کیا جائے گا اس کے اندر قائم شدہ نظریے ہی کی روح ہو گی اور اس کو پروان چڑھانے اور اسے مکمل کرنے کے لیے ہر عمل ہو گا۔

چنانچہ مذہب کا تخم یا عقیدہ وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات پر کیا جاتا ہے اور اس کا ثمرہ اس سے پیدا شدہ آخرت کا یقین ہے۔ یعنی اس دنیا سے گزرنے کے بعد ایک دوسری دنیا میں جانا ہے جہاں ان اعمال کی جزا و سزا ہو گی اور اس ذات وحدہ لاشریک کے دربار میں حاضری ہو گی جس نے ہمیں پیدا کیا۔

آج کی دنیا میں، مذہب میں بڑا زور اعمال کا ہے۔ لیکن کون سے اعمال؟ وہ اعمال مراد نہیں لیے جاتے جو مذہبی ہیں، بلکہ وہ اعمال جو دنیا میں رائج ہیں اور جن پر مادی دنیا چل رہی ہیں۔ بے شک اعمالِ مذہبی بھی بہت کمزور ہو گئے اور اس پر عمل بہت کم ہو چکا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ایمان و یقین تو پختہ ہے مگر عمل میں سستی ہے۔ بلکہ اصل میں ذاتِ وحدہٗ لاشریک پر یقین و ایمان کم ہو چکا ہے اور آخرت کا تو نام بھی اب سننے میں بہت کم آتا ہے۔ چہ جائے کہ کسی کا عقیدہ ہو کہ ہماری حشر و نشر ہو گی اور زندہ ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی ضروری اور لابدی امر ہے۔

قرآن حکیم نے ہر دعوتِ عمل پر پہلے ایمان کو پیش کیا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔[9] یَااَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اٰمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[10]۔ غرض ایک نہیں سینکڑوں آیات ہیں جن میں پہلے ایمان کو پیش کیا گیا ہے اور بعد میں حکم دیا گیا کہ عمل کرو۔ بلکہ سارے اسلام کا دارو مدار پہلے ایمان پر رکھا گیا ہے۔ بعد میں عمل کے لیے ترغیب و ترہیب ہے۔ تخم سے پہلے کوئی چیز اُگتی نہیں۔ جب تخم صحیح و سالم ہو تو پھر شاخیں، پتے اور ثمرہ صحیح پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہی خرابی آج موجود ہے کہ ایمان و یقین یعنی ایمان باللہ اور آخرت کے لیے کوئی دعوت نہیں دی جاتی اور کوئی طریقہ اس نظریے[11] کے لیے پیش نہیں کیا جاتا۔

بلکہ عمل پر ہی زور دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ وہی فطری نتیجہ ہونا ضروری ہے کہ اعمال بے ثمر ہوں اور کوئی نتیجہ اور ثمرہ دنیا کے سامنے موجود نہ ہو۔

لیکن حیرت ہے ان لوگوں پر کہ وہ مذہب کے لیے شور مچاتے ہیں اور اعمالِ مذہب کو پیش کرتے ہیں لیکن روحِ مذہب کو مکمل کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ بلکہ جو لوگ کچھ کر رہے ہیں یعنی صوفیا، ان کو بھی "بے کار جماعتِ اسلام" خیال کرتے ہیں اور ان کے اعمالِ مجاہد: کو جو سراسر پختگیٔ یقین کے لیے تجویز کیے گئے تھے، بیکار خیال کرتے ہوئے ان سے عوام و خواص کو برگشتہ کیا جاتا ہے اور غیر مذہب خیال کیا جاتا ہے۔ نتیجہ وہی پیدا ہو رہا ہے اور ان ظاہری اعمال کے اندر کوئی ثمرہ ظاہری اور آخری پیدا نہیں ہوتا بلکہ مذہب سے لوگ بیزار ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ظاہر سے باطن پر پہنچائے تاکہ ان کا دینِ حق بلند سے بلند ہوتا چلا جائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

## ضروری نوٹ

غیب وہ ہے جو سامنے نہ ہو اور موجود ہو۔ غائب کے مقابل حاضر ہے۔ جو چیز موجود ہی نہیں وہ معدوم ہے۔ معدوم بھی ذہناً کہا جاتا ہے ورنہ عدم محض، نیست ہے۔ اور غیب اسے ہی کہا جاتا ہے جو بعض کے لئے حاضر اور مشاہدہ میں ہو اور بعض سے غائب۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات عوام سے غائب ہے لیکن خواص مشاہدۂ حق سے سرفراز ہیں۔ ان کے لئے ایک درجہ غائب ہے تو دوسرا درجہ حاضر۔ کوئی آنچل میں دکھائی دے تو حاضر بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔ اسی طرح ذاتِ اقدس سامنے بھی ہے، اور پوشیدہ بھی۔

مثل بوئے گل ہیں ظاہر صاف دکھلاتے نہیں

ہوا موجود اور سامنے ہے لیکن دیکھنے میں نہیں آتی اور عوام کرۂ ہوائی کے تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔

Marfat.com

یہ اس لیے واضح کیا گیا کہ کہیں غائب کو ہمارے فلاسفر عدمِ محض کے ڈھکوسلے پر تسلیم نہ کراتے پھریں کہ ایک وہمی خیال کو غائب کی قوت کہا جاتا ہے۔ جیسے عام ہو رہا ہے، ایسے نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس کی معرفت لاکھوں کروڑوں انسانوں کو نصیب ہوئی۔ ایسے ہی ملائکہ بھی موجود ہیں۔

## حواشی

۱ اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور اس کی تعریف ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہ غالب ہے حکمت والا۔

۲ یعنی معاشرے کی زندگی ہی مقصد حیات ہے اور آخرت سے سروکار نہیں اور مَنْ کَانَ یَرْجُوالِقَاءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلَایُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ اَحَدًا (اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا امیدوار ہے اسے چاہیے کہ وہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی غیر کو شریک نہ کرے) پر کوئی ایقانی ایمان نہیں۔

۳ صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً۔ جس کی خوشنودی کے لیے اکثر صحابہؓ نے کفار کی اذیتوں سے جان دے دی۔

۴ عام طور پر عبادت اور اطاعت کو الگ الگ خیال کیا جاتا ہے، اور ہے بھی ایسے ہی۔ لیکن اب عبودیت کو تسلیم کرتے ہیں اور عبادت گزار کو پسند نہیں کرتے، جو رات دن اپنا وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بسر کرے۔ ان لوگوں کا مقصود یہ ہے کہ اطاعت سے اولی الامر کی اطاعت ہو اور بس۔ لیکن جب عبادت نہیں تو اطاعت کیسے؟

۵ جو مصیبت تمہیں زمین میں پہنچی یا تمہاری جانوں کو تکلیف پہنچی وہ ایک کتاب (کتاب تقدیر) میں اس کی پیدائش سے پہلے (لکھی جا چکی) ہے۔

۶ جو کچھ اللہ تعالیٰ مٹانا چاہتا ہے وہ مٹا دیتا ہے اور جو قائم رکھنا چاہتا ہے اسے قائم رکھتا ہے اور اس کے پاس بڑی کتاب ہے۔

۷ تشریح: مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گا اور اعمال کی سزا و جزا پر وہ ایک ابدی زندگی حاصل کریگا جس کے بعد موت نہیں ہو گی۔ خلاف لامذہب کے کہ وہ اپنی اس دنیاوی موت کو اپنی آخری اور ابدی موت خیال کرتا ہے

Marfat.com

اور لبدی موت یعنی اپنے نیست و نابود ہونے پر اتنا پریشان ہوتا ہے کہ اسے چند لمحے مرنے کے تصور میں گزارنے بھی مشکل ہو جاتے ہیں۔ خیال کیا جائے کہ امید ہی زندگی کا سہارا ہے۔ اگر یہ جاتی رہے تو پھر بلا سہارا موت سے پہلے موت آجاتی ہے جسے برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

۸۔ انہیں یہ یقین ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں اور اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

۹۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ان کے لیے ان کے اللہ کے پاس ان کا بدلہ ہے۔

۱۰۔ اے ایمان والو اپنے اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ (یعنی ایمان پختہ کرو)

۱۱۔ صلحائے امت نے جو طریقہ پختگیٔ ایمان کے لیے تجویز فرمایا تھا اور جسے اصطلاح میں تصوف کہتے ہیں اور جو وقتاً فوقتاً حسبِ طبائع اور اوقات کتاب و سنت کی حدود کے اندر خانقاہوں میں چلتا آیا، اس کے بر خلاف علمی دنیا تو کیا بلکہ علمی دینی طبقہ جائز و ناجائز طریقے سے بر ملا مخالفت پر اتر آیا۔ اور اس "روح مذہب" کے فنا کرنے پر تلا ہوا ہے اور اپنے خیال میں وہ شریعتِ مطہرہ کو آلودگیوں سے پاک کرتا ہے لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ آلودگیوں سے صاف کرتے کرتے شہ رگ کو کیوں کاٹا جا رہا ہے جس پر مدارِ زندگی ہے۔

(ستمبر ۱۹۶۴)

Marfat.com

# اعتقادیات

مذہب کے تمام اعمال کا مدار اعتقادیات پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتقادیات ایک قسم کا قالب، اعمال کے لئے ہے۔ اور ہر عملِ مذہب اُس کے اندر ڈھل کر نکلتا ہے۔ اگر ان اعتقادیات کی چولیں ڈھیلی ہو جائیں تو اعمال کی شکل وصورت اور باطن خود بخود ڈھیلا پڑ جاتا ہے، اور مذہب یا معاشرہ کی بنیاد صحیح قائم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر عمل صحیح موزوں نہ بیٹھنے کی وجہ سے معاشرہ کی دیوار مضبوط قائم نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی بنیاد مرصوص ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اعتقاد کی ہر جزئی اپنی اپنی جگہ پورے کامل طور پر یقین وایمان کا درجہ رکھتی ہو اور یقین میں کوئی لچک پیدا نہ ہوتی ہو۔

عقیدہ، عقد سے ہے، جس کے معنی گانٹھ کے ہیں۔ عقد النکاح کو عقد اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ازدواجیت کے گٹھ جوڑ پر گانٹھ لگادی گئی اور کسی صورت وہ کھولے بغیر نہیں کھلتی۔ یعنی بغیر طلاق نکاح کا جوڑ الگ نہیں ہو سکتا۔

## حقیقت عقیدہ

پھر عقیدہ ہر فکر وخیال کی پختگی کو نہیں کہا جاتا۔ بلکہ ہر وہ خیال جس کا ایک سرا تو ظہور میں ہو اور دوسرا غیب میں ہو اور پوشیدہ ہو۔ تو غیب وظہور کی موجودیت پر

Marfat.com

جب کامل یقین ہو جاوے اور ہمہ تن مکمل خیال کیا جاوے تو اسے عقیدہ کا نام دیا جاتا ہے اور اپنے یقین غیب و ظہور پر محکم مہر لگا دینے کے لئے لفظ عقیدہ استعمال کیا جاتا ہے۔ تاکہ مخاطب خیال اولین کرے کہ متکلم اسے کامل طور پر تسلیم کرتا ہے اور شریعت کی زبان میں کہا جاتا ہے۔ اِقْرَارٌ بِالِلّسَانِ وَتَصدِیْقٌ بِالْقَلْبِ زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام "عقیدہ" ہے۔

## مذہب اور عقیدہ

مذہب کے اندر عقیدہ ایک تخم ہے۔ ہر مذہب میں عقیدے کا تخم تقریباً ایک جیسا ہے۔ صرف کم و کیف کا فرق ہے۔ جیسے گندم تمام اقسام کی کہ شکل و صورت اور جنسیت میں ایک ہے لیکن رنگ، بڑائی، چھوٹائی اور ذائقہ میں الگ ہوتی ہے، اور کئی اقسام پر حاوی ہے۔

## سر چشمۂ غیب

ہر تخلیق کا سر چشمۂ حیات پوشیدہ اور غیب میں ہے۔ زمین و آسمان، چاند و سورج، ستارے، خاک و آب، پہاڑ و فضا غرض ہر چھوٹی بڑی تخلیق کی آخری کڑی غیب میں چلی جاتی ہے۔ کوئی نہیں بتلا سکتا کہ زمین کیسے پیدا ہوئی، آسمان کیسے تیار ہوا، کس نے تیار کیا اور اور کیونکر تیار کیا گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مراحل طے ہی نہیں ہوئے، نہ کسی نے اسے بنایا، نہ اُس پر مہلت لگی، نہ اُس نے اپنی حکمت سے اسے موزوں کیا۔ بہر صورت یہ تمام سوال غیب میں موجود ہیں۔ یعنی کس نے بنایا اپنے علم کے ساتھ اور اپنی حکمت کے ساتھ، موزوں صورت و سیرت، ظاہر و باطن تیار کیا۔ تمام تخلیق کے سر چشمہ کو اسی لئے ایک بڑے غیب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو ہمارے سامنے تو نہیں اور نہ ہم اسے آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے باطنی قویٰ اُسے محسوس کرتے ہیں اور پاتے ہیں اور وجدانِ کامل سے اس کی ہستی کے معترف ہیں۔

Marfat.com

سوچئے، خود سوچئے، کوئی غیب ہمہ طور غیب ہونے کی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ غیب حقیقتاً وہی ہوتا ہے، جو بعض سے غائب ہو اور بعض کے سامنے حاضر اور مشاہدہ میں ہو۔

یہ غیب کلی عوام سے گو پوشیدہ ہے۔ لیکن خواص اہلِ فکر و اہلِ دل کے اندر برابر جلوہ گر رہتا ہے۔ گو وہ بے مثل ہے، اور اس کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ کیسے ہے؟ لیکن ہستی مطلق کو تمام کائنات پر محیط خیال کیا جاتا ہے۔ اور کائنات کی کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جس پر اس کی جلوہ گری کے آثار نہ ہوں۔ خصوصاً انسان کا تو ہر فرد جاہل و عالم اس غیب کے زیر اثر نظر آتا ہے اور ہر فرد کا باطنی جھکاؤ اس کی طرف دکھائی دیتا ہے۔

## انبیاء و رسل

اس کے خاص پسندیدہ انسان تو اس کے دیدارِ باطنی سے مشرف ہیں، اس سے ہم کلام ہوتے ہیں، اس کے علم و قدرت کے وسیع اختیارات کا مشاہدہ ہر آن کرتے ہیں اور اس کی تعظیم و تکریم کے لئے اکثر سجدہ گزار رہتے ہیں جسے مختلف صفات اور مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کے صفاتی نام اتنے ہیں کہ شمار میں نہیں آتے۔ ہر صفت کا ظہور اپنا نام آپ پیدا کرتا ہے۔ اور صفت کا مظہر خود اس نام کا شاہد ہے۔ اسلام میں اس کا ذاتی نام اللہ "جل جلالہٗ" خیال کیا جاتا ہے۔ اور صفاتی نام جو خود اس ذاتِ اقدس نے تجویز اور ظاہر فرمائے، ننانوے مشہور ہیں۔ اور ہر نام اپنی صفت کا مکمل ظہور ہے۔ اور ہر ظہورِ حقیقت پر ایمان لانا در حقیقت تکمیلِ غیب ہے۔ اور جب یہ مکمل نہ ہو، تو الغیب کا مکمل تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی اس الغیب کلی کو تسلیم کرتا اور یقین رکھتا ہے تو شرع کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ وہ الغیب پر ایمان لایا۔ یعنی محکم یقین کے ساتھ بہمہ صفت اسے تسلیم کیا۔ قرآنِ حکیم کے شروع ہی میں فرمایا گیا یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ یعنی متقین نیک انسان الغیب پر ایمان لاتے ہیں جسے

مذکور ہوا۔ یہ الغیب نرا غیب نہیں بلکہ وہ الغیب ہے، جس کے اندر شہود موجود ہے اور غیبکے پردے غیب کے اندر ہو کر چاک کر رہا ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کائنات سے پہلے جو کچھ تھا اور کائنات کے فنا کے بعد جو کچھ رہے گا اُسی کا نام "خدا" ہے۔ وہی رب العالمین، وہی الغیب ہے، جس کو تسلیم کیے بغیر کسی کو چارہ نہیں، بلکہ کائنات کا ہر ذرہ اس کی تحمید و تسبیح کر رہا ہے۔ ہماری زبان نہیں، اپنی قدرتی زبان سے، اپنی فطرتی صداقت سے۔ جیسے مٹھی بھر کنکریاں نبی علیہ السلام کے فرمانے پر بول اٹھی تھیں "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"۔ فطرت تو ان کی نہ بولنے کی تھی۔ جب خود خدا نے چاہا تو ان کی فطرتی زبان میں آوازِ انسانی کی سی جنبش پیدا ہو گئی اور وہ پتھر انسانی زبان کے سے دقائق بولنے لگ گئے تھے۔

## غیب ہے کہ ظاہر

خود غیب کے پردے میں ہے۔ لیکن ہر انسان کے دل میں اپنا تصویر خانہ بنا رکھا ہے۔

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

گردن جھکانا ہے اور بس۔ اسی کو اہل تصوف مراقبہ کہتے ہیں۔ جو دل میں موجود ہے، جس کے انعکاس ہر دل میں پڑ رہے ہوں، خواہ کم خواہ زیادہ۔ کچھ واضح کچھ دُھندلے۔ بعض روشن، بعض غیر روشن۔ خود سوچئے۔ اُسے غائب کہا جاوے یا حاضر خیال کیا جاوے۔

## امانت

بعض عارفین کا خیال ہے۔ جو امانت زمین و آسمان سے نہ اٹھائی گئی اور جس کا بوجھ اٹھانے سے وہ خوف کھا گئے اور انسان نے اٹھالی، وہ امانت فطرتی محبت خدا تھی جو بھولے انسان نے اٹھالی۔ اللہ تعالیٰ رحم میں آ گئے۔ جب انسان نے اس کی محبت کا بوجھ

Marfat.com

اٹھالیا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ محبت کا وزن کون اٹھا سکتا ہے۔ اور کس سے اس کا نبھاؤ ہو سکتا ہے۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں۔

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مُشکلھا

اس افتاد مشکل سے پار نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رحم کھاتے اور شفقت فرماتے ہوئے ظلوماً جہولاً فرمایا۔ کہ کس طرح نادان بھولے بھالے انسان نے کتنا بوجھ اٹھایا۔ یہ ہماری محبت کے تقاضے کیسے پورے کرے گا۔ چنانچہ فرمایا :۔

وَ حَمَلَھَاالْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْماً جَھُوْلًا

اب کچھ تو زبانی دعوے دار (منافق) رہے۔ اور کچھ اخلاص کی جگہ شرکتِ محبتِ غیر سے ملوث ہو گئے۔ ہاں ایک گروہ کامل دین کا اخلاص و محبت پر بھی ثابت قدم ہو نکلا۔ اور جو کامل نہ اترے، ان کو سزائے فرقت (جہنم) ملے گی۔ اور جو کامل اترے انہیں وصالِ اقدس سے مالامال کر دیا جائے گا۔

## غیبت عدم موجودیت کی دلیل نہیں

عام یہ خیال کہ جب نظر نہیں آتا، اور حاضر نہیں تو موجود بھی نہیں، سراسر مغالطہ ہے۔ آپ دیکھتے نہیں۔ لاکھوں اشیاء نظر نہیں آتیں۔ لیکن ان کو موجود بہ یقین خیال کیا جاتا ہے مثلاً لندن کس نے دیکھا، روم کس نے دیکھا؟ غرض لاکھوں شہروں کو ہم موجود خیال کرتے ہیں۔ لیکن نہ حاضر ہیں نہ ہم نے دیکھے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کس نے دیکھی تھی؟ اس کا تخت اس کے قصر و محلات کی کس نے سیر کی تھی۔ لیکن ہزاروں میل دُور ہم اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے احکام و قوانین پر سر تسلیم خم تھے۔ اور اس کی بغاوت جرم ہونا کامل طور پر تصور میں اور یقین میں تھا۔ اور جب تک اس کی حکومت رہی، اس کے نمائندوں کی نیاز مندی اور ان کی بالادستی تسلیم ہوتی رہی۔

Marfat.com

آج بھی صدر مملکت کو کیا ہر ایک نے دیکھا ہے، لیکن حکومت کے نمائندوں کو عین حاکم خیال کیا جاتا ہے، اور ان کے ہر حکم کی تعمیل ہم اپنے ذمہ خیال کرتے ہیں۔ بعینہ یہی حال مملکتِ خداوندی کا ہے اس کے نمائندوں کے ذریعہ ہم تک اس کے احکام پہنچے۔ اس کے ہدایات، رشد وارشادِ رسولؐ کے ذریعہ ہمیں ہر زمانے پہنچتے رہے۔ اور احکام کے ادا کرنے والوں کیلئے بشارات اور انکار کرنے والوں کے لئے سزا کے قوانین سنتے رہے۔ اور جزا و سزائے اعمال کا دن مقررہ قدرت کی زبان ہر نبیؐ کی زبان میں آکر وعدۂ بشارت دیتی رہی۔ ایسی صورت میں الغیب (خدائیت) کو غیب کہا جاوے یا ظاہر کہا جاوے۔ بلکہ ایک طرف ظاہر ہے تو دوسری طرف باطن۔ اس لئے فرمایا گیا ہے هُوَ ...... الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَئٍ عَلِيمٌ دیکھئے سمیع حاضر کے لئے ہوتا ہے اور علیم باطن کے لئے۔ یعنی دونوں صفات سے ذاتِ حقہ متصف ہے۔

## پہلا عقیدہ

غیب (پوشیدہ) کلی پر کسی عقیدہ کا قائم ہونا ناممکن ہے۔ جب تک وہ غیب ظہور کلی موجودیت میں نہ آئے۔ انسانی تڑپ ؎

مجھ کو ہے تیری جستجو مجھ کو تیری تلاش ہے
جانِ جہاں کہاں ہے تو مجھ کو تیری تلاش ہے

حیاتِ کائنات کے سرچشمہ کی سیرابی کی کسے پیاس نہیں۔ پھر انسان جو سراسر تلاش ہے۔

دوسری طرف غیب کلی (ذات الٰہی) كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ میں تو پوشیدہ خزینہ تھا، لیکن اپنی پہچان اور شناخت پسند تھی۔ یعنی بندہ اور ذات ربی کی تڑپ نے غیب کو ظہور میں آنے کے لئے بیتاب کر دیا۔ یہاں تک کہ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى آمنے سامنے اتنے قریب ہو گئے، جتنے ایک کمان کے دوسرے۔ ایسی صورت میں غیب غیب کہاں رہا، جب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو کر

Marfat.com

اپنے بندے سے تمام رازہائے سربستہ کہہ دیئے، جو ایک مدت سے اُبال کھا رہے تھے۔ صفت قدسی کا یہ لفظ اَنْ اُعْرَفَ خود بتلاتا ہے کہ جب وہ خود شناخت اور پہچان کرانا چاہتے ہیں تو پھر کیا پوشیدگی ہوگی۔ اور ایسی صورت میں علم الیقین سے بڑھ کر حق الیقین کے (حصول) کا عقیدہ بھلا کیونکر قائم نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا۔

پھر یہ ایک ہستی کے ساتھ ہی نہیں۔ بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو شرفِ عرفان نصیب ہوا اور ایک ایک نے اس کی شناخت کا دعوی کیا، اقرار کیا۔ بلکہ اقرار اپنے عقیدہ کی پختگی کی وجہ سے دوسروں سے کرایا۔ ایسی صورت میں ہستی باری تعالیٰ کا کیا شک رہ جاتا ہے؟ کوئی بے وقوف و نادان تسلیم نہ کرے تو نہ کرے۔ ورنہ شک کی گنجائش نہیں۔

## مذہب کی جان

یہ عقیدہ ہی مذہب کی جان ہے۔ اور مذہب کا تن اور جسم ہے۔ اسی آبِ حیات کی تلاش اور تگ ودو سے زندگی ہے۔ اگر اس عقیدہ میں کمی آجائے تو جیسے خون کم ہونے سے جسم کمزور ہو جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح اس عقیدہ کی پختگی میں کمی آنے کی وجہ سے مذہب نڈھال ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ موجودہ وقت میں مذہب کے کمزور ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہ روحِ عرفان کم ہوتی جاتی ہے۔

## موجودیت

موجودیت دو طرح کی ہے۔ ایک موجودگی مادی ہے، دوسری روحانی۔ مادی موجودگی جب قائم ہو جاتی ہے۔ تو جبتک وہ قائم ہے، موجودگی ختم نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شہر کی موجودگی قائم ہوگئی۔ تو یہ موجودگی اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک اس کے آثار قائم رہیں گے۔ اور اس کے بعد اس کی موجودگی کی شہادت قائم رہے گی، جب تک اس کے دیکھنے والے موجود ہوں گے۔ اس کے بعد تاریخ کے اوراق میں اس کی موجودگی رہتی تاریخ تک رہے گی۔

Marfat.com

## روحی موجودگی

لیکن روحی یا نوری موجودگی کے نشانات مادی تو نہیں ہوتے، جو قائم رہیں۔ بلکہ یہ وہی آثار ہوتے ہیں، جو دیکھنے والا دیکھتا ہے۔ لیکن جب دیکھنے والا ختم ہو جاتا ہے، تو اس کے تاثرات ہی پھر اس کی موجودیت ہوتی ہے لیکن مرور زمانہ کی وجہ سے یہ تاثرات مدھم ہوتے ہیں۔ گو ہمیشہ قائم رہا کرتے ہیں اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ ہم نے ہی ذکر اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں لیکن ان تاثرات میں وہ جوش و خروش نہیں ہوتا، جو ابتدا میں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے پتھر بھی پگھل جاتا تھا۔ اس لئے ہر زمانے میں انسانی تڑپ اور ذات ربی ظہورات پکڑتی رہتی ہے جس سے وہ تاثرات کامل بقا کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر نسل کے لئے موجودیتِ ذات قائم رہتی ہے۔ اور وہ دریائے وحدت جو ایک لمبے بہاؤ کی وجہ سے اور جذب ہونے کی وجہ سے کمزور ہوتا جاتا ہے بدستور اس کو ان چشمہ ہائے عرفانی سے امداد پہنچتی رہتی ہے۔ اور روانگیٔ وحدت میں فرق بہت کم آتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں نکالا جا سکتا کہ جس میں غواصانِ معرفت کی موجودگی نہ ہو۔ بلکہ ہر زمانے اور ہر قوم اور ہر ملک میں (وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ) ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے برابر موجودیتِ غیب، مطلق غیب رہا کرتی ہے۔

## پختگیٔ عقیدہ

عقیدہ میں پختگی شرطِ اولیں ہے۔ جوں جوں عقیدہ میں پختگی آتی جاتی ہے، عمل کی طرف بندہ چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ گویا عقیدہ ایک تخم ہے۔ جب پختگی سے آبپاشی ہوتی ہے تو روئیدگیٔ عمل شروع ہو جاتی ہے۔ گویا پختگیٔ عقیدہ لازم و ملزوم ہیں۔ اسی وجہ سے یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ (کہ ہر غیب پر ایمان لاتے ہیں) کے بعد یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ (قائم کرتے ہیں نماز کو) فرمایا گیا۔ جب غیب ظہور میں آتا ہے اور مشاہدے اور جلوے شروع ہو جاتے ہیں، تو انسانیت محوِ تجلی ہو کر اس کے سامنے گر پڑتی ہے اور اس کی ہستی پر اپنی ہستی کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ صلوٰۃ یہ نماز فطری ہے۔ فطرتِ انسانی خود سجدہ ریز ہو جاتی ہے، اور پرستش غیب یعنی خداوند تعالیٰ اور اس کی عبادت میں اپنی تسکین پاتی ہے۔ اور جب اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ پر پختگی آجاتی ہے تو خود بخود راہ مولا پر خرچ

Marfat.com

کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جیسے جب کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے بعد اس کے قدموں پر مال نثار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مال تو کجا جان تک دریغ نہیں ہوتی۔ ایسے ہی فرمایا گیا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ وہ ہمارے دیئے سے خرچ کر دیا کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرف عبادت میں منہمک ہوتے ہیں اور سربسجود حیاتِ مطلقہ کے سامنے ہوتے ہیں، تو دوسری طرف اس کی خوشنودی میں اسی کی املاک خیال کرتے ہوئے اس کی دولت اس کے بندوں پر خرچ کرتے ہیں۔

## دوسرا عقیدۂ کتب سماویہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ (الغیب) کے نازل کردہ احکامات و ہدایات پر ایمان لاتے ہیں۔ جنہیں کتب سماویہ کہا جاتا ہے کیونکہ جب رب کو تسلیم کرتا ہے، تو رب الارباب کے احکام کو فطرت خود تسلیم کرتی ہے۔

## تیسرا عقیدہ : انبیاء ورسل

احکام تو اس وقت تسلیم ہوں گے جب ہم رسالت کو تسلیم کریں گے، جس کے پاس احکام و ہدایات پہنچتے ہوں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لئے چن لیا ہو، جس کے لئے خود وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ کا ارشاد ہے۔

ہر انسان اس قابل نہیں کہ ارشادات کے لئے مناسب ہو۔ دنیا میں نہیں دیکھتے (کہ) سرکاری مناصب کے قابل ہر انسان نہیں ہوتا بلکہ مناسب استعداد اور مناسب علم کا ہونا ضروری ہے۔ جو احکام و ہدایات لینے کے قابل ہو، اس کی رسالت پر یقین رکھنا ایمانِ غیب کا ایک جزو ہے۔

## چوتھا عقیدہ : ملائکہ

آخر رسل و رسائل کے لئے ایسے خدام کی ضرورت ہوتی ہے، جو رسل و رسائل کا فریضہ انجام دیں، جن کے وجود ایسے پاک ہوں کہ اپنی خواہشیں نہ رکھتے ہوں، بلکہ وہ ہر خواہش سے پاک ہوں۔ تا کہ احکامات اور ہدایات کے اندر کمی وبیشی کے

مرتکب نہ ہوں۔ شرع کی اصطلاح میں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے، اور ہماری زبان میں فرشتے۔ یہ لفظ ہی اس لئے موضوع ہوا کہ پاکیزگی کے لئے کسی الائش کا واہمہ تک پیدا نہ ہو۔ یعنی "فرشتہ صورت و سیرت"

## پانچواں عقیدہ: (آخرت)

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کہ آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔ یعنی مرنے کے بعد کی زندگی، جس میں جزاو سزائے اعمال ہوگی۔ کیونکہ ہدایات دینے کا مطلب بھی اس وقت پورا ہوتا ہے جب اعمال و ہدایات کی ادائیگی میں عزت و راحت اور عدم ادائیگی کی صورت میں سزا بصورت ذلت ہو۔

پہلے عقیدے، الغیب کے ظہور سے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ایک عقیدے میں پختگی نہ ہو، یا نہ رہے، تو تمام عمارت دھڑام سے گرتی ہے، اور مذہب کو کامیابی نہیں ہوتی، یا معاشرہ مکمل نہیں ہوتا، بلکہ ہر کمی کے بعد برابر کمی ہوتی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں مذہب کے اندر یا معاشرہ کے اندر جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، وہ دراصل سرچشمۂ حیات کے بارے کامل یقین نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

آپ کہیں گے۔ ہمارا یقین خدائیت پر کامل ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پھر کیوں بنیادی عقائد میں تزلزل ہو رہا ہے اور کیوں ہر برائی کے سامنے سر جھکایا جا رہا ہے۔ بلکہ آج تمام قرآن حکیم کی تاویل شروع ہو گئی ہیں۔ متدین مسلمانوں کے خلاف نئی راہ نکالی جا رہی ہے۔

## عارفین کا قول

بعض عارفین کا قول ہے اَلْفَقْرُ هُوَ اللّٰهُ۔ یعنی فقر کیا ہے۔ ذات ربی کی جلوہ آرائی، ظہور کامل، ذات اقدس کو پا جانا۔ مطلب یہ ہے کہ تصوف فقر کے سوا کچھ نہیں۔ کہ اس تک پہنچنے کے طریقے، اور اس کے وصول کے ذریعے۔ یہانتک کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب، خود ذات عَزَّ اسْمُهٗ سالک کے دل پر ظہور فرماوے۔ اور اس کی جلوہ آرائی سے دنیا چمکتی نظر آوے۔ اور اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے

Marfat.com

نظارے سامنے آجاویں اور ''جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے'' مقامِ غیب سے نکل کر مقام ظہور پر ذاتِ احد لَم یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ آجاوے۔ اور جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو پھر حق الیقین تک یقین پختہ ہو جاتا ہے، اور اس یقین کے ساتھ ہدایاتِ الٰہی اور احکاماتِ الٰہی پر دل و جان سے سالک چلنا شروع ہو جاتا ہے اور تمام اعمال عقیدۂ رنی سے بھرپور ہو کر ہدایت کے سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں اور جاندار نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں معاشرے کا یہ کامل انسان روشنی اور بصارتِ قلبی سے بھرپور ہوتا ہے جیسے آفتاب کی روشنی میں ہماری بصارت کام کرتی ہے، اور اس روشنی کے بغیر چلنا پھرنا مشکل ہوتا ہے اور کسی شے کا دیکھنا محال ہوتا ہے۔ بعینہ اس انسان کی شعائیں جو ہدایت و رشد سے پُر ہوتی ہیں، دلوں کو چیر کر پار نکل جاتی ہیں، اور قلوب صاف ہو کر ہدایتِ صادقہ کی راہ پاتے ہیں۔ غرض فقر کے ذریعے ایک طرف وصول الی اللہ کی دولت حاصل ہوتی ہے تو دوسری طرف افکار بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ اسی پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اُولٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِنْ رَبِّهِمْ وَ اُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی ہدایتِ کاملہ پر چلتے ہیں۔ اور وہی لوگ ہیں، جو دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں۔

## کامیابی!

کامیابی کا عام معیار یہ ہے کہ دولت ہو۔ لیکن حقیقت میں بڑی اور اچھی زندگی وہ ہے جو معاشرہ کے لئے مفید ہو اور جو معاشرۂ انسانی کو مضبوط کرتی ہو۔ جس کے ذریعے اخلاق بلند ہوتے ہوں اور جس کے عدل پر اقوام بھروسہ کرتی ہوں، اور جس کی پرہیزگاری ضرب المثل ہو۔ بے غرض، بے لوث خدمتگار ہونا، ہر بدی سے بچنا، ہر حق کا ادا کرنا، یہ ہے کامیاب زندگی جسے آج گئے گزرے زمانے میں بھی عزت نصیب ہے۔ لیکن کیا کیا جاوے۔ آج کل اکے دکے بھی ایسے پاکباز آدمی دیکھنے میں نہیں آتے۔ لیکن ایک وقت تھا، عام مسلمانوں میں ایک دو نہیں بلکہ ساری قوم اس صفت سے موصوف تھی، اور صبغۃ اللہ کا رنگ ہر فردِ امت پر تھا۔ کیوں؟ صرف عقیدہ کی

Marfat.com

پختگی کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھنے کی وجہ سے۔

غرض جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ اعتقادیات، اعمال کے قالب ہیں، یا ایک مشین ہے، جس سے اعمال سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اور برے اعمال کو یہ مشین خود بخود الگ پھینکتی جاتی ہے، اور انہیں ناکارہ کرتی جاتی ہے۔ اور جس عمل میں ذرا سی دراڑ رہے، اسے یہ مشین قبول نہیں کرتی اور ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتی ہے۔ اسی مشین کو مکمل بنانے اور اسے کسے رکھنے کا نام فقر و تصوف ہے اور بس۔

## معرفت اور شناخت کے مدارج

ایک آدمی کا نام سنتے ہیں۔ پھر اس کے اوصاف پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی صورت سامنے آتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ رہنے سہنے سے اس کی سیرت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد ذاتی تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کی وجہ سے اس کے ذاتی خیالات پر احاطہ ہوتا ہے۔ محبت بڑھتی ہے اور گھٹتی ہے۔ غرض ہر درجہ ایک شناخت ہے جو پہلے کی نسبت ترقی کرتی جاتی ہے۔ لیکن اس غیب عَالِمُ الغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ، جو تمام حقائق کا مالک ہے، جس کی ذات والا صفات تمام خیر و شر کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی شناخت کیسے مکمل درجے پر کی جا سکتی ہے؟ غرض ایک شناخت سے دوسری ترقی پر چلتی جائے گی۔ لیکن زندگی ختم ہو گی، شناخت و معرفت کے مدارج ختم نہ ہوں گے۔ اب تو عام طور پر عالمِ ایجاد کا بھی یہی حال ہو رہا ہے کہ ترقی پر ترقی چلی جا رہی ہے، اور سائنس کسی جگہ ٹھیر نہیں سکتی۔

## یقین اور معرفت کا تلازم

غرض شناخت و معرفت کے ساتھ یقین اس طرح قدم اٹھائے گا۔ جس طرح شناخت اٹھائی جائے گی۔ اور یقین کے مدارج بھی اتنے ہی بلند ہوتے جائیں گے، جتنی شناخت اور پہچان بلند ہوتی جائے گی۔ غرض جس طرح شناخت کی انتہا نہیں، اس طرح یقین کی انتہا بھی نہیں۔ ابتداء میں یقین کے دُھندلے نقوش ہوں گے، جیسے

Marfat.com

شناخت و معرفت کے دھندلے نقوش تھے۔ جوں جوں نقوشِ معرفت یا شناخت پختہ ہوتے جائیں گے۔ یقین کی کڑیاں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی۔

## مدارجِ عرفان

حسنِ مضطرب نہ تو حسنِ بازاری ہونا پسند کرتا ہے اور نہ خلوت خانہ میں نقاب پوش ہونا اس کی فطرت ہے۔ وہ ہر وقت ہر گھڑی سیماب کی طرح اپنے ہستی اسی میں خیال کرتا ہے کہ نقاب پوشی کے اندر اس کی عشوہ بازی رہے اور نگاہِ غلط انداز سے دلوں کو چیرتا رہے، گاہے چنیں گاہے چناں، اپنے طالبوں کو حیات سرمدی سے لبریز کرتا رہے۔ اور ایک وقفہ کے بعد دوسرے وقفہ میں اپنی تازہ جلوہ گری کا ثبوت دیتا رہے۔

ایسے حال میں جمال و حسن و کمال کیسے اندر چھپ سکتا تھا، اور کیسے بازاری بن کر عوام میں عام ہو سکتا تھا؟ قیمت تو اس کی ہے، جو کمیاب ہو، اور جس کے خریدار عام ہوں۔ اپنے اہل محبت اور جاننے والوں سے تو عشوہ بازی سے دل کو چھیڑتا رہے۔ اور نامحرموں سے الگ تھلگ اپنی ہستی رکھے۔ نہ دیکھے نہ دکھائے۔ اور محبت کے متوالوں سے ہمیشہ چھیڑ چھاڑ رہے، اور ہر آن محبت بڑھتی رہے۔

چنانچہ جن کو بے غرض محبت سے بھرپور دیکھا۔ انہیں ان کے بستر خواب سے جا کر اٹھایا، اپنا راز دار بنایا، اپنا آپ اور اپنی قدرت کے مظاہر دکھائے اور ہستی کے عجائبات سے سرفراز فرمایا، اور انہیں اپنا شیدا اور متوالا بنا کر اپنے تعارف کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں دے دیا، اور قدرت اور حکمت سے ان کے دل اور سینے بھر دیئے، اور پھر استعداد کے مطابق انہیں اپنی جلوہ آرائی سے مست کیا اور ایسے کیا کہ ان کی زبان ان کے دل اور ان کے جسم تمام کے تمام اس کی ذات سے متاثر ہو گئے اور ہر دیکھنے والا انہیں کا ہو رہا اور ان کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے احکام اور اوامر پر تل گیا۔ عمر بھر کسی طرف نہ دیکھا، اور اسی روش پر جو ازل سے ان کے لئے لکھی تھی، چلتا رہا۔

لیکن یہ جذبۂ محبت اتنا مکمل تھا کہ صدیوں اور مدتوں کے باوجود برابر چل رہا ہے۔ گو کمی آجاتی رہی۔ لیکن مدھم ہونے پر بھی ابھی شعلہ زن ہے۔ کیونکہ ہر زمانے میں اس کے عشوہ بازی کے جلوے برابر تازگی پیدا کرتے رہتے ہیں، اور

Marfat.com

جذبہ الفت و محبت کو تازہ دم رکھتے ہیں اور ہر قدم پر حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ان کے دل و جان سے نکلتا ہے، اور ہر حال اس کے سوا کسی دوسرے کی طلب ان کے دل میں نہیں اُبھرتی۔

خود فطرت کاملہ فرماتی ہے فَضَّلۡنَا بَعۡضَھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت بخشی ہے) یعنی ہر ایک کا حال جدا ہے اور ہر ایک سے راہ و رسمِ محبت الگ ہے۔ یہی ابدی زندگی ہے جو کروڑوں سال گزرنے کے بعد بھی تازہ دم ہے، اور ہر آن نئے انداز اور نئی شان میں ظہور پکڑتی ہے۔

یہی لوگ انبیاء اور رُسل کہلاتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ براہ راست بھی اپنے حکم فرماتا اور بذریعہ وحی بھی اپنا کلام بھیجتا ہے۔ جنہیں ہر طرح کے قرب سے نواز کر مسند ارشادِ الٰہی پر بٹھاتا ہے، اور غلبۂ عرفان و یقین اس درجہ پر پہنچتا ہے، کہ جو بھی ان کے حلقے میں گیا، وہ ایسے متاثر ہوا کہ ان کا کامل پیرو ہو گیا۔ کیوں؟ محبت و عرفان و یقین کے بلند مدارج سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہونے دیتے، اور یہ تاثر اتنا غالب رہتا ہے کہ ایک امت بن جاتی ہے اور ایک مذہب (روش و طریقۂ الٰہی) پیدا ہو جاتا ہے۔

نہ تنہا عشقِ از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

غم والے کی آواز غم پیدا کر دیتی ہے۔ خوشی والے کے الفاظ خوشی دلوں میں ڈالتے رہتے ہیں اور یقین والے کی گفتار یقین پیدا کرتی ہے اور معرفت و شناسائی والے شناسائی سے دلوں کو بھر دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ پیروکار حقیقی مشاہد نہیں ہوتے۔ لیکن حقیقی مشاہد سے کم صرف دوسرے درجہ پر ایمان ہوتا ہے۔ خود حضور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمام امت کا ایمان ایک طرف اور صدیق اکبرؓ کا ایمان ایک طرف۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اگر پردے اٹھا دیئے جائیں تو میرا ایمان کچھ نہ بڑھے گا۔ یعنی میرا یقین اتنا پختہ ہے کہ مشاہدہ تک پہنچا ہوا ہے۔ اور کسی مزید مشاہدہ کی ضرورت نہیں۔

نبوت کے زیر اثر جو لوگ آتے ہیں، ان کے اعمال کی پختگی کی وجہ یہ ہے کہ نبوت کے جذبات ان کے جذبات پر قابو پا لیتے ہیں۔ اور جذبۂ صاحب نبوت کا کامل عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو رتبہ ویقین اصحاب رسولؐ کا ہوتا ہے وہ پھر امت میں کسی کو نصیب نہیں ہوتا، اور اعمال صادقہ اور اخلاص و تقویٰ وہاں پہنچتا ہے جہاں پھر امت سے کسی کا وہاں تک نہیں پہنچتا، حالانکہ خود مشاہد نہیں ہوتے۔ لیکن مرور زمانہ سے یہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ اور جوں جوں دبعد ہوتا جاتا ہے، جذباتِ نبوت کے زیر اثر کم آتے ہیں۔ گو یہ اثر ہمیشہ رہا کرتا ہے۔ ورنہ مذہب بے جان ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

ان پاک نفوس جن کو اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لئے چن لیتا ہے، ان سے یہ نیچے درجے کی بزرگ ہستیاں ہوتی ہیں۔ وہ اس درجہ کے مراد (ا) تو نہیں ہوتے۔ تاہم ایک طرح عکسِ الٰہی ان میں ہوتا ہے اور فطرتاً تشنگیٔ جمال ذات رکھتے ہیں۔ اور اس فطرتی پیاس کو بجھانے کے لئے راہِ محبت اختیار کرتے ہیں یعنی مجاہداتِ نفس سے دل کو روشن کرتے اور عکسِ جمال الٰہی قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ رحمت الٰہی اپنی محبت کی آغوش میں ان کو لے لیتی ہے، اور اپنے جلوہ ہائے محبت ان پر ڈالنے شروع کر دیتی ہے، اور مشاہدات روحی ان پر کھلتے جاتے ہیں۔ اور نمونۂ رسالت و نبوت ہو کر خلق اللہ کے لئے ہدائت کا باعث بنتے ہیں۔

## معیارِ شناخت و معرفت

کسی چیز کی شناخت یا معرفت کے یہ معنی نہیں کہ اس چیز کے ظاہر سے لے کر اس کی حقیقت سے واقفیت تامہ ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر چیز کی حقیقت ہر فردِ معاشرہ کو معلوم ہو۔ طبقاتِ ذہنی کی خلقت ہی ایسی رکھی گئی ہے کہ تمام اذہان باوجود کوشش کامل کے اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے جسے کامل معرفت کہا جائے۔ بلکہ بعض ذہن ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اصل حقیقت تک پہنچنے کے سوا صبر اور سکون نہیں کرتے۔

Marfat.com

## واقفیتِ عامہ

واقفیت عامہ ضروری ہے کہ ہر ذہن کے مطابق اس کی شناخت ہو اور وہ بھی جسے اس چیز کے ساتھ خاص تعلق ہو۔ جیسے پہلے لکھا گیا ہے۔ نام سے لے کر اس کی اصل حقیقت اور شناخت تک کے سینکڑوں مدارج ہیں۔ ایسے ہی حسبِ ضرورت واقفیت اور شناخت ہونا شناخت اور معرفت کہلاتی ہے۔ اور متعلقین ضرورت کی واقفیت ان حسبِ ضرورت مکمل ہونی ضروری ہے۔ مثلاً ایک عام آدمی کو وقت کی اتنی ضرورت ہے کہ دن ہے یا رات۔ پھر اس سے بڑھ کر پہروں میں رات دن کی تقسیم کی واقفیت بعض کو ہو گی۔ اس سے زیادہ جب بڑھیں گے، تو گھنٹوں کی پہچان، پھر منٹوں کی پھر سیکنڈوں کی۔

## گھڑی

ایسے ہی گھڑی کی واقفیت عامہ اتنی ہی کافی ہے کہ یہ وقت بتلاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے مدارج واقفیت حسبِ ضرورت بڑھتے جائیں گے۔ پھر اس کی چابی بھرنے کی واقفیت گھڑی رکھنے والے کے لئے ضروری اور وقت کو صحیح کرنے کا طریقہ بھی۔ لیکن گھڑی ساز کی واقفیت اتنی کافی نہیں بلکہ اسے جوڑنے کی واقفیت ہونی ضروری ہے، تاکہ نقص نکال سکے۔ لیکن کارخانہ میں یہ واقفیت کسی کام کی نہیں، بلکہ پرزوں کی ہیئت ترکیبی اور ان کی بناوٹ سے واقفیت ہو گی اور ایسی بلند قسم کی مشینوں کا تیار کرنا، جو پرزے بنائیں واقفیت ہی کہلائے گا۔ اور آخری درجہ اس نظریہ کا ہے، جس پر وہ مشینیں تیار ہوتی ہوں، جس کے ذریعے پرزے آپس میں توافق سے ایسے چلیں کہ گھنٹے، منٹ، سیکنڈ برابر ہو کر چلیں۔ پینڈولم کی حرکت سے گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیوں پر علیحدہ علیحدہ اثر مرتب ہوتا ہے۔ جب گھنٹہ کی سوئی ڈائل کا بارھواں حصہ طے کرتی ہے تو منٹ کی سوئی پورا چکر کاٹ جاتی ہے، اور سیکنڈ کی سوئی ۶۰ چکر طے کر جاتی ہے۔

غرض یہی حال تمام صنائع اور تمام اشیاء کی بابت ہے۔ لیکن واقفیت اور

Marfat.com

شناخت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر مرحلہ کی واقفیت ہر درجہ کے آدمیوں میں پیدا ہو جائے، جس سے یہ صنعت صرف ختم ہی نہ ہو، بلکہ ترقی کی طرف اس کے قدم بڑھتے جائیں۔ مثلاً اگر صرف وقت کی شناخت تک واقفیت محدود ہو تو پھر چند سالوں میں گھڑیاں ختم ہو جائیں گی جب گھڑی ساز نہ ہوں گے۔

لیکن فائدہ اٹھانے والوں کیلئے یہ ضروری نہیں کہ تمام واقفیت رکھتے ہوں۔ لاکھوں افراد گھڑی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن وقت کی شناخت کے بغیر۔ وہ جانتے کچھ بھی گھڑی کی بابت نہیں۔ اس سے بہت اوپر کے درجہ کی واقفیت کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی آخری درجہ کے لئے تو چند ایسے ماہروں کی ضرورت ہے، جو اپنے نظریۂ فن میں کامل ہوں، جن کے سہارے یہ فن چل رہا ہے۔

غرض علم میں یہی حال ہے۔ ہر آدمی کا علم آخری حد تک پہنچنا ضروری نہیں، کہ وہ ایم۔ اے ہو۔ حسبِ ضرورت شناختِ الفاظ سے لے کر آخری سے آخری حد تک علمیت ہے اور حسبِ ضرورت علم اس فرد کے لئے اتنا ضروری ہے جتنی وہ فرد ضرورت رکھتا ہے۔

## مذہبی معلومات اور مشاہدات

ایسے ہی مذہبی معلومات کا معاملہ ہے۔ اس ابتداء کہ "میرا مذہب سچا ہے" سے لے کر ہزاروں مرحلوں کے بعد اس مشاہدہ تک شناخت اور واقفیت ضروری ہے جس پر مذہب کی بنیاد ہے۔ یعنی ذات کبریائی کے جلوے اور مشاہدے۔ جس کے سہارے مذہب کا ایک ایک عمل اپنا سہارا لیتا ہے یعنی رضائے حق۔ ورنہ عام آدمیوں کے لئے یہ ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، اوامر ہیں، نواہی ہیں، بلکہ میں ایک مسلمان ہوں۔ یہ یقین کہ میں مسلمان ہوں تمام اعمال کا محرک ہے۔ ایک عام آدمی کے لئے اپنی مسلمانی پر یقین ہونا تمام اعمال صادقہ کی تحریک ہے۔ وہ ہر نیک عمل کے لئے لپکے گا، اور ہر عمل جاں بازی کے

Marfat.com

لئے حاضر ہو گا۔ ہاں! اپنی مسلمانی کے یقین ہونے میں دراڑ پیدا ہو جائے اور وہ اپنی مسلمانی کی ذمہ داری سے دست بردار ہو جائے، تو پھر یہ تحریک مردہ ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے صرف ایک مسلمانی جذبہ سے کہا تھا ؎

اگر گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

غرض ایک سادہ مقلد کے لئے اس کی اتنی شناختِ مذہبی "کہ میں مسلمان ہوں" اس کے لئے کافی ہے۔ اور مسلمانی کے تمام عائد کردہ فرائض کے لئے ہر وقت، ہر آن اور ہر حال اسے آپ تیار پائیں گے۔

لیکن یہ اُسی وقت ہے جب ابتدائی یقین علام الغیوب کا بعض افرادِ ملت میں حق الیقین کے درجہ پر پہنچا ہوا ہو، اور نبوت کا یقین جو آفتاب کی طرح چمک رہا ہے، اس کے یقین پر پرتو فگن ہو۔ یعنی نبوت کے یقینِ مشاہدی کے ساتھ اپنا یقینِ مشاہدی ہم آہنگ ہو کر اپنا ظہور پکڑے۔ ورنہ الگ الگ ہونے کی صورت میں تشتت وافتراق پیدا ہو گا اور یقین پختگی پانے کے بجائے افتراق اور تشتت میں آجائے گا۔ جس سے مذہبی عمارت میں شگاف پیدا ہونے کا احتمال ہی نہیں ہوتا بلکہ شگاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور عمل میں پختگی آنے کی بجائے تساہل پیدا ہوتا ہے، اور ہم آہنگی نہیں رہتی، اور اعمال میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

## ضروری

اس لئے ضروری ہے کہ ہر مشاہدۂ حق پر مشاہدۂ نبوت کا ایک ظل ہو، ایک عکس ہو اور اسکے ساتھ کامل اتحاد رکھتا ہو۔

## محافظتِ مذہب

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ قرآنِ حکیم کی محافظتِ ظاہری وباطنی اس طرح چلی آتی ہے کہ حفاظ ہمیشہ تواترِ کلامِ ربانی کے محافظ ہوتے

Marfat.com

چلے آئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ختم ہو جائیں تو محافظیت ختم ہو جائے گی۔ ہر زمانے میں سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں یہ محافظِ دین حفاظ چلے آرہے ہیں اور چلے جائیں گے۔

ایسے باطنی محافظیت کا بھی حال ہے کہ متواتر حفاظِ باطن مشاہدۂ الٰہی سے بھرپور چلے آرہے ہیں، اور چلے آتے رہیں گے۔ اور مذہبی روحانی مشاہدے قائم رہیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں صوفیائے کرام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کے بارے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِبیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

وَاضۡمُمۡ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَۃً اُخۡرٰی لِنُرِیَکَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡکُبۡرٰی اِذۡھَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی۔

(ترجمہ) اپنا ہاتھ اپنی بغل میں لے لو کہ وہ تکلیف کے سوا براق ہو نکلے گا۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ تاکہ ہم اپنی بڑی نشانی تم کو دکھادیں۔ فرعون سرکش ہو چکا ہے۔ اس کی طرف (دعوت خدائی) لے کر جاؤ۔

بڑے نشانات کیا ہیں؟ وہی فرعون کی تباہی کا سلسلہ۔ یہی پاک نفوس اہلِ دل ہیں، جو سرکشانِ دین کے لئے بنائے جاتے ہیں، اور جن کے معرکے انہیں مسلمان بناتے ہیں۔ محققین اور متکلمین و محدثین کی خدمات جلیلہ ہیں لیکن ان لوگوں کی خدمات بھی دین ہیں، جن سے دین کی وقعت سربلند ہوتی ہے۔

## غیب و ظہور کی ایک مثال

ہم اپنی جان اور روح اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت سے ابھی تک بے خبر ہیں۔ اسے دیکھ نہیں سکتے، نہ پہچان سکتے ہیں۔ لیکن یہ محسوس و معلوم

ہے کہ ہمارے تمام حرکات، دیکھنا سننا، پھرنا چلنا، سوچنا سمجھنا سب اسی کی وجہ سے ہے اگر وہ نہ ہو تو ہم کچھ دیکھ سن نہیں سکتے۔ ایسے ہی باقی صفات کا حال ہے۔

باوجود غیب ہونے کے اس کے ظہور اتنے بلند ہیں کہ ہم کسی صورت انکار نہیں کر سکتے۔ بلکہ سمجھتے ہیں کہ اسی ہستی کا تمام کارخانہ چل رہا ہے۔ دیکھئے ایک طرف غیب ہے اور دوسری طرف ظہور ہے۔

## بعینہ یہی حال غیب مطلق کا ہے

غیب مطلق سرچشمۂ حیاتِ کائنات کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے، ایک طرف غیبِ کلی ہے دوسری طرف ظہورِ کلی۔ جو کچھ کائنات میں چل رہا ہے۔ یہ اسی "روحِ رواں" جان جہاں کہاں ہے تو مجھ کو تیری تلاش ہے، کا ظہور ہے۔ جس طرح ہم نے اپنی ہستی کی تلاش نہیں کی۔ ورنہ ضرور ہم اس تک پہنچ سکتے۔ بعینہٖ اسی طرح ہستی مطلق کی تلاش سے غافل ہیں۔ ورنہ ہر حرکتِ کائنات اس کی حرکتِ ارادی سے وابستہ ہے۔ اور ہر انسان جب مطالعۂ قدرت کے لئے اپنے دل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس آئینہ جہاں نما کے اندر اس غیبِ مطلق کے جلوے برابر نظر آتے ہیں۔ وہ خود بتلاتا ہے کہ میں علیم ہوں، خبیر ہوں سمیع ہوں، بصیر ہوں۔

غرض اپنی ایک ایک صفت کی تسلیم اندر اندر کراتا رہتا ہے۔ اور ہر تسلیم کرنے والا اسے ایسے دیکھتا ہے یعنی یقین کرتا ہے جیسے اُسے خود دیکھ رہا ہے۔ اس آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے۔ وہ اتنا لطیف ہے کہ دیکھنے میں نہیں آسکتا اور دل کی آنکھ اسے دیکھتی ہی نہیں بلکہ دل پر براجمان ہو رہا ہوتا ہے۔ اور دل اس کی محبت و عشق میں سرمست ہوتا ہے اور اس کی ہر آن و شان پر جان وار رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب میں غیب سے مشاہدیت پیدا ہوتی رہتی ہے، اور مشاہدیت سے غیب کی طرف رخ ہوتا جاتا ہے۔ غیب میں مشاہدیت ہے اور مشاہدیت میں غیب۔

(مئی ۱۹۶۵)

Marfat.com

# طبقات

اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہنوں کو وہ کچھ صلاحیتیں دیں جو کسی دوسرے جانور اور حیوان کو عنایت نہیں فرمائیں۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کروڑوں درجے کے ذہن ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف۔ ہر ذہن اپنی ذہنیت کے مطابق ایک اونچا درجہ رکھتا ہے بخلاف دیگر حیوانات کے۔ ان میں گو اختلافِ ذہنی کسی قدر پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک ہی قسم اور ایک ہی روش پر ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک جانور اپنے کام میں اور اپنی خدمت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائے۔ لیکن یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ اس کی درجہ بندی کی جائے۔ شہد کی مکھیوں کے بارے سنتے ہیں کہ ان میں درجہ بندی ہے، اور الگ الگ کام تقسیم ہے، اور ان میں ایک ملکہ ہوتی ہے لیکن وہ بھی محدود حد تک صرف شہد بناتے ہیں، (رس) لاتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔

بخلاف انسانی ذہن کے، اس کے اندر ہر قسم کی صلاحیتیں رکھی ہیں، اور کئی قسم کے شعور دیئے گئے ہیں۔ یہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اور وہ کام جو اللہ کی تقدیر میں ہے اس کے لئے اس کا حصہ ہے اور پھر عجب یہ ہے کہ بڑی دلیری اور ہمت سے اس کام کو نبھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ہمت پر ہی فرمایا ظَلُوْمًا جَھُوْلًا۔ جو

Marfat.com

بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا وہ بھی اٹھانے کے لئے تیار پایا جاتا ہے۔

انسانی ذہنی درجہ بندی، عام طور پر دہقانیت، تاجریت، حرفیت، چاکریت اور انتظامیت میں تقسیم ہے۔ اور معاشرۂ انسانی میں یہ پانچ رکن وہ اہم کردار ادا کر رہے ہیں جن کی کسی دوسری جنس میں نہ ضرورت ہیں اور نہ پائے جاتے ہیں۔

دہقانی ذہن عام طور پر پست ہے لیکن بڑا مشقت پسند ہے اور اپنی مشقت کے معاوضہ میں صرف اپنی دہقانیت پر خوش ہے کہ میں کاشتکار ہوں، زمیندار ہوں۔ حقیقتاً زندگی بھی یہی ہے کہ میں ہر ایک کا داتا ہوں اور تمام میرے محتاج۔ گو اپنا پیٹ بھی خالی رہے اور کسی کے سہارے زندگی بسر ہو رہی ہو۔ بلاشک دنیا اسی کے سہارے قائم ہے، جس کی کوئی قیمت دنیا میں نہیں۔ ہر پیشہ من مانی زندگی بسر کر رہا ہے، اور اپنی ذہنیت کی کامل قیمت وصول کرتا ہے۔

حرفت پیشہ کو دیکھو۔ تاجر پر نظر دوڑاؤ۔ انتظامیہ کا تو کیا کہنا۔ خود کچھ نہیں کرتا، لیکن سب کچھ اپنا ہے کسی کا اس میں حصہ نہیں۔ جیسے چاہیں گے پائیں گے، کسی دوسرے کو بولنے کا اختیار نہیں۔

چاکریت، دہقانیت سے بھی پرلے درجے پر گری پڑی ہے۔ لیکن ذہن کے اندر یہ کتنی خوبی ہے کہ وہ کسی کے سہارے ہی زندگی گذارنے کو زندگی خیال کرتی ہے اور اپنے ذہن سے زندہ نہیں رہتی۔ کسی کے ذہن پر سہارا اور حکم کے تابع۔ غرض تابعداری بھی فطرت ہو چکی ہے اور اسی زندگی میں ان کو لطف آتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جن کو کمین جیسے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر خودی موجود لیکن اپنی ہستی کی خودی معدوم ہے۔ یعنی مستقل زندگی کا خیال تک نہیں۔

بعض آدمیوں کو دھوکہ ہے کہ لینڈ لارڈ بھی دہقان ہیں جو دولت مست اور عیاش ہیں۔ لیکن دہقان تو وہ ہے جو اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے، اور روزانہ کاشتکاری کی مشقت میں مبتلا ہے، اور سال بھر میں ایک دن ایسا نہیں ملتا، جس دن وہ اپنے کام سے فارغ ہو، حتی کہ عید کے دن بھی وہ ایسے ہی مصروف کار ہے جیسے

Marfat.com

پہلے تھا۔ صرف دوگانہ عید کی فرصت ہے اور بس۔ لیکن ذہن مغرور ہے کہ تمام کا سہارا میں ہوں۔

لینڈ لارڈز تو انتظامیہ میں شامل ہیں۔ جنہیں ہر طرح کی بالادستی حاصل ہے، اور جو اپنے علاقہ میں حاکم مطلق خیال کئے جاتے ہیں، جو چاہیں کریں، اپنی رعایا میں ہی نہیں، بلکہ علاقہ ملحقہ میں بھی ان کی بالادستی تسلیم۔ تھانے ان کے، افسر اُن کے، جو چاہیں کریں اور کرائیں۔

پہلے زمانے میں حرفت پیشہ ایک مشقت پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن مشینی دور میں حرفت و تاجریت مل کر ایک حاکمیت کی صورت میں تبدیل ہو رہی ہے اور تاجریت بھی پہلی تاجریت نہیں رہی۔ جہاں بیسیوں منافع لیتے تھے اب سینکڑوں پر بھی توجہ نہیں۔ لاکھوں کروڑوں تک جا پہنچتے ہیں۔ لیکن ہوس و حرص باقی۔ بلکہ مادی دنیا کو ہڑپ کرنے کی خواہش ھَلْ مِن مَّزِیْد کی آواز لگا رہی ہے۔

کچھ بھی ہو لیکن اس ترکیبِ معاشرہ کے سوا کسی کو چارہ نہیں۔ معاشرہ ایسے ہی بنتا ہے اور اس کی اصلاح سے معاشرہ میں ارتقاء پیدا ہوتا ہے اور اس کے بگاڑ سے معاشرہ میں بگاڑ آجاتا ہے، اور معاشرہ جانور کے درجے میں پہنچ جاتا ہے۔

## معاشرتی طبقات

انسانیت جب تک معاشرتی طبقات میں تقسیم نہ ہو، اس وقت تک معاشرہ قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ گو طبقات میں تقسیم نفرت و حقارت اور حسد کی پیدا کنندہ ہے۔ لیکن یہ طبقات ایک دوسرے کے تعاون اور امداد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔ اس فطرتی مجبوری کی وجہ سے نفرت ور قابت کو بڑھاوا نہیں۔ بلکہ ایک کشمکش کی وجہ سے معاشرہ میں اعتدال قائم رہتا ہے۔

دہقانیت جو معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور جس کے تخم سے تمام طبقات زندگی حاصل کرتے ہیں، باوجود تخم معاشرہ ہونے کے ہمیشہ سے اپنے پیٹ کے لئے

دوسرے طبقات کی محتاج رہی ہے، اور دوسرے طبقات کی دست نگر۔ ذہن اگرچہ حاکمانہ ہے لیکن عملی زندگی میں اس سے زیادہ بیکس کوئی طبقہ نہیں۔ آج دنیا اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے، اور اس کے حصول کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے۔ مالکیت تو کجا، مزارعیت کے لئے باوجود حکومت کی خاص توجہ کے ابھی پہلی سی حالت ہے اور مالکانِ زمین کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حرفت کا بھی کبھی یہی حال تھا لیکن اب حرفت نے ترقی کر کے اپنے جوہر اتنے بلند دکھائے ہیں کہ تمام طبقات اس کے زیر اثر ہو گئے ہیں اور مشینی دور میں یہ طبقہ حقیقتاً معاشرہ کا مالک ہو رہا ہے۔

تاجریت جو کسی زمانے میں سب سے بلند طبقہ تھا، اور تمام طبقات اس کے زیر تھے، اب اس کی بالادستی ختم ہو رہی ہے اور حرفت کے بل بوتے پر دولت کما رہے ہیں۔

انتظامیہ اگرچہ مشقت کا نام نہیں جانتی لیکن جب کوئی شخص بھی اس کا ممبر اور رکن ہو جاتا ہے تو وہ ساری دنیا کا مالک اپنے آپ کو تصور کرتا ہے اور بسا اوقات وہ کچھ کرتا ہے جس سے انسانیت کو شرم محسوس ہوتی ہے اور دہقانیت پر رحم نہیں کھاتا، جو معاشرہ کی تمام انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کفیل ہے، اور جس سے تمام طبقات پرورش پاتے اور زندگی حاصل کرتے ہیں۔

## کردار مذہب

مذہب انسانیت کی روح رواں ہے یا آبحیات۔ مذہب ذہنی کشمکش کو دور کرتا ہے۔ طبقات انسانی کو اتحاد و مساوات اور اخوت کا سبق ہی نہیں دیتا بلکہ عملاً ایک کر دیتا ہے اور معاشرہ کو واحد جان کا تصور دلاتا ہوا طبقاتِ انسانی کو یک جان قرار دیتا ہے۔ یہ نفرت و غرور کو مٹاتا ہے۔ اور حسد و رقابت کو دور کرتا ہے۔ اور اتحاد محکم کی دیوار سے معاشرہ کا قلعہ بناتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور ہم نے قبیلے اور رشتے قائم کئے

Marfat.com

تا کہ ان سے تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ لیکن اللہ کے نزدیک تو وہ قابل احترام ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو (یعنی ہر بدی سے بچتا ہو)۔(۱)

کامل انسانیت کا شرف اسے بخشتا ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو کر اپنے اقران میں بلند ہو۔

## اختلاف کو ذہن پیدا کرتا ہے

پیشہ ورانہ صلاحیتیں اور کارکردگیاں، اختلاف ایک دوسرے سے پیدا نہیں کرتی بلکہ ذہنی اختلاف، اختلاف کا پیدا کنندہ ہوتا ہے اور رقابت، حسد اور نفرت کا باعث پیشے نہیں ہوتے بلکہ ذہن ہوتے ہیں جو اختلاف رائے پیدا کرتے ہیں، اور ایک دوسرے پر برتری کے خواہاں ہوتے ہیں۔

لیکن مذہب کا سب سے بڑا کام اس ذہنی اختلاف کو دور کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلمۂ الحق لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ کے ذریعے وحدتِ انسانیت کا تخم بویا جاتا ہے، اور ہر اقتدار اور ربوبیت کو اس کلمۂ پاک سے مٹایا جاتا ہے۔ اور پھر اس تخم سے تمام اعمال اور ثمرات کو یکسانیت دی گئی ہے۔ کسی کی برتری بھی کسی موقع پر کسی پر نہیں رکھی۔ اور انسانیت کو ایک دھاگے میں پرو دیا جاتا اور ایک لڑی میں منسلک کیا جاتا ہے۔ حقیقتاً یہ کار عظیم اتنا بلند ہے کہ جو زمین و زمان بھی اٹھا نہیں سکتے اور یہی انسانیت کے ارتقاء کا واحد گرو ہے جس سے انسانیت اپنے کامل ارتقاء پر پہنچتی ہے۔(۲)

اختلافِ ذہنیت ہی انسانیت کے لئے تباہ کن ہے۔ آپ دیکھتے نہیں مختلف نظریات نے انسان کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے۔ آج ذہنی اور نظری اختلاف کو کھلے طور پر دیکھ نہیں رہے کہ قوموں کی زندگی کو نظریات تباہ کر رہے ہیں اور انسانیت ایک دوسرے کی دشمن بن رہی ہے اور ایک دوسری کو دیکھ نہیں سکتی۔

بہر صورت مذہب کا یہی حقیقی کام ہے کہ انسانیت کا اتحاد قائم رکھے اور

Marfat.com

اس کے نظریات کو ایک سانچے میں ڈھالے تاکہ انسانیت اپنے اعلی مدارج پر پہنچ کر اپنے لئے اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ثابت ہو۔ مذہب اتحادِ فکر، اتحادِ اعمال و اخلاق اور عادات و رسومات کا ضامن ہے۔ اور ایک معاشرہ کی ہر جزو کی یکسانیت انفرادی و اجتماعی پر کڑی نگرانی رکھتا ہے اور ملت کو ایک چٹان کی طرح مضبوط بنادیتا ہے۔ مرور زمانہ کے باوجود، یکسانیت اور اتحاد فکر و ذہن میں، عمل و خلق میں اور رسوم میں یکساں رکھتا ہے۔ در حقیقت آدابِ معیشت ہی ایک معاشرہ کے خدوخال کو نمایاں حیثیت دیتے ہیں۔

زندگی کے رہن سہن کے آداب، کھانے پینے کا طریقہ، عبادت گذارنے کا سلیقہ، شادی بیاہ اور تدفین و تکفین کی رسومات، ایک ملت کو دوسری ملت سے جدا کرتی ہیں۔

اگر ان رسومات و عادات کو واگذار کر دیا جاتا ہے تو معاشرہ معاشرہ نہیں بلکہ ایک انفرادی ڈگڈگی رہ جاتی ہے۔ ہر گھر نہیں بلکہ ہر فرد جداگانہ حیثیت اختیار کر جاتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ کی تمام کڑیاں ڈھیلی ہی نہیں پڑتیں بلکہ ٹوٹ جاتی ہیں اور وحدتِ ملی کی زنجیر ٹوٹ جاتی ہے، اور ہر لڑی اپنی موت کی آپ منتظر ہو جاتی ہے اور معاشرہ کی زندگی ختم ہو کر معاشرہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

موجودہ دور میں بعض لوگ حقیقت سے ناواقف، اپنی جہالت کی وجہ سے رسوماتِ دین اور آدابِ اسلامی سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک الگ زندگی کے خوابِ پریشان دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس چھٹکارا سے معاشرہ کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ گاہے کہا جاتا ہے کہ نماز اپنی زبان میں ہونی چاہئے اور گاہے خطبۂ جمعہ کو اپنی زبان میں لانے کی تیاری کی جاتی ہے۔ اور گاہے افکارِ اسلامی کو مغربی افکار میں ڈھالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ غرض سینکڑوں تجاویز پیش ہوتی ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ایسی صورت میں اسلامی معاشرہ ختم ہو گا یا قائم ہو گا؟ معاشرہ کی جب تک ایک ایک جزو یا آداب کو پوری مستعدی سے ادا نہ کیا جائے، معاشرہ اپنی خصوصیات

Marfat.com

نمایاں نہیں کر سکتا۔ بلکہ خصوصیاتِ ذہنی اور عملی اس وقت نمودار ہوں گی اور ثمرات حقیقی اس وقت مرتب ہوں گے، جب معاشرہ کا ذہنی فکر اپنے اعمال و اخلاق اور آداب و عادات کے ساتھ وابستہ ہو کر دنیا میں چمکنے کے لئے تیار ہو گا۔

ہر وہ فرد جو معاشرتی یا مذہبی آداب سے روگردانی کرتا ہے، حقیقتاً وہ معاشرہ یا مذہب کا باغی ہے، اور اس کے لئے معاشرہ یا مذہب میں کوئی مقام نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن موجودہ دور میں ثقافتی مذہبی آداب کے بر خلاف کھلی بغاوت کرنے والوں کو بھی معاشرہ اور مذہب کا برابر کارکن خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ معاشرہ اور مذہب کو اس سے نقصان ہی نہیں پہنچ رہا بلکہ اپنے بغاوتی ذہن کے ساتھ وہ دوسروں کو دعوت دیتا ہوا مذہب و معاشرہ کے پرخچے اڑانے میں مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب ان کی صورت و سیرت میں بدنام ہو رہا ہے۔ اور مذہبی حقیقت ھباء منثورا (غبار راہ) ہو رہی ہے اور اہمیتِ مذہب کم ہو رہی ہے۔ اور احترامِ معاشرۂ اسلامی ختم ہو رہا ہے۔

## حواشی

۱ یَاأیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَا کُمْ مِنْ ذَکَرٍ اُنثٰی وَجَعَلْنَا کُمْ شُعُوْبًا وَقبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

۲ کثرت خدائی

(ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۵)

# وحدت و کثرت

ہر وحدت کی انتہا کثرت ہے اور ہر کثرت کی ابتدا وحدت۔ کائنات کے ذرے ذرے میں یہ قانون جاری ہے۔ انسان خود اپنی ذات ہی کو دیکھے۔ اس کے وجود کے اندر کتنے اعصاب، کتنے اعضا، کتنے غدود، غرض کیا کیا گنا جائے۔ لیکن تمام ایک وحدت میں جکڑ بند ہیں اور ایک وحدت سے منسلک۔ اس انسلاک (جوڑ) سے تمام کارخانۂ حیاتِ انسانی چل رہا ہے۔ اگر کسی باریک سے باریک رشتہ کا تعلق اصل سے ٹوٹ جائے، تو کارخانہ اول تو ختم ہو جائے گا یعنی چلنے سے رک جائے گا۔ ورنہ خرابی واقع ہو کر فساد کا باعث ہو گا۔

ایک درخت کو دیکھئے۔ اس کی وحدت و کثرت کا مطالعہ کیا جاوے۔ تنا ایک ہے۔ لیکن شاخیں ان گنت اور پتے پھول بے انداز، لیکن جب تک وحدت کے ساتھ کثرت ملی رہے اور متصل ہو تو ہر شاخ اور ہر پتہ سر سبز۔ اگر کسی وجہ سے کوئی شاخ کوئی پتہ الگ ہو جاوے تو وہ اپنی حیات سے دست بردار ہو جائے گا۔

کائناتِ ارضی و سماوی ایک وحدت میں چل رہے ہیں۔ اگر کسی چیز کا تعلق وحدت سے نکل جائے گا، تو وہ چیز موت کے منہ میں چلی جائے گی۔

Marfat.com

کائناتِ کی وحدت وہ وحدت مطلقہ ہے جسے خدائے عزوجل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورج کو نہیں دیکھتے، ہر ذرۂ کائنات پر اس کی چمک دمک ہے اور اس کی تپش سے دنیا زندگی پا رہی ہے۔ آفتاب بذاتہٖ کسی کے ساتھ شامل نہیں، لیکن اس کی تپش اور اس کے نور سے کوئی خالی نہیں اور یہی نور اور یہی تپش کائنات کی زندگی ہے۔ بعینہ یہی حال اس آفتاب حقیقی کا ہے، کہ وہ ہمارے اندر ذاتاً موجود نہیں، لیکن اس کی ذرہ نوازی سے ہم ہر وقت زندہ ہیں اور اس کے انعکاس نورانی سے ہم چلنے پھرنے کے قابل ہیں۔

فطرتِ کائنات کا تخم یہی وحدت مطلقہ ہے، جو دیکھنے میں نہیں آتی۔ جیسے ہماری روح ہمارے دیکھنے میں نہیں آتی اور ہمارے عضلات اور ہمارے اعصاب کے قوئ ہمارے دیکھنے میں نہیں آتے۔ لیکن ان کے متعلق ان کی طاقت اور ان کی قوت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

ایسے ہی اس قوت مطلقہ کا عام وجدان میں پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اس قوت مطلقہ کو اپنے اندر ہی اندر یعنی اپنے سینہ میں دیکھا جائے تو وہ وحدت بذلتہ سامنے آجاتی ہے۔ انسانی شعور میں یہ تصور باہر سے نہیں آیا۔ یہ تصور اپنے نفس کے اندر ہی اس کی ذاتِ ہستی سے پیدا ہوا ہے۔ اور جوں جوں ربط پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، تو یہ احساس، احساس نہیں رہتا، بلکہ مشاہدہ کی صورت میں آجاتا ہے۔ اور اس کے ارادے، اس کی صفات، اس کے افعال، بصر و سمع اور ادراک میں آجاتے ہیں۔

مذہب کی بنیاد بھی وحدت ہے۔ جو حقیقتِ کائنات کی وحدت ہے۔ اور اس تخم سے جڑ شاخیں نکلتی ہیں، تنا پیدا ہوتا ہے۔ گو وقت موسم اور جغرافیائی حالات کے مطابق کچھ تبدل و تغیر ظاہراً معلوم بھی ہو لیکن حقیقتاً ایک ہوتا ہے۔

کسی درخت کو دیکھو مثلاً آم، انار، سنگترا، جغرافیائی حیثیت کے مطابق اگرچہ شکل و صورت میں کسی قدر مختلف ہوں گے، لیکن نوعیت کے لحاظ سے ایک ہوں گے۔ یعنی دیکھنے والا ہر ملک کے آم کو آم ہی خیال کرے گا، اگرچہ شخصی صورت الگ ہوگی، ذائقہ الگ ہوگا۔ آپ خود دیکھتے ہیں کہ ہر ملک کے انسان الگ الگ صورت و سیرت

Marfat.com

اور ذہن و فہم میں ہوتے ہیں لیکن انسانیت کی صورت و سیرت تمام پر یکساں نظر آتی ہے۔ ایسے ہی وحدت مطلقہ سے جو بھی رسالت و نبوت پیدا ہو گی اس کی ذات ایک ہو گی۔ اب پھلوں میں اگر چہ ماحول وقت اور موسم کی وجہ سے کچھ اختلاف بھی نظر آئے گا لیکن حقیقت ایک ہو گی۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی شیریں ہو اور کوئی شیریں تر۔ کسی میں کچھ نقص آجائے یا رنگت میں تبدیلی ہو گئی ہو، اور کسی میں خوشنمائی بڑھ گئی ہو، کسی کا حجم زیادہ ہو اور کسی کا ذائقہ پسندیدہ ہو اور کسی کا غیر پسندیدہ۔ بہر صورت مذہب کی بنیاد ایک ہے۔ اور جب تک ایک وحدت کے تصور میں مذاہب ہیں ان کی ترقی ہے۔ لیکن جب اس وحدت سے الگ ہو کر جغرافیائی حیثیت اور نوعیت سے الگ ہو جاویں تو مذہب نہیں رہتا بلکہ ایک رسم ہو جاتی ہے۔ جس کے اندر کوئی جاذبیت نہیں رہتی۔ جیسے مردہ بے جان کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔

مرورِ زمانہ حقیقتاً حیات وحدت ہے جو اس کے بقا کی ذمہ دار ہے۔ مرور زمانہ سے ہمیشہ اصل پاک روح میں پلیدی بعض نفوسِ شریرہ سے واقع ہوتی رہتی ہے۔ اور آخر پلیدی تمام آبِ حیات کو گدلا کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ آب حیات بد ذائقہ بدبودار ہو جاتا ہے۔ عادی آدمی کو تو معلوم نہیں ہوتا۔ اور وہ بدستور پیتا رہتا ہے۔ لیکن ایک اجنبی آدمی کے لئے کسی طرح گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے قدرت مطلقہ اپنے فیضان عام سے ایک دوسرا چشمۂ صافی پیدا کر دیتی ہے۔ یا ایک دوسرا درختِ توحید باہر نکالتے ہیں جو صاف شفاف اور جس کا ذائقہ اعلیٰ اور جس کی بو مہکانے والی ہو۔ ایسی صورت میں ادیان و مذاہب میں اختلافات کی کوئی وقعت نہیں بلکہ اصل میں مذہب و دین ایک فطرتی وحدت انسانی ہے، جس کی کوئی متبادل صورت آج تک دنیا میں پیدا نہیں کی جا سکی۔

## ظاہر و باطن

ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر کو ہم دیکھ سکتے ہیں لیکن باطن کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ظاہر کو باطن کے ساتھ پورا تعلق ہے اور باطن کو ظاہر سے جان

پہنچتی ہے۔ کسی درخت کو ظاہر سے کاٹ دیا جائے، تو اس کے باطن (پوشیدہ حصہ) پر اثر پڑتا ہے۔ ایسے ہی اگر جڑ کاٹ دی جائے تو ظاہر خشک ہو جاتا ہے۔ ہاں ظاہر کا اثر باطن کو لکلیۃً فنا نہیں کرتا۔ بخلاف باطن کے کہ وہ ظاہر کو فنا کر دیتا ہے۔ روح جاتی ہے تو تمام جسم برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن جسم کے کسی حصہ میں ضرب آنے سے یا اکثر حصہ پر چوٹ آنے سے روح متألم تو ہوتی ہے لیکن فناء نہیں ہوتی۔ اور عموماً ظاہر و باطن میں تناسب ہوتا ہے۔ لیکن بعض وقت پوشیدہ رہتا ہے اور جلدی سمجھ میں نہیں آتا۔

ایسے ہی مذہب کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ باطن اس کی روح ہوتی ہے اور ظاہر اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ تو جب باطنی قویٰ مذہب زندہ ہوتے ہیں تو اعمال میں روشنی اور جذب ہوتا ہے، اور ہر دیکھنے والا متاثر ہوتا ہے۔ لیکن جب باطن خراب ہو جائے تو اعمال کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات کھلے طور دکھائی دیتا ہے کہ اعمال دکھاوے کے ہیں، ان کے اندر روح نہیں ہے۔

دین یا مذہب کی روح تصورِ خدائی ہے۔ جب یہ تصور اپنے تمام صفات عالیہ مثلاً علیم، خبیر، حکیم، سمیع وغیرہ سے پختہ ہو جاتا ہے، تو اس پختگی کے ساتھ جذبۂ محبت و ایثار پیدا ہو جاتا ہے، اور اس محبت سے محبوب حقیقی کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اور اس کی اطاعت کو جنت خیال کیا جاتا ہے، اور اس سے سرکشی کو دوزخ سمجھا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اوامر کے بجالانے میں اور منکرات اور مناہی سے بچنے کے لئے جان تک دریغ نہیں کی جاتی، اور اخلاص و تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت مذہب میں تازہ بتازہ جان سر چشمۂ لبدی سے پہنچ رہی ہوتی ہے اور ہر عمل میں ایک ذوق پیدا ہوتا ہے اور ناپسندیدہ عمل سے ایک نفرت ہو جاتی ہے۔ (۱)

تمام ادیان کی روح یہی تصور ہے۔ اور تمام ادیان میں صفات عالیہ عموماً و خصوصاً ایک ہیں۔ بعض میں مجمل، بعض میں مفصل، لیکن عملاً ایک ہیں۔ مقصود بالذات تعلق الٰہیہ ہے اور بس۔ اور اس تعلق باللہ کے بعد خود بخود انسانیت ترقی کرتی ہے۔ جیسے وہ تصور پاک اور ذات پاک عزاسمہ، خود پاک ہیں۔ ایسے ہی مذہب اور پیروانِ

مذہب کا نقطۂ نگاہ پاکیزگی پر ہوتا ہے۔ اور جن صفات عالیہ سے ذات وحدہٗ لاشریک متصف ہوتی ہے، اس کا بندہ بھی ایسے ہی صفات عالیہ کے حاصل کرنے کے لئے بلاشعور دوڑ میں ہوتا ہے، اور تمام خلق کو عیال اللہ تصور کرتا ہے، اور دوئی کا شائبہ اٹھ جاتا ہے۔ کسی کو برا بھلا کہنے سے نکل جاتا ہے اور ظاہر باطن یکساں چلنے لگتے ہیں۔ محبوب جہاں (خدا) کی طرح محبوب ہو نکلتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں خلیفہ حق کہلانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ خلائق کے محبوب ہوتے ہیں، اور ان کی تبلیغ کا طریقہ فطرتی اور قدرتی ہوتا ہے۔ کسی سے الجھتے نہیں بلکہ بیگانوں اور دشمنوں کے ساتھ محبت کرتے ہوئے انہیں اپنا یگانہ بنا لیتے ہیں، اور ہر شے سے پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔

مناظرے مجادلے اپنی جگہ، خواہ کتنی قیمت رکھتے ہوں، اور خواہ کتنا فائدہ مذہب اور دین کو پہنچاتے ہوں، لیکن یہ شاندار تبلیغ سراسر تبلیغ ہوتی ہے۔ اس کے اندر نفرت نہیں محبت جھلکتی ہوتی ہے۔ بخلاف مناظرہ و مجادلہ کے، جو اسے ظاہر میں حریف تسلیم بھی کرتا ہے، لیکن اندر اندر نفرت اپنے مقام پر گرج رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل دل کی تبلیغ کامیاب اور مستقل ہوتی ہے۔ بخلاف تبلیغ اہل علم کے کہ وہ ظاہراً طاقتور معلوم ہوتی ہے لیکن اندر سے بہت کمزور ہوتی ہے۔

خود دیکھئے ہندوستان نہیں بلکہ تمام ممالک کے اندر تبلیغی اثر کیسے پیدا ہوا اور کس کی تبلیغ بلند یا موثر ثابت ہوئی۔

## دین یا مذہب

دین و مذہب وہ اتحاد فکری و عملی ہے جس کے مقابل کوئی اجتماعیت قومی، ملکی یا فکری قائم نہیں رہ سکتی۔ قومیں آئیں اور گئیں، ملک بنے اور بگڑے، مگر فکری تبدیلی اور تغیر سالوں تک سہارا نہ لے سکا۔ غرض سالوں نہ سہی قرنوں میں وہ تبدیلی ہوئی کہ قوم و ملت کا اساسی فکر اور جہادی عمل تبدیل ہو کر قانون تک بدل گئے۔

لیکن مذہب و دین پر سالوں نہیں، صدیاں نہیں، ہزاروں زمانے کے بعد

Marfat.com

بھی فکری ذہن اپنی جگہ قائم رہا، اور اس ذہن و فکر نے عمل کو سہارا دیئے رکھا۔ گو اعمال وافکار مذہبی پر افکار واعمالِ قومیت واجتماعیت اپنے حال کے مطابق یلغار کرتے رہے، اور کچھ نہ کچھ تبدیلی آتی رہی۔ لیکن سالوں، صدیوں نہیں بلکہ تھوڑی ہی مدت میں پھر پرانی مذہبی زندگی اپنا احیا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صدیاں گزرنے پر بھی مذہبی اجتماعیت بدستور قائم ہے، اور کسی ایک فرد کے الگ ہونے کا احتمال نہیں۔ اگر ہے بھی تو ایک برادری سے دوسری برادری میں اِکا دُکا شامل ہو کر اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے۔

اس لئے مذہبی اتحاد کے مقابل، اجتماعیت کے لئے کوئی نظریہ بھی لگاہتاً نہیں لایا جا سکتا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ یہودیت کو کتنا عرصہ گزر گیا۔ کیا کچھ اس کے سر پر نہ آیا۔ لیکن یہودیت قائم ہے اور ایک عرصہ کے بعد اپنی سربلند زندگی حاصل کرنے کا عزم کر رہی ہے۔ ایسے ہی عیسائیت کو دیکھئے کہاں سے کہاں تک جا پہنچی۔ اگرچہ اپنے افکارِ سادہ اور حلقاتِ عالیہ کو کھو بیٹھی ہے، اور ہر فرد بھی اپنے افکار میں آزاد ہے، لیکن پھر بھی عیسائیت آج شہنشاہیت تک پہنچی ہوئی ہے۔

اسلام سب سے آخر آیا۔ تھوڑی مدت گذری ہے۔ لیکن دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ گیا۔ اور اپنے اعلان (اذان) میں منفرد حیثیت رکھتا ہوا ہر جگہ گونج رہا ہے۔ اس پر کتنے حملے ہوئے، کتنے مقابل ہوئے، اور کتنے دام تزویر اس کے لئے بچھائے گئے۔ لیکن بحمد اللہ آج بھی وہ اپنے افکار واعمال سے زندہ ہے۔ آپ کا خیال ہو کہ پوری عقیدت کے مسلمان آج کہاں۔ لیکن نہیں، لاکھوں مسلمان موجود ہونے کے علاوہ اسلام کے افکار واعمال اس قدر منضبط ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

مذہب کا دعویٰ ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (ہم نے ذکر اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔ یہ دعویٰ کتنا سچا ہے کہ حفاظ کی اتنی تعداد کسی الہام ربانی کو حاصل نہیں۔ پھر اس کے شروح وتفاسیر بھی اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا، اور قرآن شریف کے صحیح عامل بھی بفضلہٖ آج اتنے ملتے ہیں جتنے کہ

Marfat.com

دوسرے مذاہب میں مل نہیں سکتے۔

علیٰ ہذاالسبیل دوسرے مذاہبِ الہٰیہ کی یہی حالت ہے۔.......... مذہب پر کیا کچھ نہیں گذرا۔ کتنا وقت پستی میں گذر گیا۔ آج نشاۃ ثانیہ میں اجتماعیت کس شان سے ابھر رہی ہے۔

پھر قومیت محدود دائرہ رکھتی ہے۔ مذہب کا دائرہ لامحدود، قوموں ملکوں تک محدود نہیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

نبی کریم ﷺ کو خود عزاسمہ فرماتے ہیں رحمۃ للعالمین ۔ تمام جہانوں کی آپؐ رحمت ہیں۔ تو یہ رحمت ہی اجتماعیت اور اتحاد کی بنا ہے۔ ہر ملک کو ہم اپنا ملک، ہر قوم کو اپنی قوم خیال کرتے ہیں۔

سادہ لوح علمیت کا کیا کہنا جو مذہب کو افتراق اور انتشار کہتی ہے، اور اختلافات کا اُسے باعث قرار دیتی ہے۔ یہ جو کچھ کہا جاتا ہے سراسر سادگی ہے۔ ورنہ یہ اتحاد آج تک کسی علمی نظریے یا عملی فکریے کو نصیب نہیں ہوا، جیسا اتحاد معذیب کے ذریعہ جو مستقل پائیدار ہوتا ہے۔

## موجودہ تفرقہ کا باعث

اس وقت جو مذہب کے اندر تفرقہ پایا جاتا ہے، وہ دین کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ دین کی حقیقت کو چھوڑنے اور قومیت و رسمیت کے اختلاف میں پڑ جانے سے واقع ہو رہا ہے۔ ایک ایک دین میں کیوں تفرقہ، انتشار و اختلاف ہے۔ اس لئے کہ اصل حیاتِ دین توحید الہٰی کے تصور سے وابستہ ہے۔ اور وہ تصور اب ادیان اور مذاہب میں بہت کمزور ہو چلا ہے۔

تصور ذات اگر رسماً تسلیم کیا جاتا، اور بعض وقت صحیح بھی ہوتا، لیکن یہ تصور جب تک بتمامہ صفات و ذات میں قائم نہ ہو زندگی مجروح اور داغدار رہے گی۔ یعنی

Marfat.com

کامل ارتقائے انسانی ناممکن رہے گا۔ حتیٰ کہ بعض صفات جن کو عام لوگ ذہن میں بھی نہیں لا سکتے، اگر اس پر کامل ایمان نہ ہو، مثلاً ستار العیوب، غفار الذنوب، تو زندگی (زندگی سے مراد انسانی زندگی ہے یعنی نوعی زندگی) اپنا پایہ نہیں پا سکتی۔ کیونکہ جو اپنے گناہ کو درگزر ہونے کے قابل نہیں خیال کرتا، پھر وہ کب اپنے دامن کو کسی دن بھی پاک کرنے کے ساتھ گناہ سے بریت کرے گا۔ ایسے ہی منتقم کی صفت کو جب تک ایک مسلمان پوری طرح تسلیم نہ کرے وہ ظالم کے ظلم کی وجہ سے اپنی زندگی خود کھو بیٹھے گا، اور خودکشی پر اتر آئے گا۔ بہر صورت میرا ایمان بھی ہے کہ ہر صفتِ مولیٰ کریم پر ایسی عقیدت ہو جیسی اپنی صفاتِ ذاتیہ پر ہوتی ہے، اور یہ تصور ذات اقدس اتنا غالب ہو کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہو ؎

تصور میں کسی کے کھو گیا ہوں
کوئی قلب و نظر پر چھا گیا ہے

## حواشی

۱ سنا کرتے تھے کہ طُرُقُ الْوُصُولِ الی اللّٰہِ تَعالیٰ عَلٰی عَدَدِ النُّفُوس۔ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے اتنے ہی بے شمار طریقے ہیں جتنے بے شمار آدمی ہیں) لیکن یہ بات آج منکشف ہوئی، کہ ہر انسان کا تصور الٰہ الگ ہے اور تصور کے مطابق وصول ہے۔ سادہ لوح کا وصول و قرب اتنا ہے کہ نماز ادا کرے اور اس پر اعتماد کرے اور اس سے التجا کرے لیکن عالی ذہن اور مستعد سالک کا تصور بہت بلند ہے۔ وہ ذات و صفات کے ساتھ جب قائم ہوتا ہے، تو اس کا وصول بھی اس کے ذہن (تصورِ ذات اقدس) کے مطابق ہو گا، جس کے ثمرات یا نتائج اس تصور کے مطابق عملاً پیدا ہوں گے۔

دیکھتے نہیں کہ اہل توکل اہل دنیا کے مقابل زیادہ آسائش سے، آرام سے، سکون سے وقت بسر کرتے ہیں، اور اپنی زندگی حیاتِ لبدی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ خلاف سادہ تصورِ ذات کے کہ اس درجہ کا سکون حاصل نہیں کر سکتا، اور نہ اس کے کام بغیر اسبابِ معیشت کے تمام ہوتے ہیں۔

(جنوری ۱۹۶۶)

Marfat.com

# حقیقتِ تصوف

ہر تہذیب اور تمدن کے دو اجزاء ہیں۔ ایک قانون اور ایک اخلاق۔ کوئی تہذیب اور کوئی تمدن ان کے سوا پروان نہیں چڑھتا۔ اور جتنی بلندی اخلاق و قانون میں پیدا ہو گی، اتنا ہی تہذیب و تمدن بلند ہو نگے۔ قانون کیا ہے؟ انصاف کا دینا دلانا۔ اخلاق کیا ہے؟ مروت احسان کا نام ہے۔ انسانی معاشرہ اسی وقت قائم ہوتا ہے، جب انصاف و مروت برابر کے ہوں۔ صرف انصاف تہذیب و تمدن پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انصاف ظلم کے مقابلہ میں تو کام کرے گا۔ جب حادثات آجائیں، بُرے دن کسی کے آجائیں، تو انصاف کیا مدد کر سکتا ہے؟ ایک عورت بیوہ ہو چکی ہے اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ یا ایک ٹکراؤ ہو گیا۔ ٹکراؤ میں ایک بوڑھا آدمی لپیٹ میں آگیا ہے۔ تو انصاف ان کی کیا امداد کر سکتا ہے؟ مروت و احسان ان کی امداد نہ کریں گے تو وہ مر جائیں گے۔

یہ دونوں صفات الٰہیہ ہیں اور انہی سے دنیا قائم ہے۔ یہ صفات الٰہیہ کا انعکاس ہی انسانی ہستی میں آیا ہوا ہے کہ ہر ظلم و جور کے لیے انصاف کا جذبہ مقابل آجاتا ہے۔ اور حادثہ پر مروت و احسان کا اخلاق نمودار ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

ضابطۂ قانون وانصاف کا نام مذہب میں شریعت ہے اور مروت واحسان کا نام ''اخلاق''۔اور ضابطہ اخلاق کو ہی تصوف کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

## مذہب

میرے خیال میں کوئی تہذیب اور کوئی تمدن عالمگیر مذہب کے سوا پیدا نہیں ہوا۔ ہر عالمگیر تمدن و تہذیب کو اگر غور سے مطالعہ کریں گے تو آخری نقطہ مرکزی میں تصور خدا موجود ہوگا۔اور تمام عمارات تمدن و تہذیب کی اسی تصور خدا پر قائم نظر آئے گی۔ کیونکہ اس تصور کے بغیر رحمت و شفقت اور عدل وانصاف کا جذبہ انسانی مکمل نہیں ہو سکتا۔بالفاظ دیگر مذہب تمدن و تہذیب کا پیدا کرنے والا ہے۔

آج دنیا کی جتنی تہذیبیں ہیں۔وہ اسی تخم سے پیدا ہوئی ہیں۔ گو اس وقت اس تخم کا تصور بہت کم پایا جاتا ہے۔ لیکن اس تصور سے کوئی تہذیب اور کوئی تمدن خالی نہیں۔ دنیا میں لاکھوں انقلاب آرہے ہیں اور ہر انقلاب میں مذہبی تصور کم ہو رہا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر انقلاب کا محرک حقیقتاً وہی مذہب ہے۔ غرض اس لامذہبی کے اندر بھی مذہب کی بنیاد چمک رہی ہے، اور ہر ہوشمند اپنی نظر بصیرت سے دیکھ رہا ہے۔ عیسائیت، یہودیت، بدھیت (بدھ مت) جن کے اندر تصورِ مذہب سے لاتعلقی اس وقت بھی برتی جارہی ہے، پھر بھی مذہب کی جھلک اُن کے اندر ہے اور مذہب کے نام پر تقسیم معاشرہ و قومیت ہے۔

ہر مذہب اپنا انصاف، اپنا اخلاق اپنے جنم کے ساتھ لاتا ہے۔ جیسے ہر انسان اپنا ذاتی تعارف اپنے ساتھ لاتا ہے۔اور یہ تعارف اس کی الگ پیدائشی صورت و سیرت ہوتی ہے۔ ایسے ہی مذہب کی صورت و سیرت غرض ہر خدو خال تک وہ اپنی ذات کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

اگرچہ نوعی صورت تمام انسانوں کی ایک ہے، اعضاء ایک ہیں، صورت ایک ہے۔ لیکن ہر ملک کی ذہنیت اور ہر قوم کی صورت و سیرت الگ دکھائی دیتی ہے۔

Marfat.com

تعین تشخص کے بغیر شناخت ہی نہیں رہتی۔ اس لیے باوجود فطرتی یکسانیت کے مذاہب اگرچہ ایک ہیں اور ایک ہستی مطلق سے پیدا ہوئے ہیں لیکن ظاہری رسم و مراسم کی وجہ سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔

ورنہ مذہب صرف ان دو امور کو لے کر آیا۔ یعنی انصاف و اخلاق۔ ہر مذہب کے پیرو کاروں کے دو حصے ہو گئے۔ جو مذہب کے خدمت پر ہو گئے۔ ایک وہ جس کا تعلق ظاہر کے ساتھ وابستہ ہے، اور ظاہری اعمال کو انصاف پر لانے کے لیے مامور ہو گئے۔ دوسرا وہ جو ظاہر سے گزر کر باطن کے ساتھ وابستہ ہو گئے، اور جوارح سے بڑھ کر صرف قلب پر نظر جمانے اور قلب کو تابع مذہب بنانے میں مصروف ہو گئے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ظاہر کو چھوڑ گئے۔ بلکہ ظاہر سے بڑھ کر جذبات قلبی پر متوجہ ہو گئے۔

ایسے ہی اعمال ظاہریہ پر متوجہ ہونے والے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ باطن سے غافل ہو گئے۔ بلکہ زیادہ توجہ ظاہر پر اور کم توجہ باطن پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ جیسے خود انسان ظاہر سے باطن جدا نہیں رکھ سکتا۔ اور ظاہر و باطن الگ کرنے سے انسانیت چل نہیں سکتی۔

یہی طریقہ مذہبیت کا بھی ہے۔ کوئی مذہب صرف ظاہر کا نگران نہیں۔ بلکہ ظاہر کے ساتھ باطن پر بھی برابر کی توجہ رکھتا ہے۔ بلکہ ظاہر و باطن یکساں چلانے کا نام مذہب ہے۔ اگر ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں تو مذہب نہیں، بلکہ لادینی ہے، جس کے لیے کوئی گنجائش معاشرۂ انسانی میں نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ ہر چیز کا ظاہر ہی حقیقتاً ظاہری وجود ہے۔ لیکن ظاہر کا قیام باطن کے ساتھ ہے۔ کوئی ظاہر باطن کی زندگی کے بغیر ایک آن زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہی حال مذہبیت کا ہے۔ مذہبیت کے قوانین ظاہریہ جتنے بھی مکمل کرتے جائیں اور قانون کی کتب جتنے بھی وسیع پیمانے پر شائع کرائی جائیں، جب تک مذہب محاسبۂ باطن پر قائم نہ ہوگا انسانیت اور قانون و شریعت کی تکمیل نہیں ہو

Marfat.com

سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انصاف کے لیے کتنے وسیع پیمانے پر قانون کی کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ اور عدالتیں کتنے وسیع پیمانے پر قائم کر دی گئی ہیں۔ پھر آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان عدالتوں میں کتنے وسیع پیمانے پر انصاف کا خون ہو رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ؟ اصل وجہ وہی ہے جسے ہم پیش کر چکے، کہ باطنِ عدالت انصاف سے پرُ نہیں، اور جج کا دل رحیم نہیں، اور وہ خوف الٰہی سے خالی ہے، انصاف اور ناانصافی اس کے دل میں ایک ہو رہی ہے، کیونکہ اس کا دل حرص سے پرُ ہے، اور جب تک اُس کے اس مرض کا علاج نہ ہو، وہ کبھی منصف حقیقی نہیں بن سکتا، اور نہ ہی عدالت کی کرسی پر بٹھانے کے قابل ہو سکتا ہے۔

اس لیے ضرورت ہے کہ قانون کے ساتھ اخلاق کے پیدا اور مکمل کرنے کے لیے خانقاہیت کا سلسلہ جاری رہے۔ فقہ کے اساتذہ پیدا کرنے کے لیے جہاں مدارس میں تعلیم دلانی لازمی ہے تاکہ قضاء (عدالت) مکمل ہو، ایسے ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے خانقاہوں میں تربیت حاصل کرنے کے طریقے جاری کرنے ضروری ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب مدارس خانقاہیں تھیں اور خانقاہیں مدارس اسلامیہ کا سرمایۂ بقا تھیں۔ میں نے اپنے گھر یہ نقشہ خود دیکھا ہے، کہ مدرسہ اور خانقاہ ایک تھی۔ جہاں ایک طالب علم فاضل و عالم بنتا تھا، وہاں ایک سالک صوفی صافی واقف راہ سلوک ہو کر مربیّ کے درجہ پر پہنچتا تھا، اور خلق اللہ کا راہبر اور ہادی ہوتا تھا، جسے عام و خاص پوری مشعل (نور دادیوا) خیال کرتے تھے، اور صبح و شام اس کی زیارت ایمان کی تازگی خیال کی جاتی تھی۔

قرآن کریم اگر اکیلا آسمان سے اترتا، اور ذریعۂ نبوت نہ ہوتا تو اس کی تعلیم ادھوری ہی نہ ہوتی بلکہ صحیح تعلیم ناممکن تھی۔ رسالت کے وجود سراسر رحمت نے قرآن حکیم کے ساتھ جو لگاؤ پیدا کیا، جو معارف بیان فرمائے، جو حقیقت عملاً پیش کی، وہ صرف ذات اقدس آنحضرتؐ کی وجہ سے ہوئی۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا۔

Marfat.com

"لَقَدْ جَاءَ كُمْ رسولٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ"

صوفیت کا یہی نشان بلند صوفیت کی ضرورت کے لیے کافی ہے۔

یہ اخلاق پیغمبرؐ ہے۔ یہ تینوں صفتیں کتنی بلند ہیں۔

ا۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ — تمہاری تکلیف ان کو گراں گزرتی ہے۔

۲۔ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ — اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں

۳۔ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ

مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

کامل صوفی کی یہی صفات ہوتی ہیں، اور یہی کششِ صوفیت کا باعث ہوتی ہیں اور یہی اخلاق فاضلہ کے نمونے ہوتے ہیں، اور انہیں صفات کی وجہ سے دنیا کے سامنے چمکتے ہیں، اور انہیں اوصاف سے چمک پاکر صوفیت دنیا میں بلند اخلاقی سے چمکتی ہے اور روشن ہوتی ہے، اور انہیں اوصاف سے خانقاہیں مدرسوں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اور انہیں اوصاف سے معاشرہ تازہ روح اور زندگی پاتا ہے۔ "روے و آواز پیغمبر معجزہ است" نبی کی متابعت اور نیابت میں مربی کی آواز اور چہرہ سینکڑوں کثافتوں کو دل سے دور کردیتا ہے، ایک نیا سکون پیدا ہوجاتا ہے اور ایک تازہ محبت اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے اور دنیاوی تعلقات کی کشیدگی کم ہوجاتی ہے۔ اور ایک اطمینان آجاتا ہے اور اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کا نقشہ خود دیکھا جاتا ہے۔

اور جہاں یہ اوصاف پیدا نہ ہوں، وہ خالص خانقاہیں نہیں، بلکہ تکیئے ہیں۔ جیسے بعض مدارس نام کے مدرسے ہیں، اندران کے تعلیم نہیں ہوتی، صرف رزق کمانے کا ذریعہ ہوتے ہیں، گو رسم و رسوم میں مدرسہ کی طرح ہوتے ہیں۔

## نبوت و رسالت تکمیل اخلاق کے لیے ہیں!

حدیث میں آتا ہے۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ" (میں محض اچھے اخلاق کے مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں)

Marfat.com

دیکھیے کتنے صاف الفاظ میں نبوت ورسالت کی غرض بیان فرمائی گئی ہے
''یُزَکِّیھِم'' کے معنی ہی یہ ہیں کہ اوصاف رذیلہ سے پاک کر کے اوصاف کاملہ پیدا فرمائے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم صرف علم پڑھانے کے لیے نہیں آیابلکہ صرف تزکیۂ نفوس انسانی کے لیے تشریف لایا۔ جیسے نبوت کی غرض یہی ہے، ویسے قرآن حکیم کی غرض بھی یہی ہے۔ یہ تزکیۂ نفوس اگر صحیح ہو جاوے تو جہانداری و جہانبانی کے تمام امور خود بخود صحیح ہو جاتے ہیں اور ریاست اپنے صحیح معنوں میں چلنے لگتی ہے۔ انصاف پرور خدا ترس انسان جب حکومت کی باگ پکڑتا ہے تو جانوروں تک کا خیال رکھتا ہے چہ جائیکہ انسانی ہستی۔ لیکن جب ظالم انسان کے ہاتھ ریاست پڑ جاتی ہے، تو کوئی چیز بھی اس کے ظلم و تعدی سے بچ نہیں سکتی۔ حتی کہ جانور بھی اذیت پاتے ہیں۔ چار کی جگہ آٹھ بٹھائے جاتے ہیں، اور چابک پر چابک پڑ رہا ہوتا ہے۔ لیکن تزکیہ کا تخم صرف تصور ذاتِ اقدس ہے، یعنی اللہ، اور اس کے صفات۔ جب تک یہ تخم پختہ نہ ہوں، اخلاق کی شاخیں ثمر آور نہیں ہوتیں، بلکہ خشک ہو کر گر جاتی ہیں۔ اور یہ تخم اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا، جب تک انسان خود حسی اور وجدانی طور پر اسے پا نہیں لیتا۔ لیکن جب وجدان اور مشاہدہٴ ذاتی کے ذریعے اسے دیکھ لیتا ہے، تو لا محالہ محبت و خوف اس کی ذات سے پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے ہر حکم سے اطاعت اور اس کی نافرمانی سے خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ خوف و محبت تمام اخلاقِ پاکیزہ کی جڑ ہے۔ خوف سے پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے، اور برے فعل اور مذموم صفت سے بچنے کی کوشش ہوتی ہے، اور اس کی محبت اور رضا طلبی کے لیے نیک امر کے لیے جان توڑ عمل کرنے کے لیے بھی تیار رہتی ہے۔

غرض جب تک اندر یہ جذبۂ توحیدی پیدا نہ ہو اس وقت تک ثمراتِ نیکی پیدا ہونے محال اور بدی سے بچنا مشکل۔ اور اسی توحید کے پختہ کرنے کی ابتداء تصوف ہے۔ اور اس کے بعد اس کی تمام تفاصیل۔ جس کے ثمرہ کے طور پر اخلاق پیدا ہوتے ہیں جو تہذیب و تمدن کی بنیاد حقیقی ہیں جس پر انسانی معاشرہ بلند سے بلند تر ہوتا ہے۔

Marfat.com

لَیْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوھَکُمْ قِبَلَ الْمِشْرِقِ وَ
الْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّمَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
الْمَلٰئِکَۃِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیِّیْنَ وَآتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ
ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ
وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْاوَ الصَّابِرِیْنَ فِی الْبَأْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَأْسِ،اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا
وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥

"نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق و مغرب (قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں، اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں، اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں۔ اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں، اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں، جو سچے ہیں (ایمان میں)۔ اور یہی ہیں، جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں"۔

آیۃ بالا جامع ہے تمام اعتقادیات اور اعمالیات و اخلاقیات کی اور کئی حقائق پر مشتمل ہے۔ پہلے جزو میں فرمایا گیا کہ ایک رسم کی کوئی حقیقت نہیں جب معنی اس کے ساتھ نہ ہو۔ مثلاً ہم سجدہ کرتے ہیں لیکن سجدہ کے اندر وہ حقیقتِ توحید ی مد نظر نہ ہو یعنی ذات وحدہٗ لاشریک، تو یہ رسم بیکار ہے۔ قبلۂ عبادت تو وہ ہے۔ لیکن دل کے اندر ایمان کی حلاوت نہ ہو تو اس قبلہ کی طرف رخ کرنا اور اس کے سامنے جھکنا عبث ہے۔

## شرائع

تمام شرائع کا یہی حال ہے۔ اصل مقصد تمام میں مشترک ہے۔ یعنی توحید ذات باری عزاسمہ۔ پھر اس کی صفات پر ایمان لانا۔ اس کے بعد اس کے احکامات اور مناہی آتے ہیں۔ لیکن تمام امور کی جان ایک ہے۔ لیکن رسمی و وقتی تصور یا لباس مذہب الگ الگ نمونے پر ہوتے ہیں۔ اور اپنے اپنے زمانے کے مطابق نمونے ہوتے ہیں۔ اور ایسے سب وقت اور زبان کے نمونہ ہوتے چلے آئے ہیں۔

اگر اس حقیقت جامعہ پر نظر پہنچ جائے، تو اختلاف اُٹھ جاتا ہے۔ لیکن اختلاف کی وجہ بھی حقیقت جامعہ نہیں، بلکہ وہی صورِ مجازی یا رسمی ہیں۔ کسی کو اس ذات اقدس کی وجہ سے اختلاف نہیں، اور نہ اُس کی عبادت و پرستش پر اختلاف ہے۔ اختلاف ہے تو طریقۂ ادائیگی میں۔ اور اس طریقہ ادائیگی کو وجہٗ اصل عبادت خیال کر لیا جاوے، اور اصل نقطۂ عبادت اور پرستش سے نظر اٹھ جائے تو خود سوچیے، یہ جھگڑا کتنا عبث ہے۔ جان نہیں، لیکن مردہ لاش پر جھگڑے ہو رہے ہیں، لیکن حقیقتاً جان اعمال میں ہو تو جھگڑے ہوتے ہی کم ہیں۔ اور ہر ایک اپنی لے میں مست ہوتا ہے، اور ہر قلب کے اندر دوسرے کا احترام ہوتا ہے، اور ہر مذہب دوسرے مذہب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہاں لامذہبی برداشت نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ مذہب کے اندر فتور ڈالے۔ اگر لامذہبی فتور نہ ڈالے تو پھر لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ سامنے آجاتا ہے اور کوئی روک ٹوک نہیں"۔

دوسرا حصہ

حصہ دوم کے دوسرے حصے میں اعتقاد اور اعمال کا خاکہ پیش فرمایا گیا۔ اور سب سے پہلے اعمال کی جڑ یعنی اعتقاد کا حصہ لایا گیا۔ اور نیکی کے بارے میں ہے۔

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیّٖنَ

Marfat.com

(بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور دن قیامت اور کتاب (قرآن)
اور نبیوں پر ایمان لائیں)

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر ایمان، آخرت یعنی جزاو سزائے آخرت پر یقین، کتاب الٰہی کی تعلیم، اور نبیوں کی تصدیق کو نیکی فرمایا۔

## اعتقادیات

عام طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اعتقاد پر علماء کا زور کیوں ہے؟ لیکن حق یہ ہے کہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کے لیے یہ اعتقادیات ایک مشین ہے۔ اسی کے ذریعہ اخلاق اٹھتے ہیں، اور اعمال صالحہ بنتے ہیں۔ ان کے بغیر نہ تو اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے، اور نہ اعمال صالحہ پروان چڑھتے ہیں۔ جیسے زمین کے بغیر کوئی انگوری پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کسی اعتقاد کے بغیر کچھ اعمالی کاشت صحیح نہیں ہو سکتی، اور نہ جذبۂ اخلاق مکمل ہو سکتا ہے۔

## تیسرا حصہ

"وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ والسَّائِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ"

(اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں
اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں، اور گردنوں (کے چھڑانے)
میں (خرچ کریں۔)

اس حصے میں ذات اقدس کی محبت پر مال دینا بتلایا گیا ہے، اور یہ بھی بیان کر دیا گیا کہ کن کن کو دیا جائے۔ بلکہ یوں خیال فرمائیے کہ تمام برادری اور معاشرہ کے ضرور تمند کو اخص کر لیا گیا ہے۔ یعنی تم کو گن دیا گیا۔ یہ ضرورت مند معاشرہ ہی میں ہوتے ہیں۔ اور انہی افراد کا رابطہ قومیت کے ساتھ وابستہ کرنا ہوتا ہے۔ اور

Marfat.com

انہیں کے ساتھ احسان مندی قومیت کے فرائض میں داخل ہے۔ اور یہ احسان مندی اخلاق کے سب سے بلند معیار کی مالک ہے۔ غرض معاشرہ کے موڑ کی مالک یہ نیکی واحسان ہے، جس سے محبت بڑھتی ہے، اور اتحاد کامل پیدا ہوتا ہے۔ مروت پیدا ہوتی ہے، اور فریقین یعنی افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث ہوتی ہے۔ جس قوم وملت میں یہ جذبہ مکمل ہو جائے، اس قوم کی آبرو دنیا میں بڑھ جاتی اور قوت واتحاد بڑھ جاتا ہے۔

چوتھا حصہ

وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْا وَالصَّابِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ۔

(اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں۔ اور سختی وتکلیف میں اور (معرکۂ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں)

اس حصہ میں عملی صورت پیش کر دی گئی۔ یعنی نمازیں پڑھنا، زکوٰۃ ادا کرنا، وعدہ کیا جائے تو پورا کرنا، تکلیف ومصیبت میں صبر کرنا، خاص کر جنگ وجہاد میں قائم رہنا۔ ایمان باللہ کے لیے عملی صورت عبادت کی ہے، کہ اس کی عبادت کو رستہ نجات کا خیال کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی عبادت میں اپنی شان کی بلندی دکھائی دیتی ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ وہ ان تمام عیوب سے پاک ہے ھُوَ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاْ۔ بلکہ عبادت سے اپنا صیقل ہوتا ہے اور دل پاکیزگی پکڑتا ہے۔ جوں جوں اِیَّاکَ نَعْبُدُوَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن پڑھا جاتا ہے، یہ بندگی کے ذریعے سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جب یہ جذبہ عبودیت پختہ ہو تا جاتا ہے، تو تمام نفسی خباثتیں دور ہوتی جاتی ہیں، اور نقائص بشریت دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے فرمایا گیا۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاْءِ وَالْمُنْکَرِ۔ خود غور فرمائیے۔ جب بے

Marfat.com

حیا ئیاں اور برے کام دور ہو جائیں، تو پھر انسانیت سراسر شرافت و عفت رہ جاتی ہے۔ اور یہ کام صرف پرستش الہٰیہ کر سکتی ہے۔

## بت پرست

بت پرست بھی جب بت پوجتے ہیں، تو ان کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے۔ تو خود سوچئے۔ جب کوئی ذاتِ اقدس کی عبادت میں منہمک ہو جائے اور معبود حقیقی کے سامنے وہ اپنے کلماتِ عبودیت دہرائے، اور اُس کی تقدیس پیش کرے۔ مثلاً سبحان ربی الاعلی، سبحان ربی العظیم ۔ایک طرف تو اس کی تقدیس کا اعتبار ہے۔ دوسری طرف اپنا تعلق نسبتی ذات ربی سے پیش کر کے اس تعلق ذوقی کو کیسے بنھایا جا رہا ہے۔ اس صورت میں عابد و معبود کی نظر ایک نہ ہو جائے تو کیونکر نہ ہو۔ یہی وہ مقام بلند ہے، جس کی بابت ارشاد ہوتا ہے۔ الصَّلوٰۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ یہ نماز مؤمن کی معراج ہے۔ یعنی قرب خداوندی کی بنیاد ہے۔ ویسے تو ہر مسلمان اور ہر صاحبِ مذہب کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ قریب ہے۔ لیکن یہ قرب نظر ورحمت کچھ اور ہے۔ اور وہ قرب کی صورت کچھ اور ہے۔ یہاں ایک ہو رہے ہیں۔ اور وہاں دو دکھائی دیتے ہیں۔ خود سوچئے۔ جب آنکھیں چار ہوتی ہیں، محبت آ ہی جاتی ہے۔ غرض محبت کے آنے کا وسیلہ نماز ہے۔ اور جب محبت آجاتی ہے، تو پھر کونسا نقطۂ اتصال باقی رہ جاتا ہے؟

## زکوٰۃ

دنیا جانتی ہے۔ کہ جب محبت جھلکتی ہے، تو تن و من وار دینے کو انسان تیار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے زکوٰۃ و صدقہ اس کی محبت میں ادا ہونے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے نماز کے بعد ذکر فرمایا گیا۔ پھر اس کے اخیر میں زکوٰۃ و صدقہ کی بابت بھی بعض احکام فرمائے گئے، کہ اتنا ضروری ہے۔ اور اس کے بعد جب محبت کی پینگ میں آجاؤ تو اجازت ہے جتنا دے دو۔ لیکن ضروری وہی پہلا ہے۔ کیونکہ اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللہِ" خلقت اللہ کا عیال ہے۔ اس کے اور اس کے بندوں کے پیٹ پالنے کے لیے یہ حصہ ضرور ادا کیا جائے۔

Marfat.com

تمام مخلوق ایک برادری ہے.......... انسان جب وحدۃ مطلقہ میں آجاوے اور پھر اپنا مال بھی وحدۃ مطلقہ کا خیال کرے تو اس کے اخلاق بلند کا تقاضا ہے، کہ وہ ہر پہلو سے مکمل ہو، اور قول کا پکا ہو۔ یہ نہیں کہ کہے کچھ اور کرے کچھ۔ اس لیے اچھے بندوں کی تعریف میں فرمایا گیا وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوا جب وعدہ کرتے ہیں تو وعدہ پورا کرتے ہیں۔

انسانی شرافت کا مظہر اتم قول کی پختگی ہے، جس سے انسان کو وہ شرف حاصل ہوتا ہے جو پہلے جذبوں سے بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ حقیقی وقار کا یہ نشاں بڑا بلند ہے۔ جو قول کے پکے ہوتے ہیں، ان کو دنیا جانتی ہے۔ اور جن اقوام میں یہ پختگیٔ قول آگئی ہے وہ قومیت صرف ظاہری طور پر ہی باوقار نہیں بلکہ حقیقی طور پر مالا مال ہو گئی۔ اقوام یورپ موجودہ دور میں کیا کچھ رکھتی ہیں؟ جس کی وجہ سے ان کی یہ دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ یہی پختگی قول ہے۔ خود ذاتِ نبوت کا مطالعہ فرمایئے۔ کتنے قول کے پکے تھے اور اس ذات والا صفات میں یہ صفت کتنی مکمل تھی۔

## تحمل و برداشت

پختگی قول و وعدہ کے بعد تکلیف و مصیبت کے وقت برداشت و تحمل کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ قول و وعدے پورے کرنے کے لیے تکالیف کا سامنا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِیْنَ الْبَأْسِ۔ "سختی و تکلیف میں صبر کرنے والے ہیں۔ خصوصاً جبکہ معرکۂ کارزار ہو"

یہ صفت بھی تکمیل انسانیت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کمزور انسان جب مصیبت کے وقت لرز جاتا ہے، اور ثابت قدم نہیں رہتا، تو وقار قومیت ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ اپنا سب کچھ دے دیتا ہے۔ جو ان ہمت قومیں جب تکالیف اور مصائب میں پڑتی ہیں تو تحمل سے مصائب جھیل لیتی ہیں۔ گذشتہ جنگوں میں وہی قومیں جیت گئیں جو تحمل و برداشت کی مالک تھیں۔ ویسے ہر انسان تب ہی کامیاب

Marfat.com

ہو تا ہے جب تکلیف و مصیبت میں ثابت قدم رہے۔ آخر تکلیف دور ہو جاتی ہے اور وہ باخوش کامیاب ہو نکلتا ہے۔

## اخلاق فاضلہ

یہ اخلاق فاضلہ ہیں جن کے بغیر انسانیت کوئی شرف حاصل نہیں کر سکتی، اور یہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے لیے یہ تمغہ عنایت ہو تا ہے، جو یہ حاصل کیے ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُواوَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ یہی لوگ سچے ہیں، اور "یہی پرہیز گار، خداترس ہیں"

## عدل

یہ پہلا حصہ اخلاق آگیا، جو انفرادی طور پر ہے۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد دوسرا حصہ ہے، عدل۔ اور عدل کے لیے ہی ریاست قائم ہونی ضروری ہے۔ جب انفرادی قوائے باطنِ انسانیت مکمل ہو جاویں تو خود بخود دوسرے حصہ کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے، اور دوسرا حصہ خود ظہور پکڑتا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی فرمادیا گیا۔ یٰاَاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ۔ "اے ایمان والو! تم پر بدلِ قتل واجب کر دیا گیا"۔ اس کے اندر تمام حقوق انسانیت کا عدل آگیا کہ ہر حق کا بدلہ لیا جاوے۔

ہر تہذیب و تمدن کے دو جزو ہیں۔ جب یہ مکمل ہو جاویں، تو تہذیب و تمدن گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے، ان اخلاق واوصاف کی بنیاد ہر قوم و ملت میں وہی تصورِ حق تعالیٰ ہے۔ قوم دین سے خواہ کتنی بے پرواہو، یہ تصور کسی نہ کسی طرح اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین بھی اسی تصور پر شرک کے عادی ہو گئے۔

## کفر

خالص کفر جس میں تصور خدائیت کسی طرح بھی موجود نہیں بہت کم ہے۔

اور میرے خیال میں کفری زندگی، زندگی بن ہی نہیں سکتی۔ یعنے انسان صرف کفری زندگی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اب جو موجودہ دور میں کفری زندگی کا میدان تیار ہو رہا ہے، یہ بھی اجتماعی زندگی کیلئے ہے۔ انفرادی زندگی میں تصورِ خدا نا ممکن ہے کہ ختم ہو، کیونکہ مایوسیوں کا سہارا صرف یہ تصور پاک ہوتا ہے۔ اور ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت ہی نہیں، بلکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی مایوسی اپنے زیر اثر لائی بیٹھی ہوتی ہے۔ اور ہر مایوسی کا علاج تصور پاک خدا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ یہ تصور صرف تصور ہی نہیں، بلکہ اسی تصور میں ایک یقین ہے۔ اور وہ یقین کامل کہنے کو ہی نہیں، بلکہ ہر انسان نے دیکھا ہے کہ کیسے ناممکن کو ممکن بناتا ہے۔ یعنی مایوسی کے عالم میں جب کسی امر کو ناممکن خیال کرتا ہے تو پھر قدرت خدا سے وہ ناممکن ممکن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ مرض انتہا تک پہنچ گیا، علاج سے مایوسی ہو گئی، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، مریض پر مایوسی چھا گئی، تیمار داروں پر نا امیدی آگئی۔ لیکن پھر بھی ایک آس مریض اور تیمار داروں کے دل کے اندر ہی اندر چٹکیاں لے رہی ہے، شاید اللہ کا فضل ہو جاوے، شاید میں اچھا ہو جاؤں۔ جو ایمان نہیں رکھتے وہ کیسے اچھے ہونے کا خیال رکھتے ہیں؟ اس پر یہ کہ قدرت مجھے اچھا کر دے۔ وہ قدرت کیا ہے؟ وہی تصور خدائے قدوس ہی تو ہے۔

ایک اور آیۃ شریفہ

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
وَ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنَ السَّبِيْلِ
وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ (پارہ پنجم سورہ نساء آیۃ ۳۶)

(اور اللہ کی پرستش کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو مت شریک کرو۔ اور (اپنے) ماں باپ اور اہل قرابت (رشتہ داروں) اور

Marfat.com

یتیموں اور مسکینوں اور ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور رفیق و
مسافر اور اپنے غلاموں سے نیکی (حسن سلوک کرو۔)

اس آیت میں پھیلاؤ زیادہ کر دیا۔ رشتہ دار پڑوسی اور صرف پڑوسی اور رفاقت کے پڑوسی اور والدین شامل کر دیئے گئے۔ غور کیجئے۔ اب تعلقات کے پھیلاؤ کے مطابق احسان کو بھی پورے پھیلاؤ پر پیش کر دیا گیا۔ اس سے بڑھ کر کسی کا کسی سے کیا تعلق ہوتا ہے؟ پہلے رشتہ میں والدین کا ذکر نہ فرمایا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان فطرتی ہے۔ اور کون ہے، جو پدری مادری تعلق سے لاپرواہ ہو، لیکن بعض قبلہ ناشناس فطرتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اشد جذبہ مادری وپدری کی بھی پرواہ نہیں کرتیں۔ اس لئے اس کو ذکر کر دیا گیا۔ ایسے پڑوسیوں کے حقوق اور صاحب رفاقت کے حقوق کو بیان فرما کر معاشرہ کے ہر جزو کا ذکر ہو گیا...... ایک حدیث میں آتا ہے۔ تیرے پڑوسی چالیس گھر ایک طرف، چالیس گھر دوسری طرف، غرض ہر چہار طرف چالیس گھر ہیں۔ اس صورت میں تعلقات وہمسائیگی سے کون خالی رہتا ہے؟ اور ان تمام کو زیر احسان لانا ضروری ہے۔ اور ساتھ فرمایا جاتا ہے، اے نبی نبی صاحبہ! اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کیا کریں، ان کے حال پوچھتے رہیں، یا ان کے حال کی دیکھ بھال سے ان کی حالت معلوم فرماتے رہیں۔ اور ان کو کچھ دیتے رہیں۔ سب سے پہلے وَاعْبُدُوا اللہَ فرمایا گیا۔ کیونکہ عبادت ہی ایک ایسی چیز ہے، جو انسانیت کو مکمل کرتی ہے، اور وہ اوصافِ انسانیت بھرتی ہے، جس سے احسان پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ پھر شرک سے بچنے کا حکم بھی ساتھ دیا گیا، کیونکہ شرک وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ خود سوچئے۔ جب قبلے زیادہ ہو جائیں، تو طبیعت میں سکون ویقین کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ ایک انسان کو ہی دیکھئے۔ بہت سے انسانوں کے ساتھ بھروسہ رکھتا ہو، تو ایسے بھروسے ہمیشہ ناکامیاب ہوتے ہیں۔ اور وہ بھروسہ جو کسی ایک پر ہو، وہ نسبتاً بہت مضبوط دونوں جانب سے ہوتا ہے۔ یعنی بھروسہ کرنے والا اور جس پر بھروسہ رکھا جائے۔ یہ بھروسہ کو مستحکم رکھنے کی پوری

Marfat.com

کوشش کریں گے۔ پھر یہ یقین تو ایک کامل معاشرہ کی اجتماعیت ہے۔ اگر ہر فرد یا ایک قبیلہ ایک دوسرے معبود کی طرف متوجہ ہو اور ہر قبیلہ کا متوجہ الیہ اور ہو، تو یکسوئی ختم ہو جائے گی، اور ہر ایک آدمی ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے گا۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ اسی وجہ سے فرمایا، کہ شرک ہی اقوام کے اختلاف کا اور ایک دوسرے سے عناد کا باعث ہوتا ہے۔ ایک باپ کے بیٹے خواہ کتنے ہی اختلاف طبعی رکھتے ہوں گے لیکن نسلاً ایک باپ ہونے کی وجہ سے اپنی طبیعت متحدہ رکھتے ہوں گے۔ بخلاف چند باپوں کے بیٹے اکٹھے تو ہو سکتے ہیں، لیکن فطرتاً نہیں۔ بلکہ کسی مصلحت وقتی کے لیے۔ لیکن ایک باپ کے بیٹوں کا اتحاد فطرتی ہے، اور اختلاف غیر فطرتی۔

فلسفۂ اختلافِ اقوام

اقوام و ملل کا اختلاف معبودیت کے اختلاف پر مبنی ہے۔ اور آج اتنی ترقی انسانیت کے باوجود جو اختلاف حد حیوانیت سے بڑھ گیا ہے، اس کی وجہ وہی اختلافِ معبودیت ہے اور اسی اختلاف پر اقوام کی بنیاد ہے۔ حالانکہ تصور ایک ہے۔ لیکن صرف تصور دلانے والی شخصیتیں الگ الگ ہیں۔ لیکن جہاں یہ تصور ہی الگ ہو۔ جیسے الگ الگ بت تو پھر ان کا اختلاف انمٹ اختلاف رہا کرتا ہے۔ جیسے مشرکین عرب کا حال آپ لوگوں کے سامنے ہے۔

غرض

احسان و عدل کی بنیاد صرف توحید ہے۔ یعنی صرف تصور ذات اقدس لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ جس میں تفرقہ کا شائبہ نہیں۔ وہ خود وحدت ہے، اور وحدت کی طالب۔ تمام اشیاء کی کثرت وحدت پر ختم ہوتی ہے۔ ایک درخت کو دیکھیے۔ ایک طرف وحدت ہے، دوسری طرف کثرت۔ عالم کائنات کا سلسلہ اسی طرح جکڑا ہوا ہے۔ اس کا جتنا تصورِ پاک واضح اور یقین تک پہنچا ہو گا، اتنے ہی اخلاق بلند ہوتے چلے جائیں گے۔

Marfat.com

## تصوف و فقر

اور اسی تصور خدائیت کو واضح اور کامل یقین تک پہنچانے کے طریقے اور ضابطہ کا نام تصوف و فقر ہے۔ اور وہ وہی ہے جو نبی پاک نے ان الفاظ میں واضح فرمایا اَنۡ تَعۡبُدَاللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ (اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کر، گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔)

## ریاست کے قیام کے بعد

اِنَّ اللّٰہَ یأ مُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَاءِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ یَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاۤءِ وَالۡمُنۡکَرِ (پ ۱۴)

اس آیت میں عدل پہلے لایا گیا، اور احسان بعد میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کا اولین فرض عدل و انصاف ہے۔ دوسرے درجہ پر احسان ہے۔ انفرادی طور پر احسان مقدم ہے اور عدل بعد۔ کیونکہ احسان کے بغیر اجتماعیت کا پیدا ہونا ممکن ہے جب اجتماعیت ہو گی، عدل کی ضرورت ہو گی۔ لیکن ریاست قائم ہونے کے بعد ریاست کے فرائض میں اول درجہ عدل رکھتا ہے۔ لیکن کوئی ریاست صرف عدل پر قائم نہیں رہ سکتی۔ جب تک ریاست کے اندر رفاہ عامہ کے کام نہ ہوں، راستے سڑکیں، مدارس، شفاخانے اور امدادی ادارے قائم نہ ہوں۔

ان اخلاق بلند کے ساتھ رذائل سے بچنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے فرمایا گیا وَیَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ ۔ بے حیائی اور برے افعال و اعمال سے بچنا ضروری ہے۔ ورنہ انسانیت کے بلند سے بلند اخلاق کی قیمت رہ جاتی اور بدی سے گر جاتی ہے۔

## بغاوت

ریاست کے لیے سب سے بڑا گناہ بغاوت ہے۔ احادیث نبوی میں بھی بہت بڑی وعید آئی ہے اور ریاست کی تسلیم ضروری ہے۔ خواہ کوئی کیسا ہی سربراہ ہو۔
انسانی معاشرہ کی تکمیل کے لیے یہی امور پانچ یا چھ ضروری ہیں۔ کسی ایک

Marfat.com

کے نہ ہونے سے معاشرہ اپنی پوری تکمیل نہیں کر سکتا۔ اور یہی اُمور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا باعث ہوتے ہیں۔

## یکسانیت

یہ اخلاقِ فاضلہ تمام مذاہب کے لیے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ صرف ظاہری طور پر کمًا و کیفًا فرق پڑتا ہے۔ اور اسی کی ظاہری صورت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً احسان کے طریقے۔ کس قدر اور کن لوگوں پر کیسے کیا جاوے۔ اسلام میں طریقۂ زکوٰۃ مقرر ہے۔ اس کے علاوہ صدقات ہیں اور پھر صدقات کے الگ الگ مواقع ہیں۔ اور انسان کی مقدرت کے مطابق اور ہر انسان کے اندرونی جذبہ کے مطابق احسان کی صورتیں آپ کو نظر آئیں گی۔

## تزکیہ

ایسے ہی تزکیہ نفوس کے لیے تحمل و برداشت تمام مذاہب میں ضروری ہے لیکن اس تحمل و برداشت کے طریقے الگ الگ ہیں۔ مثلاً اسلام میں بھوک سے صفائی حاصل کرنے کے لیے روزے رکھے جاتے ہیں۔ اور راتوں کا قیام ہے، بیداری ہے۔ فرماتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ اِلاَّ قَلِيْلًا نِصْفَهٗ اَوِانْقُصْ مِنْهُ
قَلِيْلًا اَوْزِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرآنَ تَرْتِيْلًا

رسول پاک ﷺ کھڑے کھڑے راتیں گزار دیتے تھے۔ خلوتوں میں مدت بسر کر دی۔ غرض ہر مذہب میں تزکیہ نفس کے لیے مجاہدات ہیں اور مشقتیں ہیں۔ نفس کو پاک کرنے کے لیے مجاہدے ضروری ہیں۔ کیونکہ مجاہدات سے نفس کی سرکشی چلی جاتی ہے، اور خیالاتِ فاسدہ جو انبوہ در انبوہ دل میں آتے ہیں، وہ رک جاتے ہیں۔ اور قلبی صفائی اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک ہر خیالِ بد سے انسان بلند نہ ہو جاوے، اور نفس کی رعونت ختم نہ ہو۔

Marfat.com

## غرض

اخلاق وعادات کا سرمایہ ہر مذہب اپنا اپنا جدا رکھتا ہے۔ گو ایک گونہ تمام کی حقیقت ایک ہے، اور تمام اصالتاً ایک ہیں۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی صورت و سیرت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس میں تبدل و تغیر بناوٹی تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقتاً تبدیلی ناممکن ہے۔ ایسے ہی ہر مذہب اپنے رسم و رواج اپنے ساتھ لاتا ہے۔

اسلام اپنے اخلاق اپنے ساتھ لایا۔ اپنے تزکیہ کے طریقے اس کے اپنے ہیں۔ اور انہی طریقوں پر صوفیاء کرام نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ اور ان کی درخشاں زندگیاں موجبِ سعادتِ ملت ہوئیں۔ ان کا اثاثہ تمام اپنا ہے۔ کسی دوسرے مذہب کے مطالعہ سے کچھ نہیں لائے۔ کیونکہ ایک مسلمان اپنے مذہبی سرمایہ کے سوا کسی کا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ کہ میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔

بعض جو یہ کہہ دیتے ہیں، اور ان کے ساتھ بعض ہمارے علمائے کرام بھی فرما دیتے ہیں کہ تصوف اسلام کی پیداوار نہیں بلکہ دوسرے مذاہب سے درآمد کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کم علمی کی دلیل ہے، یا تعصب ہے۔ ورنہ قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ کے مطالعہ کرنے والوں پر صاف ظاہر ہے کہ خلاف سنت ہمارے بزرگ کبھی ایک قدم بھی اٹھانا نہیں جانتے تھے۔ ہاں محبت کے ازدیاد میں ایک عاشق چند قدم وہاں اٹھا دیتا ہے، جہاں اس کا جانا منع تھا، اور اس کے لیے موزوں نہ تھا۔ لیکن ادباً جاتا ہے، محبتاً جاتا ہے۔ اس صورت میں پسندیدگی اور بڑھتی ہے، اور گھٹتی نہیں۔ مثلاً فرائض و سنن کیلئے اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ لیکن ایک عابد دن بھر عبادت میں گزار دیتا ہے۔ تو کیا یہ گناہ کر رہا ہے۔ یا عبودیت کو انتہا تک پہنچا رہا ہوتا ہے؟ اس عبادت سے اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے یا ناراض۔ یہ عبادت اسے بلند کرے گی یا گرائے گی؟ اور عابدین کی بابت جب کوئی کچھ کہتا ہے، تو وہ عبادت کے لیے نہیں کہتا بلکہ اس

Marfat.com

عبادت کی شان کے مطابق وہ بعض امور دیگر میں محتاط نہیں رہتا مثلاً مذاق یا وہ کرتا ہے یا ادھر اُدھر دیکھ لیتا ہے، یا خورد و نوش کے ساتھ محبت ہے یا چاپلوسی ہے۔ ایسے ہی ایک مجاہد خلوت میں وقت گزارتا ہے، اور رب کریم کی یاد میں رہتا ہے، تو یہ جذبۂ پاک اس کی قیمت کو گرا دے۔ تو ضرور ہے کہ معاشرہ میں اس کی چہ میگوئیاں ہوں گی، اور اس خلوت سے لوگوں کو نفرت ہو گی۔

غرض یہ مجاہدہ انسانیت کو بلند کرتا ہے۔ بشر طیکہ مجاہدہ کو ناقص کرنے والا کوئی ایسا امر پیدا نہ ہو گیا ہو، جو اُسے اپنے مقام سے گرا دے۔ جس طرح نیکیاں برائیوں کا کفارہ ہوتی ہیں، ایسے ہی برائیاں نیکیوں کو برباد کر دیتی ہیں۔

## کمال

کسی کمال کے پیدا کرنے کے لیے جب تک پوری توجہ نہ ہو، اور ہر غیر ضروری امر ہی نہیں، بلکہ ضروری امر سے بھی منہ موڑا نہ جائے، تکمیل کو نہیں پہنچا جاتا۔ دنیاوی معاملات ہی پر نظر دوڑائیے۔ اب ہم بچوں کی تعلیم کے لیے کتنا روپیہ اپنی مقدرت سے باہر خرچ کرتے ہیں، قرض اٹھاتے ہیں، ذلت اٹھاتے ہیں۔ صرف تکمیل تعلیم کے لیے ایسے کرتے ہیں اور بعض وقت بچوں کو حوالہ بخدا کر کے یورپ جاتے ہیں، حالانکہ باقاعدہ گزران رکھتے ہیں، اور کاروبار میں ہوتے ہیں۔ لیکن اچانک جذبۂ تکمیل سے متاثر ہو کر تین چار سال کے لیے اپنے ملک سے باہر جاتے ہیں، اور اپنے تمام کنبے سے کٹ جاتے ہیں، اور بال بچوں کو واگذار کر جاتے ہیں۔ قرض لیتے ہیں لیکن کبھی کسی نے اس پر تنقید نہیں کی کہ ایسا کیوں کرتے ہو۔

### خلاصہ اور مقصد

اس تمام تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مذہب اور ہر تہذیب کے دو حصے ہیں۔ ایک کا نام احسان ہے، اور دوسرے کا نام عدل۔ اور دونوں تصور ذات وحدہٗ لاشریک لہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح عدل کے قوانین مکمل کرنے کے لیے فقہ کا علم ضابطہ

Marfat.com

میں لایا گیا اور اس کا نام فقہ رکھا گیا۔ اسی طرح ضابطۂ اخلاق اور اس کی تکمیل کے لئے جو علم پیدا ہوا، اس کا نام تصوف رکھا گیا۔ اور جس طرح فقہ کی بنیاد قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور اسوۂ حسنہ ہے۔ فقہ میں جہاں بنیادی طور پر نصوص سے حکم پیدا نہیں ہوتا وہاں قیاس و اجتہاد سے لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی تصوف میں کشف و انکشاف اور الہام ربانی رہبری کرتے ہیں۔ اور وہی کشف و انکشاف اور الہام قابل قبول ہوتے ہیں جو دین کے ممد ہوں اور جو دین کے ساتھ کامل مناسبت رکھتے ہوں۔

جس طرح انسانیت ایک ہے۔ لیکن ہر قوم اور ملک کی انسانیت اپنے بعض جذبات سے اور رسم و رواج اور صورت و سیرت میں الگ ہے۔ ایسے ہی مذاہب کی جان ایک ہے لیکن اپنی اپنی پیدائشی خصوصیت سے الگ الگ ہیں اور ہر مذہب اپنا تمام اثاثہ اپنے ساتھ فطرۃً لاتا ہے، اور اسی پر اس مذہب کی اُٹھان ہوتی ہے، مذہب اسلام کو کسی دوسرے مذہب سے لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا اسلامی تصوف اپنے مذہبی اثاثہ سے ہی اٹھا ہے، اور اپنے اثاثہ سے زندہ ہے۔ کسی دوسرے مذہب کی روح اس میں نہیں۔ بلکہ اس کی اپنی دینی روح زندہ ہے۔ اور جو اثاثۂ غیر خیال کرتے ہیں وہ یا تو تصوف کی حقیقت سے واقف نہیں یا تعصباً کہتے ہیں۔ طریقت میں کسی تعصب کے لیے گنجائش نہیں۔ وہ سراسر محبت ہے۔

(اپریل ۱۹۶۵)

Marfat.com

# تصوف اور اس کی بنیاد

## ٹھنڈے گناہ اور ان کا علاج

جس دورِ اسلامی میں تصوف اپنی کامل بلندی پر تھا، اور اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ کی دھن امت مسلمہ میں تیز تر ہو رہی تھی، اور وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ کے حضور کا جذبہ تکمیل پا رہا تھا، اور ہر فرد امت اپنے خالق و رازق پر پورا متوکل تھا، جنید و بایزیدؒ اور حضرت جیلانیؒ جیسے صاحب ولایت مسند ارشاد پر جلوہ گر تھے، اس وقت تصوف کا حال و قال اور کردار یکساں تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ اسلام چھوڑ غیر مذاہب پر بھی اس کا سکہ رواں تھا اور اس کا ہر قول اور ہر فعل و حال خود سند تھا، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ اور حقیقت بھی یہ تھی (کہ) ہر صوفی کا ہر فعل، ہر حرکت اور ہر قول اتباع سنت پر حاوی تھا۔ اور قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ قَالَ الرَّسُوْلُ کی تشریح و توضیح تھی اور ایک عملی نمونہ تھا۔ لیکن جیسے سنت اللہ جاری ہے،

ہر کمالے راز والے

تصوف سے یہ جذبۂ خدا پرستی اور خدا طلبی کم ہوتا گیا، اور ہر عمل و فعل میں یکسانیت نہ رہی، اور حال و قال میں اختلاف پیدا ہو گیا، تو تصوف کا احترام واقتدار بھی کم ہوتا گیا۔

یہاں تک کہ آج سرے سے تصوف کی حقیقت سے ہی انکار کیا جارہا ہے، اور اسے غیر اسلامی پیداوار خیال کیا جاتا ہے، اور اس کے ہر مسئلے پر تنقیدیں ہو رہی ہیں، اور اسے لایعنی ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تسلیم، کہ صوفی نہیں رہے۔ لیکن صوفیوں کے نہ رہنے سے تصوف اور اس کے اقدار کا انکار کیا سراسر جہالت نہیں ؟ یہ ان لوگوں کی پستیٔ علم ہے کہ ان مسائل کی بنیاد خود قرآن و سنت سے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے نہ دیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقیقتاً ان مسائل تصوف و فقر کی بنیاد ہی غلط ہے، اور ان کی بنیاد میں حقیقتاً اسلامی اعتقادات اور تصورات نہیں۔ حالانکہ عام فطرت انسانی اس کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتی۔

مثلاً حرص و طمع ہے، ہر انسان جاہل و عالم اسے برا خیال کرتا ہے۔ ہاں ! یہ فرق ضرور ہے کہ کوئی اسے معمولی برائی خیال کرتا ہے اور کوئی بہت بڑی۔

برائیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم کی برائیاں قولی و فعلی ہیں، جو قول و فعل کے ذریعے سامنے آجاتی ہیں۔ اور دوسری برائیاں قلبی ہیں، جو قلب کے اندر ہر وقت موجزن رہتی ہیں، اور ان کے اثرات دھیمی چال سے ایسے باہر آتے ہیں کہ عام طور پر محسوس اور معلوم نہیں ہوتے، لیکن ان قلبی برائیوں کے نتائج زیادہ مہلک قوم و ملت کے لئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان برائیوں پر عملاً کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی، اور قانون کے تحت ان پر گرفت نہیں ہو سکتی، مثلاً تکبر، بخل، حرص و طمع، لالچ، خوشامد لیکن قتل و غارت اور چوری و زنا سے خصوصا معاشرے کے لئے زیادہ مہلک ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے انسداد کے لئے قانون کی گرفت ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ بخلاف قسم اول کے۔ وہاں اگر محاسبہ ہے تو صرف خدائے عزوجل کا۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف سب سے پہلے خدائے عزوجل کے تصور پاک کو زیادہ روشن اور واضح کرنے پر اپنا تمام زور صرف کرتا کراتا ہے، کیونکہ تمام افکار و اعمال کی جڑ یہی ہے۔ اگر یہ بنیاد صحیح ہے، تو پھر سراسر نیکی ہی نیکی پیدا ہو گی اور برائی سے پرہیز گاری خود بخود ہوتی جائے گی اور اگر یہ

جذبۂ پاک کم ہوا تو نہ برائی سے رکاوٹ کا کوئی سامان عقل پیدا کر سکتی ہے اور نہ کسی نیک کام کی بنیاد اخلاص پر ہو سکتی ہے۔

ہمارے پیرو مرشد علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ گرم گناہوں کا علاج تو ہو سکتا ہے لیکن ٹھنڈے گناہوں کا کوئی علاج نہیں۔

ٹھنڈے گناہ وہی ہیں، جو قلبی ہیں۔ اور گرم وہی جو فعلی و عملی ہیں، جو تمام دنیا کی نظر میں ہوتے ہیں اور جن کے روکنے کے لئے کامل اختیار حاصل ہے۔

قرآن کریم تمام برائیوں کے لئے موقعہ بموقعہ ارشاد فرماتا ہے، لیکن ظاہری برائیوں کے لئے تو اس کے احکام موجود ہیں، لیکن باطنی برائیوں کے لئے تو ان سے بڑھ کر تفصیلات دی گئی ہیں، اور ان کی وعیدیں بھی بہت سخت پیش کی گئی ہیں، تا کہ پڑھنے، سننے والا دل خود کانپ اٹھے۔ ایسا ہی حال احادیث نبویہ علیہ التحیہ والسلام کا ہے، کہ ترغیبات وترہیبات کا ایک انبار ہے۔

جس طرح فقہ (قانون اسلام) تمام قرآن واحادیث میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور فقہاء نے تمام قانونِ شریعت کو یکجا کرنے کے لئے ایک مہتم بالشان کام کیا، جس کے ذریعہ امت کو ایک کامل قانون کا دفتر الگ مل گیا۔

اسی طرح صوفیائے کرام نے قلبی امراض کے علاج کے لئے قرآن و حدیث کا نچوڑ اکٹھا ہی نہیں کیا، بلکہ خود اس کے نمونے ہو کر دنیا میں روشن ہوئے اور توحید ربانی علم و عمل کے دریا بہا دیئے۔ اور دمِ عیسیٰ اور یدِ بیضا سے خداوند تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ فرمایا۔

چنانچہ آج ہم "طمع" کی بابت تصوف کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے قرآن کریم کے ارشادات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ کہ "طمع" جسے ہم کوئی مہلک مرضِ انسانی خیال نہیں کرتے، وہ کتنی مہلک ہے؟ اور اس کے کیا نتائج مہلکہ ہیں؟

Marfat.com

## سورۃ مدثر پارہ ۲۹

(الف) (۱) ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا

مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دے، (یعنی اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے) جس کو میں نے منفرد پیدا کیا۔

(۲) وَّجَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا

اور بہت مال دیا۔

(۳) وَّبَنِیۡنَ شُہُوۡدًا

اور حاضر باش لڑکے دیئے۔

(۴) وَّمَہَّدۡتُّ لَہٗ تَمۡہِیۡدًا

اور ہر طرح کے سامان مہیا کیے

(۵) ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ

پھر بھی زیادتی کی خواہش کرتا ہے۔

(۶) کَلَّا ؕ اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا

اسے ہرگز نہیں (دوں گا)، یہ تو ہماری آیات کا دشمن ہے۔

(ب) سَاُرۡہِقُہٗ صَعُوۡدًا

میں اسے صعود (پہاڑ) پر چڑھاؤں گا۔

(ج) (۱) اِنَّہٗ فَکَّرَ وَقَدَّرَ

اس نے سوچا، سمجھا اور تجویز کیا۔

(۲) فَقُتِلَ کَیۡفَ قَدَّرَ

مارا جائے، کیسا برا سوچا۔

(۳) ثُمَّ قُتِلَ کَیۡفَ قَدَّرَ

پھر یہ مارا جائے کیسا برا سوچا

(۴) ثُمَّ نَظَرَ

Marfat.com

پھر نظر دوڑائی

(۵) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ

پھر تیوری چڑھا کر منہ بسورا۔

(۶) ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَکْبَرَ

پھر پیٹھ پھیر دی اور اکڑ گیا

(د) فَقَالَ اِنْ ھٰذَا اِلَّا سِحْرٌ یُؤْثَرُ

پھر کہا یہ تو جادو ہے، جو ہوتا چلا آیا۔

## توضیح الفاظ

صعود، بعض نے کہا پہاڑ ہے دوزخ میں، جس پر چڑھیں گے اور پھسلیں گے۔ اور بعض نے کہا بہت بڑا شجر ہے، جس پر چڑھیں گے اور پھسلیں گے۔ پہاڑ زیادہ موزوں ہے۔

## پس منظر

آیات کا پس منظر یہ ہے کہ ولید بن عتبہ ایک مالدار، صاحب اولاد اور صاحب سامان کافر تھا۔ ایک دن نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھتے چند آیات سنیں، تو متاثر ہوا۔ جب ابو جہل کو خبر ہوئی، تو وہ سخت پریشان ہوا اور آکر اسے کہنے لگا کہ تمہارے لئے ہم چندہ بھاری کرتے ہیں، کیونکہ تم (حضرت) محمدؐ اور اس کے ساتھی ابوبکرؓ کی کاسہ لیسی پر اتر آئے ہو۔ ولید نے کہا میں تو بہت بڑا دولتمند ہوں، صاحب مال و جاہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے کہا پھر کیسے گئے۔ تو کہا تم جانتے ہو، محمدؐ جھوٹا تو نہیں۔ یہ بھی جانتے ہو، کبھی کہانت بھی نہیں کی۔ کوئی دوسرا بھی عیب اس میں نہیں۔ بس ہے تو جادو زدہ ہے۔ اور یہ بھی جو پڑھتا ہے۔ وہ انسانی کلام ہے اور بس۔ عتبہ متکبر ہو گیا۔ یہ بات گھڑ دی۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی خوش ہو گئے۔ اس موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

لیکن جیسا کہ قرآن حکیم کا عام قاعدہ ہے کہ ان آیات کا تعلق صرف اس

Marfat.com

واقعہ کے ساتھ نہیں، بلکہ اس واقعہ کی اصلیت اور اس کی مثال سے ایک حکمت، ایک صورتِ خاص نمونہ پیش کرنا ہے اور ایک خاص حقیقت پیش کرنی مقصود ہے۔

اور وہ ہے، طمع کا انجام اور طمع ولالچ کے نتائج اور تاثرات طبعی۔

مال، پیسے، سامان کچھ بری چیزیں نہیں، لیکن لالچ، طمع و حرص جو ظاہراً کوئی بڑا گناہ معلوم نہیں ہوتا، تمام گناہوں کی جڑ ہے اور بہت سے گناہ اس سے پھوٹتے ہیں۔ دیکھئے! اس طمع کے تخم کا ثمرہ آخر یہ پیدا ہوا، کہ برملا کہہ دیا کہ یہ نبی پاکؐ جادو زدہ ہیں، اور یہ کلام الٰہی، کلام الٰہی نہیں بلکہ انسانی کلام ہے۔ اتنے بڑے حق کی تکذیب کے لئے صرف مال و دولت ہی اس بات پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ صاحبِ دولت سوچتا ہے، اور فکر کرتا ہے، خوف کھاتا ہے، کہ کہیں حق کو باطل کہنے سے دولت تباہ نہ ہو جائے، کوئی بلا نہ ٹوٹ پڑے۔ لیکن صاحب دولت کے ساتھ طمع بھی آجائے، تو پھر طمع دولت کے ساتھ ایک بلا و عذاب بن جاتا ہے، اور وہ کچھ کہلاتا ہے، جو ایک صحیح انسان کبھی بھی نہیں کہہ سکتا۔

یہ وہی گناہ ٹھنڈا ہے، جس کا علاج قانون و شریعت میں نہیں۔ بلکہ اس کا علاجِ صحیح احکم الحاکمین کے اپنے ذمہ ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا "مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دے، جسے میں نے اکیلا پیدا کیا" اور بہت مال دیا، بیٹے حاضر باش دیئے، سامان دیئے، لیکن پھر بھی وہ کمبخت لالچ و طمع میں پڑا ہے، اور مزید چاہتا ہے۔" یہ مزید چاہنا اس کی ہلاکت ہے۔ اور ہلاکت کا کیا سامان ہے؟ وہی سرکشی اور انکارِ حق اور پھر دیکھئے کس رعونت کے ساتھ اس کا انکارِ حق ہے۔ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ "اندھے فکر دوڑاتا ہے، اور اندھی تجویزیں کرتا ہے۔" فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ "بدبخت مارا جائے۔ ہاں یہ مارا ہی جائے۔" بدبخت یہ الفاظ بددعائیہ ہیں، جو بے اختیار ایسے حال میں نکلتے ہیں، جب کوئی بہت برا کام کرے، اور جو بہت بری باتیں سوچے اور کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں بٹھانے کے لئے یہ الفاظ فطرت انسانی اور فطرت خاصہ کے مطابق کیسے ڈھالے! سبحان اللہ فطرت بول رہی

ہے۔ پھر فرماتے ہیں ثُمَّ نَظَرَ "پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی"۔ ثُمَّ عَبَسَ "پھر جیسے متکبر آدمی تیوڑی چڑھاتے ہیں، چڑھائی"۔ وَبَسَرَ "اور منہ مچوڑا اور بنایا جیسے متکبر انسان ایسے حال میں بنایا کرتے ہیں"۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اُستَکْبَرَ "پھر پیٹھ پھیر لی اور اترایا"۔ اور کہنے لگا اِنْ ھٰذَا اِلَّا سِحْرٌ یُؤثَرُ اِنْ ھٰذَا اِلَّا قَولُ الْبَشَرِ "یہ تو سحر ہے، اور یہ (قرآن) تو کلام انسانی ہے"

مقصد یہ ہے کہ دولت کے ساتھ طمع اتنی بری چیز ہے کہ نبوت اور کلام الٰہی کے جھٹلانے میں اسے ذرا تامل نہ ہوا۔ بلکہ یہ طمع اور لالچ کوئی معمولی برائی نہیں، بلکہ یہ وہ برائی ہے، جس کا علاج صرف ذات الٰہی کر سکتی ہے، تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے نابود کر دے۔ اس لئے فرماتے ہیں "مجھے اور اس کمبخت کو چھوڑ دے"، ہم اس سے نمٹیں گے یا سمجھیں گے، اور اس کا فیصلہ کریں گے، مال و جان برباد و تباہ کر دیں گے۔ احکم الحاکمین جب کبھی کلام فرماتے ہیں اور بصورۃ متکلم بولتے ہیں۔ تو ہمیشہ جمع سے کلام فرماتے ہیں مثلاً اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ، جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْئٍ حَیٍ وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَ جَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا۔ لیکن جب مقابلہ کی نوبت آتی ہے اور خود نپٹنا چاہتے ہیں، تو حریف کے مطابق نزول فرماتے ہیں، اور برابری پر آجاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں، وَذَرْنِی وَالْمُکَذِّبِیْنَ جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا "مجھے اور جھٹلانے والوں کو چھوڑ دو"۔ ہم خود ان سے نبٹیں گے اور انہیں سمجھائیں گے کہ وہ کیا ہیں اور ان کا جھٹلانا کیا ہے اور ہم ان کا بھجا کیسے نکالتے ہیں؟

آپ ان آیات سے دیکھ چکے کہ حرص طمع کے نتائج کیا ہیں؟ ایسے ہی حسد و تکبر کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ گرم گناہوں کے یہی ٹھنڈے اور سرد گناہ تخم ہوتے ہیں۔ اور قلب کے گناہ کیسے رک سکتے ہیں، جب کہ دیکھنے میں آتے ہی نہیں۔ جب ان کے اثرات باہر جاتے ہیں، تو وہ بھی صرف ایک ظہور سامنے آتا ہے، لیکن ان کے تخمی ظہور سے لاکھوں پر وبالِ جان آتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس کے استیصال کیلئے بہت کچھ ارشادات فرمائے۔ لیکن خود

Marfat.com

اندازہ کیجئے، اگر آپ کے سامنے یہ آیات اس طرح واضح نہ کرتے، تو کیا آپ طمع کی بابت یہ خیال کرتے کہ یہ مرض انسانی بہت بڑی مہلک ہے اور اس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ ورنہ معاشرہ کی زندگی برباد ہے۔

صوفیا کی نگاہ ہی اتنی تیز تھی کہ وہ ایسے گناہوں اور برائیوں کے پیچھے پڑ گئی اور ان کے نابود کرنے کے طریقے تجویز کئے اور ان پر اپنی عمریں صرف کر دیں۔ کیونکہ اصل معاشرہ کی اصلاح ان قلبی یا سر د گناہوں سے بچنے پر ہے۔

طمع کے برے نتائج کوئی دوسری قوم مانے یا نہ مانے، لیکن مسلمان قوم کے اندر تو اتنے بیشمار واقعات ہیں کہ تاریخ کا کوئی حصہ اس بد جذبہ کی خرابی سے پاک نہیں۔

اسی موجودہ دور اور تقسیم ہند کا مطالعہ کیا جاوے۔ اس میں کتنا نقصان اس غداری کے جذبے نے دیا، اور کتنی ہلاکتوں کے بعد کتنا حصہ کٹ کر ہمیں کتنا کم حصہ ملا، اگر متفق ہوتے اور بعض کو خاص لالچ نہ ہوتے، تو پاکستان کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔ بلکہ وسیع تر پاکستان آپ کے اپنے سامنے ہوتا، اور کشمیر کے جھگڑے تک نوبت تک نہ آتی۔

جتنا علاج قلبی امراض کا اسلامی تعلیم میں ہے اتنا علاج کسی دوسرے مذہبی کتب میں نہیں ملتا، اور قلب سلیم پیدا کرنے کی ترغیبات و ترہیبات کتنی وسیع ہیں؟۔ اور قرآن حکیم نے قلب سلیم کو کتنی اہمیت دی ہے۔ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔

پھر صوفیائے کرام نے اسی قلب سلیم کو اپنا محورِ اسلام ٹھہرایا، اسی پر تمام توجہات مرکوز کر دیں۔ وہ موجودہ وقت کے صوفیا کی طرح جاہل نہ تھے، ضدی نہ تھے، متکبر نہ تھے۔ بلکہ حافظ القرآن تھے، محدث تھے، اور اسوۂ حسنہ کے عاشق۔ ہر حرکت اور جنبش پر دھیان تھا اور اتباع نبوت سامنے رہتا تھا۔ ان کا کوئی قول، کوئی فعل بلا بنیاد قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ کے نہیں تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ کسی کی نظر اس بنیاد پر نہ پڑے۔ کیونکہ ان کی نظرِ وسیع تک ظاہری علم نہیں پہنچ سکا۔ آپ خود دیکھتے ہیں کہ فقہ کا علم، جس کا صرف ظاہر کے ساتھ تعلق ہے، اس کی بنیاد بھی آج بعض فقہا نہیں بتلا سکتے، کیونکہ فقہ و شریعت کے احکام قرآن و حدیث میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں، اور

اس طرح دیگر احکام اخلاق و تصوف و سیاست ملے جلے ہیں، کہ ان کے الگ کرنے کے لئے عمریں درکار ہیں۔ چنانچہ فقۂ حنفیہ کوئی ایک دو سال کے اندر پیدا نہیں ہوئی، بلکہ قرنوں کے بعد یہ ذخیرے کتب، کے تیار ہوئے۔ اگرچہ مآخذ دکھانے کے لئے کئی کتب موجود ہیں۔ لیکن وہ وہی دکھا سکتے ہیں، جن کو ان کتب پر عبور ہے، اور جن کی طبائع اس مشکل کام پر متوجہ ہیں، ورنہ ایک عام فقیہہ صرف جزئیات و کلیاتِ فقہ تک اپنا علم محدود رکھتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال تصوف کا ہے۔ یہ عاشقان خدا اور سول، جن کی نظر میں یہ جذبہ عمر بھر ابھرتا رہا کہ دنیا جب تک اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَأَنَّکَ تَرَاهُ کے جذبہ تک نہ پہنچے، حقیقی اسلام حاصل نہیں ہوتا اور مکائدِ نفس سے خلاصی نہیں ملتی اور ذمائم قلبی سے نجات نہیں ہوتی، عمر بھر کے مجاہدوں، مشقتوں، اور فکری مطالعۂ قرآن و حدیث کے بعد اقرار تصوف کو جمع کرنے پر متوجہ رہے اور ایک پورے علمِ تصوف کی بنیاد قائم کی۔

ایک زمانہ میں خود سنتا تھا اور پڑھتا تھا کہ تصوف اسلام کسی دوسرے مذہب کی درآمد و پیداوار ہے۔ لیکن جوں جوں قرآن مجید کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا اور فکر و ذہن نے وسعت حاصل کی، تو بفضلہٖ تعالیٰ اب میں دیکھتا ہوں کہ نصف سے زیادہ بلکہ دو تہائی کے برابر قرآن حکیم تصوف کے اقدار سے پُر ہے، اور ہر آئینہ کے اندر اپنی نمایاں حیثیت پیش کرتا ہے۔

یہی آیات جن کو پیش کیا گیا ہے، آج سے پہلے کئی بار پڑھیں، پڑھائیں لیکن اس حقیقی نکتہ پر پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ ان آیات کے پیش کرنے کا مقصد صرف طمع کے متعلق بیان نہیں، بلکہ یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ ان تمام صفات ردیہ جن کی بابت تصوف اپنا تمام زور اور نابود کرنے پر صرف کرتا ہے، اس کی تمام بنیاد قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ ہے۔

علمائے ظاہر کا محورِ علمی ظاہر کے ساتھ زیادہ ہے۔ اور قواعدِ فقہ اور احکامِ شریعت پر توجہ زیادہ دیتے ہیں۔ لیکن اہلِ باطن توجہ اور فکر، باطنی معاملات اور کیفیات

پر رکھتے ہیں۔ اور دونوں گروہ یقیناً فکر و علم اسلامی رکھتے ہیں اور حدودِ اسلام کے اندر تیراک ہیں۔ ہاں ! ؎

نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا

ان آیات میں یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہو گا۔ تبلیغی طریقۂ صوفیا بھی مطابقت طریقۂ الٰہیہ سے رکھتا ہے کہ ٹھنڈے گناہوں کے لئے مقابلہ نہ کیا جائے۔ کذب بڑا عظیم گناہ ہے کہ تکذیب جس سے دین کی ہو، اور رسالت کی تکذیب کی جائے۔ لیکن صرف یہ کہہ کر (وَ ذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النِّعْمَۃِ "صاحب دولت جھٹلانے والوں کو اور مجھے چھوڑ دے) اس لئے آپ فکر نہ کریں، آپ پریشان نہ ہوں، میں خود نمٹونگا، خود ان سے سمجھ لوں گا کہ وہ کیا ہیں، اور ان کی تکذیب کیا حقیقت رکھتی ہے ؟

بعینہٖ یہی طریقہ صوفیاء کرام کا ہے کہ یا تو انفاسِ قدسیہ اور نظر محبت بھری سے علاج کرتے ہیں۔ اور ایک آن میں دلوں کو صاف کر دیتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ فرماتے تھے یا پھر ذاتِ الٰہی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ جانے اور اس کا کام۔ وہ خود بلٹے گا، جس سے ہم نبٹ نہیں سکتے۔

ہمیں علمائے کرام کی کوششوں سے انکار نہیں۔ بلکہ انہوں نے دین کی بہت بڑی خدمت علوم اسلامیہ کے ذریعہ سر انجام فرمائی، اور دین حقہ کی بڑی علمی طور پر آبیاری فرمائی، اور شریعت حقہ کی ترویج واشاعت کی۔ لیکن حق یہ ہے کہ دینداری کی جو خدمت صوفیائے کرام نے کی، وہ کسی دوسرے گروہ سے نہیں ہوئی۔ ایک انسان کو کامل انسان بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ جتنے وسیع حلقے صوفیائے کرام نے دینداری کے پیدا کئے، اتنے وسیع حلقے علمائے کرام سے نہیں ہو سکے۔ پھر ہر چہرہ پر رسالتمآب ﷺ کی جھلک ہے۔ آج گئے گزرے زمانے میں بھی حلقہ ہائے علوم و تصوف پر آپ نظر ڈالیں، اور پورے غور سے مطالعہ کریں گے، تو آپ کھلے طور پر صوفیا کا پلہ بھاری پائیں گے۔

اگر صوفیا میں کچھ برے لوگ ہیں، تو علماء کرام کا طبقہ کیا سے خالی ہے ؟ بلکہ ان سے زیادہ۔

Marfat.com

اس لئے اس طبقۂ صوفیا کے پیچھے علماء کرام کا پڑ جانا کوئی اچھا کام نہیں، بلکہ کچھ اپنا بگڑ تا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام کا وقار گر رہا ہے۔ زمانہ گر چکا ہے، لیکن صوفیت گو بہت گر چکی ہے، اور اس کے پلے کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اپنے اسلاف کے طریقے پر جمع ہوتے ہیں، اور دین کا بناتے کچھ نہیں تو بگاڑتے بھی نہیں۔ لیکن کون؟ جو صحیح صوفی ہیں۔ اور جنہوں نے پیٹ کے لئے نمائشی طریقہ اختیار کیا ہوا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ صوفی نہیں، بلکہ صوفیت کو بدنام کرنے والے ہیں، نہ دین کا احترام ہے، نہ دنیا میں رہنے کا سلیقہ ہے، اللہ تعالیٰ ان سے اپنے بندوں کو پناہ دے۔

الغرض سر دگناہوں کا علاج صرف پاک دلوں کے پاس ہے، اور بس ؎

تمنا دردِ دل کی ہے، تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں

انبیاء علیہم السلام کی قوتِ باطنی قوت ظاہریہ سے بہت بلند تھی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ قوت ظاہریہ بھی ایک طرح قوت باطنی کا ظہوری حصہ تھا۔ ورنہ جو کچھ تھا، دل تھا۔ اور وہ تھا فکر بلند سے پُر۔ یعنی توحیدِ خالقی سے بھرپور اور اس کے نشہ میں مخمور۔ اسی نشہ کی لے میں کمانِ نبوت کا سہارا تھا اور حقیقتاً وہی نشہ اور مستی نبوت کی قوت و جان تھی۔ وہ ہاتھ کی ضرب نہ تھی، بلکہ دل کی ضرب تھی، جو سینکڑوں کو ایک آن میں کفر سے نکال کر مسلمان بنادیتی تھی۔ آج بھی جن صوفیوں کے اندر جذبۂ توحید موجزن ہے وہ بیک کرشمہ دوکار کے مالک ہیں۔ ایک آن میں کفر سے نکال کر مسلمان بنادیتے ہیں۔

لیکن یاد رہے، جب دل خالی ہو، تو زبان کی تلوار کچھ کاٹ نہیں سکتی۔ مسندوں پر بیٹھے وہی کام کر سکتے ہیں، جن کے دل محبتِ خدائی اور خوفِ خدائی سے بھرپور ہیں۔ ورنہ خالی علم اور خالی مسندِ ارشاد کچھ بنا نہیں سکتی ؎

دل و نگاہ مسلماں نہیں، تو کچھ بھی نہیں

## فقر کی بنیاد

تصوف و فقر کی بنیاد " اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ" کے حاصل کرنے کے لئے صرف ذکر و فکر پر زیادہ توجہ ٹھہرائی گئی۔ اور عام احکامِ اسلام نسبتاً خلوص سے ادا کرنے پر مرکوز رکھی گئی۔

ذکر و فکر حقیقتاً دونوں قلبی مطلوب ہیں اور قلب کو بیدار کرنے اور اس کو آئینہ ودار بنانے کے لئے یہی صیقل کا کام دیتے ہیں۔ اس کے بغیر قلب اپنی پوری صفائی نہیں پکڑ سکتا، جس کے اندر جلوہ ہائے الٰہیہ پڑنے شروع ہوں۔

ابتداً ذکر زبانی شروع کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات جہری یعنی زور کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے تاکہ یکسوئی حاصل ہو، اور حواسِ خاصہ و عامہ ہر طرف سے بند ہو کر صرف ذکر کی لے میں آجاویں اور محویتِ ذکر پیدا ہو۔

لیکن جب حواس متوجہ ہو جاتے ہیں، تو پھر ذکر قلبی کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ اور زبانی ذکر کم اور قلبی زیادہ کرایا جاتا ہے۔ یہاںتک کہ آخر زبانی بالکل بند کر دیا جاتا ہے۔ اور ذکرِ قلبی ہر حال اور ہر وقت جاری و ساری ہو جاتا ہے ۔

تصور دل میں رکھے ذاتِ حق کا
بہر وقت و بہر حال و بہر جا
زباں خاموش ہو، پر دل میں جاری
رہے ہر وقت ذکر ذاتِ باری

یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ کا حال پیدا ہو جاتا ہے۔

## فکر

جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے اور ذکر ہر رگ و ریشہ سے شروع ہو جاتا ہے اور جسم کے ہر رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا ہے، تو فکر کی باری آجاتی ہے۔ اور اس تصور قریب کے "کَاَنَّکَ تَرَاهُ" "گویا تو اسے دیکھتا ہے" لائے جانے کے لئے "اللّٰہ

Marfat.com

مَعِی"  "اَللّٰہُ نَاظِرِی"  اللہ مجھے دیکھ رہا ہے "اللہ میرے ساتھ ہے" کا تصور پختہ کرنے کے لئے مراقبہ کی صورت میں یہ تصورات (اللہ حاضر ہے، اور میرے ساتھ ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اللہ شاہ رگ کے قریب ہے) پختہ کئے جاتے ہیں۔

یہ وہ تصورات ہیں، جن کے الفاظ قرآن حکیم میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَئیٍ شَھِیۡدٌ، وَاَللّٰہُ بَصِیۡرٌ بِمَا یَعۡمَلُوۡن

اللّٰہُ مِنۡ وَرَآئِھِمۡ مُحِیۡطٌ ،نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ

غرض وہ تصورات جو قرآن حکیم نے اپنی ذات کے بارے پیش کئے ہیں، درجہ بدرجہ پختہ کرائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ "کَاَنَّکَ تَرَاہُ" کا تصور پاک پختہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذکر کے وہ الفاظ جو قرآن و سنت میں بکثرت مذکور ہیں، اپنی طبع کے مطابق پڑھنے پڑھانے کے لئے تجویز کئے گئے۔ مثلاً اللہ، اللہ، اللہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اللہ ھو، یہ نام اور الفاظ ذکر قرآن کی بنیاد پر تجویز کئے گئے۔ کوئی ایسی چیز فقر و تصوف نے تجویز نہیں کی، جو قرآن و سنت سے باہر ہو۔ ہاں! سادہ عقل، سادہ علم، ظاہر بین گو اس بنیاد تک نہ پہنچے ہوں۔ جاہل سے بڑھ کر عاقل کا ذہن کام کرتا ہے۔ اور عاقل سے بڑھ کر ایک عالم کی وسعتِ دماغی کام کرتی ہے۔ ایسے ہی صاحب فقر و مشاہدہ کی وسعتِ قلبی اور ذہنی، عالم سے بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم اور احادیث نبویہ اور اسوۂ حسنہ سے جو کچھ اپنی باریک بصارت سے دیکھتا ہے، دوسرے عام (لوگ) اسے نہیں دیکھ سکتے، چونکہ وہ باریک نقطۂ علمی دنیا کی نظر میں بھی نہیں آتا، اس لئے علمیت واویلا کرتی ہے کہ قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ سے باہر کی چیز اہل تصوف در آمد کرتے ہیں، اور اسلام میں داخل کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس کا ماحصل، اس کا ثمرہ اسلام کے عین موافق ہے، یا مخالف ہے۔ اور اس کے نتائج خدا رسیدگی کے قریب کرتے ہیں، یا دور کرتے ہیں۔ یا شریعت غرا کی اتباع پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے، یا کم دنیا پرستی کا جذبہ زیادہ ہو رہا ہے، یا کم ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہا ہے۔

چونکہ ملت کسی درجہ کسی وقت بھی دنیا کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس لئے دنیا طلبی کے لئے کئی طریقے عمدہ سے عمدہ علمی استدلال کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ بلکہ الٹا تصوف کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے، یہ ترک دنیا کیسی؟ اسلام تو دنیا سنوارنے کے لئے آیا، نہ کہ برباد کرنے کے لئے آیا۔ لیکن کوئی نہیں دیکھتا تصوف نے دنیا سنواری یا بگاڑی اور برباد کی۔ اس نے تو اصلاح معاشرہ کے لئے دنیاداری کو دینداری کے ڈسانچے میں ڈال کر دنیا کو خوبصورت بنایا، اور اس کے پیچ پیچ کو نکال کر خطوطِ صحیحہ پر قائم کرنے کا جذبہ پیدا کیا، اور داخلِ تصوف ہونے والے کی دنیاداری کو دینداری کے اندر جذب کرنے کا طریقہ سکھایا۔ ہاں! اترانا، تکبر کرنا، حسد ور قابت کرنا، جو دنیا کے اسباب و علل کے لئے مہلک ہیں، ان کے دور کرنے اور ان کی اصلاح کرنے پر توجہ دلائی، تاکہ معاشرہ پورے جوبن سے ترقی کرے اور معاشرۂ اسلام اُس (درجہ پر) جا پہنچے جہاں کہا جائے اَصلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرعُهَا فِی السَّمَآءِ تُؤتِی اُکُلَهَا کُلَّ حِینٍ بِاِذنِ رَبِّهَا وَ یَضرِبُ اللّٰہُ الْاَمثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یتفکرون

## کیفیات

کیفیاتِ صوفیہ پر علمی طبقہ بڑا شاکی ہے، لیکن قرآن حکیم اور حدیث پاک کے قارئین پر پوشیدہ نہیں، کہ قرآن پاک ان کیفیات باطنی کو تسلیم ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کے تسلیم کرانے کے لئے دعوت بھی دیتا ہے مثلاً وَفِی الْاَرضِ اٰیٰتٌ لِلْمُوْقِنِیْنَ ہ وَفِی اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ہ کے طریقہ پر کیفیاتِ باطنی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ سورۃ "نجم" میں فرماتے ہیں وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ان آیات میں تعلق کیا ہے؟ وہی باطنی اور غیبی حالات یا قرآن حکیم۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی۔ "جو کچھ اس نے دیکھا، اس میں شک کرتے ہو"؟

Marfat.com

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی | بے شک اسے دوسری بار بھی دیکھا، |
| عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَھٰی | (کہاں؟) سدرۃ المنتہٰی کے قریب |
| عِنْدَھَا جَنَّةُ الْمَاوٰی | اس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ |
| اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی | ڈھانپلیا سدرہ کو جس چیز نے ڈھانپ لیا۔ نہ بہکی نگاہ |
| مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی | اور نہ حد سے بڑھی۔ |
| لَقَدْ رَاٰی مِنْ آیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی | بیشک اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں اس نے دیکھیں |

غرض بیسیوں جگہ ان کیفیات اور مشاہداتِ باطنی کی طرف قرآن حکیم توجہ دلاتا ہے۔ اسی صورت میں اگر صوفی سالک مشاہدات الٰہیہ کو بیان کرے، تو شرعاً اسے کیوں زجرو توبیخ کی کی جاوے۔ جبکہ عین مطابقت مشاہداتِ رسالت مآب ﷺ ہو۔ بلکہ جس کے تسلیم کرنے کرانے کیلئے خود قرآن دعوت دیتا ہے۔

## مسند فقر وارشاد

مسند ارشاد و فقر پر پورا غور کیا جاوے۔ صدیاں گزر گئیں، جب سے صوفیت کے مسند پیدا ہوئے اور ان کے ذریعہ ارشاداتِ نبوت کی اشاعت ہوئی۔ کیا یہ مسندِ ارشاد عینِ مسند ارشادِ نبوت کے مطابق نہیں تھے، اور اَلْفَقْرُ فَخْرِی کا نمونہ نہ تھے ایک درویشانہ زندگی بسر نہیں کرتے رہے اور توکل کے سوا اپنا سہارا بنایا؟ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ نکھٹو کام نہیں کرتے رزق کے لیے نہیں دوڑتے، عوام پر بوجھ ہیں۔ لیکن کیا رسول اکرم ﷺ ہر وقت کسبِ معاش کے لئے کمر بستہ رہتے تھے۔ وہ اپنے مصبِ رسالت کے فرائض بجالاتے یا وہ کسبِ معاش کے پیچھے دوڑتے پھرتے۔ یہی وجہ تو ہے کہ آپ کو صرف فقر کا سبق دیا گیا۔ زندگی بھر پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوا۔ اور پھر فخر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنا نوازا ہے اور کتنی عنایت فرمائی۔ یہی حال ہماری مسند کا ہے۔ توکل اور صرف توکل، جو کچھ آگیا اس پر قناعت کرتے ہوئے رات دن مشاغل میں مصروف رہتے، ارشادات کی مسند پہ جمے رہتے ہیں اور ہر آنے والے کے لئے سایہ دار

Marfat.com

درخت ہوتے ہیں۔ یہ میری تحریر سے نہیں بلکہ دنیائے عالم کی زبان سے سنئے۔ ان میں سے میں بھی ایک ہوں، جو یہ سنا رہا ہوں۔ نرمی گرمی کے ساتھ بسر کرنا اہل اللہ کا شیوہ ہے۔ اور طمع جیسی بُری چیز کسی صورت میں بھی ان کے دل پر گاہے نمودار نہیں ہوئی۔ کوئی دنیادار ہے، جو اس کمبخت طمع سے بچا ہو اور جس کی عزت اس بدبخت طمع نے برباد نہ کی ہو۔ خصوصاً کاروباری آدمیوں میں تو یہ مرض عام ہے۔ آج یہ مرض علماء اور صوفیاء کو بھی کھائے جا رہا ہے۔

صحابۂ کرام کی دولت اور ان کے کسب معاش کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ اول تو بہت کم مثالیں دنیاداروں کی ان میں ملتی ہیں۔ ہمیں تو مسندِ ارشادِ نبوت کا خاکہ دیکھنا ہے۔ کیونکہ مسندِ ارشادِ نبوت کے طریقہ پر فقر نے کام کرنا ہے۔

صحابہ کرام تو مسند نبوت سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ اکثریت کو طمع سے بچانے کے لئے ہی انہیں توکل کے اسباق پڑھائے جاتے ہیں، اور اسباب و ذرائع سے بلند کر کے انہیں صرف اپنی ذات حقہ کا دست نگر کیا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِه اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ۔ ایسے حال میں صوفیائے کرام کو یہ کہنا کہ یہ کچھ کرتے نہیں۔ یہ خود پر بوجھ ہیں۔ کیونکر جائز ہے؟۔ بادشاہ کیا کرتا ہے، کیا کماتا ہے؟ حالانکہ ساری سلطنت میں اس کا حصہ ہے۔ یہی حال سلطنت فقر کا ہے، جو رات دن خدمت خلق اللہ میں مصروف ہے۔ جس کے ذریعے ثمراتِ نبوت پیدا ہو رہے ہیں، اور جو سراسر دین ہو چکا ہو، اسے کمانے سے کیا واسطہ، وہ اپنا پیٹ پالے یا ہمارا کچھ کرے۔ جو پیٹ پالتا ہے، وہ کسی کا کچھ نہیں کرتا۔

## فہم فقر و تصوف

ہر کج رو اور کم فہم تصوف کے نکات اور اس کے مسائل اپنے فہم میں نہیں لا سکتا۔ بلکہ سب سے پہلے فطرتی توحید پرستی اور توحید طلبی کے ساتھ شیخ کامل و اکمل کی

محبت ہونی ضروری ہے۔ اور پھر علوم متداولہ اسلامیہ سے کامل واقفیت ہو، اور قرآن و حدیث پر پورا عبور ہو۔ اس کے بعد تدبر فی القرآن کا ملکہ جب پیدا ہوگا، تو تصوف کے برکات اور تصوف کے مسائل ذہن اور قلب پر ایسے واضح، قرآن حکیم سے، ہوں گے، جو کسی تفسیر کے اندر نہ ہوں گے اور جس کے کھلتے ہی انشراح الصدر حکم ہوگا اور حقیقت اسلام واضح ہوگی اور نبوت کے مدارج کھلیں گے اور اسرار الہٰیہ اور الہٰیہلہٰیہ دل پر منکشف ہوں گے۔ ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف کے مدارِج کمال ظہور پذیر ہوں گے، اور قرآن حکیم انوار الہیہ کا خزینہ ہو جائے گا۔ اور ایک ایک حرف پر بے اختیار آنسو پھوٹ نکلیں گے۔

نحو کی ایک کتاب "کافیہ" ہے، جو بہت مشکل ہے۔ کسی زمانے میں عربی طلباء اسے یاد کرتے تھے، اور پورے سال پڑھتے تھے، اور یہ کمال خیال کرتے تھے۔ ایک طالبعلم عربی جس نے اسے پوری توجہ اور پوری کوشش سے پڑھا تھا، طلباء کے مجمع میں بیٹھا کہہ رہا تھا کہ کافیہ کے ایک ایک لفظ کے اندر ایک ایک شیر ہے۔ تو دوسرا طالب علم جس نے سادہ بلا شروح پڑھا تھا، کہنے لگا، ہم نے تو لومڑی بھی سارے کافیہ میں نہیں دیکھی۔ یہی حال طبائع کا ہے۔ دور رس طبائع وہ کچھ دیکھتے ہیں، جو عام طبائع دیکھ نہیں سکتیں۔ آج آپ نے ہر عربی قدرداں سے سنا ہوگا کہ یہ معلوم نہیں یہ تصوف و فقر کہاں سے آیا؟ قرآن وحدیث میں تو اس کا پتہ ہی نہیں۔ لیکن خود سوچیے، قرون اولٰے کے مسلمانوں میں جب یہ جامِ تصوف چھلکا تو کیسے؟ جبکہ وہ سراسر عمل تھے اور سراسر اتباع رسالت تھے، اور سراپا محبت الہٰیہ میں غرق تھے۔

موجودہ دور میں علمیت ہی علمیت ہے، اور بس۔ دین سے واسطہ نہیں ہے۔ پھر ظاہری ارتقا پر جان دی جارہی ہے اور اصل اثاثۂ فطرت یعنی توحید کا خیال تک نہیں۔ جن کو ہے، وہ بھی لفظی۔ معنوی نہیں۔ تصوفِ پاک اور اس کے اثرات کا کوئی اثر ان کے اعمال وافعال پر، اور ان کے دلوں اور چہروں پر نمودار نہیں۔ وہ بے تکی ہانکتے پھرتے ہیں۔ زبان بے لگام اور دل بے دھیان ہے۔ رات دن ان مشاغل میں مصروف

ہیں، جن مشاغل کی اللہ تعالیٰ سے دوری ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے نیابت رسالت کا اور نائب رسولؐ کہلاتے ہیں۔ لیکن قوم کی حالت یہ ہے کہ ان کے ہر فعل و قول پر معترض اور شاکی ہے اور کسی کے دل میں ان کا احترام نہیں، اور نہ ان کے دل میں کسی کا احترام ہے۔ وہ خود ہی خدا کی خدائی ہیں اور بس۔ ایسے حال میں ان کے ذہن میں تصوف و فقر کے مسائل کیسے داخل ہوں۔ اور کیسے اسرار و انکشافات الہٰیہ کھلیں۔ تاکہ ذات حقہ چہرہ کشا ہو۔

## مقاصد

میں نے ایک کتابچہ "حقائق قرآنی کو اپنانے کا نام تصوف ہے" لکھا۔ جس کے تین حصے نظریۂ حیات، خانقاہیت، اور طریقت، شائع ہو چکے ہیں۔ اور دو حصے باقی ہیں۔ پہلا حصہ "درس تصوف سورۃ المزمل میں" اور دوسرا "تصوف اور قرآن" لکھنے باقی ہیں۔

ہم قارئین کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مضمون کی آیات سے پہلے سورۃ المزمل کا مطالعہ فرماویں۔ اور دیکھیں کہ نبوت الہٰیہ کی اٹھان کس تربیت سے کی گئی۔ خانقاہی تربیت سے یا مکتبی اور درسی سے؟ فیصلہ آپ پر ہو گا۔ انشاء اللہ، جلدی موقعہ ملے گا، تو ناظرینِ رسالہ ہمارا یہ حصہ المزمل دیکھیں گے اور انشاء اللہ اسی سورۃ کے آئینہ میں پوری تصویر فقر و تصوف کی پائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(مارچ ۱۹۶۵)

Marfat.com

# قرآن اور تصوف

مادی دنیا کی ترقی اور زر پرستی نے مذہب کے تقدس اور احترام پر بہت کاری ضرب لگائی۔ یہاں تک کہ مذہبی انسان کے پاؤں بھی لڑکھڑا گئے اور لاشعوری طور پر ان کے دل بھی دنیا پرستی کی طرف پھر گئے۔ یہ تبدیلی انیسویں صدی کی ابتدا سے زیادہ ترقی پذیر ہو گئی۔ جوں جوں مادی وسائل بڑھتے گئے اور دنیا عیش پرستی میں مبتلا ہوئی، توں توں مذہب سے صرف بیگانگی ہی پیدا نہ ہوئی بلکہ ایک گونہ نفرت بھی ہو گئی۔

ایسے حال میں خود قیاس کر لیویں کہ تصوف سے بیزاری کیوں نہ ہوتی، جو روح مذہب تھا۔ ساتھ ہی صوفیت بھی جب دنیاوی تعیش سے خیرہ چشم ہو گئی، تو خود صوفیت گرتے گرتے اسفل السافلین تک پہنچ گئی اور مقصد جلیل ہاتھ سے کھو بیٹھی۔ ایسی صورت میں اگر تصوف سے بیزاری ہوتی چلی جائے تو کیا تعجب؟

مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام سے بیزاری اگرچہ ظاہراً صحیح ہے، لیکن حقیقتاً غلط ہے۔ مذہب کے پیرو جب مذہب پر نہ چلیں اور لاعلمی کا شکار ہو جاویں اور پھر یہ بات واضح بھی ہو تو پھر کیسے باور کیا جاتا ہے کہ جو کچھ مسلمان ہیں وہی اسلام بھی ہے۔ مذہب تو سراسر عمل ہے، ہدایت ہے، عفت ہے اور رحم و شفقت ہے۔ تمدن و تہذیب کی بنیاد

ہے اور پھر ہر آن ارتقائی صورتِ دینی کا ذمہ دار اور ایک جاہل کو خدا تک پہنچانے کا رہبر۔ایسی صورت میں مذہب سے کیونکر نفرت ہو سکے؟

ہر مذہب کے ابتدائی دور کو دیکھا جائے۔ ہر پیروِ مذہب پاک جذبات سے معمور ہوتا ہے اور جذبہ اپنا عمل پیش کر رہا ہوتا ہے، رات کو خدا کے سامنے ہوتا ہے اور دن کو دنیاداری کے تمام مراحل میں سب سے آگے چلتا ہے، جان نثاری اور قربانی کو اپنا حق خیال کرتا ہے اور اس کے لیے اپنے ساتھیوں سے بڑھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ الغرض رات دن اسے ایک گھڑی بھی آرام نہیں آتا۔ سیماب کی طرح ہر گھڑی ہر پلک عمل میں مصروف ہے۔

لیکن جوں جوں مذہب بڑھتا ہے اور وقت گذرتا ہے، مذہب کے تقدس میں کمی آتی جاتی ہے اور مذہبی احترام گرنا شروع ہوتا ہے، تو پیروانِ مذہب بد عملی کا شکار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن پہلے احساسات گرتے ہیں اور پھر عمل میں فتور آجاتا ہے۔ ایسے حال میں مذہب، پیروانِ مذہب پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ اور وہ مذہب کیلئے بوجھ نہیں ہوتے بلکہ سیاہ داغ ہو کر دنیا کو اپنے مذہب سے بیزار کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ مذہب کا چہرہ ان کی بد عملی کی وجہ سے بدنما نظر آتا ہے۔

## اسلام

اسلام کا دورِ اول تو اتنا درخشاں ہے کہ کوئی تہذیبی اور تمدنی دور یا دورِ لادینی اس کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہر مسلمان اپنا آپ نمونہ تھا۔ شاہ و گدا تک سراسر عمل تھے، اور اپنی انفرادی صلاحیت کے ساتھ قوم کے اندر مدغم تھے۔ایک اور صرف ایک وحدہٗ لاشریک کے پرستار تھے۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کسی کی پروانہ کرتے تھے اور لَا مَعْبُودَ اِلَّا اللّٰہ، کے نعرے ہر طرف بلند تھے، اور ہر طرف وحی الٰہی کے منتظر تھے۔ ایک طرف حکم ہوتا، تو دوسری طرف عمل شروع ہو جاتا تھا۔ زمینی میدان تنگ ہو گئے اور دلوں کی وسعت زمین و آسمان کو اپنے اندر گھیرے ہوئے

تھی۔ دنیاومافیہا سے بے خبر۔ لیکن ایک جہانِ دنیاان کے دل میں بستا نظر آتا تھا۔ جہاں حکومت تھی تو صرف خدائے وحدہ لاشریک کی۔ وہ تھے اور مذہب تھا، اور مذہب کی روح۔ جس طرف مذہب ان کو پھیرتا تھا، پھرتے تھے۔ جہاں وہ روکتا رکتے تھے۔ الغرض تمدن و تہذیب کی روح میرے نزدیک مذہب ہے۔ لیکن کون سا مذہب؟ وہ جس کے اندر روحِ الٰہی زندہ ہو، اور اس روح الٰہی کے مشاہدات روزانہ دیکھے جاتے ہوں، کھلے کانوں روزانہ سنائی دیتا ہو۔ اَلَا اِنَّ نَصرَ اللّٰہِ قَرِیبٌ

تصوف اس حصۂ مذہب کا نام ہے، جس کے اندر مشاہداتِ قرب الٰہی حاصل ہوں، اور پھر مشاہداتِ الٰہیہ کی نوید ہر وقت تازہ دم رکھتی ہو، اور ہر عمل کے لیے جاں نثاری کا جذبہ تازہ ہوتا رہے۔ ایک طرف اپنی کیفیاتِ باطنی کا احتساب ہو، اور دوسری طرف جلوہ ہائے الٰہیہ کی بیتابی ہو، اور صوفی کا دل اندر کباب ہو رہا ہو، اور ہر آن اس کا قدم بلند سے بلند مقام کی طرف چل رہا ہو۔ نہ خود سوئے نہ کسی کو سونے دے۔ نہ خود بے کار ہو، نہ کسی کو بے کار دیکھ سکے۔ اپنے نفس کے ضبط سے دنیا کے نفوس کو ضبط رکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ مگر جو بیچارہ اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے، اس بے چارے کو صوفی کہنا اور اس پر تصوف کی بدعملی کے داغ دینا کون سی عقلمندی ہے؟

## صوفی

صوفی ایک آفتابِ جہاں تاب ہے کہ اس سے ہر ذرۂ کائنات فیض اٹھاتا ہو اور اس کی تپش دلوں پر ایسی پڑ رہی ہو، جیسے آفتاب کی تپش ہر ذرہ پر پڑتی ہے اور ہر ذرہ کو آفتاب بنانے کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زمین میں نمی نہ ہو اور آفتاب کی تاب کی طاقت نہ رکھتی ہو، اور خالی تپش کے سوا اس کی روئید گی نہ کر سکے۔ لیکن اس صورت میں آفتاب کا کیا گناہ یا کیا خسارہ؟ وہ تو اپنی تاب و تپش میں ہر وقت سرگرداں اور ہر ذرۂ کائنات پر مہربان ہے۔

Marfat.com

جب تک روحانیت مذہب کے اندر جوش زن رہتی ہے، مذہب ترقی کرتا رہتا ہے، لیکن جب روحانیت (ہدایت) کم ہو جائے، اور قیل و قال بڑھ جائے تو مذہب کا ارتقا رک جاتا ہے۔ صاحب قیل و قال خیال کرتے ہیں کہ ہم مذہب کی خدمت کر کے مذہب کو بلند کر رہے ہیں، لیکن حقیقتاً مذہب قیل و قال میں گم ہو رہا ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اندازہ کیجئے، علمیت کہاں تک بلند ہو گئی ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ دین اور مذہب کم ہی نہیں ہو رہا بلکہ ختم ہو رہا ہے۔ لیکن علم والے ہیں کہ برابر اپنے قیل و قال میں مست ہیں اور اتنے مست کہ روحانیت پر برابر برسنا ہی اپنا منصبی فریضہ خیال کرتے ہیں۔ اور اب یہاں تک ترقی کر گئے ہیں کہ تصوف کو مذہب کا جزو ہی خیال نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ وہ خیال کریں کہ توحید تصوف کی جان ہے اور روحانیت توحید ہے اور بس۔ اس کے سوا ایک قدم بھی توحید کا چلنا مشکل ہے۔ عمل کس کے پاس نہیں؟ ہر انسان عمل کے لیے پیدا ہوا۔ دیکھنا یہ ہے کہ عمل قالبِ عمل سے موزوں ہو کر نکلا ہے یا بے ڈھنگا ہے، جس کے لیے جوڑ پیدا نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ اس عمل کے اندر روح بھی چھلکتی ہے یا صرف ظاہری اور نمائشی جھلک ولک رکھتا ہے اور اندر سے کھوکھلا ہے۔ آج دینی اعمال جتنے بھی ہم کر رہے ہیں، اگر غور سے انہیں دیکھا جائے تو اس کے اندر ایک بو بھی اخلاص کی نظر نہیں آتی اور اخلاص و تقویٰ ہر عمل میں مفقود ہے۔

## تصوف کیا چاہتا ہے؟

تصوف یہی چاہتا ہے کہ عمل کے اندر اخلاص و محبت اور تقویٰ و پرہیزگاری موجود ہو، اور ہر عمل اخلاص کی روح پر ہو۔ ایسی صورت میں یہ کہہ دینا کہ تصوف کے لیے مذہب کے اندر کوئی مقام نہیں اور کتاب و سنت میں اس کا اثر نہیں ملتا اور یہ کہ اسلام کی پیداوار نہیں، بلکہ جوگ ویدانت اور رہبانیت ہے، یہ کتنی بے علمی ہے؟

Marfat.com

## ہر مذہب اپنے خدوخال اپنے ساتھ لاتا ہے

جیسے ہر صورت اپنے خدوخال پیدائش سے اپنے ساتھ لاتی ہے اور عارضی بناوٹ کے سوا اصل موجود رہتی ہے، ایسے ہی ہر مذہب تمام وجود کے خدوخال اپنی پیدائش کے ساتھ لاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض نقوش ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں، لیکن تمام نقشہ و صورت کسی سے نہیں ملتا۔ مذاہب یا ادیان انسانیت کی طرح ایک ہیں، لیکن اپنی ذاتی صورت سے تمام ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔ ایسے ہی اسلامی تصوف اپنا رنگ وروپ الگ رکھتا ہے، اگرچہ اقدار میں تمام قسم کے تصوف ایک نوع میں شامل ہیں۔ اس لیے اسلامی تصوف سراسر اسلام سے پیدا ہوا ہے اور اسلامی تعلیمات کے اندر ہر جگہ اس کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

## قرآن حکیم

قرآن حکیم جو اسلامی تعلیم کی بنیادی کتاب ہے، سراسر روحانیت سے پُر ہے اور توحید کی خالص روحانی تعلیم سے پُر ہے۔ کوئی صفحہ یا ورق، کتاب حکیم کا ایسا نہیں جس کے اندر توحید کی رہنمائی نہ ہو۔ پھر غور فرمایا جائے کہ توحید کے معارف فقر و تصوف نہیں تو کیا ہیں؟ فقر و تصوف خود کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتا، بلکہ کتاب و سنت سے اخذ کردہ وہ مسائل ہیں جو توحید کو پختہ کرنے اور اس کی تکمیل کے لیے آئے۔ ان کو مکمل کرنا تصوف ہے اور اس تکمیل کو معرفت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم نے جہاں تک مطالعہ کیا ہے، قرآن حکیم کا اکثر حصہ فقر و تصوف کی ترجمانی کرتا ہے اور اس انداز سے کرتا ہے جس انداز سے کتبِ تصوف پیش کرتی ہیں۔

قرآن حکیم ایک جامع کتاب ہے جس کے اندر تمام دین کے حصے و شعبے بیان کیے گئے ہیں اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی رہنمائی نہ کی گئی ہو۔ اور ہر حصہ اجمال و تفصیل سے پُر ہے، لیکن مطالعہ کرنیوالوں کی اپنی اپنی مناسبت ہے کہ وہ اپنی مناسبت کے مطابق توجہ دیتے ہیں اور قرآن حکیم کو اپنی مناسبت سے مطالعہ کرتے

ہیں۔ ایک فقیہ فقہ کے مسائل پر توجہ دے کر اپنے مسلک کی آئین تلاش کرے گا۔ ایک سیاسی آدمی کی اپنی سیاست کی آیات پر تدبر کر کے اپنا مقصد حاصل کرے گا۔ غرض ہر شخص شعبۂ دین کا اپنی مناسبت سے مطالعہ کرتا ہے۔

ایک بازار میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن ہر خریدار اپنی اغراض کے مطابق اشیا خرید کریگا، اور ان دکانوں پر جائے گا، جہاں اس کی خریداری کی اشیاء ہوں گی۔ ایک دال خریدنے والا بزازی کی بڑی سے بڑی دکان پر کبھی نہ جائے گا، اور اپنے محلّہ کی ایک کریانہ کی معمولی دکان سے خرید کر ہنڈیا کو جوش دے گا۔ ایسے ہی کپڑے کا خریدار کپڑے کی دکان تلاش کرے گا، اور زیورات کی دکان پر اس کی نظر کبھی آئے گی ہی نہیں۔ لیکن جوہری کی دکان کو تلاش کرنے والے بہت ہی کم ہونگے اور دن بھر میں کوئی اکادکا دکان پر پہنچے گا۔ لیکن خریداری ہزاروں اور لاکھوں کی ہوگی۔

یہی حال قرآن حکیم کا ہے۔ ہر چیز موجود ہے ضرورت مند اپنے مسلک اور عقیدہ کے مطابق تلاش کر کے اپنے مقصد اور ضروریات کے مسائل تلاش کر لیتے ہیں۔ ہر سورۂ قرآن اپنے انداز بیان الگ رکھتی ہے اور پھر ہر آیت اپنی حقیقت کی آپ ہی شاہد ہوتی ہے۔ پھر تدبر کرنے والے کے لیے ایک آیۃ ہی کئی پہلو رکھتی ہے اور ہر پہلو میں ایک حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو تمام آیات اور سور کا ایک خاص اتحاد ہے جس کے اندر تمام قرآن حکیم کی آیات منسلک ہیں اور اسی اتحادی رشتہ کی وجہ سے ادھر ادھر نہیں مڑتیں۔ اور وہ ہے توحید الٰہیہ کہ ایک اور صرف ایک ہے، جسے رب العالمین کہا جاتا ہے اور اس کی ربویت کی شان ہر ذی شعور خود دیکھ رہا ہے۔

غرض ہر حصے کے الگ الگ مطالعہ کرنے والے تو بہت ہیں، اور ہر مسلک کے مطالعہ کرنے والے اپنے مسلک کے مطابق نمایاں ہیں۔ لیکن اس جوہر حقیقی کو تمام قرآن حکیم میں دیکھنے والے بہت کمیاب۔ کوئی اللہ کا بندہ ہے، جو اس تمام مظاہرِ کائناتی میں اس روح جانفزا کو جاری وساری دیکھ سکے۔ قرآن کی ہر آیت اس کی شان کبریائی

Marfat.com

کے لیے آیت ہو کر اس کی صورت بے مثل و بے مثال دکھا رہی ہے اور پڑھنے والا اپنی قلبی آنکھ سے اس ذات بے مثال کا نظارہ کر رہا ہوتا ہے۔

تیرھویں صدی کی ابتدا میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا تعلیم صرف غیر مقلدوں کے لیے مخصوص تھی لیکن تمام قرآن حکیم احکام شرک سے بھرا نظر آتا تھا۔ فرنگی چکر سے قوموں کی آنکھیں کھلیں تو مسلمان بھی بیدار ہو۔ اس وقت کے علما کو قرآن حکیم سراسر سیاست ہی نظر آیا اور تمام مسائلِ دینی زیرِ حجاب آگئے۔ اس وقت کا عام تدبر و فہم یہی ہے۔ کہ ذات وحدہ لاشریک جو روحِ قرآن ہے کسی کی نظر میں نظر نہیں آتی۔ اور نہ ان آیات کی طرف توجہ دی جاتی ہے جن آیات میں کھلے طور پر وہ اپنی ذات کی شناسائی بخشتے ہیں اور جن کے اندر وہ خود بول رہے ہیں۔ صوفی اپنے نہاں خانوں میں مست ہیں اور علماء اپنے کتب خانۂ علم میں مست۔ کوئی غریب ہشیار ایسا ہو گا، جو ان بزرگواروں کی حاشیہ نشینی کی برکات سے دلِ منور رکھتا ہو، اور دونوں کو سر چشمۂ ہدایت خیال کرتا ہو اور دونوں سے عقیدت رکھتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ مجھے بزرگانِ دین کی خدمت کا شرف حاصل رہا، اور مفسرینِ قرآن کی تفسیر سننے کے موقعے میسر ہوئے، اور فہم و تدبر کی راہیں کھلیں، اور قرآن حکیم اپنی حقیقی صورت میں سامنے آگیا۔ تکلیف و تکلف سے پاک اس کے معانی و حقائق سامنے آگئے، اور بے مثل و بے مثال کی صورت قرآن حکیم میں دیکھنا نصیب ہوئی، اور ہر آیت میں اس کی جلوہ نمائی سامنے آئی، گویا خود بول رہے ہیں، اور اپنے مظاہر قدرت سے اپنی شان دکھا رہے ہیں اور اپنے بے تاب جلووں سے دنیا کو معمور و مسحور فرما رہے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ علم بڑا حجاب ہے۔ باوجودیکہ علم ہدایت کا سر چشمہ ہے، لیکن پھر بھی حجاب۔ جن بزرگواروں کو دیکھا وہ نہایت پاک طینت ہونے کے باوجود اسی علمی زعم میں اصل راس المال کی طرف متوجہ نہ دیکھے۔ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو اہل دل کرتے ہیں، لیکن ان کے دل میں وہ بستا نظر نہیں آتا، جو جگ میں بستا ہے۔ ہاں! ان کے دل میں علم بستا ہے اور وہ علم کے پرستار اور علم کے پاسبان ہیں۔

شریعت اور حکمت پر تمام توجہ ہے، اس پر جان دیتے ہیں، اور جس ذات نے ان کو پیدا کیا ہے اس کی طرف دھیان نہیں جو ہونا چاہیے۔ خاص کر محبت کا میدان گم ہے، جو مطلوب تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ سرد علم سے کیا حاصل ہو سکتا ہے جب تک گرم دل ساتھ نہ دے، اور محبت کے نشے میں آنسو جاری نہ ہوں اور ہر آن اور ہر گھڑی اس کا تصورِ پاک دل میں جوش زن نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کی ان آیات کی طرف توجہ نہیں فرمائی جاتی جو آیات خالص اس کی ذات کے لیے ہیں، اور جس کے اندر صفات و ذات شیشے کی طرح جھلکتے نظر آتے ہیں اور جن کے دیکھتے ہی تمام غبارِ خاطر دور ہو جاتا ہے اور دنیا کی حقیقت اور بے مائیگی نظر آنے لگتی ہے۔ اگرچہ میرا مطالعہ وسیع نہیں، لیکن جہاںتک وسعت ہے وہاں تک یہی نظر آیا کہ علمی دنیا نے ان آیات پر توجہ تک نہیں کی، کیونکہ وہ اس کے دل کی بات نہ تھی یا اس تک ان کی رسائی نہ تھی، ورنہ کون سا حصہ قرآن حکیم ہے، جس میں وہ خود نمودار نظر نہ آتا ہو۔

اس پر طرہ یہ کہ کہا جاتا ہے کہ قرآن تصوف و فقر سے خالی ہے اور یہ عجمیت کے اثرات ہیں جو تصوف اپنا رہا ہے۔ کبھی اسے جوگ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کبھی رہبانیت کہدیا جاتا ہے۔

## رسمی تصوف

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ رسمی تصوف میں بہت سی بدعات ہی پیدا نہیں ہو گئیں، بلکہ اصل مقصود بھی گم ہے اور لا معبود الا اللہ کجا، جیسے حضرت مرشدم میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اب تو لا الہ اللہ انگریز رسول اللہ، پیسہ رسول اللہ پڑھا جارہا ہے۔ لیکن اسی رسمی تصوف کی بے مائیگی سے اصل تصوف کے اقدار پر تو کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔

## تزکیہ

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ آپ کتاب وحکمۃ کے ساتھ تزکیہ بھی فرماتے ہیں۔ الگ الگ مظاہر بنالیں، تو پھر تزکیہ خود حضورؐ کی ذات سے وابستہ ہے۔ تعلیم قرآن الگ اور تزکیہ الگ۔ لیکن غور کیا جائے تو مذہب یا دین تزکیۂ نفوس کے لیے ہی تو آیا ہے، ورنہ ہر طرح کے معاشرے تو معاشرے ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تزکیہ کے طریقوں سے انکار کیا جاوے، جب کہ خود قرآن حکیم اس کا شاہد ہو اور اس کے طریقوں کی بنیاد خود قرآن حکیم ہو۔

قرآن حکیم میں کسی امر کی تفصیل نہیں ہے۔ ہر امر کی بنیادی حقیقت پیش کر دی گئی ہے۔ نماز جیسی چیز جو پانچ وقتی فریضہ ہے، اس کی پوری ترتیب کہاں ملتی ہے؟ لیکن اس کی حقیقتِ جامعہ پر پوری توضیح ملتی ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ہ وہ مومن کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں میں عجز لیے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ ہ

کتنا افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ غرض حقیقت پیش کر دی گئی ہے۔ اب ذرا اپنی نمازوں پر غور فرمایا جائے کہ کس درجہ کی ہماری نمازیں ہیں؟ منہ تو قبلہ کی طرف ہے اور دل کے گھوڑے مشرق کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ تصوف یہی بتلاتا اور سکھاتا ہے کہ یہ نماز کسی کام کی نہیں۔ خاشع نماز ادا کرو۔

## دنیا دھوکہ ہے

توحید کے بعد فقر اور تصوف کا تصور ایک اور ہے کہ دنیا دھوکا ہے اور اس تصور کے دل پر جمانے کے لیے طریقے اور ذرائع پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی من گھڑت بات نہیں، بلکہ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ہ کی عملی تفسیر ہے۔ لیکن اس سے کیوں گھبرا لیا جاتا ہے؟ صرف اپنی نفسی خواہشات کے لیے۔ ورنہ

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ جس نے دنیا کو دھوکا خیال نہ کیا وہ ہمیشہ بے راہ چلتا ہے اور اپنی بے راہ روی سے دنیا کو تباہ کرتا ہے اور جس نے دھوکا خیال کیا وہ اپنے نفس پر قابو پا کر راہ روی اختیار کرتا ہے، اور ہدایت الٰہیہ پر چلتا ہے۔

## خانقاہی تصوف

آج علمی دنیا میں خانقاہی تصوف بڑا بدنام کیا جا رہا ہے لیکن غور کیا جاوے جو کچھ دین کے آثار، شکل و صورت اور روزہ نماز قائم ہیں وہ اسی خانقاہی تصوف ہی کی برکت ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں تصوف کا سایہ نہیں وہاں شکل و صورت اسلامی کا تمسخر اڑایا جاتا ہے، اور تصوف و صلوٰۃ سے بیزاری ہے۔ طلبائے مدارس دینیہ تک کا مطالعہ کیا جاوے تو آپ اس حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف تمام نہ سہی، نصف نہ سہی آخر کچھ نہ کچھ ایسے نفوس آپ کو ملیں گے جو اپنے نظریاتِ دینی میں پختہ ہوں گے اور عملاً دین کی تفسیر ہوں گے۔ پھر یہ کہنا کہ قرآن حکیم میں اس خانقاہی تصوف کی نشاندہی نہیں ملتی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے؟

## سورۂ نور

سورہ نور عائلی قانون کا مجموعہ ہے اور نصف قانون ایک طرف اور نصف قانون دوسری طرف رکھ کر درمیان میں آیۂ نور کو دیدیا گیا۔ کیونکہ تمام اسلامی معاشرہ کا مرکزی نقطہ یہ آیت ہے، جو خانقاہیت کی پوری تصویر پیش کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ معاشرہ کا مرکزی نقطہ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْہَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْہِیْہِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ہے۔ اس کے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

پھر آپ تمام ائمہ تفاسیر جدید و قدیم کا مطالعہ فرمایئے۔ اس آیۃ پر کیا کچھ لکھا؟ معلوم ہوتا ہے، اس آیۃ پر دھیان ہی نہیں دیا گیا؟ یا اپنے ہم خیال نہ ہونے کی وجہ سے دیدہ دانستہ وضاحت سے گریز کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے علم دوست صرف اسی

Marfat.com

آیۃ پر توجہ دے دیں تو مجھے یقین ہے کہ نفرت کی بجائے محبت پیدا ہو جائے اور اختلاف کی جگہ اتحاد۔

غرض الغیب کی بابت جہاں کہیں بھی آیات آئے یا اس کے متعلقات کی بابت ذکر ہوا، علمائے ظواہر نے خاموشی اختیار کی اور ایک لفظ تک نہ لکھا۔ ورنہ قرآن پاک الغیب کی توضیح و تشریح میں بے شمار آیات اپنے اندر رکھتا ہے۔

## اصحابِ کہف

اصحاب کہف کا قصہ علمی دنیا جانتی ہے، اور توضیحات جو اس قصہ کے بارے پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن غور فرمایا جاوے کہ اس کے نتائج کیا کچھ دکھلائے گئے؟ یا اس کی وضاحت کتنی کی؟ جدید و قدیم مفسرین ایک راہ چلے اور مطلب واضح نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض الفاظ کے معانی جو پیش کئے گئے وہ غلط تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے حقائق پر غور نہ کیا گیا۔

چنانچہ اب ہم اپنی تفسیر اصحاب کہف کے بارے پیش کر کے آپ کو متوجہ کرتے ہیں کہ آپ ہماری تفسیر اور توضیح کامل غور سے پڑھیں اور پھر ائمہ مفسرین کی تفاسیر کا مطالعہ فرماویں۔ اور پھر موازنہ فرمائیں کہ کونسی تفسیر دلنشیں ہے اور کونسی تفسیر فطرتِ، صحیح تسلیم نہیں کرتی، اور پھر دیکھئے کہ فقر و تصوف کے کتنے مسائل اس تفسیر میں واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم یہ سلسلہ جاری رکھیں گے اور آپ یہ دیکھیں گے کہ قرآن حکیم تصوف سے پُر ہے یا خالی؟ آفتاب آمد دلیل آفتاب!

(جون ۱۹۶۵)

Marfat.com

# تصوف اور مقام تصوف

معلوم نہیں دنیا نے آج تصوف کو کیوں اسلام کے سوا کچھ اور سمجھ رکھا ہے۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے تصوف اسلام کی روح کے سوا کچھ نہیں۔ جن حقائق یا عقائد کو اسلام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسلام خود چاہتا ہے کہ یہ حقائق قلوب انسانی میں روشن ہو کر دنیا کی فلاح و برکت کا باعث بنیں، انہی حقائق کو اپنانے کا نام تصوف ہے۔ توحید، اسلام کا پہلا عقیدہ ہے لیکن اس عقیدہ کی پختگی کے کئی مدارج ہیں اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمام امت کا ایمان ایک طرف اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان ایک طرف۔ اب غور فرمایا جائے کہ یہ اتنا فرق عظیم کیوں؟ صرف پختگیٔ ایمان کی وجہ سے۔ نتائج کا مدار بھی عقیدہ کی پختگی پر ہے۔ قرآن کریم میں فرماتے ہیں یَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ۔(۱) ایمان دارو! اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ دنیا ساری خدا سے ڈرتی ہے لیکن وہ سب کچھ کرتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ روکتا ہے اور وہ سب کچھ نہیں کرتی جس کا حکم ہوتا ہے۔ غور فرمایئے واقعی اگر ڈرتے تو ایسا ہوتا؟

نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات جب تک تھی، تو آپ کی محبت کے شرف اور آپ کی نظرِ کیمیا اثر سے، اور اس وقت دنیا مخالفی کی وجہ سے عقائد اسلامی اس درجہ پر

Marfat.com

پہنچ گئے تھے، جس درجہ پر ان کا پہنچنا حق تھا۔ لیکن جوں جوں رسالتؐ کے زمانے کو بعد ہوتا گیا، طبائع کے اندر عقائد گرنے شروع ہو گئے۔ لیکن جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص بنالیا اور جن کو اپنے فضل و کرم سے ممتاز فرمانا تھا، ان کو اپنی محبت کے اندر جذب فرمالیا اور ان پر توحیدِ کامل کے انوار وارد فرمائے اور ان کو دنیا سے بیگانہ فرما کر اپنے لیے خاص فرمالیا، جن سے یہ خدمت پسند تھی کہ وہ اسلام کے حقائقِ قرآنی اور افکارِ ربانی کی عملی تفسیر ہو کر خلق اللہ کے لئے نمونہ ہو جائیں۔ یہی نمونہ اہل دل اور اہل تصوف کہلاتے ہیں اور ان بزرگانِ دین نے ان حقائق کو اپنانے کے لیے جو جو طریقے روشن فرمائے ،ان طریقوں سے وہ اس خدمت اسلامی کو سرانجام فرماتے رہے اور لوگوں کو تزکیہ ٔنفس کی اعلیٰ تعلیم عملاً دے کر دنیا کو اسلام کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔

کتبِ قوم موجود ہیں، ان کے حالات موجود ہیں، ان کی صورت و سیرت کے نقشے موجود ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ اسلام کے سوا کچھ پیش کرتے رہے اور قرآن حکیم کے سوا کچھ اور تعلیم فرماتے رہے؟ توحید کو کس کمال تک پہنچایا کہ دوئی کا شائبہ تک نہ رہا تھا۔

تو درو گم شو وصال ایں است وبس

رسالت کی محبت پر جان دیتے گئے۔

زمہجوری بر آمد جانِ عالم　　　　تَرحمؐ یا نبی اللہ تَرحمؐ

اسی نظریۂ حیات کو اپنانے کے لیے وہ دنیا سے ایسے دست کش ہوئے کہ مرتے دم تک کسی دنیاوی لذت اٹھانے تک کا خیال نہ آیا۔

چیست تقویٰ زہد اے عالیجناب　　　　بر مرادِ خود نہ گشتن کامیاب

ان قرآنی حقائق کے اپنانے سے، وہ خود تو درویش تھے، لیکن بادشاہِ وقت ان کی سلامی کو فخر جانتے تھے۔ اپنے نہیں، غیر اقوام کے بادشاہ بھی جوتے اٹھانا فخر خیال کرتے تھے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ قرآنی حقائق کو جو ان کا حق تھا اسے اپنانے میں اپنی تمام عمریں صرف کر دیں اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ کی کئی تفسیریں اور

Marfat.com

تاویلیں آپ نے دیکھی ہوں گی۔ لیکن اہل دل نے جو تفسیر فرمائی ؎

مال واولادت بمعنے دشمن اند
گرچہ نزدیک تو چشم روشن اند

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ یاد گیر
مال وملک ودولتش برباد گیر

اس سے بڑھ کر کسی حقیقت شناس انسان نے اس کی تفسیر و تعبیر کی ؟ کتنے واضح الفاظ میں کھلم کھلا کہہ دیا

گرچہ نزدیک تو چشم روشن اند

پھر بھی زبانی دعویٰ نہیں رہا۔ جب کبھی مال و دولت کی ٹکر ہوئی تو اس سے اتنا بھاگے کہ مڑ کر نہیں دیکھا۔

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے۔ جب حرم کعبہ میں ان کے صاحبزادے آئے اور ان کی طرف طبیعت للچائی اور ان کی رعنائیت پر نظر جمی تو اسی وقت بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے کہ یا اللہ ! کس فتنے میں مجھے ڈال دیا گیا، مجھ سے یہ فتنہ دور فرما۔ بیان کرتے ہیں کہ صاحبزادے کا پاؤں پھسلا اور وہیں جان بحق ہو گئے۔ آپ کہیں گے کہ یہ فقر و تصوف ہے جو بیٹے تک سے لاپرواہے۔ لیکن ذرا آنکھ کھول کر دیکھا جائے کہ دنیا کی محبت میں آل اولاد نہیں بھول جاتی ؟ آج اس محبت کی وجہ سے باپ بیٹا مخالف نظر آتے ہیں۔ بلکہ ساری دنیا اس پاک جذبۂ الفت کو صرف مال و دولت کے نشۂ محبت میں لگانے سے ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں اور کوئی بھی نہیں جو ان پر طعن و تشنیع کرے۔ اگر طعن و تشنیع ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی محبت پر۔ کوئی دنیا میں اپنا مال و دولت لاکھوں کا آوارگی میں خرچ کرتا پھرے لیکن کسی کو اعتراض نہیں۔ اعتراض ہے تو اس خرچ پر جو راہ حق میں کوئی خرچ کرے۔ محبتِ الٰہیہ سدا سہاگن ہے۔ باقی تمام محبتیں فانی ہیں کب تک وہ ساتھ دیں گی ؟ آج کی دنیا تو یورپ وامریکہ کی سیر کے لیے بیویاں خاوند بچے بیٹے چھوڑ کر جا رہی ہے اور اس پر فخر کرتی ہے اور ان کے اعلیٰ اقدار اپنانے پر نشریات ہوتے ہیں اور کوئی ملامت نہیں کرتا کہ وہ فطرتی محبت کہاں گئی ؟

Marfat.com

## مقام تصوف

تصوف کی نگاہ و نظر کسی عمل کے ظاہر تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ عمل کی ظاہری صورت سے بڑھ کر عمل کی روح پیدا کرنے تک ہوتی ہے۔اور جب تک یہ روح پیدا نہ ہو ، یہ عمل کو لگاتار کرتا رہتا ہے۔اور عمل کی کثرت سے عمل کی روح جب پیدا ہوتی ہے تو اس وقت اس کے نزدیک عمل کی قیمت ہوتی ہے اور عمل کا احترام۔اس درجہ سے پہلے اس کے نزدیک ظاہراً کوئی کتنا ہی اچھا دکھائی دے اس کے نزدیک اس کی قیمت نہیں۔

## ذکر

یہ لا الہ الا اللہ کو پنج وقتہ اذان کے بعد پڑھنے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اَفْضَلُ الذِّکْرَ لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ کے دوامِ ذکر سے اپنے سینہ میں نور دیکھنا چاہتا ہے۔اور جب تک یہ نورِ قلبی پیدا نہ ہو جائے صرف ذکر کی کوئی قیمت اس کے نزدیک نہیں۔

## نماز

اسی طرح نماز کو پنج وقتہ ادا کر کے اپنی تسلی نہیں پاتا، بلکہ کثرتِ نوافل کی عبادت کو رات دن اپنا وظیفہ خیال کرتا ہے اور جب تک اَلصَّلٰواۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ کی حقیقت اس کے سامنے نہیں آتی یہ اپنی نماز کو نماز نہیں خیال کرتا۔

## روزہ

ماہ رمضان کے روزے رکھنے سے یہ اپنا فرض ادا ہونا خیال نہیں کرتا بلکہ اپنے نفس کے تزکیہ کے لیے مدتوں روزے رکھتا ہے یہاں تک کہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن کی شان پیدا ہو جاوے اور اسرار الٰہیہ کی موج سینہ میں لہرانے لگے۔

## زکوٰۃ

واجب مال پر زکوٰۃ پر اسے قناعت نہیں، بلکہ تمام مال و جان کو راہِ مولیٰ دینے

کو اپنی زکوٰۃ جان و مال خیال کرتا ہے حتیٰ کہ اولاد کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا،

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُو

ہر چہ داری صرف کن درراہ او،

پر عمل ہوتا ہے اور شان صدیقیت کا پورا نمونہ ہونے کی تڑپ رہتی ہے۔

## حج

یہ اپنے حج کو اس وقت تک حج نہیں خیال کرتا جب تک اسے حرم کے اندر عرشِ عظیم پر خدائی جلوے نظر نہ آئیں اور اپنے آپ کو بارگاہ الٰہیہ کے حرم میں نہ دیکھے۔

## ظاہر و باطن

ظاہر و باطن اور لفظ و معنی کو ایک دیکھنا پسند کرتا ہے اور جسم و جان کو اکٹھا جب تک عمل میں نہ دیکھے اسے منافقت سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے صرف شریعت پر قناعت نہیں۔ جب تک طریقت حقیقت تک شریعت نہ پہنچے، شریعت کو بے حقیقت جانتا ہے۔ یہ کتاب و سنت کو تزکیہ کے ساتھ لازم سمجھتا ہے اور جب تک تزکیہ نفس پر توجہ نہ ہو، کتاب و سنت کو بے معنی و بے روح خیال کرتا ہے۔ الغرض ہر عمل میں ظاہر و باطن کی تمیز اٹھانا اس کا اولین مقصد ہے۔ ایسی صورت میں خود اندازہ لگائیے کہ تصوف کا مقام اسلام میں کس درجہ بلند ہے اور کتنا رفیع۔ لیکن کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں جو اپنے علم کے زعم میں اسے اسلام سے الگ بتانے پر اپنا پورا زور خرچ کر رہے ہیں اور اپنے اندر نہیں دیکھتے کہ کون سی طوطی ان کے اندر بول رہی ہے اور خیال نہیں فرماتے کہ نبی کریم ﷺ صرف شارع اسلام ہو کر تشریف نہیں لائے تھے، بلکہ مزکی بھی تھے، قرآن حکیم جہاں وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ فرماتا ہے وہیں وَیُزَکِّیۡھِمۡ کی صفت سے آپ کی شان بڑھاتا ہے۔ کتاب و سنت تزکیہ کے بغیر نہیں اور تزکیہ کتاب و سنت کے سوا کچھ نہیں۔ پھر کیونکر تصوف کو اسلام سے جدا خیال کیا جائے اور کیونکر تصوف کے حقائق کو

Marfat.com

ویدانت وغیرہ سے تعبیر کیا جائے۔ رومی اسی درد پر بول اٹھے تھے ؎

من زقرآن مغز را بر داشتم    استخواں پیش سگاں انداختم

قرون اولیٰ میں کتاب و سنت اور تزکیہ الگ الگ نہ تھے۔ کتاب و سنت کے مالک پورے اور کامل مزکی ہوتے۔ اور اہل علم اور اہل دل جدا نہ تھے۔ ایک جان دو قالب کے مطابق اسلام تھا۔ ہر قالب میں دونوں صفتیں جلوہ گر تھیں۔ لیکن رسالت سے جوں جوں زمانہ دور ہوتا گیا اور طبائع گرتی گئیں، دونوں صفات کو کمال تک پہنچانا بیک وقت مشکل ہو گیا۔ اس لیے اہل اسلام کی پیشوائی اور رہنمائی کے دو طبقے ہو گئے ایک اہل علم اور کتاب و سنت کا، دوسرا اہل دل صاحب تصوف کا۔ پھر بھی ان میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ صاحب علم صاحب تزکیہ ہوتے تھے اور صاحب تزکیہ صاحب علم۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جنیدؒ بایزیدؒ یا شیخ عبد القادرؒ کتاب و سنت کے عالم نہ تھے۔ یا شافعیؒ واحمدؒ تزکیہ سے خالی تھے۔ صرف امام فن ایک میں تھے۔ یا تصوف میں یا کتاب و سنت میں۔

لیکن آج عجب معاملہ الٹ گیا ہے۔ اہل تصوف اہل علم کو محجوب جانتے ہیں، اور اہل علم اہل تصوف کو بے علم۔ شاید حقیقت موجودہ وقت ایسی ہی ہو۔ لیکن اس وجہ سے اصل تصوف پر حرف نہیں آتا۔ حرف ہے تو متصوفین پر۔ ان پر لے دے ہو، تو کچھ معنے بھی ہو گا۔ لیکن اصل تصوف پر لے دے کرنا ہمارے نزدیک خود اسلام پر لے دے ہے اور بس۔

خود تصوف بذاتہ وَيُزَكِّيهِمْ (ان کا تزکیہ فرماتے ہیں) کی تفسیر و تعبیر اور اس کے ذرائع و وسائل کے سوا کچھ نہیں۔ مقصود تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنا ہے۔ خواہ کچھ ادھر ادھر بھٹک کر ہی پہنچیں۔ سیدھے راہ چلنے والے اگر منزل مقصود پر دھیان ہی نہ رکھیں، تو پھر وہ کیونکر پہنچیں گے۔ جو راہی راہ کی بھول بھلیوں کو سیر جانتا ہو وہ کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا۔ موجودہ وقت کا علم بھول بھلیوں کے سوا کچھ نہیں، اور اسی بھول بھلیاں میں تماشائی رہنا عقل کے خلاف ہے۔

ص، کتاب و صد ورق در نار کن    روئے خود را جانب دلدار کن

ترجمہ :۔ سینکڑوں کتابیں سینکڑوں کاغذ آگ میں ڈال دے۔ اور اپنا منہ اور توجہ دلدار حقیقی کی طرف پھیر دے۔ یہ ہے تصوف جس کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔

اہل علم ہمیشہ علم کے نقطۂ نگاہ سے حقائقِ قرآنی کو حل فرمانے کی کوشش فرماتے رہے۔ لیکن

پائے استدلالیاں چوبیں بود      پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اہل عقل کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور لکڑی کے پاؤں بہت ہی کمزور ہوتے ہیں اور اس حل کا نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا تھا۔ اور حقائق قرآنی کے عقلی حل دلوں میں نہ بیٹھے ،نہ بیٹھیں گے۔ لیکن اہل دل نے اپنی ایک پاک نظر اور اپنی ایک پاک توجہ سے آن میں تمام شکوک کو رفع کر دیا اور ان کے عقل کا اندھاپن ان کے سامنے کر دیا۔ شک گیا اور یقین بیٹھ گیا۔

یہی حقیقت کبریٰ، ''کہ دنیا دھوکے کا سامان ہے''، کس علم والے کے دل پر بیٹھی ہے اور کون صاحب علم ہے کہ اپنے استدلال سے کسی انسانی ذہن پر یقین کا حال پیدا کر دے۔ لیکن دنیا میں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں مزکی (صاحبِ نظر) کی ایک نگاہ غلط انداز سے دنیا کا صحیح نقشۂ فنا سامنے آگیا اور پھر مرتے دم آنکھوں سے او جھل نہ ہوا۔ یہ ہے فقر اور یہ ہیں اس کی کرشمہ سازیاں۔ باوجودیکہ آج نام ہی نام فقر و تصوف کا رہ گیا۔ پھر بھی طبائع اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں دیکھتیں کہ کسی کے درِ دولت پر جاکر مریں کہ بامراد مرینگے۔ آخر کوئی حقیقت تو تھی، اور کوئی حقیقت ہے۔ ورنہ آج کی دہری دنیا ایک سنانے میں دس سناتی ہے۔ استدلال پر استدلال ہے یہاں تک کہ وقت نکل جاتا ہے اور طبیعت اکھڑ جاتی ہے، اور بے مزہ ہو کر اپنا اپنا راستہ لیتی ہے۔ آج بھی نظر و قلب سے مسلمان کام لیں گے تو کام چلتا رہے گا، ورنہ علم سے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

''بس ہو چکی نماز مصلے اٹھایئے'' کے نعرے ہر طرف بلند ہیں اور بس

Marfat.com

## افادیت نظریۂ حیات قرآنی

یوں تو مختلف مواقع پر کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے، لیکن زیادہ واضح کرنے کے لیے عنوان ہذا کے تحت اتنا اور لکھا جاتا ہے کہ اس نظریۂ حیات نے مسلمانوں کو بے کار نہیں بنایا بلکہ باکار بنایا۔ انہیں بے کاری کی موت نہیں سلایا بلکہ باکاری سے ان کیلئے حیات ابدی کے سرچشمے کھول دیئے۔ موت و زندگی ان کے سامنے برابر ہو گئی۔ موت ان کے لیے جامِ شہادت ہو کر پیش ہوتی رہی اور ہر حصۂ زندگی میں دنیائے عالم سے پیش پیش ہوتے گئے، یہاں تک کہ عالم کے فاتح ہو کر نکلے اور جہانبانی اور جہانداری کے وہ انوکھے طریقے دنیا میں دکھائے، جس سے دنیا پہلے روشناس نہ تھی۔ وہ بے سامانی کو سامان سمجھنے لگے۔ طارق نے اپنے ساز و سامانِ فتح کو آگ لگا کر دنیا کو بتلا دیا کہ بے سامانی زندہ اقوام کے لیے خود سامان ہے، اور اسلام کی نظر میں سامان پر بھروسہ نہیں، صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔

ایک طرف جہاد (جنگ) کے لیے مجاہد اپنی کمر کستے تھے دوسری طرف اپنی بے ساز و سامانی پر نظر رکھتے ہوئے جامِ شہادت کے منتظر ہو بیٹھتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ تاریک زندگی چھوڑ کر ایک پاک زندگی میں داخل ہو دیں، جہاں دنیاوی مال و متاع کے سوا وہ سب کچھ ہو گا جو نہ آنکھ نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا ہے۔

دنیاداروں کا یہ بڑا مغالطہ کہ دنیا ہیچ سمجھنے میں بیکاروں کی دنیا ہو جائے گی، کتنا بڑا مغالطہ ہے کہ یہ ایسا ہی ہے۔۔ جیسے ایک جاہل کہہ دیتا ہے کہ دنیا کو پڑھا کر دنیا کو بیکار بنانے کی پالیسی ہے۔ لیکن اس جاہل کا کیا قصور؟ اس نے واقعی ایسے دیکھا کیونکہ تھوڑا بہت پڑھ کر جب بچے نہ تو کام کرتے ہیں اور نہ ہی نوکری کے قابل ہوتے ہیں تو وہ کیوں نہ ایسا کہے لیکن وہ نہیں دیکھتا کہ جو پڑھ گئے دنیا میں بڑھ گئے اور اعلیٰ مناصب پر جا پہنچے اور اعلیٰ تجارت کے مالک ہو کر دنیا کے خزانے جمع کر رہے ہیں اور اعلیٰ کاشتکاری کے اصولوں پر کاشتکاری سے لاکھوں روپے کما رہے ہیں۔

یہی حالت ہماری پست قوم کی ہے کہ وہ نہیں دیکھتے دنیا میں وہی ممتاز ہوئے جو قوم کے لیے اپنی پیٹ پوجا سے نکل کر اپنی قوم کے لیے مر مٹے۔ اور یہاں حالت اس سے بھی بلند ہے کہ قوم کے لیے نہیں آخرت کی زندگی کے لیے اور مولیٰ کریم کی رضا کے لیے، جس کی رضا دین و دنیا کی فلاح ہے، جس کے اندر کبھی گھاٹا نہ ہوگا۔

قرآن کریم نے جہاں دنیاوی زندگی کی بے اعتباری کا نقشہ پیش کیا وہیں آخرت کی حیات کے ثمرات پیش کیے۔ اسی آیت زیر نظر وَمَا الْحَیٰوۃِ الدَّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ کے بعد فرماتے ہیں سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِنْ رَبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ لوگو! اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف لپکو اور نیز بہشت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا) ہے جیسے آسمان و زمین (ملا کر) دونوں کا پھیلاؤ، اور تیار کرائی گئی ہے ان کے لیے جو خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں (ترجمہ مولوی نذیر احمد)

۱۔ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدَّنْیَا اِلَّا لَعِبٌ وَلَھْوٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ٥

(پ رکوع نمبر ۴ سورۃ انعام)

۲۔ وَذَرِا لَّذِیْنَ اتَّخَذُ وادِیْنَھُمْ لَعِبًا وَلَھْوًا وَغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا ٥

(پ رکوع سورۃ انعام)

۳۔ اَلَّذِیْنَ اتَّخَذُ وادِیْنَھُمْ لَھْوًاوَ لَعِبًا غَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا

(پ رکوع نمبر ۶ سورۃ اعراف)

۴۔ وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَھْوٌ وَلَعِبٌ ٥

(پ رکوع نمبر ۴ سورۃ لقمان)

۵۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا ٥

(پ ۲۱ رکوع نمبر ۷ سورۃ عنکبوت)

۶۔ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغُرُوْرُ ٥

(پ ۲۳ رکوع نمبر ۷ سورۃ عنکبوت)

۷۔ یٰقَوْمِ اِنَّمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَ اِنَّ الْاٰخِرَۃَ ھِیَ دَارُ الْقَرَارِ ٥

(پ ۲۴ رکوع نمبر ۱ سورۃ مومن)

Marfat.com

## اہل تصوف

کوئی سالک جب اپنے فرمودۂ شیخ پر کثرت ذکر و کثرتِ عبادت پر اتر آتا ہے اور متواتر روزوں (بھوک) سے سینہ پاک کر لیتا ہے تو انفاق فی سبیل اللہ کے جذبہ سے معمور ہو کر اپنا مال و دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے۔ تو اللہ کریم اس کے اعمال میں نورانیت پیدا فرما دیتے ہیں اور یہ نورانیت قلب سالک کو منور فرمانا شروع کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا سے کامل بیزاری ہو جاتی ہے اور دنیا اسے بُری معلوم ہونے لگتی ہے، اور جو مولا کریم نے حیاتِ دنیا کی تعریف کا بیان فرمایا ہے اس سے پار نکل جاتا ہے، اور اَلدُّنْیَا جِیفَةٌ وَطَالِبُهَا کِلَابٌ کی حقیقت اس کے سامنے آجاتی ہے تو اس وقت وہ تمام علائقِ دنیا اور دنیا سے الگ ہو کر جلوۂ الٰہی اور دیدار الٰہی کی تڑپ میں گنگناتا ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی   اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش پر آتی اور اپنے جلوے قلبِ سالک پر ڈالنے شروع کر دیتی ہے اور لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِی فِیهِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ (الحدیث) کے مطابق ہمہ تن جلوہائے الٰہی میں غرق ہو جاتا ہے تو اس وقت سالک یا صوفی نمونہ رسالت مآب ﷺ کے مطابق بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِهٖ توحید کے انتہا تک پہنچتا ہے، کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِهٖ پھر اس کے چہرے مہرے کے انوار سے کفر و ضلالت کے اندھیرے پھٹ جاتے ہیں، حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ اور اس کی تمام عادتیں اور خصلتیں بھلی معلوم ہوتی ہیں صَلُّوا عَلَیْهِ وَ آلِهٖ تو ساری دنیا اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے سلامتی اور رحمتیں اللہ تعالیٰ سے طلب کرتی ہے۔

آیت نور جس کی تفسیر میں علم والے حیران نظر آتے ہیں اور جس کی تفسیر و تاویل میں عقلیں عاجز ہیں صوفی بعینہٖ اس کی تفسیرِ حیاتی ہو نکلتا ہے، ہو بہو نور الٰہی کی طرح دنیا پر نور الٰہی کے انوار ڈالتا ہے اور دنیا اس کے مشعلِ قلب و بشرے سے ہدایت پاتی ہے اور نور الٰہی کی طرف دوڑتی ہے۔ (جنوری ۱۹۶۵)

# کیفیات

کیفیت حال کا نام ہے جب کسی عمل سے ایک خاص قسم کا حال پیدا ہو مثلاً کسی کام سے خوشی، اور کسی کی موت پر غم۔ اس حال کو کیفیت کہتے ہیں۔

راہ محبت میں جب آتشِ محبت بھڑکتی ہے اور اس آتش محبت سے سوز و ساز کی حالت پیدا ہو، تو اس حالت کا نام راہ سلوک میں کیفیت ہے۔

محبت کوئی بھی ہو، وہ سوز و ساز سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن طبائع کے اختلاف سے کسی کا سوز و ساز بلند ہوتا ہے، اور کسی کا دھیما۔ محبت کی آتش ختم ہو جائے تو سوز و ساز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب محبت گرما گرم ہوتی جائے، تو سوز و ساز بڑھتا جاتا ہے۔

اور بعض وقت تو یہ سوز و ساز جنوں کے درجہ پر پہنچ کر جنون پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت وہ کیفیتِ محبت ختم ہو جاتی ہے، اور دل کا نقشہ کلیتہً بدل جاتا ہے۔ اور جنون اپنے جنون میں صاحب جنون کے افعال و حرکات کو مجنونانہ کر دیتا ہے۔ اس وقت کچھ سینہ میں نہیں رہتا۔

جس انسان کے دل میں محبت نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ محبت کئی اقسام کی ہے۔ انسان کی محبت انسان کے ساتھ، انسان کی محبت جانور کے

Marfat.com

ساتھ، اور انسان کی محبت خدائے حق کے ساتھ۔ لازوال کی محبت لا زوال ہے۔ صاحب زوال کی محبت کتنی بھی پختہ ہو، آخر زوال پذیر ہوتی ہے۔ اسی طرح جانور کی محبت کا درجہ اور کم ہو جاتا ہے۔

اغراض کا تخم بھی محبت ہے۔ لیکن یہ گھٹیا قسم کی محبت ہے۔ اصل میں محبت اس انس کا نام ہے جو فطرتاً بلا کسی غرض و غائت ہو۔ جیسے حسین کی محبت، کہ اس میں ایک خاص ذوق ہوتا ہے اور آنکھ سے محبت پھوٹتی ہے۔

اس محبت کا نقشہ کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ دنیا و مافیہا سے اہل محبت جدا ہو بیٹھتا ہے، اور رات دن اس کے سوز و ساز میں سرشار رہتا ہے۔ محبوب سامنے ہو یا نہ ہو، نہ فراق میں آرام ہے، نہ وصل میں سکون۔ یہ سوز و ساز ہی حقیقتاً زندگی ہے، جسے نصیب ہو۔

اہل دل جو اپنا سینہ خدائے قدوس کی محبت سے بھر ا رکھتے ہیں، جب ان کی نگاہ کسی کے چہرے پر نہیں بلکہ دل پر پڑ جاتی ہے، یا کسی کی نگاہ اس چہرۂ مبارک سے شرف حاصل کرتی ہے، تو جس دل کے اندر تخمِ محبت ہوتا ہے، وہ فوراً پھوٹ اٹھتا ہے، یا اس مادۂ محبت کو آگ لگ جاتی ہے اس وقت دل گرم ہو جاتا ہے اور خدائے قدوس کی لگن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ میری محبت الٰہیہ بھڑکے۔ اس وقت وہ اس مردِ خدا کے قدموں پر سر رکھتا ہے اور اسے اپنا مرشد بناتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طریقہ سے اس کی محبت بھی اپنا رنگ لائے اور راہِ ہدایت پر قدم زن ہو۔

سالک اپنی طبعی محبت اور مربی کی توجہ سے ذکر شروع کر دیتا ہے، اور متواتر ذکر۔ جیسے چکروں سے بجلی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح ذکر کثیر سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو سالک کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے، جس سے سالک ہر آن اور ہر گھڑی منزل مقصود کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ گرمیٔ محبت کم ہوتی جائے، تو کیفیت بھی لازماً کم ہو گی۔ اور کیفیت کم ہونے سے حرکتِ ارتقائے منزل بھی کم ہوتی جائے گی، قدم سست ہوتے جائیں گے۔

Marfat.com

اس وقت مربی اپنے خزینۂ محبت سے پھر ایک داغِ محبت دے کر راہ رو ہدایت کے قلب کو گرمادے گا، اور ذکر بدستور تیزی سے شروع ہو جائے گا، اور کیفیت بلند ہوتی جائے گی۔

بعض وقت سالک کی استعداد بلند ہوتی ہے۔ یعنی اس کے دل میں محبت کا جوہر زیادہ ہوتا ہے۔ اگر مرشد بلند طبیعت سے واسطہ پڑ گیا تو آتش محبت زیادہ ہو کر بعض سالک کے حالات تیز بتیز بدلتے ہیں۔ اور بعض وقت جیسے بتی کی روشنی اور شعلہ جب بہت بلند ہو جاتا ہے، تو لالٹین کی تمام بتی کو آگ لگ کر تیل کو آگ لگ جاتی ہے۔ اس وقت یا تو اسے بجھانا پڑے گا، یا شعلہ اتنی تیزی پکڑ جائے گا کہ شیشہ چور چور ہو جائے گا، اور لالٹین بجھ جائے گی۔

بیٹری کی جب رو چھوڑی جاتی ہے، تو ریڈیو کے والو روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن رو سست ہو، تو آواز نہیں پکڑتے۔ لیکن جب زیادہ روشن ہو جاویں تو آواز بگڑ جاتی ہے۔ والو کے روشن کرنے کا مقصد سٹیشن کی آواز لینا ہے، صرف والو کو روشن کرنا مقصود نہیں۔

اسی طرح سالک کے لطائفِ سبعہ کا روشن کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ ان کے روشن کرنے سے مقصود بالذات معرفت الٰہیہ ہے، جو مشاہدہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ غرض مقصود ذکر و فکر اور لطائف کے روشن کرنے سے ذات اقدس کے جمال و جلال کا مطالعہ ہے۔

جو سالک لطائف کے روشن ہونے کو معرفت خیال کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے موٹر کا پڑول چھوڑ دیا جائے، اور مشین حرکت میں آجائے، لیکن باڈی کا اتصال نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی اپنی جگہ پر رہے اور مشین دھڑادھڑ چلتی نظر آئے۔ یہی حال موجودہ صوفیت کا ہے۔ ذکر اور لطائف پر دھیان ہے اور انہیں ہی مقصود بالذات خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ سو ایسے حال میں خدا کا فضل ہی شامل حال ہو تو قدم آگے نکلے ورنہ وہ ہمیشہ اسی خیال میں محو رہے گا کہ جو کچھ حاصل

کرنا تھا حاصل ہو چکا۔

جیسے پہلے لکھا گیا ہے۔ لطائف کی روشنی بھی ایک خاص قسم حد تک نہ پہنچے تو قدم آگے نہیں اٹھتا۔

بھٹے کی۔ بھٹی کی آگ کا تاؤ جب ایک خاص معیار پر نہ آئے، جسے تاؤ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، بھٹی پختہ نہیں ہوتی خواہ کتنے دن ہی آہستہ آہستہ آگ جلتی رہے۔

گاڑی کا جب تک ویکم صحیح نہ ہو اس وقت تک گاڑی کیسے چلتی ہے۔ کوئلہ جب تک گیس نہ دے اس وقت تک پوری حرارت قائم نہیں ہوتی۔

لیمپ اس وقت روشن تر ہوتا ہے، جب تیل گرمی اور ہوا سے گیس ہو کر روشن کرے۔ گرمی یا ہوا کا دباؤ کم ہونے سے تیل کا گیس ہونا بند ہو جائے گا، تو اس وقت تیل دھواں بنے گا اور شیشہ سیاہ ہو جائے گا۔ بعینہٖ یہی حال ہمارے سالکین کا ہے۔ کچے تیل کی طرح ان کا ناپختہ ذکر روشن کرنے کی بجائے ان کے دل کو زنگ دینا شروع کرتا ہے، اور کیفیت بلند ہونے کی بجائے گرنی شروع ہو جاتی ہے۔

بھٹی کی آگ اگر سرے کا راہ نہ لے، یعنی دھواں اوپر سے نہ نکلے، اور آگ کا دھواں بند ہو جائے، تو آگ سرے کی طرف جانے سے رک جاتی ہے۔ اس وقت بھٹی والا کسی تدبیر سے سوراخ کھول دے، اور آگ کو اٹھنے کا موقع دلا دے تو آگ چوٹی سے جا نکلے گی، ورنہ چولہے میں پھرتی رہے گی اور اینٹ کسی صورت میں بھی پختہ نہ ہو گی، اور اوپر کا حصہ سارا کچا رہے گا۔ اس لیے ایک تو سالک اپنے ذکر کو برابر جاری رکھے اور ساتھ ہی مربی اپنی نظر سے اس کے سوراخِ دل صاف رکھے۔ تاکہ ذکر ذاکر اٹھ کر اپنی راہ لے، اور معرفت کی طرف قدم اٹھے۔

جس گاڑی میں پٹرول نہ ہو، یا پٹرول گیس نہ بنے، وہ گاڑی کسی صورت میں ایک قدم بھی چل سکتی ہے؟ نہیں۔ ہر گز نہیں۔ یہی حال سالک کا ہے...... جب ذکر سے کیفیتِ ذکر نہ اٹھے۔ اس وقت سالک کا کوئی قدم بھی معرفت الٰہیہ کی طرف نہیں اٹھتا۔ جو کچھ ہے کیفیت ہے۔

Marfat.com

بعض علمائے کرام جب یہ کہتے ہیں کہ کیفیات کی اس راہ میں کوئی حقیقت نہیں بلکہ سراسر عمل ہی عمل ہے، تو حیران رہ جاتا ہوں۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ہو گا، وہ کیفیات ہی کی بدولت ہو رہا ہے۔ سو کارخانۂ الہٰی کا گیس کیفیاتِ مختلفہ چلا رہی ہیں۔ پھر کیسے راہ ہدایت کے لئے کسی کیفیت یا کیف کی ضرورت نہیں۔

کیف یا کیفیت ہی راہِ عمل کے لیے بیتاب ہوتی ہے۔ کیف عمل پیدا کرتا ہے۔ جیسے عمل سے کیف پیدا ہوا تھا، اسی طرح یہ کیف عمل سے پیدا ہو گا۔

بے ذوقی اور بے کیفی سے جو عمل ہوتا ہے، وہ بے ثمر ہوتا ہے اور بے مزہ۔ اس کی حالت زیادہ نہیں رہتی، چند روز کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں وہ کیفیات جو عمل پیدا نہ کریں، وہ کیفیات بے ثمر کسی کام کی نہیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

مراقبہ میں کیف ہے لیکن نماز میں نہیں۔ کیوں! اس لئے کہ مراقبہ کو مقصود سلوک خیال کیا گیا تھا۔ اگر مراقبہ ذریعہ خیال کیا جاتا تو نماز میں دس گنا لطف حاصل ہوتا، اور نماز عبودیت کا مظہرِ اتم نظر آتی۔

عملِ بے ذوق کس کام اور ذوق بے عمل کی کیا قیمت؟ لیکن جب سالک ان تمام مراحل سے گزر کر ہمہ اوست ہو جائے تو پھر نہ کیفیت ہے، نہ بے کیفی۔ ہر خیال ہر فکر خود عمل ہو جاتا ہے۔ اور یہ دنیائے خیال سراسر دنیائے عمل ہوتی ہے۔

ہاں جب ذوق اور بے ذوقی، عمل اور بے عملی سے انسان نکل جائے، تو پھر ہر خیال ہر فکر عمل کا رنگ دنیا میں پیدا کرتا ہے۔ سو خود بے عمل بے ذوق نظر آتا ہے۔

عشق و عقل کی جنگ سے کون واقف نہیں۔ لیکن اس راہ میں ان کے اکٹھے چلنے چلانے سے منزلیں طے ہوتی ہیں۔ عشق بے راہ تباہی لاتا ہے، اور عقل دیدہ ور جہاں تک ہو سکے مہالک میں چلنے سے بھاگتا ہے۔ اس لیے جب تک ان کا جوڑ نہ ہو، انسانی زمین کی کاشت ناممکن ہے۔ جب یہ اکٹھے ہو کر چلتے ہیں اور ذکر کی گرمی ان کو پگھلا

Marfat.com

کر روحانی لطیف کیفیت میں تبدیلی نہیں کرتی، اس وقت تک قدم نہیں اٹھتا۔ لیکن جب یہ لطیف کیفیات پیدا ہو کر فوارۂ دل سے نکلنی شروع ہو جاتی ہیں اور گرمیٔ قلب زیادہ سے زیادہ ہوا دینے لگتی ہے، تو پھر یہ کیفیات زمین و آسمان میں نہیں سما سکتیں، اور اس فضا سے نکل کر ملکوتی فضا میں داخل ہو جاتی ہیں، اور وہاں سے برابر اڑتی حریم ناز کے آستانہ پر جا پہنچتی ہیں، اور پھر آستانۂ عالیہ کے حاشیہ برداروں کی طرح ہمیشہ اسی آستانہ کی ہو جاتی ہیں اور واردات الٰہیہ اور احکام الٰہیہ کی منتظر ہمیشہ رہتی ہیں۔ یہی کیفیات جب سالک میں جوش کھاتی ہیں، تو وہ نقوش زندگی (آواز، تحریر) میں آجاتی ہیں۔ اور وقت وقت کے مطابق کیفیات اپنا روپ بدلتی رہتی ہیں۔

چند کیفیات کا نمونہ پیش کر دیا جاتا ہے تاکہ فہم طبع میں آسانی ہو۔

جو سر دتیاں راقب ملے اوہ پیارا
بڑا ستا سودا خریدار نوں ہے

☆☆☆

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

☆☆☆

جو سر ہتھیلی پہ رکھ نہ سکے وہ ہماری گلی میں آئے کیوں
جو طعنے جگت کے سہہ نہ سکے وہ پریتم پر یت لگائے کیوں

☆☆☆

میری آس امید دی دنیا اندر تیری یاد دا دیوا بلدا رہے
اے محبوباں دیا محبوبا ایہہ سارا ای چانن تیرا اے

(اکتوبر ۱۹۶۲)

Marfat.com

# ذکر

محبت کی بھٹی میں جب عقل چڑھتی ہے، اور جوشِ ذکر سے وہ چکر کھانے لگتی ہے تو عقل کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور صاحبِ عشق و محبت آزادانہ اڑتا ہے، تمام حدود عقلیہ توڑ دیتا ہے، افلاک سے بڑھ کر عرش مجید کے کنگرہ پر جابیٹھتا ہے اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو پہلے اس کے گمان ووہم میں بھی نہ آیا تھا۔ عقلی بندشیں اور گرہیں ایک ایک کر کے کھل جاتی ہیں۔ اس وقت زبان حال سے پکار اٹھتا ہے سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ اور وہ حقیقت تمام عیاں ہو جاتی ہے، جس کے بیان سے، بیان عاجز ہے۔ اور کارخانہ قدرت پر رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًاo بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا ہے اور سجدۂ الٰہی میں گر جاتا ہے۔ وہ وقت ہوتا ہے جب مشاہدۂ الٰہی کے انوار قلبِ سالک پر وارد ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور سالک کمالِ عبودیت میں آکر اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ کی حقیقت سے سرفراز ہوتا ہے اور نماز ہی اس کے لیے قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ ہو جاتی ہے۔

ذکر ایک یاد ہے اور بس! اور اس یاد کے قائم کرنے کے لیے ذکر، سالک کو بتلایا جاتا ہے۔ اور جب یہ ذکر، پختگی میں آجاتا ہے تو پھر بھی یاد ہے اور بس عبودیت

Marfat.com

نہیں۔ ہاں! عبودیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے یہ ایک ''زینہ'' ضرور ہے۔ لیکن کوئی اگر اسی پر اکتفا کر بیٹھے، تو پھر زینہ ہی زینہ ہے۔ جنہیں ملتا ہے، وہ ابھی حجاب میں اور وہ اپنی کرسی الرَّحمٰنُ عَلیَ الْعَرش اسْتَوٰی پر جلوہ گر ہیں۔

لیکن جب فضلِ الٰہی دیکھتا ہے کہ یہ میرا بندہ درِ مولیٰ پر ایک مدت سے منتظرِ رحمت اور ہماری یاد میں تازہ دم ہے، تو دوسرے قدم پر چڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرض وَاخْتِلاَفِ اللَّیْل وَالنَّھَار لَاٰیَاتٍ لِاُ وْلِی اَلْاَلْبَابِ اَلَّذِیْن یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَ قُعُوْدًا وَعَلٰی جُنُوْبِھِم

دیکھیے۔ فرماتے ہیں جو لوگ اٹھتے بیٹھتے سوتے ہمارا ذکر کرتے ہیں (اس سے نماز مراد نہیں کیونکہ جُنُوْبِھِمْ کا خاص لفظ موجود ہے) تو ان کے لیے خلق زمین و آسمان اور دن رات کے پے در پے آنے میں بڑے نشانات موجود ہیں۔

ذکرِ کثیر پر نشاناتِ الٰہیہ کا کھلنا ضروری ہے۔ اور وہ نشاناتِ الٰہیہ کیا ہیں؟ وہی مظاہرِ قدرت اور ان کا مطالعہ۔ جب یہ مطالعہ اور یہ مشاہدہ سَنُرِیْھِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِی اَنْفُسِھِمْ مکمل ہو جاتا ہے۔ تو ظہورِ حق کی جلوہ آرائی شروع ہو جاتی ہے حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ۔ پھر کیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر دکھائی دیتا ہے اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ شَھِیْدٌ کیا تجھے ہر چیز پر خدائے قدوس کا مشاہد ہونا تیرے ایمانِ مشاہدی کے لیے کافی نہیں؟ یعنی کافی ہے۔ یہی حقیقت (بیان) ''آیۃ خلق'' میں بھی فرمائی جاتی ہے۔ لیکن بالفاظ بندہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا، کہ میرے رب یہ کچھ تو نے بیکار پیدا نہیں کیا۔ اس کے بعد علمی مشاہدہ میں سالک داخل ہو جاتا ہے اور اپنے منہ سے بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ سُبْحَانَکَ اے اللہ تو پاک ہی پاک ہے۔ لیکن ایک عرض ہے کہ ہمیں آگ سے بچائیو۔ (نفسی آگ ہو، شیطانی آگ ہو یا دوزخ کی آگ ہو) غرض ہر آگ سے بچائیو۔ پھر بندہ مناجات الٰہیہ

Marfat.com

میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہ مناجات عبودیت مطلقہ ہے اور وہ کیفیات ہیں، جن پر عبودیت ختم ہوتی ہے۔

خود سوچیے اور غور سے مطالعہ کیجیے۔ اس لیے لکھا گیا ہے۔ نماز عبودیتِ مطلقہ کی مظہر اتم ہے۔ اس میں وہ تمام صفات آجاتی ہیں، جو دنیا کے سالک سے لے کر اللہ کے سالک کی کیفیات ہیں۔ اور نماز ہر کیفیت کا تخم اپنے اندر رکھتی ہے۔

جب انسان یا سالک کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر یہ ہی دولت حاصل ہوتی ہے، جس میں تکمیل ایمان ہے، اور مطلوب و مرغوب ربِ العزت ہے۔ اس کی حقیر اور اشرفِ مخلوقات صفت و ثنا کے بعد اس سے تناجی کرے اور کہے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلوٰۃُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَینَا وَعَلٰی عِبَادِاللّٰہِ الصَّالِحِینَ۔ سبحان اللہ، انسان غافل کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ وہ خود حاضر، اور اس کا رسول حاضر، اور اس کے بندے حاضر، اور سراسر طلب ہی طلب ہے۔ اور وہ کیسے جامع الفاظ میں کہہ رہا ہوتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَینَا وَعَلٰی عِبَادِاللّٰہِ الصَّالِحِینَ۔ یہ ایمان اور ایمانِ مشاہداتی کی حقیقت ہے۔

دوستو! خیال کیجیے۔ کہاں صرف اللہ اللہ سے یاد اور کہاں یہ قربِ حقیقی۔ ایک طرف بندہ ہے اور دوسری طرف خدائے ذوالجلال۔ اور محبت کی گفتگو ہے، جو سراسر عبودیت کے اظہار کے لیے ہے اور کچھ نہیں۔

اس دولت کو وہی جانتے ہیں، جنہیں اُولُو الْاَلبَابِ (عقل والے) کہا گیا، اور جو صاحب عقل نہ رہے، وہ بھلا اس "دولت" سے کیا حصہ پائے۔ وہ ایک یاد ہے یاد۔ پھر یاد میں بھی جب لذت ہو، تو یاد بھی دولت ہے۔ لیکن یاد بھی جب یاد تک رہے اور اس سے ترقی نہ کرے، سوز و ساز پیدا نہ ہو، تو "بے لذت یاد" کس کام کی۔

اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ ہر عمل کے لیے ذوق و شوق اور کیف و حال کا تخم ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ تخم نہیں تو پھر کوئی عمل بھی ثمر آور نہیں ہوتا۔ مشہور ہے "نیت ثمرہ نیست، تخم است" اور نیت کیا ہے۔ وہی شوق و ذوق عمل۔

Marfat.com

میرے محترم! میری اس مختصر تحریر سے میرا مطلب واضح سمجھ گئے ہوں گے کہ اسلام صرف عمل کا نام نہیں بلکہ ایمان کا تخم ہونا ضروری ہے، اور ایمان کا لفظ ایمان پیدا نہیں کرتا۔ ایمان تو یقین اور محکم یقین کا نام ہے۔ اور ''محکم یقین'' اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مشاہدہ ہو۔ مشاہدہ کے بغیر ایمان انسان کی تکمیل ناممکن ہے۔ ہاں تقلیدی ایمان بھی کامل ہوتا ہے۔ جب مشاہدی ایمان والے پر کامل یقین ہو اور اس کے مشاہدات پر بھی کامل یقین ہو۔

اصل مقصودِ تحریرِ ہذا تو یہ تھا، کہ کیفیت کی خلقت (پیدائش) کا تجزیہ دکھایا جاوے، کہ نہ تو صرف ''محبت'' کی آتش سے کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ گو محبت کی آتش اور سوزش ایک گونہ کیفیت ہوتی ہے۔ وہ کیفیت دل سوز تو ہے لیکن اس میں پرواز کی طاقت نہیں، جو اڑ کر کہیں سے کہیں جا نکلے۔ لیکن محبت کے ساتھ ''عقل تیز'' شامل ہو تو پھر کیفیت اتنی بلند ہوتی ہے جتنی عقل بلند ہوتی ہے۔

جن کاملین نے محبت کے دریا بہائے اور جن کا ذکرِ خیر دنیا میں پھلتا پھولتا آپ دیکھتے ہیں، یہ وہی حضرات ہیں، جن کی عقل تیز اور بلند نے یہ کرشمے دکھائے اور محبت کا صور دنیا میں پھونک کر گئے۔ مرے کیا، بلکہ زندہ ہوئے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اگرچہ اس سے بڑھ کر اہل محبت آئے اور گئے۔ لیکن ان کا نام تک نہیں

گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے ا؎

پرواز کی طرح اٹھے اور شعلۂ چراغ پر جان دے گئے۔

غرض یہ ہے، کہ محبت کے ساتھ عقل کی شرکت بلند ہمتی کے لیے ضروری ہے اور یہ راستہ اسی وقت طے ہوتا ہے، جب سوز کے ساتھ ساز بھی شریک ہو۔ سوز، محبت کا کام ہے اور ساز عقل کے کرشمے ہیں۔ اقبالؒ کیا خوب کہتے ہیں ؎

کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی (۲)

Marfat.com

سوز و ساز کے مقابل، پیچ و تاب ہے۔ اس میں عقل تو بہت ہے لیکن سوز کم، پیچ ہی پیچ ہیں۔ اس میں وہ کیفیاتِ محبت کہاں، جو رومی کے دل سے موجِ دریا کی طرح اٹھیں اور دنیائے محبت کو اپنے اندر جذب کر گئیں۔

وہ سالک جو عقل میں کم ہوتے ہیں، ان کا نقطۂ نظر اور مقصد بلند نہیں ہوتا۔ وہ صرف ذکر کو مشاہدۂ الٰہی خیال کرنے لگتے ہیں، اور لطائف کے روشن ہونے کو معرفتِ حق خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے (کہ) ان کے روشن ہونے سے کیا فائدہ؟ جب ان کے اندر "وہ" نظر نہ آیا۔ آئینہ جمال کو صاف کر دیا۔ اور وہ صاف ہے۔ لیکن جب تک اپنا چہرہ یا کسی ماہ رو کے چہرے کے عکس اس کے اندر نہ آئے وہ کس کام!۔

لطائف کے روشن ہونے پر جب دِل مصفی صیقل ہو کر مشاہدے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، تو اس وقت پہلے اپنا نفسی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس نفسی حقیقت کے کھلنے کے بعد سرکار والا تبار (۴) کی جلوہ آرائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر کبھی خود غائب۔ کبھی وہ غائب۔ کبھی دونوں اکٹھے۔ یعنی ایک نہ ایک حقیقت تو ضرور سامنے ہو گی۔ جب وہ موجود اور یہ غائب، تو سالک اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور اسے سراسر وہی نظر آتا ہے۔ مجاذیب اسی صورت سے پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن جب وہ غائب اور خود موجود ہو کر جلوہ دیتا ہے۔ تو اَنَا الْحَقّ کے نعرے لگنے شروع ہو جاتے ہیں...... لیکن جب وہ اور خود موجود یعنی بندہ، بندہ اور حق، حق نظر آتا ہے۔ تو یہ ہیں کمالات نبوت اور اس کے انعکاس

"تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں"...... کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ پہلے تو صرف یادِ خدا تھی۔ اب یاد کے ساتھ مشاہدہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ پھر اس یاد سے جو لطف آتا ہے وہ اکیلی یاد سے کہاں حاصل ہوتا ہے...... وہ یاد دہی یاد نہیں، یاد کے ساتھ حاضریٔ دربار بھی ہے۔

Marfat.com

بعض وقت حاضری پر، یاد نکل کر حیرت آجاتی ہے۔ وہ وہی جذب ہے، اپنی ہستی کا پتہ نہیں استغراق ہے۔ حیرت ہے۔ لیکن اس "حیرت" میں وہ کیفیاتِ مشاہدہ کہاں، جب وہ اپنی یاد کے ساتھ ہوں۔ لطفِ وصال اسی وقت ہوتا ہے۔ جب دوئی سے اتصال ہو۔ اگر "دوئی" نہ رہے تو "اتصال" کے کیف کہاں ہوں گے۔

بہر صورت حقیقتاً معرفت کاملہ وہی ہے، جب مراحلِ نفسی سے گذر کر حقیقتِ کبریٰ تک سالک پہنچے۔ اور پھر رجوع الی الحق کی صورت اپنی کھوئی ہوئی ہستی میں بندہ جلوہ گر ہو کر مشاہدۂ حق میں غرق رہے ..................!!!

استعداد باطنی کا مدار ان باطنی کوائف پر ہے، جن کو بیان کیا گیا۔ ولایت اور آثارِ ولایت، طریقت اور اہل طریقت کا تمام مدار کیفیات کی شدّتِ گرمی اور ان کی کمزوری اور نرمی پر ہے۔ جیسے کیفیات ہوں ان کے مطابق ظہور و آثارِ کمالات ہوں گے۔!

## حواشی

۱۔ نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

۲۔ اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

(جنوری ۱۹۶۳ء)

Marfat.com

# مرعوبیت

طریقت کے اندر خداشناسی نہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی مرعوبیت پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے طریقت کے عقائد میں تزلزل پیدا ہوگیا ہے اور صوفی اپنے اصول سے ہٹ رہے ہیں۔

افکار جب پختگی پکڑتے ہیں اور عقیدہ کی صورت میں ڈھلتے ہیں تو عزائم میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ موت قبول ہوتی ہے لیکن اپنے خیال و عقیدے سے ہٹنا مشکل ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے۔ لیکن جب اس عقیدہ میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس عقیدہ سے ہٹنے کے لیے ایک معمولی بہانہ تلاش کر لیا جاتا ہے اور اپنے خیال کے برخلاف عملاً کاروائی شروع ہوتی ہے۔

"عرس" کیوں جلسے بنائے جارہے ہیں؟ سب سے پہلے تو وہی بات کہ صوفیت اپنے عقیدہ خداشناسی سے محروم ہو رہی ہے اور اس تک پہنچنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ دوسرے علماء کرام کی بے پناہ تنقید سے رسمی عقیدہ جو کچھ بچا بچایا تھا وہ بھی گر رہا ہے جس کی وجہ سے صوفیت اپنے اعمال و اشغال سے خود بخود ہٹتی جاتی ہے اور ناقدین کی رو میں بہہ رہی ہے۔

Marfat.com

مثلاً ذکر و فکر طریقت کے اولیات میں سے ہے اور قرآن کریم کی آیات سے محکم بلکہ محکم تر، لیکن علمائے کرام کی متواتر تنقیدوں سے اب صوفی اپنے اس عقیدہ پر کہ ذکر کے سوا اس راہ تک وصولی ناممکن ہے، ہٹ رہا ہے اور عملاً قدیم سلسلے کی روایات نسبتاً بہت کم باقی ہیں۔ بچپن میں میں دیکھتا تھا کہ ہر گاؤں میں ذاکرین تھے اور وہ بھی چشتی سلسلہ کے عام ہونے کی وجہ سے سر شام اور صبح سویرے ذکر کی لے چل جاتی تھی۔ گاؤں کے ایک ایک فرد تک لا الہ الا اللہ۔ یا اللہ، یا اللہ۔ اللہ ھو، اللہ ھو۔ کی آوازیں کانوں تک پہنچتی تھیں اور دنیائے عالم کو بیدار کر دیتی تھیں اور یہ آوازِ محبت اتنی پر اثر ہوتی تھی کہ کافر و ملحد بھی رام رام کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن اب سالوں گزر جاتے ہیں، کسی طرف سے یہ دلربا آواز کہیں سنائی نہیں دیتی۔ پھر اگر کوئی عمل اس کی جگہ نعم البدل چھوڑ صرف بدل بھی پیدا ہو جاتا تو شاید طریقت اپنا دم نہ توڑتی۔ لیکن اصولی طور پر کوئی بدل یا نعم البدل پیدا نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ لوگوں میں عام غفلت پیدا ہو رہی ہے اور وہ اطمینانِ قلب جو صوفیائے کرام کی خاص صفت تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے والا ایک آن میں یکسو ہو جاتا تھا اور مطمئن دل لے کر واپس آتا تھا، گم ہو چکی۔ اب خود صوفی اس گھن چکر میں ہے کہ سراسر کھانے پینے میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات خود اسے شرم آتی ہے کہ دنیا تو میرے گرد سکون کے لیے چکر لگا رہی ہے، اور میں خود چکر میں ہوں لیکن یہ سوچنے میں نہیں آتا کہ سلف کس طرح سے پر سکون زندگی بسر کر گئے؟ صرف خود ہی سکون حاصل نہیں کیا بلکہ دنیائے اسلام کو سکون کیسے دے گئے؟

ایسی صورت میں "مرعوبیت" طریقت پر نہ چھائے تو کیوں کر؟ بلکہ میں تو صاف کہوں گا کہ عوام و خواص پچھلے عقیدے کے مطابق جنہیں آب حیات خیال کرتی ہے، وہ خود اس آب حیات کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ لیکن اتنی نظر اور توجہ اس طرف نہیں پھرتی کہ وہ دنیا میں سب کچھ طلب کر رہے ہیں۔ لیکن اگر تلاش نہیں اور طلب نہیں تو صرف ایک خدائے لایزال کی، جو سرچشمۂ حیاتِ عالم ہے، جس کے ایک کن

Marfat.com

نے دنیا کو پیدا کر کے عالم رنگ وبو سامنے کر دیا۔

لیکن جو گروہ اپنے اصولی عقیدے کھو بیٹھا ہو اور باہر سے بھی عام تنقید ہو رہی ہو، بھلا وہ اپنے اعمال واشغال جاری رکھ سکتا ہے؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فقر انفرادیت ہے اور اجتماعیت سے فقر بھاگتا ہے۔ اس لیے یہ اسلام نہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ انفرادیت نے اجتماعیت پیدا کی، یا اجتماعیت نے انفرادیت کو جنم دیا؟

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

(اقبال)

ذرا اس مسئلے پر غور کیا ہوتا، تو ان کے سامنے آجاتا کہ ہر مذہب انفرادیت سے پیدا ہوا ہے اور اس انفردیت نے ایسی اجتماعیت پیدا کی کہ زمانے پر زمانہ جار ہا ہے اور ہر قسم کے انقلاب قومیت آرہے ہیں لیکن ابھی تک اس انفرادیت کا اجتماعی دھاگا (خیال) ٹوٹنے میں نہیں آتا۔

ہزاروں نہیں لاکھوں کوششیں ہو رہی ہیں۔ اندر اور باہر سے حملے ہو رہے ہیں لیکن ملت ختم ہونے میں نہیں۔

عیسائیت، یہودیت اور اسلام پر کتنے زبردست ذور آئے۔ لیکن اجتماعیت ابھی تک جوں کی توں قائم ہے۔ گو عقیدۂ اس اجتماعیت میں دراڑیں اور شگاف پیدا ہو رہے ہیں اور باہر سے بھی ان پر حملے ہو رہے ہیں لیکن مضبوط چٹانیں بدستور قائم نظر آتی ہیں۔ اب دوسرے پہلو پر کوئی اجتماعیت ایسی دکھائی جائے جس نے انفرادیت کو مکمل کیا ہو۔ بلکہ وہ اپنی اجتماعیت کے مکمل کرنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے اور پھر دوسری اجتماعیت کے سامان پیدا کرنے میں افراد لگ جاتے ہیں۔ تا آنکہ زمانہ گزر رہا ہے۔ ابھی تک کوئی اجتماعیت اپنی پوری قدو قامت میں نہیں آئی جو صدیوں قائم رہے بلکہ ہر روز ایک رنگ آتا ہے اور دوسرا جاتا ہے۔

Marfat.com

میں حیران ہوں کہ کوئی دوسرا تو اس انفرادیت پر اعتراض کرے، لیکن کسی صاحب مذہب کو کیا حق ہے کہ وہ کامل انفرادیت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے۔

ہر صاحب مذہب کیا تھا؟ انفرادیت تھی یا کچھ اور۔ اور پھر اس نے اپنی انفرادیت کی تکمیل کے لیے کیسے تخلیے کیے، کتنا دنیا سے الگ رہا۔ لیکن جب وہ انفرادیت تکمیل کو پہنچی، اس نے اتنی ہی بلند اجتماعیت اپنے دل سے پیدا کی۔ غرض جتنی تفرید تھی اتنی ہی تجمیع (اجتماعیت) اس نے پیدا کی۔

یہی مذہب کا دنیاوی فلسفہ ہے۔ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، نہ تو وہ اپنی عقل سے سوچتے ہیں اور نہ ہی اقوام و ملل کا مطالعہ سامنے رکھتے ہیں۔ ایک پراگندہ خیالات لے کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جو کچھ منہ میں آتا ہے کہے جاتے ہیں۔

فرد سے قوم تک پہنچا جاتا ہے۔ ذرّے سے زمین بنتی ہے نہ کہ زمین سے ذرّے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آج بھی انفرادیت کی تکمیل کا اصول پیش نظر ہو تو تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ حقیقتاً دنیا کی بنیاد اکائی ہے اور ہر اکائی ترقی کرتے کرتے مجموعہ لاتعداد بنتا ہے جس کو شمار نہیں کیا جا سکتا، لیکن تخم ایک اور صرف ایک ہے۔

اسی طرح افکار کی بھی اکائی ایک ہے اور فکر جب پختہ ہو جاتا ہے تو کئی قومی اکائیاں (فکر) اس کے ساتھ ملتے ملتے "قومیت" (مذہب) کا خمیر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً بنیادی طور پر ایک اور صرف ایک اکائی ہوتی ہے۔

ذات حقہ خود وحدت ہے۔ اس وحدت مطلقہ نے ظہور فرمایا اور سینکڑوں نہیں لاکھوں کروڑوں اکائیوں کا ظہور ہو کر ایک عالم کی تخلیق کا باعث ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک فرد کو اپنے انتخاب میں لے لیا اور پھر اس فرد کے ذریعے ایک قوم کو ترقی دی اور ایک ملت کے درجے پر پہنچایا، اور ہر برائی سے ملت نے خلاصی پائی۔ طریقت "نو نقد نہ تیرہ ادھار" پر ایمان رکھتی ہے۔ یہ اپنے عمل کا نتیجہ اسی زندگی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ فرد کا حساب شریعت کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ وہ اگلی دنیا میں جنت چاہتی ہے جس کے اندر لقائے رب تعالیٰ ہو گا۔

لیکن طریقت اس دنیا میں اپنے مولیٰ کی لقا کے لیے تڑپ رہی ہے اور جان و مال سب قربان کرنے کے لیے اسی نقد سودے کے لیے بازی لگائے بیٹھی ہے ؎

جو سر دتیاں راقب ملے اوہ پیارا
بڑا ستا سودا خریدار نوں ہے

مَنْ کَانَ یَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ اَحَدًا ۝

(ترجمہ) جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملاقات کی پس چاہیے کہ اچھے عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اسی دنیا میں دیکھنا طلب ہے اور دیکھنے پر پھر کیسے شرک اور دوئی پیدا ہو سکتی ہے، ورنہ بن دیکھے شرک سے کیسے خلاصی پائی جا سکتی ہے؟ بلکہ ایک دوئی چھوڑ لاکھوں، کروڑوں شریکوں سے کوئی ایماندار بچ نہیں سکتا۔ پھر یہ باتیں زبانی نہیں، ایک فارمولا نہیں بلکہ ایک عملی زندگی ہے، جس پر ایک نہیں لاکھوں، کروڑوں چل کر واصل خدائے قدوس ہوئے، جو آج تک رہتی دنیا کے لیے نشانِ راہ ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

(ترجمہ) بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو پروردگار ہے جہانوں کا، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی طرح امر کیا گیا اور میں پہلا مسلمان ہوں۔

Marfat.com

کیا یہ قرآن پاک نہیں فرماتا؟ کیا یہی اسلام نہیں؟ پھر طریقت یہی کچھ پیش نہیں کرتی؟ اور اس پر عمل کرنے کا نام طریقت نہیں؟ ایسے حال میں پھر کیوں اہل اسلام طریقت کو بدنام کرنے کی کوشش میں ہیں؟

اللہ العالمین دنیائے اسلام کو ایک کرے اور تمام کے علم و عمل میں یکسانیت پیدا فرمائے تاکہ دشمنانِ دین رسوا و ذلیل ہوں۔

شریعت، ظاہری محاسبہ سے تعلق رکھتی ہے اور طریقت، باطنی محاسبہ کا نام ہے۔ اگر ظاہری محاسبہ پر کسی کی توجہ زیادہ ہو جائے تو عالم کہلاتا ہے اور اگر باطنی محاسبہ پر کسی کی توجہ مرکوز ہو جائے تو صوفی کہلاتا ہے۔ لیکن "اسلام" دونوں محاسبوں کا نام ہے۔

اجتماع میں اگر ظاہری امور پر توجہ ہو اور شریعت کے احکام سنائے جا رہے ہوں تو جلسہ ہے اور اجتماع کے اندر باطنی توجہات پر خیال اور قلبی تاثرات اخذ کرنے پر خاموشی ہو تو عرس ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ٥

(اکتوبر ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

# ولی را ولی مے شناسد

عنوان بالا عام مشہور ہے۔ بات تو صحیح ہے کہ حقیقت وہی پہچانے جو اس کا اہل ہو۔ کسی دوسرے کو کیا علم کہ اس قالب کے اندر کون بستا ہے؟ لیکن جہاں ہر چیز کے نشانات اور اثرات سے شناخت ہوتی ہے، اور ادنیٰ شناخت کا یہ طریقہ چلتا ہے، وہاں آثار و نشانات سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن کوئی سورج کی بابت پوچھے کہ سورج کی کیا شناخت ہے تو اسے لوگ باؤلا نہیں کہتے؟ بعینہ یہی مثال صحیح ولی اللہ کی شناخت کے بارے میں ہے۔ ولی اللہ کوئی ایسی گمنام ہستی نہیں ہوتی جسے کوئی پہچان نہ سکے۔ خدا کی شناخت اور معرفت گو مشکل ہے۔ تاہم ایک دنیا اسے جانتی پہچانتی ہے اس کے نام کا ورد جپتی ہے۔ ولی اللہ اس کا صحیح عکس ہوتا ہے۔ اور جیسے وہ رب العالمین ہے ویسے ہی رحمۃ للعالمین ہے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمتہ للعالمین فرمایا۔

ولی اللہ کے مدارج ہیں۔ اور ہر ایک بمتابعت نبی آخر الزمان اپنا درجہ رکھتا ہے۔ بلند سے بلند اور ادنیٰ سے ادنیٰ تک۔ لیکن ولی اسے ہی کہا جائے گا جو بفرمان الٰہی زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو وکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا کے یہی معنی ہیں کہ دنیا اس کی شہادت

Marfat.com

دے۔ اور یہ شہادت ساری خدائی دے۔ اکے دکے کا اعتبار نہیں۔ دشمن گو دشمن ہوتے ہیں، لیکن ولی کا اعتراف اور یقین ان کے اندر بھی ہوتا ہے اور یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ ھُمْ ترجمہ :۔ پہچانتے ہیں اس کو جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں کے مصداق ہر ایک جانتا پہچانتا ہے، اور اس کی دعا و بددعا کا خیال عام ہوتا ہے۔ طالب وسائل اس کے دروازہ پر گرتے ہیں اَلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ، وہ ولی اللہ جنہیں خود گمنام رہنا پسند ہے اور ان کے رب کو ان کا گم رکھنا کسی مصلحت عامہ کیوجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے خفیہ پولیس کے افسر۔

مولائے کریم خود فرماتے ہیں اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ (۱) ظلمات نفسی اور شیطانی لا تعداد ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان تمام اندھیروں اور حجابوں سے نکال کر اپنے نور کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں، یا اپنا نور دکھلاتے ہیں۔ خود سوچئے، جس کے ظلمات دور کر دیئے جائیں، گھپ اندھیرے سے جسے باہر نکال لیا جائے، پھر اس کے اندر اپنی روشنی کے انعکاس ڈال دیئے جاویں وہ کیونکر دنیا میں نہ چمکے ؟ اور کیونکر دنیا اسے شناخت نہ کرے۔ بلکہ اس کے نور سے دنیا کا چمکنا ضروری ہے۔ خود خداوند تعالیٰ تو ظاہر نہیں ہوتے لیکن وہ اپنے بندے کے ذریعہ اپنی شناخت اور اپنی معرفت کراتے ہیں اور اسے اپنے نور سے منور کرتے ہیں۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ صاحب ولایت کو اپنی ولایت کا علم ہونا ضروری نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ دنیا اسے جانے۔ ممکن ہے ایسے ہو۔ لیکن ایسی ولایت کا کیا فائدہ ؟ اگر خود علم رکھے اور دنیا کو پتہ نہ ہو، تو یہ بات تو ہو سکتی ہے کہ اللہ میاں بندے کا راز آپ ہے۔ کسی دوسرے کی گنجائش علم نہ رکھی گئی ہو۔ لیکن جب خود صاحبِ ولایت بھی علم نہیں رکھتا تو اللہ میاں کے تعلقات کا اظہار کیسے ؟ یا وہ تعلقات اپنی مخلوقات کے ذریعہ ظاہر فرماوے کہ دنیا اس کی ولایت کی معترف ہو لیکن ایسے حال میں وہ خود کیسے لا علم رہ سکتا ہے ؟ لیکن ایسی شہنشاہیت کا کیا فائدہ جب کہ نہ شاہ کو پتہ ہو نہ شاہ کی رعیت

کو پتہ، نہ احکام و فرامین چلتے ہوں نہ لشکر و سپاہ ہو، اور نہ خزینہ و مال۔ ایسے (میں) تو وہی مثال "بے تاج بادشاہ" کی ہے۔ ایسے بادشاہ کس کام کے۔

اپنا خیال تو یہی ہے کہ ولایت کے لوازمات تمام ہوں، مقبولیت عامہ اور خاصہ ہو، خود جانتا ہو اور دنیا بھی جانتی ہو، حاضرین ایک طرف مضطرب و پریشان نظر آتے ہوں تو دوسرے تسکین و یقین لے کر جاتے نظر آتے ہوں۔

خود سوچئے بادشاہ ان بوریا نشینوں کی خدمت کے لئے کیوں کمر بستہ حاضر ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ حضرات سرکاری خزینہ کے مالک ہیں۔ جیسے چاہیں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ اذن دادہ ہیں اور مختار کل ہیں۔ علیٰ حسب تعداد و مقدار۔

ہاں! اس درجہ کے ولی بہت کم ہوتے ہیں۔ اور دنیا میں ان کی اتنی کثرت نہیں جتنی خیال کی جاتی ہے۔ اور ہر کہ و مہ اپنے مرشد کو ایسے خیال کرتا ہے کہ یہی غوث وقت ہے۔ اگر ذرا غور فرمائیے کہ آخر غوث کا لفظ کیوں وجود میں آیا، اگر یہ با معنی نہ تھا۔ بلکہ پہلے معنی ہوتا ہے اور بعد میں لفظ اس کے لئے پیدا کیا جاتا ہے۔ مسمی پہلے دنیا میں آتا ہے، بعد میں اسم تجویز کیا جاتا ہے۔

خود صاحب ارشاد سے اپنے ارشاد مند ہونے کا اقرار لیا جاتا ہے۔ انبیاء تک سے اقرار اپنا اور اپنی رسالت کا لیا جاتا ہے۔ خود صاحب رسالت کو بھی لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا اقرار ضروری ہے۔ خود نبی کو خطاب ہوتا ہے۔

۲۔ یَآاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرۡسَلۡنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا (الاحزاب)

۳۔ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (یٰس)

قرآن حکیم مطالعہ فرمایا جائے۔ ہر موقعہ پر ایسے الفاظ فرمائے جاتے ہیں، جس سے نبی کریم کو اپنی رسالت کے فرائض کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ آخر یہ تعارف نہیں تو کیا ہے۔ اگر یہ تعارف نبی کیلئے ضروری ہے تو کیا ولی کے لئے ضروری نہیں؟ جو اس کا نائب ہے؟ میرے نزدیک ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عبادت گزار صالح و

Marfat.com

پرہیزگار کی دعائیں قبول ہوں اور اس کی بددعاؤں کا اثر بھی ہو۔ گو اس کی قبولیت اور اثر کی وجہ سے بعض ایسے پاک عبادت گزار کو خدائے برتر و اعلیٰ کا مقرب خیال کریں۔ لیکن یہ قبولیت تو عامہ ہے۔ یہ ہر کہ ومہ کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی جناب کی طرف رجوع کرتا ہے۔

۴۔ اَمَّن یُّجِیبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْءَ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْض ٥

۵۔ اُدْعُوْنِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ''

یہ عام فرمان ہیں۔ لیکن جب عبادت گزار مقبولیت خاصہ پر جا پہنچتا ہے تو پھر اسے پہلے بتلایا جاتا ہے کہ ہمارے تمہارے تعلقات کچھ خاص ہیں اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوا عَنْہُ۔۶۔ کے درجہ پر ہو چکے ہیں۔ تم ہماری حکمت پر راضی اور میں تمہاری ہر مرضی پر برضا۔ شرعی صورت پر یہ ولی اللہ شریعت سے باہر نہیں نکلتے۔ اور تکوینی صورت میں وہ تابع بامر اللہ ہو جاتے ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے یہ چاہتے ہیں۔

فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اس گھر میں آ نکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

## حواشی

۱۔ اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف۔

۲۔ اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ۔

۳۔ تحقیق تو ہے بھیجے ہوؤں سے اوپر سیدھی راہ کے

۴۔ بھلا کون پہنچتا ہے بے کس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے، اور دور کر دیتا ہے سختی، اور کرتا ہے تم کو نائب اگلوں کا زمین پر۔

۵۔ تم مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔

۶۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی

(نومبر ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

# حال و قال

عرفان کے مدارج کا فرق سلطان الہند حضرت اجمیری مجدد صاحبؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے درمیان دریافت کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ یہ فرق بدیہی اور سطحی ہے۔ لیکن علمائے کرام کیوں اس فرق کو نظر انداز کر کے عامیہ انداز میں صوفیا کی صحبت بابرکت سے اپنی تشنگیٔ تصوف بجھانے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی صوفی کی خدمت میں کوئی درس لینے کے لیے حاضر ہو، اور بخاری، ہدایہ کی تحقیق چاہے۔ دوکان سے تو وہی چیز ملے گی جو اس کے اندر ہے۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ اقرار ہے کہ میری معلومات بہت کم ہیں۔ اگر وسعتِ معلومات کا ذخیرہ ہوتا تو قدرت نے ذوقِ سلیم عنایت فرمایا تھا۔ ایسی صورت میں میں کسی سے کم نہ ہوتا۔ اوّل تو حافظہ ندارد پھر مطالعہ کا اشتیاق نہیں اور کبھی دل چاہے بھی تو طاقت اور قویٰ کام نہیں کرتے۔ شاید ایسا ہی ہو جیسے ہمارے کرم فرما فرماتے ہیں۔ میرے سامنے صرف دو شعر ان کے نام نامی [1] سے حضرت قبلہ مرمشدر حمۃ اللہ علیہ نے کئی بار تکرار فرمائے۔

وصالِ حق طلبی ہمنشین نامش باش
ببیں وصالِ خدا در وصالِ نامِ خُدا

Marfat.com

یقین بداں کہ تو باحق نشستۂ شب و روز
چو ہمنشین تو باشد خیالِ نامِ خُدا

غور کیجئے، سلوک کی ابتداء وانتہا جو کچھ بھی ہے وہ ان اشعار کے اندر موجود ہے۔ اس کی تفصیل حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے خوب بیان کی ہے۔ حقیقتاً سب کچھ یہی ہے۔ دانہ کے اندر تمام درخت اپنی پوری صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن اسے ہر ایک نہیں دیکھ سکتا۔

حضرت قبلہؒ جب پہلے پہلے ان اشعار کو دہراتے تھے تو میں مطلق سر حقیقت سے واقف نہ تھا۔ ہزاروں جتنوں کے بعد معاملہ اختتام پر پہنچا اور خیال کیا، تو یہی تھا۔ کتنا بلند معاملہ ہے کتنے سادے الفاظ ہیں جو "ہیں وصال خدا در وصالِ نام خدا" کے اندر ظاہر کیا گیا ہے۔ در حقیقت وصالِ خدا ہے کیا کچھ ؟ یہی وصالِ نامِ خدا۔ بھلا یہ معاملہ کسی کی سمجھ میں کیونکر آئے۔ لیکن پوچھ کر دیکھئے تو سہی کہ سالک سے کیوں ذکر جاری و ساری کرایا جاتا ہے اور وہ کیوں ذکر میں محو ہو جاتا ہے، اور محویتِ تامہ سے کیا ظہورات ہوتے ہیں۔ ذرا غور و تامل کیجئے تو سب کچھ عیاں ہے۔

ذکر کو دنیا بے فائدہ سمجھتی ہے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ جب خیالِ نام خدا تیرا ہمنشیں ہو گا، تو حقیقتاً تو خدا کا ہمنشیں ہو گا۔ جس نے اسم کی خیالی ہمنشینی پیدا کی کیا اسے اپنی ہمنشینی خدا عزوجل کا اطمینان نہ ہوا۔ کیا وہ کسی دوسرے کو اپنا ہمنشیں بنانا چاہتا ہے ؟ وہ اسے اپنا مونس و ہمنشیں نہیں سمجھتا۔ مانا کہ یہ اشعار معین سنجریؒ کے نہ ہوں۔ لیکن یاد رکھیئے کہ نظم میں بھی قدرتِ کلام فطرتی ہے جو طویل مضمون کو چند الفاظِ سادہ میں سمیٹ کر رکھ دیتی ہے۔ دوسرے جب ایسی ہستی سے سُنا جو اپنے وقت کے راہِ معرفت و طریقت کے سر تاج ہیں تو لا محالہ تمثیلاً وہ الفاظ نکل گئے کہ غریب نوازؒ کے صرف دو شعر حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ کے طویل مضامین کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

تمثیل کو جانے دیجئے۔ اصل مطلب پر آجایئے۔ کیا حقیقتاً ان بزرگوں کے اندر کوئی تفاوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا؟ اور انوکھی چال، انوکھی ادا کس کی؟ اور فضیلت کسے؟ یہاں میرے اور آپ کے فیصلے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمیں جمہور اسلام کا اور دنیا کا فیصلہ طلب کرنا ہے۔ یہاں خواص و علماء کا فیصلہ نہیں چاہیے بلکہ خواص و عوام جن کو اس راہ میں مہارت ہے۔ اور جن کو اس راہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں وہ صحیح رائے کیا قائم کر سکتے ہیں؟

حاشا و کلا! کہ مجددؒ علیہ الرحمۃ کی مجددیت کی شان میں میرے اندر کوئی سقم ہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں، کہ ہمارے دوستوں نے مجددیت کی شان کو سمجھا ہی نہیں۔ جیسے مودودی صاحب نے مجددیت کوئی خاصہ قرار نہیں دیا اور ہر عالم مجاہد کو مجددیت دینے کے لیے ہمہ وقت تیار۔ یہ ان کے فہم کا قصور نہیں بلکہ اُس فہم کا قصور ہے جس نے ابھی تک مجددیت کی حقیقت تک رسائی نہیں پائی۔

ہمارے علمائے کرام نے مجددؒ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں سمجھی کہ وہ بدعت کا قاطع اور شریعت کا رہنما ہوتا ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ آج کہ ومہ مقام نبوت پر بیٹھ کر دعوتِ خلق کو اپنا فرضِ اوّلین خیال کرتا ہے حالانکہ خود اس کا قلب ماسوا سے پاک نہیں ہو سکا اور اعراض ماسوا قلب میں صفتی طور پر جگہ حاصل نہیں کر سکا ہے۔

میں نے صرف چند مکاتیب کا خلاصہ دیکھا۔ بخدائے لایزال میرے اندر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ ہمارے بزرگ عقیدتاً یا علماً حضرت کے مکاتیب شریف پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ ورنہ وہ جس جذبہ سے معمور ہیں وہ جذبہ کسی کے اندر پیدا کیوں نہیں ہوتا؟ صوفی صافی بھی ہو عالم باعمل سنن بھی ہو اور مکاتیب کا مطالعہ بھی رکھتا ہو اور پھر اس کی وہی حالت ہو جو علماء کی عام حالت ہو یا عوام کی حالت ہو۔ نوافل و سنن کے اندر اتنا زور اور فرائض سے اتنی لاپروائی۔ کاش کوئی ہوتا اور ان لوگوں کو حقیقتِ مکاتیب سے واقف کرتا۔ یہ لوگ اس پر خوش ہیں کہ حضرتؒ فرماتے ہیں جو کچھ علماء نے فرمایا

ہے اور جو عقیدہ و عمل علمائے کرام کی کسوٹی پر صحیح اُترا وہی صحیح ہے اور جو ان کے نزدیک غلط ہے وہی غلط۔ بے شک یہ صحیح ہے لیکن ایسا کیوں فرمایا؟ کس حقیقت کو مدِ نظر فرما کر ایسا کہا اور وہ حقیقت آخر کیا ہے؟ مگر کسی کی بلا جانے چشتی کیا ہیں؟ نقشبندی کیا ہیں؟ ان کو عوام کی طرح ایک تقلیدی پھندہ گلے میں ڈالنے کی ضرورت ہے اور بس۔ ایک طرف مذہبی تقلیدی قلادہ ہے تو دوسری طرف قلادۂ فقر۔ خواہ دونوں چھوڑ ایک کا بھی نباہ اور برداشت نہ ہو سکے۔ غرض اپنے خیال کا پاس ہے اور بس، خواہ صحیح ہو یا غلط۔ اس سے واسطہ نہیں کہ ہمیں حق کے سامنے جانا ہے اور ہم صرف حق کے لیے پیدا ہوئے اور حق کے لیے زندہ ہیں اور حق کے لیے مریں گے۔

اب میں اصل مسئلہ کی وضاحت کرتا ہوں جس سے خود بخود حقیقت اور فرق دونوں ظاہر ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ توحید صرف ایک نہیں بلکہ علمی، حالی اور فطرتی تین مدارج رکھتی ہے۔

## علمی توحید

علمی توحید استدلال سے قائم ہوتی ہے۔ لیکن وہ ڈھول کی طرح اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے۔ ڈھول کی آواز دُور تک جاتی ہے۔ لیکن ڈھول کو ایک ٹھیس لگ جانے سے ڈھول چُور چُور ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ عوام کے لیے مفید ہے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں۔ اسی کے بارے میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اسی وجہ سے اَلْعِلْمُ حِجَابٌ اَکْبَرُ کہا جاتا ہے۔ یہ توحید علمائے ظاہر کی ہے۔

## حالی توحید

یہاں علم کا کوئی واسطہ نہیں۔ حالت سے توحید بلا استدلال تشبیہی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً جلوہ آرائی کے لیے کوئی منظر تلاش کرتی ہے۔ اسی سے توحید

وجودی پیدا ہوتی ہے۔ کثرت کو وحدت میں اور وحدت کو کثرت کے اندر نمایاں کیا جاتا ہے۔ غرض اس کے مظاہر بیشمار ہیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ یہ پختہ ہوتی ہے اور اٹل۔ لیکن حال کے ساتھ وابستہ حال گیا تو یہ بھی گئی۔ البتہ کسی کی ضرب سے یہ گرتی نہیں بلکہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ اکثر اس پر وار کرنے والا اس کے اندر گر کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے توحید اولیائے عظام کی۔

## فطرتی توحید

نہ اس کو استدلال سے واسطہ ہے نہ حال سے۔ بلکہ یہ فطرت و جبلت کے اندر ایسی ساری و جاری ہوتی ہے جیسے روح و جان تمام بدن کے اندر۔ جب تک روح و جان ہے اس وقت تک یہ بھی موجود۔ ہزاروں حال بدلیں، لاکھوں تغیرات آئیں یہ اسی طرح قائم رہتی ہے۔ نہ بلند ہے نہ پست۔ اپنی جگہ صحیح مقام پر نہایت نورانیت سے جلوہ آرا ہوتی ہے۔ تشبیہ و تشبّہ سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ نہ یہاں وحدت و کثرت کا خیال ہے۔ نہ یہاں کسی جلوہ گاہ کی ضرورت۔ کائنات کے ہر ذرّے کے ساتھ ہے۔ وہ خود سب کچھ دیکھتی ہے لیکن کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ جو اس کے سب سے زیادہ اقربیت میں رہتے ہیں وہ کہتے ہیں لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ [2] کیوں اس لیے کہ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ [3] ہے۔ لطیف و خبیر ہونے کی دلیل کیا؟ قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ [4] اُٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے لڑتے جھگڑتے، ہر حال میں یکساں۔ نہ نماز کے اندر زیادہ، نہ بیوی کے پاس بیٹھنے سے کم۔ یہ ہے توحید انبیاء علیہم السلام کی۔ فطرتاً ایسی توحید کو دعوت کا حق ہے۔ دوسری یا تو سرے سے حق رکھتی ہی نہیں یا جو کچھ وہ کرتی ہیں تقلیداً اور ظلاً کرتی ہیں۔

البتہ ان توحیدات کے امتزاج سے کماً و کیفاً لا تعداد اقسام توحید پیدا ہو جاتی ہیں، جن کا شمار نہیں بلکہ ہر موحّد کی توحید دوسرے موحّد سے علیحدہ ہوتی ہے اور ہر ایک کی توحید کا ذوق و وجدان الگ الگ۔

Marfat.com

## ہر توحید اپنے ذوق، عمل، اثر اور تشخص میں منفرد ہے

سب سے پہلے توحید کے تخم ظاہری لا الٰہ الا اللہ کو لیجیے۔ صاحبِ نبوت کی فطرت اسے دہراتی ہے، تو وہ اپنے ذوق فطرت سے مجبور ہو کر اس کلمہ کا تکرار کر کے اپنی فطرت کی تسکین کرتی ہے۔ اس کے سوا اس کا مقصود نہیں۔ بے اختیار وہ حقیقت اس پر آشکار ہوتی ہے جو اس کی بصارت کے اندر موجزن ہے۔ بخلاف صاحبِ حال کے، وہ اوّلاً تو تقلیداً ایسا کہتا ہے۔ لیکن حال آنے پر اپنے حال کے قائم رکھنے کے لیے یا بڑھانے کے لیے وہ دُہراتا ہے یا ہمیشہ کے لیے خاموش رہ جاتا ہے۔ اور صاحبِ علم یا تو رسماً یا تقلیداً پڑھتا پڑھاتا ہے یا ظاہراً حدودِ اسلام کے اندر رہنے کے لیے اور رکھنے اور لانے کے لیے پڑھنا ضروری خیال کرتا ہے، ورنہ اس کی بصارت میں کوئی دوسری حقیقت نمودار نہیں ہوتی جس کے مشاہدہ کی وجہ سے وہ اس کلمہ کے تکرار پر مجبور ہو۔

## نماز

توحید کا سب سے بڑا ظہور نماز میں ہے۔ حضرت رسالت پناہؐ فرماتے ہیں اَرِحْنِیْ یا بلالُ اور قُرَّۃُ عَیْنِی فِی الصَّلوٰۃِ[6]۔ جب کہ طبیعت پر گرانی پیدا ہوتی تھی۔ گویا ایک سکون و قرار اور آرام نماز تھی اور تمام تھکاوٹوں کو دُور کرنے والی تھی۔ کیونکہ فطرتِ عالیہ کا ذوق وجدانی اپنے ذوق کو پُورا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا کوئی مقصود نہ ہوتا تھا۔ اس سے طلب بڑھانی مقصود نہ تھی بلکہ آتشِ طلب بجھانی مقصود تھی۔ بخلاف صاحبِ حال کے۔ وہ اوّل تقلیداً تو ادا کرتا ہے، پھر باطن کی ترقی کے لیے، اور معراجِ مومنین کے لیے۔ قیام ہے تو طلب میں، رکوع ہے تو طلب میں اور سجود ہے تو طلب میں۔ صاحبِ علم کی نماز صرف اپنے مولا کے فرائض ادا کرنے کے لیے۔ ظاہری فوائد کے لیے، اخوّت کے لیے، جماعت بندی کے لیے، مساوات کے لیے، وغیرہ وغیرہ، جس میں پرستش یا عبادت مطلقہ کا شائبہ تک نہیں۔ نہ اسے پڑھنے میں لذّت ہے اور نہ اس کی فطرت میں اس کا ذوق ہے۔ صرف رسم ہے اور بس۔ قرأت

Marfat.com

پڑھتا ہے تو یہ معلوم نہیں کہ کس کا کلام ہے، گو معانی جانتا ہے۔ وجود اور دلِ پر کوئی اثر نہیں پیدا ہو تا بلکہ جیسے نماز سے پہلے تھا ویسے نماز کے اندر اور ویسے ہی نماز سے فراغت پر۔ نہ نورِ باطن کو بڑھاتی ہے اور نہ دل کو اطمینان دلاتی ہے۔

## اعمالِ صالحہ وغیرہ

الغرض تمام اعمالِ صالحہ کا یہی فرق برابر چلا آتا ہے اور ہر ایک اپنے توحیدی تخم کے مطابق اعمال، افعال، حرکات اور اثرات سے نشو و نما رکھتا ہے اور سب کے مطابق صاحبِ توحید کے جذبات ہوتے ہیں اور ان جذبات کی ترجمانی بھی اپنے اپنے خاص رنگ ڈھنگ میں ہوتی ہے۔ صاحبِ فطرت کے سارے الفاظ فطرت و جذباتِ انسانی کو اپیل کرنے والے ہوں گے اور صاحب حال کی زبان گنگ۔ صرف حال اپنی ترجمانی آپ کر رہا ہے۔ آنکھ ہے تو مسحور، چہرہ ہے نور علیٰ نُور، ایک نظر اٹھی اور سب کفر دُور ہوئے۔ اور چہرہ کا پھیلنا ہے کہ سینکڑوں بُت گر گئے۔ لیکن صاحب علم کی زبان سیف ہو رہی ہے۔ دل کے اندر پیچھے آتا ہے لیکن زبان پر پہلے آنکلتا ہے۔ علمی استدلال اتنا زبردست کہ عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔ لیکن جب بہت کچھ ہو جاتا ہے تو نہ میاں کے اپنے اندر کچھ ہے اور نہ کسی دوسرے کے اندر کچھ۔ ہاں استدلال ہے اور قوۃ بیان۔ البتہ عقلی اور استدلالی آدمی پر کچھ نہ کچھ جادُو چل جاتا ہے اور کچھ نہ سہی تو ظاہری طور یعنی عقلی طور پر موحد ہو بیٹھتا ہے۔

## مراتب اور مدارج کا فرق بدیہی ہے

اس تعقل کے بعد اگر آپ تمام انبیاء پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو بداہتاً خود بخود اس حقیقت سے انکار نہ ہو گا کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ [ے] حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد رسُول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء اپنے اپنے مناصب اور مدارج پر کھڑے صاف نظر آتے ہیں۔ اگرچہ خاص امتیاز ہر ایک کا دکھایا نہیں جا سکتا تاہم صاحب بصیرت سے کچھ پوشیدہ بھی نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح اولیاء بھی اپنے مدارج اور

Marfat.com

مناصب پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ کوئی ایسا ہے کہ کسی دو کو ایک جگہ اور ایک منصب پر خیال کرے۔ دُور کیوں جایئے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کو لے لیجئے۔ ایک مرشد ہے اور ایک مرید۔ کیا دونوں کے الگ الگ مناصب اور مدارج نظر نہیں آرہے۔ خواہ ان کے کلام اور کمالات نہ بھی دیکھے ہوں۔ ایک پر دوسرے کی فضیلت کا پتہ نہیں چلتا؟ اگر چلتا ہے تو پھر کیا بداہتاً ہم اجمیریؒ اور سرہندیؒ اور دہلویؒ میں فرق دیکھ نہیں رہے؟ اگر دیکھ رہے ہیں اور یقیناً دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے منہ سے نہ کہیں؟ کیا یہ تنقید ہو گی یا ایک مشاہدہ کا بیان؟ میں حیران ہوں کیوں دوست احباب ایسی سادہ باتوں کو معمات کی صورت میں بدل دیتے ہیں؟

اب آیئے، ذرا خود دیکھئے کہ ان حضرات میں کیا فرق ہے۔ حضرت قبلہ مجدد علیہ الرحمۃ کو مجدد اور سلطان الہندؒ کو سلطان الہندؒ اور امام الہندؒ [8] کو امام الہندؒ کے القاب کس نے دئے اور کیوں دئے۔ کیا ان کا علم و عمل برابر ہے۔ کیا ان کا حال و قال مساوی درجہ رکھتا ہے کیا ان کی توحید ایک ہے۔ کیا ان کی دعوت کے اثرات ایک ہیں۔ اور ان کی کلام کی حلاوت کا مزا ایک ہے؟ جسے اللہ جل شانہ نے کچھ بھی بصیرت دی ہو وہ کھلے طور پر ہر ایک کو اپنے اپنے تشخصات علمیہ وعملیہ، حالیہ وذوقیہ میں دیکھتا ہے۔ حصرت اجمیریؒ صرف اپنی توحید حالی سے سلطان الہند کہلائے۔ نہ ان کو دعوت کا حکم ملتا ہے۔ نہ ان کی زبان ہلتی ہے۔ نہ ان کے قلم میں جنبش آتی ہے۔ جو کچھ ہے اندر ہی اندر ہے۔ اگر کچھ نکلتا ہے تو آنکھوں کے ذریعے یا چہرہ بشرہ کے ذریعہ لیکن لطف یہ کہ سارا ہندوستان کفرستان ہے۔ ایک متنفس بھی توحید سے آشنا نہیں۔ یہ اللہ کا بندہ اپنے حال میں مست اپنی دُھن میں صرف اجمیر کا راستہ لیے چلا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصود اجمیر پہنچنا ہے اور بس۔ لاکھوں سرکش سامنے آتے ہیں۔ سینکڑوں منکرانِ توحید مقابل آجاتے ہیں اور بیسیوں سازشیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ اللہ کا بندہ خاموش اپنے حال میں مست۔ جو بھی سامنے آتا ہے گرنے کے سوا چارہ نہیں دیکھتا۔ راجے مہاراجے سب مقابلہ کے لیے منتر جنتر لے کر آئے لیکن بڑھے

Marfat.com

تو کیا دیکھا، پلٹے تو کس حال میں ؟ سینکڑوں نہیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں دم بخود ہو کر اس کا توحیدی کلمہ الاپتے گئے۔

دوسری طرف دیکھئے، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے ایک بزرگ اور بابرکت خاندان میں پیدا ہوئے۔ ہر قسم کے دینی علوم میں مہارت پیدا کی۔ تصوف کی چاشنی اچھے سے اچھے بزرگوں سے لے کر مسند آرائے فضیلت ہوئے۔ توحید اور اس کے معارف اور لوازمات سے دفتروں کے دفتر لکھ دئے۔ اسلامی توحید کا کوئی ایک شعبہ نہیں جس پر آپ کی تصنیف اپنی نظیر آپ نہ ہو۔ خود تصوف پر کئی ایک رسالے لکھے جن کے دیکھنے سے عقل متحیر ہو جاتی ہے۔ لیکن ان سے وہ کچھ نہ ہو سکا، جو اجمیریؒ کی ساحرانہ نگاہ نے کیا تھا۔ کوئی آپ کو دیکھتا بھی ہے تو علمی نقطۂ سے اور سند پیش ہوتی ہے تو امام الہندؒ کی۔ گو وہ تصوف کا خاصہ مذاق رکھتے ہیں لیکن کوئی ان کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ آپؒ کے تمام علمی کارناموں میں تصوف کا ہلکا رنگ برابر ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی ان کا شیدائی نہیں، بلکہ ان کے علمی وجدان و ذوق کے لیے ان کے سامنے محو ادب ہے۔ اور علمی توحید حاصل کرنے والوں کا مجمع ان کے گرد اگر دبخاری و مسلم پڑھنے کے لیے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اور کوئی ایک متنفس بھی ان کی خدمت میں ایسا نظر نہیں آتا جو مراقب ہو کر اُس کی تلاش میں ہو، جس کے لیے یہ سب کچھ ہے۔

تیسری جگہ پر حضرت مجددؒ تشریف لاتے ہیں۔ علم میں وہ کمال تو نہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کا ہے اور حال میں اس انتہا کی جادوگری تو نہیں رکھتے جو غریب نوازؒ کے اندر تھی لیکن قدرت نے ایک ایسا مساوی امتزاج حال و قال کا آپ کے اندر ودیعت فرمایا کہ نہ حال کو قال سے جدُا کیا جا سکا اور نہ قال کو حال سے۔ علم کو حال کے اندر ایسا غوطہ دیا کہ علم کی حقیقت ہی بدل دی اور حال کو علم کے اندر ایسے چھپایا کہ کوئی پہچان تک نہیں سکتا کہ اس کے اندر ہے کیا؟

غرض جب سے نبوت کا سلسلہ ختم ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک ایسا سپوت دنیا نے نہیں پیدا کیا، جس کے اندر یہ دونوں اوصاف مساویانہ درجہ پر اس

موزونیت کے ساتھ ودیعت فرمائے گئے ہوں۔ نہ قال کی تیزی ہے نہ حال کا جنون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر و شکر مساویانہ امتزاج لے کر ہر دل کی سیرابی کا باعث ہو رہے ہیں۔ نہ تو کوئی صاحب علم دم مار سکتا ہے اور نہ صاحبِ حال باہر نکل سکتا ہے۔ جہاں علم کو حال کے شیشہ میں اُتار کر دنیائے علم کو حیران کر دیا وہاں حال کو علم کے لباس سے مزین فرما کر حال کی صورت کو دوگنا چگنا نہیں سینکڑوں درجہ موزونیت کی نورانی صورت بنا کر صاحب احوال کا دل موہ لیا۔

یہ توحیدی رنگ اگرچہ انتہائی درجہ نہیں رکھتا لیکن اس کی نرالی صورت فطرتی توحید سے زیادہ مشابہ ہے اور صاحب نبوت سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ اگر کوئی کامل غور کرے تو اس کے خدوخال، قدو قامت بہت قریبی مشابہت فطرتی توحید سے رکھتے ہیں لیکن عین وہ نہیں۔ گو مناسبت بہت زیادہ ہے اور عام دیکھنے والے اسے ظل قرار دے سکتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ وہ کچھ اور یہ کچھ اور، لاکھوں درجہ کا فرق۔ ایک طرف حضرت مجددؒ کے کلام کا مطالعہ کیا جاوے اور دوسری طرف حدیث و قرآن کو غور سے پڑھا جائے۔ پھر ان کا موازنہ اور مقابلہ کیا جائے تو دیکھئے فطرت کے صحیح متوازی اور مناسب امتزاج کس کے اندر موجزن ہیں۔

قرآن پاک ایک سادہ عقل کے سامنے پڑھا جائے تو اس کے دل میں گھر کر جاتا ہے۔ ایک بلند عقل دیکھے، تو حیران ہو جاتی ہے۔ لیکن مکتوبات شریف کا یہ حال نہیں۔ یہ وہی سمجھیں جن کو اس راہ (حال و قال) میں دسترس ہو، اور جن کے اندر کچھ دیکھنے سمجھنے کا سامان پہلے سے مہیا ہو۔ بخلاف قرآن و حدیث کے اس کے لیے صرف توجۂ انسانی درکار ہے اور بس۔ اس کے بعد فطرتِ انسانی فطری قویٰ کے اندر خود بخود داخل ہوتی جاتی ہے اور فطرت اپنی فطرتی پیاس بجھتی دیکھ کر اپنا دل لے کر بیٹھ جاتی ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ کی سیرت اور حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ کے سوانح کا ایک سرسری مطالعہ بھی جس نے کیا وہ ظاہر دیکھ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے ساتھ

باوجود ایک بڑی نسبت اور بڑی مشابہت کے، جس کے حاصل کرنے اور ترویج دینے کے لیے مجدد علیہ الرحمۃ نے تمام عمر صرف کی، پھر بھی کتنا بلند فرق امتیازی کھلم کھلا نظر آتا ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

وہاں سراسر فطرت ہے اور یہاں سراسر تصنع۔ یہاں کے ذکر واذکار اور وہاں کے ذکر واذکار، یہاں کی مجالس علمی ذوقی، اور وہاں کے محافل فطری کا مقابلہ کر کے ذرا غور تو فرمایا جاوے۔ بیشک دعوت کے لیے خالق سے خلقت کی طرف رجوع میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا رتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن اس کے اندر حال ہی نظر آتا ہے اور کیا حال ہی آپ کو اس حال کی طرف نہیں لایا؟

بہر حال توحید اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرتی ہے۔ اور اپنے حال کے مطابق ایک راہ اور مسلک تلاش کرتی ہے، پھر اس راہ اور مسلک پر اپنا تمام زور لگاتی ہے۔ گو وہ راستہ بلندی کا ہو یا پستی کا، خالق کا یا خلقت کا، ملکوتی ہو یا ناسوتی، کشفی ہو یا غیر کشفی، اصلاح سے تعلق رکھے، ظاہر سے ہو یا باطن سے، بہر صورت حال ہی سب کچھ ایسا کراتا ہے۔ اس لیے کوئی حال بھی خواہ کس قدر فطرت سے مشابہ ہو فطرتی کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔

## توحید کی فطرتِ صحیح کیا ہے؟

پھر اگر جمع اضداد یا مصدر صفات متضادہ کا نام توحید ہے۔ تو یہ بے شک اپنی وسعتِ کمالات میں بہت وسیع اور تمام کائنات پر محیط ہے۔ اگر خالق کی صفات چھوڑ کر خلقت کے اعتبار سے توحید کا مطمعٔ نظر دیکھا جائے تو توحید انبیاء کا مسلک نہایت بلند اور اکمل اور اس کے پھلنے پھولنے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ یہ بھی اس وسیع توحید کے آثار و لوازم سے پُر ہے۔ ایسی صورت میں کوئی فیصلہ کُلی نہیں دیا جا سکتا کہ کس توحید کا درجہ بلند ہے؟ فطرتا کی وجہ سے وہی بلند جو اس کی فطرتی خوبیوں سے پُر ہو۔ لیکن منشائے ظہور فطرت پر توجہ رکھی جائے، تو یہی انبیاء علیہم السلام کی توحید بلند

ہے۔بلکہ خود توحید اپنے لیے یہی موزوں مقام جب پسند کرتی ہے تو پھر کسی دوسرے کا کچھ کہنا سب بے جا۔ لیکن اس کے اندر بھی شک نہیں کہ ہر قسم کا توحیدی رنگ اس کے اندر سما نہیں سکتا۔ یہ اپنے مخصوص رنگ کے سوا کسی دوسرے رنگ کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ بخلاف اوّل [9] کہ وہ تمام اپنی اقسام اور اپنے تمام رنگوں کو اپنانا جانتی ہے۔ وہ عام ربوبیت کے درجہ پر بیٹھ کر ہر وقت خنداں ہے، اسے کسی سے بیر نہیں، کسی سے ناراض نہیں، کسی سے خاص تعلق نہیں، اور نہ کسی سے یگانگت۔ وہ اپنا اور پرایا نہیں دیکھتی، اس کی آنکھ میں سب برابر ہے

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب
گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں راکجا کنی محروم
تو کہ بادشمناں نظر داری

یہ اس کی نرالی شان ہے۔ قرآن پاک خود اس حقیقت سے پُر ہے۔

اسی وسعتِ حوصلہ کا نتیجہ ہے کہ اکبر جیسا بے دین شہنشاہ پا پیادہ آگرہ سے اجمیر جا کر حضرت اجمیریؒ کے مزار پُر انوار کی قدم بوسی اور خاکبوسی کو فخر جانتا ہے، اور جابجا فخر سے ذکر کرتا ہے۔ حالانکہ جہانگیر، اورنگ زیب باوجود عقیدتمندی کے دربار مجددی میں حاضر ہونے پر اپنا انکسار اس درجہ پر دکھا نہیں [10] سکے۔ آخر وجہ کیا؟ کیا ان کی عقیدت کم تھی، یا انہیں ایسا کرنے کی اجازت اور موقع نہ ملا۔ وہ دنیا کی مراد کے لیے جاتا ہے اور یہ سراسر دین کے لیے۔ آخر کوئی جذبہ تو اجمیریؒ کے مزارِ پرنوار کے اندر تھا جس نے اکبر جیسے شہنشاہ کو اپنے دربار میں اس طرح گھسیٹا۔

جہاں علم کو ظاہر کے ساتھ تعلق ہے، وہاں حال کو باطن کے ساتھ ویسے ہی تعلق ہے۔ جہانبانی [11] اگر علم سے مناسبت رکھتی ہے تو جہانداری حال کے ساتھ۔ اصل فطرت کے ساتھ برابر کی دونوں کو نسبت ہے۔ علم کو ظاہری اسوۂ حسنہ سے، تو حال کو باطن کے اندرونی کوائف سے۔ علم مخلوق سے خالق کی طرف

جاتا ہے، تو حال خالق سے مخلوق کی طرف آنکلتا ہے۔ ایک عبادت اس لیے کرتا ہے کہ معرفت نصیب ہو دوسرا اس لیے کہ معرفت اسے سر اٹھانے نہیں دیتی، اور اپنے سامنے سر بسجود رکھتی ہے، بلکہ اس کے سوا وہ اپنے اندر چارہ نہیں دیکھتا۔ ایک کا سرا خالق تک ہے اور دوسرے کا سرا مخلوق کی حد سے شروع ہوتا ہے۔ ایک کا رُخ اوپر کی طرف ہے اور دوسرے کا منہ نیچے کی طرف۔ ایسی صورت میں کس کی مجال ہے کہ حال کو علم سے کم کہے، اور حال سے بڑھ کر علم کا شیدائی ہو۔ وہ تمام باتیں جو سننے میں آئی ہیں، وہ ان لوگوں کی ہیں جو یک سُو ہو کر اپنے فیصلے دیتے ہیں۔ اور جس کی دونوں آنکھوں میں بصارت ہے۔ وہ کلی فیصلہ کا حق خدائے علام الغیوب کے حوالے کر کے دم بخود رہتا ہے۔

حضرت پیر دستگیر غوث الاعظمؒ کو حال نے غوث بنایا، یا قال نے ؟ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو علم نے عزت بخشی یا تصوف نے ؟ حالانکہ وہ تصوف کے نہایت باریک بین عارفین میں سے تھے۔ اسی طرح محی الدین ابنِ عربیؒ صاحب سے حال نے وہ سب کچھ کہلوایا جو انہوں نے کہا یا علم نے ان کی زبان درازی کی۔ پھر باوجود حال بلند ہونے کے وہ کچھ نہ کر سکے ۱۲ جو غوث الاعظمؒ کر گئے۔ آخر اس کی وجہ کیا؟ غوث الاعظمؒ بھی بلند مقام رکھنے کے ساتھ تصانیف بلند کے مالک ہیں اور ابنِ عربیؒ بھی تصانیف غریبہ رکھتے ہوئے مقاماتِ عالیہ سے سرفراز۔ دونوں سے حال نے ہی سب کچھ کہلوایا۔ لیکن غور کیا جاوے تو ایک کے اندر علم کی خاصی باریکی حال کے اندر پہنچ گئی ہے جو اس کے علم کو اتنے بلند درجے پر لے گئی کہ عقل حیران ہے۔ اسی وجہ سے جن کی سمجھ سے بالا ہو گئی، انہوں نے اسے پایۂ اعتبار سے گرا دیا۔ یہ باریکی علم بھی تو حال نے پیدا کی تھی۔ بخلاف غوثِ اعظمؒ وہ اپنے حال میں مست جو کچھ لکھتے ہیں حال کی تیزی ہی سے، اپنی دلی زبان سے گاہ بگاہ کچھ گنگناتے لکھتے ہیں، ورنہ ذاتی طور پر اس کی طرف رُخ نہیں۔

زیادہ واضح مثال دیکھنا چاہیں تو ایک نظر عینی لحقائق امام السنۃ ابن تیمیہؒ (اور)

Marfat.com

امام الہدیٰ ابن جوزیؒ پر نظر ڈالیں۔ وہ صرف سنتِ نبویؐ کے اندر فکر و غور کرنے سے کس مقام پر پہنچے! آخر ان کا علم حال میں تبدیل ہو گیا اور ان کے حالی علم نے ہزاروں لاکھوں کو گھسیٹا اور اپنے حالی علم میں اتنے غوطے دیئے کہ کسی کو خبر تک نہ رہی اور اسی نشہ میں مرے۔ لیکن یہ حال الگ ہے جو علم سے ناشی ہوا۔ اور وہ حال الگ جو معلوم سے پیدا ہو کر اس کی صفات کی طرف متوجہ ہوا۔ بہر صورت صفات سے ذات کی طرف جانا اور ذات سے صفات کی طرف متوجہ ہونا اپنے اثرات دونوں الگ الگ رکھتے ہیں۔ عملاً آخری توحید یعنی ذات سے صفات کی طرف جانا زیادہ مؤثر ہے۔ اور یہی فطرتی توحید کا حقیقی رنگ ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام خالق سے مخلوق کی طرف متوجہ ہوئے۔

الغرض ذات سے جب کلی تعلق پیدا جاتا ہے تو صاحبِ حال کسی نہ کسی صفت سے ذات کی طرف خود بخود اپنی ذاتی فطرت کے مطابق جس کی استعداد اس کے اندر ودیعت فرمائی گئی ہوتی ہے، متوجہ ہوتا ہے۔ کوئی صفت علم کی طرف اور کوئی صفت تکوین کی طرف۔ پہلے کی انتہا قطب ارشاد پر ہے اور دوسرے کی اخیر قطب مدار پر۔ بہت کم ایسی خوش نصیب پاک ہستیاں بھی ہیں جن کو دونوں صفات میں طیران نصیب ہو کر بیک وقت قطب ارشاد و قطب مدار ہو کر دنیا میں روشن ہوئی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس تمام صفات ذاتیہ کا یہی حال ہے۔ ذات کا حال جس صفت کی طرف متوجہ ہو گا، اسی صفت کی تکمیل ہو گی۔ اور اسی صفت کا ظہور صاحبِ حال کی ذات میں زیادہ بلند ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اولیاء کلی فضیلت حاصل نہ کرنے کے باوجود کسی ایک صفت کی وجہ سے دنیا میں کامل شہرت رکھتے ہیں۔ بخلاف دیگر کہ مجموعاً وہ افضل ہوتے ہیں لیکن خاص حال پیدا نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنا پایہ بلند نہیں پاتے۔

مجدد اعظم علیہ الرحمۃ کا کارنمایاں بظاہر وہی کچھ ہے جو امام السنۃ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کا ہے۔ لیکن ان کے اندر اور جذبہ کار فرما ہے اور مجددؒ کے اندر اور۔ یہ حکم ذاتِ خصوصی سے سب کچھ کر رہے ہیں اور وہ حکم عمومی ذات سے یعنی قرآن و حدیث کے عام حکم کے ماتحت۔ اور یہ حضرت وہی کرتے ہیں جو اُن کو خود الہاماً کہا جاتا ہے، وہ کوئی

Marfat.com

مثالی صورت تقرب کی خود نہیں دیکھتے اور نہ اپنے تقرب کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور یہ اپنے تقرب کے مناصبِ عالیہ خود دیکھتے ہیں، اور ساری دنیا کو ان سے روشناس کرانا اپنا فرض جانتے ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ آپ کا حال جب نہایت بلند ہوا اور سیر فی اللہ پر گامزن ہوئے تو آپ کی سیر کا رخ اس علم کی طرف تھا جو اپنے اہل تدریس سے حاصل کیا تھا، اور جس کی امواج نے کسی زمانہ میں آپ کو اپنے اندر مستغرق کر رکھا تھا۔

باوجود انتہائی صاحبِ حال ہونے کے آپ ہر حرکت ناپسند شرع اور علم پر ملامت کرتے تھے۔ بخلاف اہل علم کے کہ وہ کھوکھلے ہو چکے تھے اور ظاہری تقلید اور خشک زہد کے سوا ان کے اندر کچھ نہ رہا تھا۔ تاہم کسی موقعہ پر آپ ان کو ملامت نہیں فرماتے بلکہ آپ ان کی اصلاح فرماتے ہیں اور حقائق و معارف بیان فرما کر ان کا دل متوجہ فرماتے ہیں۔ الغرض آپ کے حال نے علم پر وہ آب و تاب دی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے اور ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی آواز اٹھنے لگی۔ اہل علم نے اپنی صداقتِ علمی کو ایسے رنگ میں دیکھا جو پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اہل حال نے اپنے نقائص اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر اپنے مولا کا شکر ادا کیا کہ ان کو اس زندگی میں استغفار حقیقی پڑھنے کا موقعہ میسر آگیا ورنہ ہمیشہ کے لیے پچھتاتے۔

قرآن پاک کو دیکھیں گے تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ سراسر عقل و علم و دانش ہے۔ لیکن یہ تمام عقل و دانش اور علم کس سے پیدا ہوا۔ یہ سراسر حال سے پیدا ہو کر تمام عقول انسانی کو اپنی طرف متوجہ کرنے والا تھا۔ لیکن یہ صرف عقول کو روشن کرنے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ دلوں کو صاف کرنے کے لیے اور روشن کرنے کے لیے نازل ہوا۔ اور ایسے حال میں جبکہ نبوت سراسر حال ہوتی تھی اور عقل کی گرفت سے بالکل آزاد ہوتی تھی، ایسے حال میں کون انسان صحیح الفطرت ہے، جو حال کی اہمیت سے انکار کرے اور علم کو بلند پایہ کہے۔

نبی کریم ﷺ کو جب فطرت مطلقہ تسلی دیتی ہے تو فرماتی ہے اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ [۱۳]۔ نبوت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے

کہ صراط مستقیم پر اس کی فطرت ہوتی ہے۔ یعنی ایک میانہ روی پر۔ سو اس حیثیت سے وہی صوفی بلند پایہ ہے جو صراطِ مستقیم کی راہ پر ہو نہ کہ حال میں مست ہو کر مجذوب ہو گیا ہو یا قال میں محو ہو کر اپنی شان گرا بیٹھا ہو۔ یہ دونوں حال فطرت سے دور ہیں۔ بلکہ حال و قال کی آمیزش سے ایسا معجون مرکب تیار ہونا چاہئے کہ دونوں میں تمیز کرنی مشکل ہو جائے۔ بلکہ ایک دوسرے سے جُدا نہ کیا جا سکے۔ یہی خصوصیتِ ممتاز ہے، جس نے حضرت مجددؒ کو مجددیت کے بلند منصب پر سر فراز فرمایا۔ ورنہ آپؒ سے بڑھ کر کئی ہستیاں اسلام کے اندر ایسی گنی جا سکتی ہیں جن کے علم و معارف کا پایہ بہت بلند ہے اور جن کی خدماتِ اسلامی اتنی ہیں کہ تمام دنیائے اسلام اوّلاً و آخراً ہمیشہ کے لیے فائدہ اُٹھاتی رہی اور اٹھاتی رہے گی۔ مثل مشہور ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تو پھر ایسی پاک ہستیوں کے کارناموں کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے خواہ وہ علمی ہوں یا حالی۔ احیائے دین کے دو شعبے ہیں۔ ایک اندرونی تقویت، ایک بیرونی اشاعت۔ دوسرے شعبہ کا مدار پہلے پر ہے۔ اور پہلا جب تک موجود نہ ہو دوسرا پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت مجدد کا بڑا کارنامہ اندرونی تقویت ہے اور زیادہ تر آپؒ اسی میں متصرف رہے لیکن یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا [141] کا طغرائے امتیاز سلطان الہندؒ کو سر زمین ہندوستان میں نصیب ہوا۔ ایسی صورت میں سلطان الہندؒ کو کیونکر گرایا جا سکتا ہے؟

آج ہر دو پاک نفوس کے مزاراتِ پُر انوار پر حاضر ہو کر تماشہ دیکھئے تو بالکلیہ ان کی زندگی پاک کا تمام نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ سلطان الہندؒ کے مزار پر اپنے پرائے کی تمیز نہیں۔ شاہ و گدا یکساں نثار ہو رہے ہیں۔ سیاہ کار سے سیاہ کار بھی روشن ترین دل کے دوش بدوش کھڑا نظر آتا ہے۔ اور خواہش اور مطلوب کے لیے دردمندانہ توجہ اس قدسی صفات کی طرف تمام عالم کی ہے۔ حتیٰ کہ جو اسلام سے سر فراز نہیں وہ بھی ان کے درِ دولت پر عقید تمندانہ جا کر اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

بخلاف حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ کے، حلقہ اتنا وسیع نہیں۔ جو ہیں وہ بھی اپنے پاک نفوس کے سوا، کسی کی طاقت نہیں کہ آنکھ اٹھائے، اور وہ بھی صرف صفائی قلب

Marfat.com

کے لیے اور بس۔ کچھ اور مانگنا ہو تو اس دربار میں اس کے لیے گنجائش نہیں۔ اگر ہے بھی تو پھر اپنوں کے لیے، غیروں کو یہ دروازہ کھٹکھٹانا گناہ نہیں تو معیوب ضرور ہے۔ یہاں قرآنِ پاک ہے اور مراقبہ۔ اس کے سوا کسی دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔

الغرض اگر تمام اولیائے کرام پر آج نظر ڈالی جاوے یا ان کے مزاراتِ مقدسہ پر حاضر ہو کر دیکھا جاوے تو جو کچھ وہ اپنی زندگی میں تھے ایسے ہی آج کچھ نظر آرہے ہیں۔ جس طرح وہ اپنی حیات ظاہر میں اپنے اخلاق اور مراتب و کوائف رکھتے تھے اسی طرح بعینہ ان کی مزارات پورا پورا رفعت کا پتہ دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی درماندہ اپنی بصارت سے جو کچھ بد اہتاً دیکھے اور بیان کر دے تو اس کے معنی یہ نہ ہوئے کہ اس نے کسی بزرگ ہستی پر اعتراض کیا ہے یا اس کی عیب جوئی کی ہے یا تنقید یہ جو کچھ لکھا گیا مختصراً لکھا گیا۔

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

حضرت قبلہ جد امجد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت سرہندیؒ کے ادنیٰ سلسلہ ذاروں سے ہیں۔ یہ ناقص، کروڑوں درجہ ان سے بھی کم ہے۔ چہ جائیکہ حضرت سرہندی رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ جو کچھ ہے علمی مذاق کی وجہ سے لکھا گیا ہے۔ ورنہ حالانکہ یہ سب کچھ گناہ ہے۔ مولیٰ کریم معاف فرماوے!

حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ اور سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر ہو چکا ہے۔ تیسرے نمبر پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی زندگی اور حیاتِ طیبہ کا اجمالی عکس بھی سامنے کر دیا ہے۔ لیکن اس امام الہندؒ کے مزارِ پُر انوار کا نقشہ گو اصحابِ علم سے پوشیدہ نہ ہوگا اور نہ اصحابِ باطن سے کچھ چھپا ہوا ہے لیکن ناظرین کے ذہن میں لانے کے لیے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ دلی میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو آپؒ کے مزارِ پُر انوار کے دیکھنے کا شوق دامنگیر ہو یا ان سے کوئی خاص عقیدت علمی عقیدت کے سوا روحانی ہو، جو کسی کو بے اختیار اس درِ دولت پر لے جاوے۔ بلکہ اکثر باشندگان ان کی ذاتِ بابرکات کی شناسائی سے بھی محروم۔ چہ جائیکہ اُن کو ان کے مسکنِ

دائمی پہ جانا نصیب ہو۔ ترکمان دروازہ کے باہر وہ جس خاموشی سے لیٹے ہوئے ہیں، ان کی ذاتی کیفیت کی سادہ مثال یا ایک ظاہری نمونہ ہے۔ نہ زائرین کا اژدہام ہے نہ مجاورین کا شور و غل۔ نہ مقبرہ کی شان و شوکت والی عمارت سر پر۔ ایک سادہ قبر کے نیچے اپنی سادگی، اور اپنے تخیل علوی میں لیٹے ہوئے ہیں۔ کسی آنے جانے والے کی طرف التفات تک نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی کسی تالیف میں مصروف ہیں۔ کوئی جاتا بھی ہے تو چار قل کا فاتحہ پڑھ کر اٹھ آتا ہے۔ کسی کے نہ آنسو پھوٹتے ہیں اور نہ کسی کو کوئی کیفیت ملتی ہے۔ غرض جیسے زندگی میں تھے ویسے ہی زندگی کے بعد اب دکھائی دیتے ہیں۔ علماء کرام جن کو آپؒ کی ذات کے ساتھ بڑی دلبستگی اور بھاری عقیدت ہے وہ بھی آپ کے علمی تذکرہ کے سوا اپنے منہ سے کچھ نہیں نکالتے۔ اوّل تو کسی کو وہاں تک جانا نصیب نہیں۔ اگر کوئی گاہ بگاہ چلا بھی جائے تو اسے گھر پلٹنے کا خیال جانے سے پہلے آدھمکتا ہے۔ قبر کا نقشہ بعینہٖ اپنی زبانِ حال سے اپنے زائر سے کہتا ہے ؎

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

دلی بھر میں کسی کو آپ کے دامن تلے سونے کا خیال تک نہیں کہ اس آفتابِ علم و حکمت کے سایہ کے ساتھ قیامت کو اٹھوں۔ لیکن اس کے مقابلہ پر شاہ نظام الدین اولیاءؒ کو دیکھئے۔ دلی سے چھ سات میل کے فاصلہ پر آپؒ کا مزار پُر انوار ہے۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہے۔ مجاورین کی بھیڑ بھاڑ کہ الٰہی توبہ۔ کسی کا دامن کھینچتے ہیں، کسی کو گھسیٹتے ہیں لیکن خلق اللہ ہے کہ ایک روضے کے اندر داخل ہوتی اور دوسری نکلتی ہے۔ نظر اُٹھا کر گرداگرد دیکھئے تو ایک دنیا ان کا سہارا لیے بیٹھی ہے۔ اعیان مملکت اور وزیرانِ سلطنت پر بھی قدم پڑتے ہیں اور وہ بھی بیکسی کی صورت میں کچھ کہتے ہیں تو اپنی بیکسی ظاہر کرنے کے لیے ؎

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزارِ مرا
کہ سبز پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

دلی کا کوئی ایک بھی باشندہ ہو گا، جس کے دل میں یہ تڑپ نہ ہو گی کہ میری قبر کو نظام الدینؒ میں جگہ ملے یا باقی باللہؒ میں۔ سیاہ سے سیاہ دِل بھی جس نے کبھی اپنے مولا حقیقی کے سامنے سر خم نہیں کیا۔ جب روضہ کے سامنے جاتا ہے اور قبر سے آنکھ لڑتی ہے تو طبیعت بھر آتی ہے، آنسو پھوٹ آتے ہیں، ہچکیاں شروع ہو جاتی ہیں اور تمام سیاہ نامۂ اعمال سامنے آجاتا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا؟ کیا شاہ صاحب فنا و بقا سے نہیں گزرے یا وہ ولایت حقہ کے مالک نہ تھے، یا ان کی ذات ستودہ میں کچھ کمی تھی یا علم و عمل میں کچھ کسی سے کم تھے یا خود وہ ایسا چاہتے تھے؟

بہر صورت سوچ اور غور کا مقام ہے اور سرسری گذرنے کے قابل نہیں۔ جیسے پہلے لکھا گیا، علم سے معلوم کی طرف جانا، یا معلوم سے علم کی طرف آنا یعنی خلق سے خالق کی طرف جانا، اور خالق سے خلقت کی طرف آنے میں بہت بھاری فرق ہے اور اتنا ہی جتنا زمین و آسمان میں بلکہ اس سے بھی بلند۔ اسی طرح ذات کی فنا اور صفات کی فنا میں بھی ایک زمین و آسمان کا بلکہ عرش کا فرق ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بقائے ذات اور بقائے صفات کا فرق اسی درجہ پر ہے۔ ایک کی فنا و بقا ذاتی ہے، اور دوسرے کی صفاتی ہے، تو پھر کیونکر اثرات و نتائج میں فرق پیدا نہ ہو۔

صفات داخل ذات ہوں یا خارجِ ذات۔ جہاں وہ باعث ظہور ذات ہیں وہاں وہ حجابِ ذات بھی تو ہیں۔ حُسن، جہاں ظہور ذات کا باعث ہے وہاں حجاب ذات بھی تو ہے۔ جیسے قبح، ذات کی خوبیوں کا حجاب ہے ویسے حسن، ذات کے قبائح کا حجاب ہے۔ لباس جہاں خوبصورتی بڑھاتا ہے اور حسن کو ظاہر کرتا ہے وہاں خوب صورتی اور حسن کا پردہ پوش بھی تو ہے۔ جسم روح کیلئے جہاں باعث ظہور صفات ہے وہاں باعث حجاب روح بھی تو ہے۔ سالک کی صحیح سیر اسی وقت فی اللہ ہو گی جب ذات کے اندر سیر ہو۔ اور صفات کی طرف اس کی توجہ نہ جائے۔ مازاغ البصر وما طغیٰ کی حقیقت پر آنکھ ادھر ادھر نہ بھٹکے، عمر بھر اسی میں رہے۔

لیکن اگر اس کی سیر کا رُخ ذات سے ہٹ کر صفات کی طرف پھر گیا تو جہاں

Marfat.com

وہ منشاء ذات کے احکام کے مطابق کتنا ہی کیوں نہ ڈھلتا جائے گا لیکن صفت میں انہماک سے ذات سے دُوری ہوتی جائے گی۔ مثلاً صفت علم ہے کہ سالک کو رُشد کے اندر انہماک ہے اور اس کے اندر استہلاک سے اُسے روکے گی۔ سالک کی ذات پر صفت علم کا حجاب آجائے گا جو ذات کے مشاہدہ سے اسے روکے گا، اور جمال حقیقی کا مانع ہو گا۔ اس صورت میں فناوبقاذاتی نہ رہے گی، بلکہ فناوبقا صفاتی سے تبدیل ہو جائے گی اور اس کے اثرات و نتائج وہی پیدا ہوں گے جو صفات کو مقابلۂ ذات کے درجہ پر ہوا کرتے ہیں۔

مظہر ذات مظہر صفات ہوتا ہے لیکن مظہر صفات مظہر ذات نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ صفاتِ متقابلہ یا متخالفہ کے اندر بیک وقت استہلاک و انہماک ناممکن ہے مثلاً صفاتِ جلالیہ و جمالیہ کا اکٹھا ہونا اور ان دونوں کے کمال کا حاصل ہونا ناممکن اور محال ہے۔ کیونکہ ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب ہے۔ بخلاف مظہر ذات کے کہ وہ اپنے اندر ذات کے انعکاس سے سب کچھ مہیا کیے ہوتا ہے جو ذات جل و علیٰ کی ذات مجمع الصفات کے اندر ہے۔ اسے جلال کے ساتھ بھی وہی محبت ہے جو جمال کے ساتھ ہے اور محبت سے بھی ایسے خوف کھاتا ہے جیسے قہر سے۔ یا قہر کو بھی وہ ویسے لطف جانتا ہے جیسے مہر کو۔ غرض دونوں سے یکساں بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مظہر ذات سے سراسر رُشد، سراسر ہدایت کیوں کر پیدا ہو، جب کہ اس کی مظہریت کے اندر ضلالت کو بھی وہی نسبت ہے جو رشد کو۔ خصوصاً اُس کے مقابلہ میں جو سراسر رشد وارشاد کی صفت میں کامل انہماک اور استہلاک رکھتا ہو اور رات دِن اس کے اندر کوشاں ہو۔ لیکن غور کیا جائے کہ خود ظہور ذات رشد وارشاد، خیر واصلاح کے سوا کیا ہے۔ اس کی صفت مضل کا ظہور بھی تو سراسر رشد وارشاد ہے لیکن اسے وہی دیکھتا ہے جس کو اس کی راہ میں راہ ہو ورنہ دوسرے کسی بےخبر کو کیا خبر ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر جاں زنی یارے بود

Marfat.com

آیئے اور غور کیجئے کہ سلطان المشائخؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے رشد وارشاد میں کس کا پلہ بھاری ہے؟ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر آج تک ان کے سلسلہ پر ایک طرف نظر دوڑائیے۔ دوسری طرف شاہ صاحبؒ سے لے کر تا ایں دم ان کی تمام کڑیوں کو پورے فکر سے دیکھئے کس سلسلہ میں رشد ارشادِ حقیقی کا پلہ وزنی ہے؟ شاہ صاحبؒ نے سینکڑوں کتابیں صراطِ مستقیم کے واضح کرنے اور اس سے وہ کدورتیں دُور کرنے کے لیے لکھ دیں جو اس راہِ اسلام میں آکر مخل راہ ہوئی تھیں اور آپؒ کے متبعینِ سلسلہ بھی آپؒ کے قدم بقدم چل کر صراطِ مستقیم یا دینِ حق کو واضح اور صاف کرتے رہے۔ اس سلسلہ کی تمام خدمات ان لوگوں کے لیے نہایت مفید ہیں جو اسلام سے روشناس ہو کر اس پر کمر بستہ تھے اور صرف واضح راہ کے متلاشی تھے۔ لیکن یہ کوشش ان لوگوں کے لیے بالکلیہ بے سُود ہے، جو اپنی گردن کو اسلام کے سامنے ابھی تک صحیح معنوں میں خم نہ کر سکے، گو وہ ظاہراً مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ بخلاف سلسلۂ سلطان المشائخ کے کہ انہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ آئندہ نسلیں اس کو دیکھ کر اپنا مسلک صاف کریں، یا بنائیں۔ لیکن اس سلسلہ کے اندر وہ جاذبیت ضرور آج تک ہے کہ جو بھی سامنے آیا سر بسجود اسلام ہوا، اس کی گردن خود بخود اسلام اور صاحب اسلام کے لیے جھک گئی اور اس نے اپنی گردن میں وہ قلادہ وسیع ڈالا کہ مرنے سے پہلے کسی صورت جدا کیا ہوتا، قبر کی تنگ و تاریک کوٹھی میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ جس درجہ کے آدمی اس سلسلہ نے پیدا کیے، اُس سلسلۂ عالیہ شاہ ولی اللہؒ کے اندر پیدا نہیں ہو سکے۔ اگر سلسلہ کے ایک ایک نفس پر نظر دوڑائیے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں تک سچے مسلمان بنائے جو قبروں میں سوئے ہوئے آپ کو نظر آئیں گے۔ یہ میں ہی نہیں کہہ رہا بلکہ ساری دُنیا یہی کہتی ہوئی گزری۔ آخر اس کی وجہ کیا یہی نہیں کہ یہ مظہر ذات ہیں اور وہ مظہر صفات۔

انبیاء علیہم السلام کو جب کبھی نبوت یا رسالت کے درجہ پر سرفراز فرمانے کا ارادہ ازلی ہوتا ہے تو پہلے خالق اللیل والنہار ان کے دلوں پر توحید کے دروازے کھولتا

Marfat.com

ہے اور توحید کے معارف واسرار کے خزانے ان کے حوالے ہوتے ہیں۔ اس وقت صاحبِ توحید پر عبودیت مطلقہ کا حال وارد ہوتا ہے۔ اس حال کے آنے سے تمام قلوبِ انسانی قلبِ نبوت کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں، جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قلب نبوت سے سیراب ہو کر ابدی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال اولیائے عظام کا ہے کہ جب فنائے مطلق میں پہنچ کر عبودیتِ مطلقہ حاصل کر لیتے ہیں تو پھر پتھر سے پتھر دل ہی کیوں نہ سامنے آئے، موم ہوتا جاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ جن کے بارے میں حکم ہوتا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔

الغرض، توحید کامل اور عبودیتِ مطلقہ سب سے پہلے غفلت کا پردہ دل سے اُٹھاتی ہے اور دل کو جیتا کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کی بینائی کے لیے صراطِ مستقیم یا قانونِ فطرت یا بالفاظ دیگر دینِ حق ان بینا قلوب کے لیے پیش کرتی ہے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر راہِ نجات پر قدم زن ہوں اور ابدی فلاح پائیں۔

اُولوالعزم انبیاء علیہم السلام اور رسل دونوں صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ اور ایک طرف وہ دل کی آنکھ سے پردہ چاک کرتے ہیں، اور دوسری طرف دین حق کا صراطِ مستقیم پیش کرتے ہیں۔ لیکن اولوالعزم کے سوا باقی انبیاء علیہم السلام صرف پہلے درجہ پر فائز ہوتے ہیں کہ آنکھوں کو بینا کرتے ہیں، لیکن صراطِ مستقیم یا قانونِ فطرت کے اندر کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ اپنے سے پہلے دین کے داعی ہوتے ہیں اور ان کے لیے افرادامت پیدا کرتے ہیں۔

ائمۂ مجتہدین اور مجددین کی کوششیں زیادہ تر اسی دوسرے حصہ یعنی صراطِ مستقیم کی وضاحت یا قانونِ فطرت کی جزئیات کی نشاندہی میں ہوتی ہیں۔ یا ان بدعات کے قلع قمع میں ہوتی ہیں جو اس راہ میں پیدا ہو کر خلل انداز براہ سالکین ہدایت ہوتی ہیں۔ اس کے سوا اس کے اندر وہ مادہ اور استعداد بہت کم ہوتی ہے، جو اصل رشدوارشاد کی جڑ ہے۔ یعنی دل کی بینائی پیدا کرنا اور سیاہ اور قسی دِل کو روشن کرنا یا کافروبے دین کو

مسلمان یا دین دار بنانا۔ یہ چیز بدرجۂ اتم ان لوگوں میں ظاہر ہوتی ہے، جو توحید میں کامل اور عبودیت میں راسخ ہو کر مظہر ذات کی جلوہ گری میں ظہور پذیر ہوں۔ یہ بیک وقت دلوں کو بینا کرتے ہیں اور دلوں کو جمالی طریقہ اور صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں۔ بلکہ صراطِ مستقیم پر ان کو گامزن کر کے انتہائے سعادت یعنی عرفان کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ بخلاف اول کے کہ وہ صراطِ مستقیم کی وضاحت کے سوا کچھ زیادہ اپنے میں ہمت نہیں پاتے کہ امت کو اس پر چلنے کی دعوتِ عامہ دے کر ان کے ہمراہ ہو کر صراطِ مستقیم کی آخری سرحد پر پہنچادیں۔ ان کے ذہن میں اسلام کا آخری منتہا یہ ہے کہ انسان کے اعمالِ صالحہ اپنی تکمیل کو پہنچیں، اور ان سے وہ فوائد و برکات اٹھیں، جو اس دنیا کی تکمیل کرتے ہوئے آخرت کے اندر بھی بار آور ہوں۔ بخلاف طبقہ اوّل کہ اس کا منتہائے مقصود اعمال نہیں، بلکہ اعمال سے بلند ہو کر اس دنیا اور اس عالم سے باہر مقصودِ آخری صرف عرفانِ ذات ہے اور بس۔ اس سے پہلے کا تمام سلسلہ ان کے لیے ایسا ہے جیسے درخت کے لیے شاخ و برگ، لیکن درخت کا حقیقی فائدہ صرف ثمرہ اور پھل ہے اور بس۔

ایسی صورت میں فیصلہ کرنا کیا مشکل ہے کہ مظہر ذات کون لوگ ہیں اور مظہر صفات کون بزرگ، کس کو اصل ذات کے ساتھ محبت ہے اور کس کو صفات کے ساتھ، کون سے لوگ ہیں جو عبودیت ذاتی سے سرفراز ہیں اور کون سے اصحاب ہیں جو عبودیت صفاتی سے متصف، کن بزرگواروں کو توحید ذاتی نصیب ہوئی اور کن کو توحیدِ صفاتی۔ غرض تھوڑی سی فکر سے تمام معاملہ صاف ہو جاتا ہے اور اس اُلجھاؤ کے دُور ہونے کے بعد کوئی مشکل نہیں رہتی کہ کون سے بزرگوں کی فنا و بقا ذاتی ہے اور کون سے اصحاب کی صفاتی۔

صاحب نبوت اور رسالت کے اندر توحید ذاتی اور صفاتی، عبودیت ذاتی اور صفاتی اور محبت ذاتی و صفاتی مساوی درجہ کی ہوا کرتی ہے۔ صفات کے بغیر وہ ذات وحدہٗ لاشریک کو ویسے ہی جانتا ہے جیسے صفات کے ساتھ متصف ہونے کے بعد۔ ایسے ہی

Marfat.com

عبودیت ذاتیہ توحید ذاتی کے مقابلہ پر جب ظہور پکڑتی ہے تو اس جل وعلا کی کبریائی کے سامنے اپنی عبودیت کے سوا چارہ نہیں دیکھتی تو توحید صفاتی کے مقابلہ پر عبودیت صفاتی سے متصف ہو کر مقامِ محمود کی متمنی ہوتی ہے۔ ذات سے فطرتاً محبت ذاتی بھی ہے۔ جیسے ماں کو بیٹے سے یا بیٹے کو ماں سے، اور صفاتی بھی ہے کہ رازق وخالق ہے اور رحمٰن الرحیم ہے اور رب العالمین ہے اور مساویانہ اعتدال اُمت میں کسی کو بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ اسی اعتدال (المشابہ بالنبوۃ) ہونے کی وجہ سے مجدد کہلائے۔ دوسری طرف صراطِ مستقیم کی شاہراہ کو بدعت سے پاک کر کے دین کی تجدید فرماتے گئے۔ آپؒ صرف ایسے مجددؒ نہیں ہوئے کہ تجدید دین اور احیائے دین کے سبب تو بہم پہنچائے ہوں لیکن عام خلق اللہ کو اس کی دعوت نہ دی ہو۔ جیسے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ قبلہ کہ وہ تمام کچھ مہیا کرایا جس کی دین کو ضرورت تھی اور جس سے شاہراہ صراطِ مستقیم واضح اور بے خطر ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ایک عام دعوت نہ دے سکے جس کیلئے وہ سب کچھ مہیا کیا گیا تھا۔ خواہ فرصت نہ ملی، خواہ اس کی استعداد ہی ودیعت نہ فرمائی گئی۔ اسی وجہ سے بعض اکابر نے کھلا اقرار کیا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے مجدد دین کا خاکہ پیش کیا۔ اور سید صاحب شہیدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ ان کے مجددیت کے مہتمم ہوئے۔ گویا مجددیت کے کام کو تین ہستیوں نے سرانجام دیا۔ تاہم وہ ابھی تک ویسے بار آور نہ ہوئی جیسے چاہئے تھی۔ بخلاف مجدد الف ثانی کے کہ تھوڑا بہت جو کچھ ان کی نگاہوں میں تھا یا جس کے لیے وہ منتخب ہوئے تھے، وہ اپنی زندگی میں ختم کر کے تشریف لے گئے۔ ایسی صورت میں فیصلہ کرنا گو مشکل ہے۔ تاہم غور کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کس کا درجہ رشد وارشاد کے اندر بلند ہے۔

ذات کے حصول سے پیشتر صفات واصل ذات ہونے کا باعث ہوا کرتی ہیں لیکن حصولِ ذات کے بعد صفات کی طرف توجہ ذات سے دُوری کا باعث اور حجاب ہوتی ہیں۔ اور جتنا شغل صفات کے اندر زیادہ ہوتا جائے گا، ذات کا تعلق حجاب میں آتا جائے گا۔ خصوصاً ایسے صفات جن کا تعلق وجدان اور ادراک کے ساتھ وابستہ ہے۔

Marfat.com

کیونکہ ذاتِ بابرکات جل و علا کا قرب ذاتی تمام کائنات کے ساتھ یکساں ہے، کائنات کے ذرّہ ذرّہ کے ساتھ وہی ہے جو ایک پاک دِل کے ساتھ ہے۔ البتہ وجدانی اور ادراکی تقرب جو حضرتِ انسان کا خاصہ ہے اور اسی پر تمام تقرب کے آثارِ عالیہ مرتب ہوتے ہیں، اور یہی تقرب و جدانی انبیاء علیہم السلام کے مدارج عالیہ اور اولیائے عظام کے مناصب جلیلہ کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کوئی سالک یا عارف کسی وجدانی یا ادراکی صفت کے اندر شاغل ہوتا ہے تو اس ادراک حقیقی سے کیونکر نہ تسلیم کیا جائے کہ اس کے ادراک کا رُخ تبدیل نہیں ہوا اور وہ ذات سے صفات کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

آیئے ایک طرف سلطان المشائخ کے مشاغل واذکار اور دوسری طرف حضرت شاہ صاحبؒ کے اشغال وافہام کا مقابلہ کر کے دیکھئے کہ کس کا ادراک صرف ذات کی طرف ہے، اور کس کا ادراک صفات کی طرف متوجہ ہے۔ شاہ صاحبؒ ایک اچھے خاصے امیر ہونے کے علاوہ صاحب درس و تدریس بھی اور اہلِ تالیف و تصنیف بھی تھے۔ تدریس بھی یہ نہیں کہ صرف ایک خاص مضمون کی، حدیث و تفسیر کے علاوہ ہر علم میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے اور ہر آنے جانے والا آپؒ کے فیض علمی سے سیراب، کیا منطق کیا فلسفہ، کیا حدیث و تفسیر، ہر قسم کے طلاب زانوئے تلمذ تہہ کیے بیٹھے نظر آتے تھے۔ لیکن اس پر ہی اکتفا نہیں تھی۔ جب دار التالیف میں قدم رکھتے، تو گاہ تصوف گاہ تفسیر قرآن حکیم میں وہ بے مثال علوم و معارف کے انبار لکھتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ لیکن طبیعت نے ذرا فرصت پائی تو دار الحکمت میں جا کر اقتصادیات اور معاشیات کا فلسفہ سامنے آگیا اور بے اختیار اس پر لپک گئے اور انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کو اپنی بلند فطرت استعداد سے اسلامی طریقہ پر ایسے حل فرمایا کہ کسی کو آج تک اس پر حرف گیری کا موقع نہ ملا۔ غرض اسلام اور اسلامیات کا کوئی ایک پہلو ایسا بھی نہیں جس پر آپؒ نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ بدعات کا خیال آیا، ازالۃ الخفا اور البلاغ المبین لکھنے بیٹھ گئے۔ اور تصوف کا رنگ غالب ہوا، الانتباہ فی سلاسل الاولیاء لکھ دی۔ غرض ایک دل

Marfat.com

اور سینکڑوں فکر۔ مانا یہ سب کس کے لیے ؟ صرف اسی کے لیے۔ جس کے لیے سلطان المشائخ کی نظر کی کیا مجال کہ نقطۃ التوحید سے عمر بھر ادھر ادھر پھری ہو۔ وہ صرف اس ذات وحدہٗ لاشریک کی طرف ہی دیکھتے رہے۔ اور اس کے کارخانہ قدرت پر ہی نظر تھی اور بس۔ اس کے اندر چون وچرا کی گنجائش نہ دیکھی۔ عبادت و پرستش ذاتِ واجب الوجود کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور جو کچھ کیا وہ بھی اسی غرض و غایت کے لیے کہ ہر قدم حیرت کے اندر اور بڑھے اور اپنی ہستی موہوم فنا ہو کہ یہی اس کی بقا کے لیے دلیل ہے۔ نہ اقتصادیات و معاشیات اسلامی ان کی توجہ اپنی طرف کھینچتے، اور نہ تصوف کی باریک تراز مو معارف کے لکھنے کی اپنے اندر کوئی خواہش پاتے ہیں، نہ تفسیر وحدیث کے درس و تدریس کا اشتیاق انہیں اپنی طرف پھیرتا ہے۔ اگر ہے تو دیدارِ یار اور بس۔ اگر حاضری ہے تو اسی کی اور انتظار ہے تو اسی کا۔

ایسی صورت میں ان دونوں بزرگوں کو کیونکر ایک صورت میں دیکھا جائے اور کیونکر ایک درجہ میں رکھا جائے اور کیسے ان کے اندر جو قدرت نے فطرتی استعداد رکھی ہے، اس کی تمیز نہ کی جائے اور کیونکر ان کے کارناموں کو ایک کر دیا جائے۔ پھر جب کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو کیونکر ان کے ثمرے دیکھتے ہوئے ان کو ایک جگہ کھڑا کیا جائے اور کیونکر ایک کو فنائے ذاتی اور دوسرے کو فنائے صفاتی سے متمیز نہ کیا جائے۔ ایک پر قلبی کیفیت طاری اور دوسرے پر عقلی فکر غالب۔ ایک قلبی راہ دکھاتا ہے اور مرشد کہلاتا ہے، اور دوسرا علمی راہ چلا کر استاذ کے بلند منصب سے سرفراز۔

غرض یہ اور ہے وہ اور۔ اعمال و حالات ہی الگ نہیں بلکہ دونوں کے دل الگ الگ، فطرت الگ الگ، صورت و سیرت کا نقشہ الگ الگ۔ سب سے بڑھ کر دونوں کے ثمرات الگ الگ اور پرورش یافتہ الگ الگ۔ ایسی صورت میں مرنے کے بعد ان کے مزارات اور ان کے انوار و برکات الگ الگ ہوں تو تعجب کیسے۔ بلکہ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ کے مطابق وہی کچھ ہیں، جو کچھ وہ اپنی پاک زندگی میں تھے اور ہمیشہ رہیں گے جب تک دنیا قائم۔ کیا محمد رسول اللہ ﷺ وہی کچھ اب بھی اپنی قبر مبارک

میں نہیں جو اپنی پاک زندگی میں تھے۔ بس تو وہی شان جلالی و جمالی نظر آ رہی ہے۔ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ مَنْ زَارَ قَبْرِی فَکَاَنَّمَا زَارَنِی فِی حَیَاتِی (جس نے میری قبر کی زیارت کی اُس نے گویا مجھے حیاتی میں دیکھا)۔ کیا کسی کو اس سے انکار ہے؟ اگر نہیں تو کیونکر پھر وہی کچھ نہ دیکھیں جو کچھ وہ اپنی حیاتی میں تھے۔ آپؐ کے قدموں پر ویسے ہی خلقت نثار ہو رہی ہے جیسے آپؐ کی زندگی میں ہوا کرتی تھی اور وہی روضۂ مقدسہ کے دیکھنے سے وارفتگی پیدا ہوتی ہے جو آنحضرتؐ کے جمال پر انوار کی زیارت سے اصحاب پر وارد ہوتی تھی۔ جامیؒ کہتے ہیں ؎

زمہجوری برآمد جانِ عالم
ترحم یا نبیؐ اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی
زمحجوراں چرا فارغ نشینی

لیکن یہاں یہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے جس کی طرف بہت کم کسی کا ذہن منتقل ہو گا، کہ صفات کا شغل صفات کو بھی فنا کرتا ہے، اور خود ذات پر کوئی فنائیت کا اثر نہیں ہوتا۔ ذات کی طرف توجہ کرنا ذات کو فنا کے درجہ پر پہنچاتا ہے اور جس درجہ کی توجہ ذات کے اندر ہو گی اُسی درجہ کی فنائیت حاصل ہو گی۔ کمی بیشی کا انحصار توجہ پر ہے اور بس۔ مثلاً صفتِ علم کے اندر شغل پیدا کرنا صفتِ جہل کی فنائیت کا باعث ہو گا اور جتنا علم کے اندر انہماک زیادہ ہو گا، جہالت کم ہوتی جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس! تمام صفات متعاکسہ کا یہی حال ہو گا۔ لیکن خود ذات پر فنائے ذاتی کامل طور پر کسی صورت میں وارد نہ ہو گی۔ گو کہ ذات پر صفت کے اشغال سے اثر ہو گا، لیکن وہ بھی اس معیت کی اصل ماہیت کے مطابق ہو گا جو اس صفت کے اندر ذاتی اور فطرتی ہے۔

هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (پڑھے لکھے اور ان پڑھ برابر ہو سکتے ہیں؟) علم کا جذبہ انانیت بڑھاتا ہے۔ اسی طرح لاعلمی کا احساس انانیت کو کم کرتا ہے۔ اور تکبر کو زائل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے، قارون نے کہا۔ اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی

Marfat.com

عِلمٍ عِندِی (میں اپنے علم کی وجہ سے سب کچھ دیا گیا ہوں) اور کئی جگہ یہی ارشاد ہوتا ہے کہ علم کے بعد سرکشی کی وجہ سے اختلاف کیا۔ (فَمَا اختَلَفَ الَّذِینَ اُوتُو الکِتَابَ اِلَّا مِن بَعدِ مَا جَاءَ ھُمُ العِلمُ بَغیًا) (پس اختلاف نہ کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس وقت جبکہ ان کو علم حاصل تھا بغاوت کے لیے ایسا کیا)۔
رَبِّ زِدنِی عِلمًا (اے رب میرا علم بڑھا) کی دُعا یا علم کی فضیلت میرے اس نظریہ کے بر خلاف نہیں۔ علم ایک بڑی دولت ہے جیسے دولت سے تکبر پیدا ہونا فطرتی ہے، ایسا ہی علم سے بھی۔ کیونکہ وہ مادی سرمایہ ہے اور یہ عقلی سرمایہ۔ جیسے گاہ بگاہ دولت سے اچھے اچھے کام ہوتے ہیں اور صاحب دولت کی طبیعت پر بھی نیک اثر ہو تو یہ دولت کا فطرتی اثر نہیں، بلکہ کسی دُوسری صفت کا اثر ہوتا ہے، جس کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ مثلاً خود ذات دولت سے پہلے فنا کے درجہ پر پہنچ گئی، یا دولت سے پہلے کا عجز سامنے آکر شکر گزاری کا باعث ہوگیا۔ دوسرے یہ علم جو آنحضورؐ نے طلب کرنے کا ارشاد فرمایا ہے یہ وہ علم نہیں، جس کو حصول سے واسطہ ہو اور جس کے حاصل کرنے سے انسان اتراتا ہے اور اپنے اندر فکر محسوس کرتا ہے۔ تاہم کوئی حصول بھی ہو اس احساس سے پاک نہیں کہ کچھ اندر آگیا۔ اور احساس، فنائیت کے بر خلاف انانیت سے تعمیر ہوتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام ایسے حصول کو انعام وافضالِ الٰہی جانتے ہیں اور اپنے آپ کو محض ایک کٹھ پتلی قدرتِ الٰہیہ کی متصور فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے اندر صفت علم کا فطرتی جذبہ انانیت پیدا نہ ہو تو تعجب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے صاحبِ ارشاد ہونے سے پہلے فنا وبقا سے سالک کو گذارنا ضروری خیال فرمایا ہے۔ اور اسی پر تمام ارشاد کا دارومدار رکھا ہے، تاکہ اس کے اندر صفات خارجہ کا کوئی اثر نہ ہو۔

جس طرح صفات کا اثر ذات پر ہوتا ہے یعنی بعض صفات ممد فنا ہوتی ہیں اور بعض انانیت بڑھاتی ہیں۔ اسی طرح ذات کی طرف متوجہ ہونے سے فنائے ذاتی حاصل ہونے کے بعد خود بخود ایک فنائے ذات کا اثر صفات پر وارد ہوتا ہے، اور صفات کسی قدر

Marfat.com

ضرور تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ صفات کلیۃً فنا نہیں ہو سکتیں، جب تک کہ ذات کو صفات کے ساتھ فنا نہ کیا جائے۔ اسی وجہ سے کامل توحید وہی ہے جو ذات و صفات پر شامل ہو اور ذات و صفات کو الگ الگ نہ رکھے اور ان کے فنا و بقا کا کوئی الگ الگ تجزیہ نہ کیا جائے بلکہ اکٹھا مدِ نظر رکھ کر انہیں اُٹھایا اور گرایا جائے۔

یہ توحید صرف اسلام اور صاحبِ اسلام نے نمونہ بن کر پیش کی۔ تمام ادیانِ دیگر میں یہ مساوات نہیں۔ کوئی صرف ذات کی طرف متوجہ ہے تو کوئی صفات کو اپنا مطمحِ نظر رکھ کر ذات سے ایک زائد تعلق کے سوا کچھ خیال نہیں کرتا، جیسے عام اہلِ دُنیا، اور اہلِ علم کہ وہ اصل اعمال کو ہی تصور کرتے ہیں، ذات کو ایک واسطۂ حصول گردانتے ہیں۔ بخلاف طبقۂ صوفیہ کے، کہ وہ ذات کو اصل مدعا خیال کرتے ہیں۔ اور اعمال صرف حصولِ مشاہدہ کے لیے خیال کرتے ہوئے انہیں ایک ذریعۂ جمالِ الٰہی جانتے ہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو یہ دونوں نظریئے صحیح نہیں۔ بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ نہ اعمال کو قابلِ درگذر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ دنیا کا قیام اعمال پر ہے اور نہ ذات کو، کیونکہ ذات کے تصور کے سوا صحیح اعمال اور صفات پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اعمال و صفات ہی انسانی مطمحِ نظر ہونے چاہئیں تو پھر اس کارخانۂ قدرت کی پیدائش کا فلسفہ آنکھوں کے سامنے کوئی نہیں آتا، کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے اور اس کی علتِ غائی کیا ہے؟

قرآنِ پاک دونوں نظریوں کا جامع ہے۔ جیسے وہ ذاتِ بابرکات کا بے مثل بے مثال تصور پیدا کرتا ہے، اور اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور جذب کرتا ہے، ویسے صفات اور اعمال کی طرف متوجہ ہے اور ایک ایک عمل اور ایک ایک صفت کے لیے اور ان کے پیدا کرنے اور حاصل کرنے پر اپنی پوری طاقت اور پورے زورِ کلام سے انسانی قویٰ کو دعوت دیتا ہے اور تحصیل اعمال کا فلسفۂ بلند پیش کرتا ہے اور صاحب اسلام کو نمونہ پیش کر کے فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے واسطے رسول اللہ ﷺ ایک عمدہ نمونہ ہیں)۔

Marfat.com

الحمد شریف کو ہی مطالعہ کیا جاوے۔ پہلے ذات کا تخیل اور تصور پیش فرمایا گیا اور اس کے صفات کا بے پایاں سمندر کوزہ میں بند کر کے انسانی تخیل کے اندر بٹھانے کے لیے جامع الفاظ سے جذب قلوب فرمایا گیا۔ اس کے بعد اعمال کا مقدس نظریہ ایسی صورت میں پیش کیا گیا کہ اعمال کی تمثیلی صورت سامنے آجاتی ہے اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ سے اعمال کی قسمتِ بلند کا پتہ دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک دوسری جگہ وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنَ (ہم نے جن وانسان کو اپنی عبادت اور پوجا کے لیے پیدا کیا ہے) کے مقدس الفاظ فرما کر کائنات کی سب سے بلند اور اشرف ذات کی غرض و غایت ذات اور صرف ذات فرمائی گئی "اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" دو چھوٹے جملے تمام قرآنِ حکیم میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ذات وصفات کا جامع مذہب اسلام سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں۔ اس کے اندر دنیا وعقبیٰ کو یکساں، ہر موقع ہر لحظہ ہر حال میں پیش کیا گیا اور دونوں کے لیے یکساں قدم اٹھانے کی دعوت فرمائی گئی۔ ایک کا قدم دوسرے کا قدم ہے۔ ایک کی رکاوٹ دوسرے کی رکاوٹ ہے۔ اور صاحب اسلام کی سیرت کے مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آپ کے ہر حال کے اندر یہ دونوں جذبے یکساں برابر جاری وساری رہے۔ جنگ جیسے مشکل اور آڑے وقت پر بھی ذات حق کی طرف توجہ تھی اور نماز جیسی پاک پرستش کے اندر بھی بچے کے رونے کا خیال تھا۔ یہ اعتدال ذات وصفات یا اعمال کسی دوسرے رسول یا نبی کو کم میسر ہوا۔ البتہ حضرت ابراہیم صلوٰت اللہ علیہ متقدمین انبیاء میں ایسے ہی تھے۔ اسی وجہ سے ملتِ ابراہیمی کی دعوت قرآن پاک میں دی گئی۔ فرماتے ہیں۔ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرَاہِیۡمَ (یہ طریقہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا ہے)۔ حضرت موسیٰ پر صفاتی جذبہ غالب تھا۔ انہیں صفاتی معجزے دئے گئے اور فرعون جیسے بادشاہوں سے ٹکر لینے کے لیے انہیں تیار فرمادیا گیا اور زمین کی بادشاہت اور لشکر کی سپہ سالاری کے لیے منتخب ہو کر بنی اسرائیل کے لیے زمین کی بادشاہت کے طالب رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ذات کے غلبہ نے روح القدس کے صفات اپنے

Marfat.com

اندر پیدا کر لیے۔ اور قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ کہہ کر مردے کو زندہ کر دیا جو خاصہ ذات تھا اور زمین کی بادشاہت کا ذکر ہی اپنا مطمحِ فکر رہا۔ اور دُنیاوی تعلقات سے بالکلیہ بے توجہی رہی۔ نہ فوج ہے نہ لشکر ہے۔ چند شاگرد ہیں اور آپ ہیں۔ کوئی سُولی چڑھاتا بھی ہے تو فرمایا جاتا ہے بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ (بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا)۔ لیکن ذات و صفات کی کشمکش کا موازنہ کیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام باوجود غلبہ زمین لوگوں کو اتنے یہودی نہ بنا سکے جتنے حضرت عیسیٰ ایک درویشی حالت میں بنا گئے۔ اور اُن [15] کے اُٹھ جانے کے بعد اور ان [16] کی وفات کے بعد دیکھئے یہود برابر گرتے گئے اور عیسائی برابر بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ آج دنیا میں تمام مذاہب سے زیادہ افراد اسی امت عیسائیہ کے ہیں، اور یہی سب سے بڑی امت کہلاتی ہے۔ بخلاف یہود کے کہ وہ بہت کم ہیں اور جو ہیں اُن کی موت بھی اُن کے سر پر موجود ہے۔

قرآن پاک میں دونوں قوموں اور امتوں کے فرق کو بالکلیہ الگ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک مغضوب علیھم کے درجہ پر پہنچ گئی اور دوسری ضالین تک جا کر رُک گئی۔ اور سب سے بڑی ان کی صفت جس کو قرآن پاک بیان فرماتا ہے وَاَنَّھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (وہ تکبر نہیں کرتے) ہے، اور یہ صفت صرف فنائے ذاتی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہود کی سب سے بڑی صفت جس کو اللہ جل شانہ بیان فرماتے ہیں، استکبار ہے جو تمام صفاتِ رذیلہ کی جڑ ہے۔ کیونکہ قوم کے اندر استکبار آجانے کے بعد اصلاح اور صلاحیت کی استعداد بالکلیہ فنا ہو جاتی ہے۔

بیشک صفاتِ کاملہ اور حسنہ صفاتِ رذیلہ اور ناقصہ کی تبدیلی کرتی ہیں لیکن ذاتی طور پر نہیں صفاتی طور پر ان میں لچک پیدا ہو جاتی ہے اور اپنا رنگ آجاتا ہے، لیکن ذرا سی حرکت اور تھوڑی سی جنبش سے پھر وہی اصل رنگ اور حالت کا پتہ کھل جاتا ہے۔ لیکن ذات خود ذات ہے۔ اس لیے اس کی فنا کے بعد جب بقا حاصل ہو جاتی ہے تو خود ذات ہی تبدیل ہو جاتی ہے اور ہر مقابل آنے والی

چیز پر اپنا کامل اثر دکھلاتی ہے، کیونکہ ذات کے اندر عشق و محبت ہے اور صفات کے اندر اغراض و مقاصد۔ بھلا اغراض و مقاصد کو محبت و عشق سے کیا واسطہ ؟اس وقت تک کوئی ان کے پیچھے ہے، جب تک غرض ہے اور وہ مقصد ہے۔ غرض بدلی تو مقصد بدلا۔ مقصد میں تغیر آیا تو ساری روش پر تغیر آنا ضروری ہے۔!

حواشی

۱۔ حضرت سلطان الہند اجمیری رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ اس کو نگاہیں پا نہیں سکتیں وہ نظروں کو پالیتا ہے۔
۳۔ اور وہ لطیف ہے اور خبر والا۔
۴۔ تمہارے پاس آئی ہیں رب کی طرف سے روشن دلیلیں۔
۵۔ اے بلال مجھے راحت پہنچا۔
۶۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔
۷۔ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔
۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
۹۔ توحید
۱۰۔ حالانکہ آپ زندہ تھے
۱۱۔ جہانبانی سلسلہ، تعلقات دنیاوی، جہانداری، قیام جہاں
۱۲۔ خوارق اور کرامات اتنے ظہور پذیر ہوئے جتنے غوث الاعظمؒ سے ظہور پذیر ہوئے اور وہ شہرت کسی نہ پائی جو غوثِ اعظمؒ نے پائی۔ وہ خواص و عوام کے رہنما ہوئے اور یہ صرف خواص کے۔
۱۳۔ بے شک آپؐ مرسلین میں سے ہیں اور سیدھے راستے پر ہیں۔
۱۴۔ اللہ کے دین میں فوجوں کی فوجیں داخل ہوں گی۔
۱۵۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔
۱۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

**(توحید نمبر جون۔ جولائی ۱۹۶۶)**

Marfat.com

# وحدت الوجود

## (ہمہ اوست)

نظریہ وحدۃالوجود یعنی "ہمہ اوست" کو اہل طریقت و حقیقت تسلیم ہی نہیں کرتے آئے بلکہ خود اس مشاہدہ میں عمریں گذار دیں۔ کسی زمانہ میں یہ نظریہ بطور عقیدہ اہلِ طریقت کے اندر گشت کرتا تھا۔ افسوس آج عام طور پر ذہنوں سے نکل چکا ہے۔ تاہم گاہ گاہ صاحبِ علم اس پر فکر کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہ تبصرہ پیش کیا۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم

## تلاش اور مشاہدہ

مجھ کو ہے تیری جستجو مجھ کو تیری تلاش ہے
جانِ جہاں کہاں ہے تُو مجھ کو تیری تلاش ہے

یوں تو وجدانی طور پر (۱) ہر ایک انسان کے دل میں ذات الٰہی کا تصور ہر آن اور ہر گھڑی چکر کھاتا رہتا ہے اور جب انسان کو اپنی انسانیت کا احساس پیدا ہوا، تو اُسی

Marfat.com

وقت تصورِ الٰہ فطرتِ انسانی میں آموجود ہوا، اور کوئی انسان اس وصف سے خالی نہیں۔ مثبتاً ساری دنیا اس روش پر ہے۔ اور خال خال لوگ بناوٹی طور پر عقل کے بے بنیاد تخیل سے اس فطری نظریہ کے انتفا کا تصور بھی گھڑتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بھی اُس کے اثبات کی دلیل ہے۔ کیونکہ ہست کے بعد نیست کا آنا، ہستی پر دال ہے اور یہ تصور ہر اس انسان کے اندر موجود ہے، جسے انسانی شعور ہے۔

لیکن بعض صالح فطرت اور سلیم القلب انسان اس پاک تصور میں ایسے محو ہو جاتے ہیں، کہ مضطربانہ اس کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ کون اُن کو پریشان کر رہا ہے اور اسی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں مجنونانہ صحراؤں اور جنگلوں میں بھاگ جاتے ہیں، اور اس اضطراب و کرب کی تشنگی رات دن انہیں پریشان رکھتی ہے، اور ایک لمبی خلوت اُن کی اس فطرتی پیاس کی تسکین ہوتی ہے۔ اور دُنیا اور اہل دُنیا سے بالکل الگ ہو کر اپنے وجدانی تصور (چلہ کشی) میں رات دن مشغول رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس جذبہ سے معمور ہو کر سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اس نسیان ماسوا کے اندر ہو تصور وجدانی اپنی نُورانی جلوہ آرائیاں شروع کر دیتا ہے، اور مشاہدۃً وہ کچھ سامنے آجاتا ہے جس کی تلاش میں انہیں ایک مدّت بسر ہو گئی تھی۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حتی کہ اپنی نور کیفیت (۲) کے ساتھ اپنی شیریں کلامی سے بھی ہمکلامی شروع کر دی جاتی ہے۔ اور وہ تصور ایک مثالی صورت میں جلوہ آرا ہو جاتا ہے۔ اس تصورِ پاک کی مثالی صورت جب سامنے آجاتی ہے، اور اس کی ذات عین الیقین سے حق الیقین ہو جاتی ہے، تو عارف اس کی ذات کو تمام کائنات پر محیط پاتا ہے، اور کائنات کی ہر چیز میں اسے دیکھتا ہے اور ہر چیز اس کی شہادت دیتی ہے کہ اُس ذات کا ایک حصہ ہوں اور وہ میری جان ہے۔ ایسے وقت میں عارف مشاہداتی طور پر کائنات کو اُس کی ذات خیال کرتا ہے۔ بغیر ذاتِ حق سبحانہ کے اُسے نظر ہی نہیں آتا۔

Marfat.com

تجلّیٔ تیری ذات کا سُو بسُو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے

اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہ کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔

چُوں تمام افتد سراپاناز مے گردد نیاز
قیس رالیلیٰ ہمی نامند درصحرائے من

اس وقت اس حالت میں عارف "ہمہ اوست" پر اپنا عقیدہ پختہ کرتا ہے۔ اور یہ درجہ ہر ولی اللہ کو نصیب نہیں۔ اہل طریقت میں اکثر لوگ اس درجہ پر پہنچ کر عقیدۂ "ہمہ اوست" کے قائل ہوئے ہیں۔ اور نظریۂ وحدۃ الوجود ان کا اذعانی اور ایمانی مسئلہ بن گیا ہے۔ اگرچہ عوام اس کے انکار پر عقلاً اپنے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اور اس نظریہ کی تردید کئی صورتوں سے کرتے ہیں کہ کیسے ممکن ہے کہ خالق و مخلوق اور رازق و مرزوق اور عابد و معبود ایک ہو سکتے ہیں اور پھر عبادت کیسے واسطہ بن سکتی ہے، اور نیاز و ناز کیسے ایک ہو سکتے ہیں، اور کس طرح ممکن اور واجب کو اکٹھا کیا جائے، کہ جزو تو ممکن ہو اور کُل واجب ہو۔

ضرورت تھی کہ اس نظریہ کو واضح کیا جائے کیونکہ ہزاروں نہیں لاکھوں صاحبِ نظر اس نظریہ کے قائل ہو گزرے ہیں، اور ہزاروں کو قائل کر گئے۔ اگرچہ "گناہ کا ارتکاب" اور "اختیار انسانی کا فیصلہ" وغیرہ کے معمے ایسے تھے جو عوام کے افکار میں خلش پیدا کرتے آئے تھے۔ اس لیے چند حروف اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

اُمید ہے کہ ارتکابِ گناہ کی ذمہ داری اور جزاوسزا کا مسئلہ خود بخود اس کے اندر حل ہو جائے گا۔ اور غور سے پڑھنے کے بعد آپ اپنی رائے کو قرآنِ حکیم کے فیصلے پر قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔! وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ۔

## حواشی

ا۔ وجدانی کیفیت اُس احساس کا نام ہے جو فطرتی ہے، اور عقل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ مثلاً بھوک، پیاس اور محبت وغیرہ۔

۲۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کو اصطلاحاتِ صوفیہ میں وحی یا الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

# وحدتِ وجود یعنی ہمہ اوست کی حقیقت

جب یہ مسئلہ عام افکار کے سامنے آتا ہے تو عام لوگ خیال کرتے ہیں کہ خالق و مخلوق، عابد و معبود، رازق و مرزوق، ظاہر و باطن کیسے ایک ہو سکتے ہیں؟ وہی عابد وہی معبود، وہی خالق وہی مخلوق۔

لیکن جب ذرا نظر کو وسعت دی جائے تو اچنبھا نظر نہیں آتا اور نہ کوئی فکرِ محال پیش ہوتا ہے انسان کو دیکھ لیا جائے۔ روح اور جسم کے تمام تشکل کو انسان کہتے ہیں۔ حضرت روح یا صرف جسم انسان نہیں۔ چہ جائیکہ اُنگلی، انگوٹھا، چشم، ابرو یا کسی اجزء کو انسان کہا جائے۔ گو اُنگلی جزو انسان ہے اور جسم کا ایک حصہ، لیکن کوئی بھی اسے انسان تصور نہیں کرتا۔ انگلی یا آنکھ انسان کا جزو بھی ہے اور خدمت گار اور تابع بھی ہے۔ انسان چشم و گوش کا کُل بھی ہے اور مالک بھی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح تمام صفاتِ الٰہیہ کے ظلال (یعنی تشخصات و تعینات) ایک گونہ "جزو کُل" وحدہٗ لاشریک قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اور وہ لاشریک اُن کا خدائے قدوس ہے۔ اسی صورت میں اعضا اگر اپنے کُل کا حکم تسلیم کریں، تو وہ ایک بھی ہیں اور دو بھی۔ غیریت بھی ہے اور عینیت بھی۔

غیریت کے اعتبار سے عابد و معبود دونوں الگ۔ اور عینیت کے لحاظ سے دونوں ایک۔ لیکن اس حثیتی تفاوت کی وجہ سے ذہن میں کوئی اختلال واقع نہیں

Marfat.com

ہوتا، کہ یہ کیسے عابد و معبود ہو سکتے ہیں اور یہ کیا عبادت ہے، جو اپنی آپ، یعنی اپنی ذات کی خود ذات پُوجا کرے۔ غیریت موجود ہے۔ ہاتھ پاؤں جب انسان کے حکم یا ارادہ پر حرکت کرتے ہیں، تو یہ حرکت کس کی ؟ ایک تو خود ذات کی، اور دُوسری اعضا کی۔ دونوں کا فرق برابر نظر آرہا ہے۔

اگر اعضاء اپنی ذات کی اطاعت سے الگ ہو جائیں، اور نافرمان ہو جائیں تو ذات کو کتنی تکلیف ہو گی۔ خواہ بامرِ مجبوری ہو (یعنی اعضاء کسی عارضہ کی وجہ سے شل ہو جاویں)

اور پھر اگر اعضاء ذات کے ارادے کے ساتھ برابر شریک ہوں اور متحرک۔ تو ذات اپنے اعضاء و جوارح سے کتنی مسرور ہو گئی۔ یہی سرور "رحمت" کہلاتا ہے۔ اور یہی ( اِنّ اللّٰہ وَمَلَائِکَتہِ یُصَلُّوْنَ عَلیَ النّبی ) صلوۃ ہے جو اپنے خاص بندوں کے لئے ہے، اور جو اپنے بندوں سے خواص کو ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ ذاتِ اقدس کو سرور اپنے بندوں سے اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب وہ ذات کی رضا پر اطاعت اختیار کریں۔ اس کے بعد وحدتِ وجود کی اصل حقیقت یہی کچھ ہے کہ جیسے ایک انسان کی روح جسم کے ذرہ ذرہ میں نمودار ہے، اور خود رُوح کا پتہ نہیں چلتا۔ تو یہ مشاہدہ اور یہ عقلی تخیل خود بخود یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ انسان کی ذات جسم و جان سے تیار ہے اور دونوں یعنی جسم و روح الگ الگ نہیں بلکہ ایک حقیقت ایک ذات ہیں۔

بعینہٖ یہی مثال کائنات اور اس کے خالق پر مطبق خیال فرمائی جاوے، کہ جن لوگوں کے مشاہدہ میں دوئی پیدا نہیں ہوئی، وہ ذاتِ حق اور تمام کائنات کو اسی طرح خیال کرتے ہیں، جس طرح ایک انسان کی رُوح اور جسم کو ایک خیال کرتے ہیں، اور تمام احکاماتِ وجودیت ایک قائم کرتے ہیں۔ یہی لوگ وحدتِ وجودیہ کہلاتے ہیں۔ رہے وحدتِ شہودوالے! وہ وحدت کو کثرت سے الگ جانتے ہیں اور کثرت کو وحدت

Marfat.com

کا مغائر جانتے ہیں۔ لیکن سر رشتہ جوڑنے کے لئے اور وحدتِ وجود کے نظریہ سے بچنے کے لئے اس کی تاویل وحدتِ شہود سے کر دیتے ہیں۔ اصل نظریہ وحدتِ وجود کا ہے۔ اور نظریۂ وحدتِ شہود اس کا ردِ عمل خیال کیا جائے۔ اور کتاب و سنت کو تطبیق دینے کے لئے وحدتِ شہود کا نظریہ قائم کیا جاتا ہے۔

وحدتِ وجود کا نظریہ ایسا نہیں کہ ہر کہ ومہ کے ذہن میں سما سکے، لیکن اس کے برعکس نظریۂ وحدتِ شہود متعارفۂ اذہان ہو سکتا ہے۔ اور بلا چون و چرا تسلیم کرنے کے قابل۔ گو کہ سطحی نظر والے اسے بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ عین کو بالکلیہ غیر خیال کرتے ہیں۔ لیکن سالکینِ راہِ ہدایت قرونِ اُولیٰ کے بعد ان نظریات کے قائل ہوتے چلے آئے۔

اپنا خیال تو یہ ہے کہ یہاں کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔ جس پر جو حال آیا، وہ بے اختیار ہے جو کچھ کہے، کہے، تمام صحیح۔ لیکن جس پر حال نہیں وہ ایک بناوٹی مسلک کے لئے جو کچھ زبان سے نکالتا ہے، وہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کی تہہ میں کوئی حقیقت نمایاں نہیں ہوتی، اور جو کچھ زبان پر ہوتا ہے یا تو اپنے مسلک کی وجہ سے تقلیداً ہوتا ہے، یا ایک عقلی ڈھکوسلا ہوتا ہے، جس پر مشاہدہ اور یقین کے انوار نہیں ہوتے۔

ہاں موجودہ دورِ تصوف میں کچھ بھی نہیں۔ نہ یہ نہ وہ۔ اگر کوئی رسماً قائل ہے اور وہ اس عقیدہ کی ترجمانی کرے تو غنیمت ہے کیونکہ نقشِ پا تو نظر آتے ہیں۔ لیکن ان بے جان آثار سے معدومیت اچھی اور بے نشانی بھلی۔

اب وحدتِ وجود کی مثالی توضیح کر کے مسئلہ کو زیادہ واضح کیا جاتا ہے۔

ایک مُرغ کو دیکھئے ایک جان اور ایک جسم ہے۔ اور پھر جسم کے کئی اعضاء اور کئی جوارح ہیں۔ اور جسم کے اعضاء اور جوارح کا الگ الگ کام اور الگ الگ تعین ہے۔ اور ہر تعین کی صورت الگ۔ آنکھ تمام جسم سے الگ ہے، اور یہ اگرچہ گوشت کا لوتھڑا اور دوسرے اعضاء کے برابر ہے، لیکن بینائی جیسی قوت اور صفات اور روشنی کسی دوسرے حصہ گوشت کو نصیب نہیں۔ یہ آنکھ اپنے تمام دوسرے اعضاء سے

Marfat.com

بالکل جدا بلحاظِ صورت، بحیثیت معنی بالکل الگ ہے۔ اور دُوسرے اعضاء کے بر خلاف اس کا کام بھی الگ۔ ایسے ہی چونچ، کان، ٹانگیں، دُم اور پر۔

غرض ایک ایک جوڑ صورت و سیرت میں اپنے مماثل اعضاء سے الگ اور اپنی ذاتی حیثیت سے الگ الگ ہے۔ اب کوئی حصہ بھی لیا جائے، تو یہ مُرغ نہیں۔ نہ ظاہراً نہ باطناً۔ اگرچہ کُل بنانے میں یہ جزو ہی سب کچھ ہے۔ جو کچھ وہ ذات خود ہے۔ لیکن اپنی کارکردگی اور اپنا تعین وجودی و معنوی الگ ہے۔ اب آنکھ کا دیکھنا، کان کا سننا، پاؤں کا چلنا، پروں سے اُڑنا اگرچہ اصل ذات کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن ایک گونہ اصل سے جدا بھی ہے۔ ایسے ہی جگر و دل اور معدہ وامعاء یہ سب کچھ مرغ کے اندر ہیں، لیکن ذاتِ مرغ نہیں، اور باہر بھی نہیں۔ یہی حال ذاتِ حقہ کا ہے۔ ہم ایک گونہ اس کی ذات میں داخل ہیں اور ایک گونہ الگ۔

اعضاء کے تحرک کا منشاء تو ذات ہے۔ مگر اس منشاء ذات کے ساتھ منشاء عضو ایک الگ حیثیت بھی رکھتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آنکھ کھلے، لیکن کھل نہیں سکتی۔ کیوں؟ کسی عارضہ کی وجہ سے! دل چاہتا ہے۔ کہ قوم اُٹھاؤں لیکن اُٹھ نہیں سکتا۔

لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ کُلی طور پر منشائے ذات غالب رہتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم فرماتا ہے وَمَا تَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہ۔

اب دیکھیے۔ وَمَا تَشَاءُ وْنَ پہلے ہے اور اس کے بعد اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہ۔ فرمایا منشائے انسانی پہلے لایا گیا اور اس کے بعد منشائے ذات کو اس کے ساتھ وابستہ کیا گیا۔ اندر اندر گو ذاتِ کبریائی کی کارفرمائی ہے لیکن ظاہراً جو کچھ منشائے ذاتِ انسانی ظہور پذیر ہو رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے اور اسی پر احکام وارد ہونا تقاضائے عقل و نقل ہے۔

## وحدتِ وجود و وحدتِ شہود کے مغالطہ کی حقیقت

اشیائے کائنات کو دیکھا جائے تو ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن

Marfat.com

ہے۔ ظاہر کو جسم کہا جاتا ہے، باطن کو رُوح۔ جسم کو تو ہم دیکھتے ہیں، لیکن روح ہماری نظر سے غائب ہے۔ مگر روح کے آثار اور نشانات ہم دیکھتے ہیں۔ جب روح نہیں رہتی تو جسم مردہ اور خشک ہو جاتا ہے اور بعد میں کلی فنا ہو جاتا ہے۔ اور ہر ذی عقل یقین رکھتا ہے کہ جسم و رُوح دو الگ چیزیں ہیں، جو مل کر کسی ہستی کو برقرار رکھتی ہیں۔

روح آج تک کسی نے نہیں دیکھی۔ لیکن صاحبِ فراست اسے الگ بھی تصوڑ کر سکتے ہیں۔ مگر ایک عام عقل کا آدمی رُوح کو کسی صورت میں جسم سے الگ تصور نہیں کر سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب جانوروں کے سوا کسی دُوسری کائناتی چیز میں رُوح خیال نہ کی جاتی تھی۔ مثلاً درخت، پتھر، مٹی وغیرہ لیکن جب عقل ذرا تیز ہوئی تو نباتات کی رُوح بھی قائل ہو گئی۔ اس کے بعد اب ہر ذی جسم کی روح تمام دُنیا کا عقیدہ ہو چلا ہے۔ حتی کہ پتھر، مٹی میں روح کے آثار و نشانات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اور اب تک اتنی ترقی ہو گئی ہے کہ اشیاء جفتی سے بڑھتی ہیں، ہنستی، کھیلتی شاخیں نظر آتی ہیں۔ نر کھجور اور مادہ کی جفتی ساری دُنیا کے سامنے تھی۔ بخلاف بعض دیگر درختوں کے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ تمام کائنات میں اپنی اپنی جفتی چلتی ہے۔ حتی کہ زمین و آسمان اپنی روح رکھتے ہیں۔ اور ان کو اپنا ایک خاص شعور بھی ہے۔ جیسے جانوروں کا خاص شعور آپ دیکھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے تیرہ سو سال پہلے یہ فیصلہ دے دیا تھا

"ہر چیز ذی روح ہے"

۱۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ

ترجمہ:۔ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتی ہے

۲۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض

ترجمہ:۔ زمین و آسمان کی تمام مخلوق اللہ کا سجدہ کرتی ہے۔

۳۔ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

ترجمہ :۔اور (اللہ تعالیٰ نے) سُورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر فرمادیا۔

٤۔ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض

ترجمہ :۔زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔

٥۔ فَاَبَیْنَ اَنْ یَحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَ حَمَلَھَا الْاِنْسَانُ

ترجمہ :۔(آسمانوں نے اور زمین نے اور پہاڑوں نے) اللہ کی امانت اٹھانے سے انکار کر دیا۔اور انسان نے اسے اٹھالیا۔

٦۔ وَلٰکِنْ لَا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ

ترجمہ :۔لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔

پھر یہ بھی فرمادیا۔

بہر صورت رُوح عوام کی نظر سے اوجھل ہے۔ عقلمند اس کی ذات کا الگ تصور کر سکتے ہیں۔اور عام شعور کے آدمی روح کا تصور الگ نہیں کر سکتے۔بلکہ جسم و جان کو ایک چیز خیال کرتے ہیں۔

## خیر و شر کا مغالطہ

جسم کے تمام حصوں میں ایک خون جاری و ساری ہے۔ لیکن کسی عضو میں پہنچ کر خراب ہو جاتا ہے، اور وہ عضو متورم ہو جاتا ہے۔اب غور کیا جائے کہ خون کی خرابی زیادہ، یا اُس حصۂ جسم کی خرابی زیادہ جس میں آکر وہ زیادہ بدبو دار ہو کر نکلتا ہے، اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

گو خون کی خرابی بھی عضو میں آسکتی ہے۔ لیکن زیادہ خرابی کا مرکز تو وہی عضو متورم ہے۔اب علاج یا چیر پھاڑ کس جگہ کی ہو گی ؟ اسی حصہ کا علاج اور اسی حصہ کو چیرا دیا جائے گا جہاں درد ہے اور جہاں پھوڑا پھوٹ نکلا ہے۔ یہی حال بعینہٖ ذاتِ مقدس اور انسانی رُوح کا ہے اور انسانی رُوح کا بگاڑ جب ہو جاتا ہے تو اصل ذات جو سراسر منبع خیر

ہے۔ جیسے خون، لیکن سراسر خیر، اس ذات میں آکر شر بن گئی۔ اس لئے اس ذاتِ انسانی کا علاج بھی ذاتِ اقدس کرنا چاہتی ہے تاکہ منبع کا سرچشمہ گدلا نہ ہونے پائے۔

اب ذرا آیت " وَمَاتَشَاءُ وْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ" کا اگلا حصہ ملاحظہ فرمائے۔ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا یعنی اللہ تعالیٰ صاحب علم و حکمت ہے۔ یہ علت قرار دی جارہی ہے کہ منشاء ذاتِ انسانی کو منشاء ذاتِ حق کے ساتھ کیوں وابستگی ہے؟ کیوں کہ یہ بصیر نہیں، علیم نہیں، اپنے منشائے ذاتِ کی حقیقت سے بے خبر ہے، اس لئے علیم وبصیر کی نگہبانی ضروری ہے۔

پھر فرماتے ہیں یُدْخِلُ مَنْ یَّشَاءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ منشاء ذات حق ہے جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں لے لیتا ہے اور صالح ہو کر چلتا ہے۔ اور جو سرکش ہو کر منشائے ذات سے اپنی ذاتی سرکشی پر اتر آتا ہے۔ اس کے علاج کے لئے دردناک عذاب ہے۔

برائے علاج معالجہ قدرتی اصلاح فرمائی جائے گی۔ بہر صورت ایک عقلی بات بھی ہو جاتی ہے کہ جو لوگ ہمہ اوست کی آڑ میں گناہ کو اپنا گناہ خیال نہیں کرتے ہیں بلکہ ذات کو ملزم ٹھہراتے ہیں، وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ جو کچھ وہ دنیا میں کرتے ہیں وہ اپنی منشاء کے مطابق کر کے خوش و خرم ہوتے ہیں اور لذت اٹھاتے ہیں۔ ضرورت اور خواہش میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہیں، اپنی خوشی کے پیدا کرنے اور اپنے غم سے بچنے کے لئے ہزاروں نہیں لاکھوں ایک دُوسرے سے لڑتے ہیں اور خود یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خود یہ کر رہے ہیں۔ لیکن جب دوسرا پہلو سامنے آتا ہے تو جھٹ پہلو بدل لیتے ہیں اور تمام امور کا متصرف خود خدا کو گردانتے ہیں اور حقیقتِ نفسی کے اعتبار سے بالکل عام انسانوں کی طرح اپنے مایحتاج پر لڑتے ہیں۔

جن بزرگوں پر ہمہ اوست کا حال تھا، وہ ایک نہیں سینکڑوں ہیں۔ لیکن آج تک نہ تو کسی نے اپنے پوجنے کی دعوت دی اور نہ ہی کسی نے ارتکاب گناہ سے بچنے کے لئے اللہ میاں کی آڑلی۔ وہ ہمیشہ عابد اور خائف رہے۔ منصور کو دیکھئے انا الحق تو کہا، لیکن اپنی پرستش کی دعوت نہ دی نہ ہی دار ورسن کا ذاتِ حق کو مجرم ٹھہرایا۔ بلکہ اپنی محبت و

عشق کو مجرم ٹھہرایا۔ اور خوشی خوشی سولی چڑھ گئے۔

بعض مصنفین موجودہ وقت بھی ''ہمہ اوست'' کے حال کو اپنے میں ظاہر کرتے ہیں۔ وہ طریقت کی تلقین اس طرح فرماتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہے حق ہی حق ہے پھر ساتھ ہی خود مرشد بنتے ہیں اور دوسرے کو مُرید خیال کرتے ہیں، اور روزی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، جو ایک حریص دُنیادار بھی نہیں مارتا۔ پھر یہ بھی سمجھتے ہیں، کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اللہ اکبر! یہ بھی تو تصوف و فقر پر ایک وقت آنا تھا۔ یہ تصوف اپنے لئے وہ کچھ روا رکھتا ہے جو صرف ناجائز ہی نہیں بلکہ ایک شریف انسان کے لئے حرام ہے۔

آج کی دنیا سانس کے چلنے کو روح سمجھتی ہے۔ کہ جب یہ سانس بند ہوا رُوح ختم ہو گئی۔ اصل حقیقت یہ ہے، کہ سانس روح و جسم کا پیوند ہے۔ جب تک سانس ہے روح بدن میں رہے گی۔ جب سانس بند ہو گا روح بدن سے الگ ہو جائے گی۔

یہ سوال کہ پھر روح کہاں جاتی ہے۔ یہ بات عقول سے بلند ہے۔ لیکن خدائے قدوس کے انوار شناس جنہیں پیغمبر کہا جاتا ہے، وہ بذریعہ وحی فرماتے ہیں کہ علیین اور سجین یعنی اچھے اور برے مقام پر رہا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ پھر بالید گی حشر کو ہو گی اور پھر جسمی اور روحی پیوند از سرِ نو قائم ہو گا۔

لیکن بات جو ذہن میں آچکی ہے وہ یہ ہے کہ روح صرف ہوا نہیں۔ بلکہ ایک نوری جسم (مادہ) رقیق شفاف ہے۔ جو بعینہٖ اپنی جسمانی صورت کے مطابق ہوتی ہے۔ اور جب کبھی کوئی مردہ آدمی کی رِوح خواب میں آتی ہے، جو سالوں پہلے گزر گیا ہو تو وہ اپنی کامل صورت میں نمودار ہو کر خواب دیکھنے والے کا پورا یقین پیدا کر دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی جیسے جسم کی صورت ہے، ہر اعضاء کی اپنی جگہ صورت بعینہ وہی صورت رُوح کی اس مقام پر ہے۔ اور جو فعل وہ عضو کرتا ہے وہ اس کی مدد ہوا کرتی ہے۔

اب یہ خیال، کہ روح پہلے تھی، جسم بعد میں اس پر آیا، بطور لباس کے۔ یا جسم پہلے آیا، رُوح بعد میں اُس کے اندر پیدا ہوئی؟ اہل مذاہب کا تو متفقہ فیصلہ ہے، کہ روح پہلے تھی جس پر لباس مادی بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن موجوہ وقت مشککین کہتے ہیں۔ جسم نے پہلے مادہ روح پیدا کی، پھر حیرت ہوتی ہے، کہ بے جان سے جان دار کیسے پیدا ہو،

Marfat.com

بے شعور سے شعور کیسے نکلے، انڈے سے بچہ پیدا ہوتا ہے لیکن کیا معلوم کہ انڈے کے اندر رُوح نہیں، جو بعد میں بالیدگی آنے پر بچہ کی شکل میں نمودار ہو، تو گویا اُس نے رحمتِ الٰہی میں داخلے کی سند حاصل کرلی، رہا ظالموں کا معاملہ تو انہوں نے ابتدا سے لے کر انتہا تک ہر مرحلے میں اس کے قانون آسمانی اور کلیاتِ ہدایت کی مخالفت کی، اور خدا کے ارادۂ رحمت اور قانونِ ہدایت سے تجاوز کی، اب ان کے لئے رحم و کرم کا سوال نہیں عدل وانصاف کا فیصلہ ہے کہ ان کو سزا دی جائے اور دردناک عذاب میں مبتلا رہیں۔

## فنا وبقا کا معیارِ حقیقی

ہر جاندار اور غیر جاندار کی ایک نوعی صورت ہوتی ہے، اور ایک شخصی اور ذاتی جس کے ذریعہ اپنی تشخیص اور شناخت میں اپنے نوعی افراد سے الگ ہوتا ہے، اور اپنے غیر سے اپنی صورت شخصی میں ممیّز ہوتا ہے۔ نوعیت تمام افراد میں ایک ہوتی ہے۔ اور تشخص کا روپ ہر ایک کا الگ۔ اگر یہ شخصی صورت یا تعین کسی صورت سے اٹھا دیا جائے، تو نوع مطلق کے افراد میں تمیز نہیں رہے گی، اور من حیث النوع مطلق رہ جائے گی، جس کی شناخت صورت نہ ہو گی، لیکن شخصیات سے بالا ہونے پر تشخصات اور تعینات سے نکل کر ایک وحدتِ قائمہ میں ہو کر وہ نوع ہو جائے گی، نوعی صورت میں اور نوعی کیفیات میں نوعی روح اپنی انتہائی صورت میں پہنچ جائے گی۔

بعینہٖ یہی صورت انسانی تشخصات اور صور کی ہے۔ جس سے تشخصات اور تعیناتِ انسانی اٹھ جاتے ہیں۔ تو انسان کی ایک نوعی صورت و سیرت جگمگانے لگتی ہے۔ اور ہر طرح کے تشخص سے جب پاک ہو جاتی ہے، تو اس نوعی صورت کی وحدت کو وحدتِ مطلقہ کے ساتھ کامل تشابہ ہو جاتا ہے، اور اس تشابہ کی وجہ سے وحدتِ مطلقہ کے عکوس وحدتِ نوعی پر اتنے زوردار وارد ہوتے ہیں کہ بسا اوقات وحدتِ نوعی وحدتِ مطلقہ کے تمام لوازمات سے سرفراز ہو کر نکلتی ہے، اور وحدتِ مطلقہ کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

Marfat.com

لیکن یہ کس وقت ؟جب تشخصی انانیت وحدتِ مطلق کے دریائے مطلق میں گُم ہو جائے۔ اور اس کے بعد وحدتِ نوعی اس وحدتِ مطلقہ میں کلی طور پر غرق اور گم ہو جائے۔ لیکن جیسے تشخصات کا اٹھنا محال ہے اسی طرح انانیتِ شخصی کا ختم ہونا محال ہے۔ گو انانیت کے لوازمات اور صورت و سیرت اور انانیت کے نقوش بہت ہی مدھم ہو جاویں گے، لیکن کلی ختم ہونا محال ہے۔ اسی طرح ناممکن ہے کہ کوئی انانیت کلی طور پر انانیت کبری میں محو ہو جائے، اور اس کا کوئی وجود قائم نہ رہے، اور نہ اس کی صورت و سیرت کا پتہ چل سکے۔ خواہ فنا کتنی ہی غالب ہو۔ اور بقا بھی کتنی ہی بلند نصیب ہو۔

ارادۂ شخصی کی فنا کے بعد انانیتِ شخصی کے لوازم شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب تک تعین و تشخص ہے بھلا کیونکر ممکن ہو کہ کلی طور پر ارادہ ختم ہو جائے۔ اس لئے رسالت ہو یا ولایت بلند سے بلند مقام پر بھی اپنی کامل فنائیت کے باوجود انانیتِ مطلقہ اور انانیتِ محدودہ الگ ایک قالب دو جان کی صورت برابر نمودار ہو کر خلق اللہ کی ہدایت کا باعث ہوتی ہیں، اور ہر فعل و حرکت میں دونوں الگ الگ دکھائی دیتی ہیں۔ اسی قالب میں انانیتِ مطلقہ اور انانیتِ محدودہ اپنی تعلیم و تلقین اور آداب و رموز معرفت ایک دُوسرے کے سامنے ہو کر پڑھتی پڑھاتی نظر آتی ہیں، اور کوئی دھوکہ نہیں لگتا کہ اُستاد کون ہے اور شاگرد کون ہے۔ خدا کی ذات کون سی ہے اور نبی کریم ﷺ کی ذات مُبارک کون ہے۔ جان و دل اور قلب و قالب ایک۔ لیکن اس ایک میں دو کا بسیرا ہے۔ اور تیرے میرے کی گنجائش نہیں۔!!

(توحید نمبر، جون۔ جولائی ۱۹۶۶)

Marfat.com

# شان غفاری

## ایک حدیث پاک اور اس کا مفہوم

"ترجمان القرآن" کے ایک قاری نے سید ابو الاعلیٰ مودودی سے ایک حدیث کے بارے میں استفسار کیا جس کا مختصر جواب انہوں نے اپنے رسالہ میں شائع کیا۔ مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر حضرت قبلہ ترجمان الحقیقت قدس سرہ نے "شان غفاری" کے عنوان سے اس حدیث پاک کے مفہوم کی وضاحت فرمائی۔ "سلبیل" میں یہ دونوں جواب ایک ساتھ شائع ہوئے۔ ذیل میں پہلے سید مودودی کی تحقیق اور اس کے بعد حضور قبلہ عالمؒ کا ایمان افروز مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔

### سوال

ابو زید صاحب اصلاحی کا ایک مضمون ماہ جولائی ۶۲ کے "فاران" میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ضمیر کی اصلاح اور درستی"۔ اس مضمون میں ذیل کی حدیث نقل ہوئی ہے۔ حدیث ہے :۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کیا تو تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ اٹھالے گا اور ایک دوسری قوم لے آئے گا جو گناہ کرے گی اور مغفرت چاہے گی۔ پس اللہ اس کو بخش دے گا"۔

ہم سب جانتے ہیں کہ عوام کے ذہنوں میں گناہ کا تصور صرف کبائر ہی کا ہے، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ گناہ کے معنی ہیں زنا اور اس کی قبیل اور جھوٹ، چوری۔ اگر سوسائٹی کسی قدر معیاری ہو تو غیبت کو بھی کبھی کبھار گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ نماز نہ پڑھنا، روزہ نہ رکھنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، استطاعت پر حج نہ کرنا، کسی کا مذاق اڑانا، کسی کو برے ناموں سے پکارنا، بعض مرتبہ رشوت بھی لے لینا، سود لینا اور سود دینا، لذت نفس کے لیے ایک دوسرے کی مذاقاً غیبت کر لینا، سینما دیکھنا، غض بصر نہ کرنا، عورتوں کا بے پردہ گھومنا اور اسی طرح کئی حدود پھلانگنا بھی گناہ نہیں ہیں، صغائر کو چھوڑ ہی دیجیے۔

ان حالات کے تحت اگر یہ حدیث عوام پڑھیں تو کیا ان میں کا بیشتر طبقہ اس بات پر خوش نہ ہو گا کہ وہ تو گناہ کر ہی نہیں رہے ہیں۔ اگر وہ اس وعید والی حدیث پر عمل نہ کریں تو یقیناً وہ تباہی کا شکار ہو جائیں گے۔ یعنی وہ صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی کی خاطر یا تباہی سے بچنے کے لیے زنا، چوری، جھوٹ وغیرہ ہر قسم کے گناہوں کا (جن کو وہ گناہ سمجھتے ہیں) ارتکاب اور اس کے بعد توبہ اپنے اوپر لازمی قرار دیں گے۔ یا اگر چند افراد میں دینی حس پیدا ہو گئی ہو تو وہ یہ خیال کرنے لگیں گے کہ جو لوگ ابتداءِ عمر ہی سے بہت کم کبائر میں مبتلا ہوئے ہیں وہ قوم کے لیے نقصان دہ ہوں گے۔ انہیں گناہ کرنا لازمی ہو گا اور اس کے بعد توبہ۔ یا بعض ہمدردانِ قوم جب یہ دیکھیں گے کہ ان کی اولاد گناہوں میں ہی مبتلا ہو رہی ہے، تو وہ صرف اس لیے انجان ہو جائیں گے کہ اس میں قوم کی بھلائی ہے اور انہیں بعد میں توبہ کی توفیق مل جائے گی۔ یہ توبہ اور استغفار کا طریقہ سچ مچ ایک حکمت ہوتا تو اسلاف ضرور تعاونوا علی

Marfat.com

الاِثمِ وَالعُدوان کی نصیحت اپنی اولاد کو کرتے تاکہ ایسا نہ ہو کہ نیکیوں کی کثرت کی وجہ سے وہ اٹھا لیے جائیں، اور ان کے بجائے گنہگار قومیں چینی تاتاری اور حبشی وغیرہ آجائیں۔

ناچیز کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا حدیث دین کی غربت کے دور میں بنالی گئی ہوگی۔ اس غربت کے دور میں جب احادیث پر عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے اعمال کی تائید میں احادیث کا REFERENCE دیا جاتا تھا۔ یا واقدی اور ان جیسے دوسرے لوگ، اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے یا خلفاء وقت اور امراء اور سلاطین کو خوش کرنے کے لیے ایسی احادیث گھڑا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں استغفار کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے لیکن جتنی اہمیت استغفار کی ہے اس سے کہیں زیادہ گناہ پر آمادہ کیا گیا ہے۔ میرا جہاں تک مشورہ ہے تو ایسی احادیث کو حدیثوں کی کتابوں سے بالکل نکال دیا جائے یا عوام کے سامنے پیش ہی نہ کیا جائے۔

جواب

کسی حدیث کو رد کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ آدمی اس کے مضمون پر تھوڑا سا غور کرے اور اگر بات سمجھ میں نہ آئے، یا اس کا کوئی غلط مفہوم ذہن میں پیدا ہو جائے تو بے تکلف یہ فیصلہ کر دے کہ حدیث گھڑی ہوئی ہے اور ایک نظریہ یہ بھی ساتھ ساتھ قائم کرے کہ فلاں فلاں وجوہ سے گھڑی گئی ہوگی۔ اس طریقے سے احادیث پرکھی جانے لگیں تو نہ معلوم کتنی صحیح حدیثوں کو دریا بُرد کر ڈالا جائے گا۔ حدیثوں کو پرکھنے کے لیے علم حدیث کی گہری واقفیت ضروری ہے اور اس کے بعد دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی میں بات کے مغز کو پہنچنے کی عمدہ صلاحیت ہو۔ اس طرح جب روایت اور درایت میں صحیح توازن قائم ہو جائے تب انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ احادیث کو جانچ کر ان کی صحت و سقم اور ان کے مضمون کی معنوی حیثیت کے متعلق کوئی رائے قائم کرے۔

Marfat.com

جس حدیث کے متعلق آپ نے تنقید کی ہے وہ مسلم، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد طریقوں سے منقول ہوئی ہے اور روایت کے اعتبار سے اس پر کوئی وزنی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ رہا اس کا مضمون، تو اس موضوع سے متعلق جو دوسری احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ان سب کے ساتھ ملا کر اسے پڑھا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کو جان بوجھ کر گناہ کرنا چاہیے اور پھر توبہ کر لینی چاہیے بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انسان جب تک انسان ہے بالکل بے خطا اور بے گناہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کی اصل خوبی یہ نہیں ہے کہ اس سے کبھی گناہ سرزد ہی نہ ہو، بلکہ اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ جب بھی اس سے گناہ سرزد ہو جائے، وہ نادم ہو اور اپنے خدا سے معافی مانگے۔ اس مضمون کو ذہن نشین کرنے کے لیے حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اللہ کو بے گناہ مخلوق ہی پیدا کرنی ہوتی تو انسانوں کے بجائے کوئی اور مخلوق پیدا کرتا۔ انسان کو تو خدا نے نیکی اور گناہ دونوں کی صلاحیت و استعداد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور اس نوعیت کی مخلوق سے بے گناہی مطلوب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تو بڑے سے بڑا مقام یہی ہو سکتا ہے کہ بتقاضائے بشریت جب بھی اس سے قصور سرزد ہو، اس پر اصرار نہ کرے بلکہ نادم ہو کر استغفار کرے۔

(ترجمان القرآن)

---

## حدیث پاک

عَن اَبی ھُرَیْرۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوْلَمْ تَذْنَبُوا الذھَبَ اللّٰہُ بِکُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ وَلَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ فَیَغْفِرُ لَھُمْ رواہ مسلم۔

(مشکوٰۃ المصابیح باب الاستغفار جلد ۳)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کیا تو تم کو اللہ تعالیٰ اُٹھا لے گا اور ایک

Marfat.com

دوسری قوم لے آئے گا، جو گناہ کرے گی اور مغفرت چاہے گی۔

پس اللہ اسے بخش دے گا"۔

اس حدیث پاک میں کئی باتیں شامل ہیں۔

اول :۔ انسان کی گناہ پر طلبِ مغفرت اللہ تعالیٰ کو بڑی پسند ہے۔

دوم :۔ انسان کی تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے، جب توبہ استغفار پر اپنی جبین جھکائے۔

سوم :۔ اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ کا مظہر اتم ہونا اس وقت ہوتا ہے جب اس کی تکمیل مکمل ہو جائے۔ گناہ نہ ہو تو مغفرت کیسی؟ مغفرت اسی وقت ہو گی، جب گناہ ہوں گے۔ اور پھر جب گناہ نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز کیسے؟ اور نیاز مندی کیسی جو انسانیت کی تکمیل کامل ہے؟

یہ حدیث تکمیل انسانی کے لیے ایک ہدایت ہے لیکن بعض سطحی نظر کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو گناہوں سے محبت ہے اور وہ خود چاہتا ہے کہ گناہ کیے جاویں۔ اگر ایسے ہے تو معاشرہ سراسر گناہ ہو جائے گا۔ تو پھر ضرورتِ شریعت کے کیا معنی؟ اور خوف الٰہی کا کیا درجہ؟

بعض لوگوں کا یہاں تک خیال ہو گیا ہے کہ یہ حدیث گھڑی گئی ہے اور کسی من چلے نے اپنی بے راہ روی کے واسطے بنالی، لیکن تحقیق کی رو سے یہ حدیث صحیح ہے اور بالکل صحیح ہے اور تعدیل پر پوری اتری ہوئی ہے۔ اس لیے ہم واضح کرنے کے لیے گناہ کے اس تصور سے جو عام، خاص میں پایا جاتا ہے، غلط فہمی دور کرنے کے لئے گناہ کا دائرہ حقیقی دکھاتے ہیں۔

## گناہ

آج گناہ صرف زنا تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ بھی بعض معاشرہ میں نیک خیال کیا جاتا ہے۔ باقی ہر بد فعل، گناہ خیال نہیں کیا جاتا۔ تکبر، حسد، عجب، ریا، غیبت، حرص، جبن اور بخل وغیرہ کو گناہ خیال نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ یہ وہ گناہ ہیں، جن سے

Marfat.com

سینکڑوں گناہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل، تکبر سے پیدا ہوتا ہے۔ حرص سے ہر ناجائز مال، جائز خیال کیا جاتا ہے۔ ترازو کا ہیر پھیر کتنا بڑا جرم ہے اور قرآن حکیم اس پہ شاہد ہے لیکن آج بڑے سے بڑا تاجر اس میں مبتلا ہے۔ مزدور تک اپنے معاوضۂ اجرت میں سستی و کاہلی کر کے کام میں روکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ رشوت حرص کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

غرض، اگر آپ ذرا خیال کریں گے اور انسانی معاشرہ پر آج نہیں، جب سے دُنیا ہے، نظر ڈالیں گے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہر فرد ایک گناہ میں مبتلا ہے اور یہ گناہ ہی حقیقتاً زندگی کا سہارا ہیں۔

میرا اپنا تو یہ خیال ہے کہ اگر آج یہ گناہ اٹھا لیے جاویں تو یہ جیتی جاگتی دنیا فوراً سو جائے یعنی مر جائے۔

## مجھے گناہ زندہ کیے ہوئے ہیں

میں خود جب بھی اپنا مطالعہ کرتا ہوں اور زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو ہمیشہ مجھے یہی خیال نظر آیا کہ گناہ مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ میرے قریب ترا قرباء، والدین، بیٹے، بیویاں، بھائی، غرض میں کس کس کو شمار کروں، نوجوانی کے عالم میں اٹھا لیے گئے اور جب بھی کوئی مجھ سے جدا ہوا، دنیا مجھ پر اندھیر ہو گئی اور دم رکنے لگا۔ لیکن چند ہی دن کے اندر گناہ سر اُٹھاتے ہیں اور مجھے زندہ کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ چیز، جو ایسے وقت پر سامنے آتی ہے وہ جنسیت کا اُنس، پھر مال و دولت کا حرص، پھر اقران سے سبقت، پھر مخالفین کی مدافعت یا مقابلہ۔ غرض کتنے گنوں سینکڑوں گناہ اکٹھے ہو کر دوڑتے آتے ہیں اور مجھے ایک ایک دلاسہ دیتا ہے۔ واللہ اگر یہ نہ ہوتے تو اقرباء کی موت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھا، جس کے باعث موت کو زندگی پر ترجیح دیتا تھا لیکن جب میں مرنے پر تیار ہو گیا تو ہمیشہ گناہ نے مجھے سہارا دیا۔

ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا ”اگر کوئی قوم گناہ نہ کرے گی تو اسے مٹا کر ایسی قوم پیدا کروں گا جو گناہ کرے گی اور بخشش طلب کرے گی“ کتنا صحیح فرمایا۔ کیونکہ اس قوم کی

زندگی، خود بخود ختم ہو جائے گی۔ جب چہل پہل ختم ہو جائے گی تو قوم کی زندگی کیا ہو گی؟

لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا کہ "قوم" کا لفظ فرمایا، "انسان" نہیں فرمایا۔ لاکھوں پاک باز ہو سکتے ہیں، جو گناہ سے بچائے جائیں۔ مگر تمام قوم کا پاکباز ہونا ناممکن ہے۔ اور ہو گی تو اسی وقت، جب حیاتِ معاشرتی ختم کر بیٹھے گی۔

پھر جہاں گناہ کا لزوم انسانی فطرت کے اندر ودیعت فرمایا گیا وہاں ہدایت کا جذبہ بھی ہر انسان کے اندر قائم فرمایا گیا۔ گناہ کے بعد ندامت ایسی صفت ہے جو گناہ کو دھو دیتی ہے، اور جب دل کی آنکھوں سے پانی نکلتا ہے تو دل خود بخود گناہوں سے صاف ہوتا نظر آتا ہے۔

کون سا لباس ہے جو میلا نہیں ہوتا۔ کونسا وجود ہے جو غسل نہیں چاہتا؟ کیوں جسم پر میل آجاتی ہے؟ خواہ کتنا ہی کوئی ستھرا انسان ہو اور خاک و غبار سے بچے لیکن دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں غبار نہ ہو۔ جس طرح مغفرت تکمیل صفات الوہیت ہے، اس طرح ندامت اور توبہ تکمیلِ صفتِ انسانیت ہے۔ یہ ارتقائی صورت ہے نہ کہ نزولی۔ ایسی صورت میں انسانی روح بلند ہوتی ہے۔ گناہ سے جتنی روح گرتی ہے، ندامت سے اتنی ہی بڑھ کر روح بلند ہوتی ہے۔ مقصود بالذات بلندیٔ انسانیت ہے۔

واہمہ

یہ وہم کہ اس حدیث یا اس خیال سے گناہوں کو تقویت ملتی ہے اور گناہوں کی خواہش پیدا ہوتی ہے، یہ ایک ایسا وہم ہے جو حقیقت سے خالی ہے۔

کھانے کے لیے اتنے مصالحہ جات کی ضرورت ہے، جو کھانے سے مناسبت رکھتے ہوں۔ لیکن ذرا سا تناسب بگڑ جائے تو کھانا خراب ہو جاتا ہے اور پھینک دیا جاتا ہے۔ آٹے میں نمک کا ہونا ضروری ہے۔ کتنا؟ جتنے میں مرغوبیت پیدا ہو لیکن جب تلخی پیدا کرے اور بے مزہ ہو جائے تو کون کھائے گا اور کون پسند کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کو بھی انسانیت سے اتنی ہی لغزشیں پسند ہیں جن سے ارتقا حاصل ہو۔ نہ کہ وہ گناہ پسند ہیں جو

Marfat.com

انسانیت کی موت کا باعث ہوں اور انسانیت ختم ہو جائے۔

گھی تمام غذاؤں سے اچھا ہے لیکن یہ کامل انسانی غذا کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ تمام غذا کو کامل کرنے کا ممد ہوتا ہے۔

نباتات کو اپنی تکمیل کے لیے کئی اشیاء کی ضرورت ہے۔ مثلاً پہلے زمین، پھر پانی۔ زمینی اجزائیں بھی کئی اجزاء شامل ہیں اور پانی میں کئی اشیاء شامل ہوتی ہیں۔ کھاد کیا ہے ؟ گوبر یا شوریدگی۔ لیکن کبھی یہ بھی دیکھا کہ کھاد سے کوئی روئیدگی ہوئی ہو۔ ریت زمینی اجزاء میں ترقی کا باعث ہے لیکن صرف ریت سے روئیدگی ناممکن ہے، جب تک مٹی کے اجزاء شامل نہ ہوں۔

ایسے ہی گناہ ارتقائے انسانی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جس سے انسانی زمین میں شوریت پیدا ہو کر صفات محمودہ کی پیدائش ہو۔ ورنہ صرف گناہ سے تو انسانی موت ہے۔ صرف گناہ، کوئی بُرے سے بُرا انسان بھی پسند نہیں کرتا۔

## جذبات

ہر جذبۂ انسانی قابل قدر و قیمت ہے اور جذبات سے بہ آسانی تکمیل انسانی ہو جاتی ہے۔ اور جذبہ میں جتنا تناسب زیادہ ہوگا اتنا ہی اس شخص کا کردار بلند ہوگا اور جتنا کسی کا اعتدال کم ہوگا اتنا ہی وہ گرتا جائے گا۔ شہوت ایک جذبہ ہے۔ اگر ترقی کر جائے تو زانی کہلائے گا، اگر گر جائے گا تو جبن سے موصوف ہوگا۔ دونوں صورتیں مذموم ہیں۔ ایسے سخاوت اسراف میں آجاتی ہے یا بخل میں۔ جب تبدیل ہو جائے تو یہ ظہور "مروت و احسان کا جذبہ" برباد ہو جائے گا۔ یہ جذبہ مروت و احسان اس وقت کہلائے گا۔ جب سخاوت کے اعتدال پر قائم رہے۔ کسی تخلیق انسانی یا کسی دوسری تخلیق میں کسی عضو کی تخلیق بھی بے کار ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں زندہ جانوروں یا بے جان چیزوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ تمام سے یہ حقیقت نمودار ہوتی ہے، اِنَّا خَلَقْنَا کُلَّ شَیْئٍ بِقَدَرٍ ہ (یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک خاص اندازے سے پیدا کیا) پھر ہر

Marfat.com

تخلیق کو اس کی اندرونی اور بیرونی بناوٹ، اس کی حقیقی صورتِ روحی کی دی گئی ہے۔ عام خیال تو یہ ہے کہ "ظاہر جیسے جسم ہو، ویسی جان ہوتی ہے"۔ لیکن مذہب تو کہتا ہے کہ روح کے مطابق جسم ڈھالے جاتے ہیں۔ بہر صورت میرا کہنا ہے کہ کوئی چیز زائد پیدا نہیں کی گئی۔ بعینہ اسی صورت میں جذبات بھی بے کار اور بے فائدہ پیدا نہیں فرمائے گئے۔ بلکہ ہر جذبہ انسان میں اور جانوروں میں پوری تکمیل اور ارتقا کے لیے پیدا کیا گیا، بلکہ عین مصلحت کے لیے۔ اور ہر نوع اور ہر ذات کے الگ الگ جذبات، حسبِ فطرتِ جانور پیدا کیے گئے۔ ایسی صورت میں کیونکر ممکن ہے کہ جذبات گناہ صرف برائی کے لیے پیدا کیے گئے۔ بلکہ عین مصلحتِ انسانی کے لیے تمام جذبات کو مناسب وزن واعتدال پر قائم فرمایا گیا اور کمی بیشی میں بھی ایک خاص تناسب عالمِ کل کے لیے رکھا گیا۔

مغفرت کا اذنِ عام بھی ایک تناسب سے قائم ہے۔ یہ نہیں کہ ہر گناہ بخشا جائے گا اور ہر توبہ مغفرت کا سامان لائے گی۔ لائے گی اور ضرور لائے گی۔ مگر توبہ اور انابت کا درجہ گناہ کے اندازے کا ہوگا۔ اگر توبہ اور انابت کامل نہ ہوگی تو مغفرت بھی اسی درجہ کی وارد ہوگی۔

بعض نفوس کے اندر ندامت کا جذبہ مکمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے مغفرت مکمل آجاتی ہے۔ اور بعض نفوس کا جذبہ کامل نہیں ہوتا وہ مغفرت کو جذب نہیں کر سکتے۔

ایک زمیندار اکثر قتل کے مقدمات میں ماخوذ ہوتا تھا اور رہائی پا جاتا تھا۔ میرے عزیز عبدالرسول صاحب کہنے لگے یہ جلال، کئی قتلوں میں آیا اور ہمیشہ خلاصی پا گیا۔ میں نے جواباً کہا کہ یہ خالص توبہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دلوں کا واقف ہے۔ جب وہ عجز و نیاز دیکھتا ہے، معاف کر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پھر قاتل بن جاتا ہے۔ جواب دیا کہ یہ بعد کا جذبہ پھر پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ ایک بار دل خالصۃً پاک ہو کر نکلتا تھا۔ انسان کی صفت ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا۔ یعنی انسان بے صبر پیدا کیا گیا ہے جب تکلیف پاتا ہے تو بلبلانے لگتا

Marfat.com

ہے اور جب بھلائی میں آجاتا ہے یعنی آرام پاتا ہے تو اکڑ تا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس وقت تک مہربان نہیں ہوتا، جب تک اس عجز کے ساتھ اس کے در پر جبہ فرسائی نہ کی جائے۔ اور جب ایسے ہو جائے تو پھر وہ بڑی سے بڑی گستاخیاں بھی معاف کر دیتا ہے۔

غرض ایک زمانہ تھا۔ مسلمان کا عقیدہ آمَنَّا وَصَدَّقْنَا پر تھا۔ ہر حکم الٰہی پر دل و جان سے ایمان تھا۔ آج مسلمان سے یہ دولت چھن گئی اور یہ ہر حکم الٰہی پر تنقید کرتا ہے اور اپنی عقل کے مطابق جرح قدح کرتا ہے اور سمجھ آجائے تو موافق ہو جاتا ہے۔ وہ بھی زبانی، عملاً نہیں۔ ورنہ چونک اٹھتا ہے کہ یہ کیسا حکم ہے؟ جو سراسر منافیٔ عقل ہے۔

اس حدیث کے بارے کئی صحائف یومیہ میں اعتراض دیکھا گیا اور پھر الہامی حکمتیں نہ سمجھنے والوں نے تبدیلِ معانی پر اپنا اپنا زور لگایا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس جسارت سے بچائے اور اللہ تعالیٰ کے ہر ارشاد پر کامل یقین کی دولت نصیب ہو۔

لیکن صاحب فکر جانتا ہے کہ اس حدیث پاک نے کتنی بڑی صفاتِ خداوندی اور رحمت خداوندی کی وسعت و بے پایانی کو کیسے پاک الفاظ میں بیان فرمایا۔ ساتھ ہی بنی آدم کو اپنی شان عفو و کرم دکھاتے ہوئے اپنے بھائی بندوں کی خطاؤں سے درگزر فرمانے کا طریقہ اور راستہ دکھایا۔ خالق و رزاق ہونے کے باوجود مالک ارض و سما اپنے بندے اور انسان پر اس قدر مہربان ہے کہ ہر خطا جس کے بعد ندامت، توبہ و استغفار ہو، وہ بخش دی جائے گی۔ بلکہ فطرت انسانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلان فرمادیا کہ اگر خطاکاری نہ ہو گی تو مغفرت کی صفت بے پایاں کیسے ہو گی؟ اس لیے ہم اپنی صفت غفاری کو دکھانے کے لیے اس مخلوق کو ناپید فرمادیں گے اور اس کی جگہ ایسی مخلوق لائیں گے جو صفت غفاری کی طالب ہو گی۔ غرض گناہ انسانی نشو و نما کے لئے خمیر اور کھاد کا کام کرتا ہے۔

(جولائی ۱۹۶۳ء)

Marfat.com

# نسبت موسوی، نسبت عیسوی اور نسبت محمدی

ملک یوسف العزیز ۱۹۶۷ میں محکمہ اوقاف مغربی پاکستان لاہور میں اعلیٰ انتظامی عہدہ پر فائز تھے۔ وسیع دینی مطالعہ اور اعلیٰ تحریری ذوق رکھتے تھے۔ حضرت ترجمان حقیقت رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "طریقت کی حقیقت۔ قرآن کی روشنی میں" سے متاثر ہو کر ایک استفسار نامہ خدمت عالیہ میں ارسال کیا جس کے جواب میں حضرت اقدسؒ نے نسبت موسوی، نسبت عیسوی اور نسبت محمدی کی وضاحت فرمائی اور ان کے نتائج واثرات پر عارفانہ مجتہدانہ تبصرہ فرمایا۔ ذیل میں سوال وجواب دونوں درج کئے جا رہے ہیں۔

خط

حضور!

السلام علیکم!

ایک مدت کے بعد حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ یہ نہیں کہ میں غافل تھا ستم ہائے روزگار کا رہین تھا۔ اب کیا اور کس کا گلہ کروں۔ وہ تو فرماتا ہے کہ ہر شر، خیر ہے۔ اور جسمانی ضرر، رحمت۔ پھر بیماریوں کو ستم ہائے روزگار کہنا ظاہر طور پر تو ٹھیک، مگر باطنی طور پر ؟؟؟

(HERPES) ہرپیز کے عارضے نے اچانک حملہ کیا اور پورا ایک مہینہ بستر پر بسر ہوا۔ اس طرح کہ صرف دائیں پہلو پر۔ ''بایاں پہلو'' ہرپیز کے آبلوں سے ایک مسلسل طویل و عریض زخم بن گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور اب چل پھر کر دینی اور دنیاوی فرائض ادا کرنے کی کوشش اس کی توفیق سے کرتا ہوں۔ اگرچہ اس مرض کے اثرات مابعد ابھی موجود ہیں۔

حاضر خدمت ہونے کی فوری وجہ ایک خلجان ہے، جو جناب کی تصنیف بعنوان ''طریقت کی حقیقت قرآن کی روشنی میں'' کے صفحہ ۱۶ پر مندرجہ ذیل سطور نے پیدا کر دیا ہے :۔

> ''(حضرت عیسیٰ) کسی سے لڑے نہیں، جھگڑے نہیں۔ جہاد کے لیے تلوار تو کجا ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ بلکہ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو اپنا منہ سامنے کر دیا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام باوجود ایک بھاری سلطنت بنانے کے، دنیا میں اتنے روشن نہ ہوئے جتنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ یہودی دنیا میں ہمیشہ کی زندگی ذلت سے بسر کر رہے ہیں۔ اور عیسائی اُس وقت سے آج تک باعزت سلطنتوں کے مالک چلے آتے ہیں۔
> یہ کیا؟ وہی فرق نسبت تکوینی و تشریعی کا یعنی توحید ذاتی و توحید صفاتی کا''...... ؟ ؟ ؟

کیا اس تحریر کا یہ مطلب لیا جائے

کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاد کی لیے تلوار اٹھائی اور شریعت پر زیادہ زور دیتے تھے، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نسبت رکھنے کے باعث یہودی ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جھگڑالو نہیں تھے، جہاد کے لیے نہ صرف تلوار نہیں اٹھائی بلکہ

Marfat.com

کسی نے اگر ہاتھ اٹھایا تو اپنا منہ آگے کر دیا، اس لیے عیسائی ان سے نسبت رکھنے کے باعث باعزت سلطنتوں کے مالک چلے آتے ہیں۔ اور پھر اسی روشنی میں امت محمدیہؐ کو دیکھئے۔ عیسائیوں کے مقابلے میں ان کی حکومتیں باعزت نہیں، دوسروں کے دست نگر ہیں۔ اس کا باعث کیا سمجھا جائے۔ وہی...... جو آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور یہودی قوم کے متعلق فرمایا ہے۔؟

سبھی جانتے ہیں کہ عیسائی دنیا تمام شرعی جرائم کی مرتکب ہے۔ زانی ہیں، لوطی ہیں، شرابی ہیں، بداخلاق ہیں، بے اخلاق ہیں، خدا پرست نہیں، مشرک ہیں، مگر اس کے باوجود باعزت سلطنتوں کے مالک ہیں۔ کیا اس لیے کہ انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نسبت ہے؟ (اور) انہوں نے کبھی تلوار کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اس ضمن میں اور سوال بھی پیدا ہیں۔ جن کی یہ خاکسار بیان کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ مگر جنابِ والا اپنے باطن کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ خدارا ان سطور کی وضاحت کیجئے۔

خاکسار

**ملک یوسف العزیز**

**محکمہ او قاف سول سیکریٹریٹ لاہور**

## الجواب

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری
واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

برادر محترم زاد شرفہ وصحتہ!

وعلیکم السلام!

آپ کا مکتوب پہنچا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ میری تحریرات پورے غور سے پڑھتے ہیں۔ اگر اس طرح آپ پڑھتے رہے، تو انشاء اللہ جو شکوک پیدا

Marfat.com

ہوتے ہیں وہ خود بخود رفع ہو جائیں گے۔

بفضلہٖ تعالیٰ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہر سوالے راجوابے کے مطابق میری تحریرات باطنی طور پر سوالوں کا جواب ہی جواب ہیں۔ جہاں کوئی سوال اٹھا، وہیں جواب لکھ دیا گیا، اگرچہ ظاہری طور پر سوال و جواب کا سلسلہ نہیں۔ (میری تحریرات کو غور سے پڑھنے والوں پر واضح ہے)

"انقلاب" بھی شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے لکھی گئی۔ "انقلاب" میں جہاں حضرت اعلیٰ شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھے ہیں، وہاں تصوف اور سلوک کو بھی نمایاں اور واضح کرنا مقصود تھا۔ شکوک و شبہات کے دور کرنے کا پورا پورا خیال رہا۔ بہر صورت بار بار مطالعہ کرنے سے تمام حقائق خود بخود واضح ہوتے جائیں گے۔

سلوک اصل میں مشاہدات، کیفیات اور حالات کا نام ہے۔ یہ نہ کوئی علمی خزانہ ہے اور نہ کوئی کتاب۔ مجھے وہ دولت تو نہیں دی گئی کہ مشاہدات کا مطالعہ کرا سکوں، لیکن علمی طور پر کوئی حقیقت ایسی نہیں جسے میرا قلم بیان نہ کر سکے۔ ذَالِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ۔

جواب میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ میں عرصہ سے بیمار ہوں۔ دمہ، زکام اور بخار کی شکایت رہی۔ جیسے آپ مریض ہیں، اس سے بڑھ کر میں مریض ہوں۔ آپ صرف جسمانی مریض ہیں، اور میں جسمانی مریض بھی ہوں اور روحانی بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شفا بخشے!

## نسبت

جس مسئلہ کی بابت آپ نے لکھا ہے، اس کی وضاحت اپنی تحریرات میں کئی جگہ کر چکا ہوں۔ مثلاً "حال و قال" کا آپ مطالعہ فرمائیں۔ انشاء اللہ آپ کا یہ خلجان دور ہو جائے گا۔ "نسبت" تعلق باللہ کا اصطلاحی نام ہے۔ مختصراً اتنا عرض ہے کہ اس "نسبت" کا اعتدال کسی کو کم نصیب ہوا ہے۔ صوفیاء کا مقولہ ہے۔ طُرُقُ الۡوُصُوۡلِ

Marfat.com

الی اللہِ تَعَالیٰ عِلیٰ عَدَدِ النُّفُوس یعنی ہر نفس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے تعلقات اس کے استعداد کے مطابق ہیں۔ خود ذات اقدس کی بے اندازہ (لاُتعدّ ولَا تُحصٰی) صفات عالیہ کا ظہور اسی انسانی دل میں ہو رہا ہے اور ہو تا رہے گا۔

جذباتِ انسانی کا مرکز دل ہے، جو بے اندازہ ہے۔ جذبات ارادہ کو پیدا کرتے ہیں اور ارادہ افعال کا محرک ہے۔ اور افعال کے جو نتائج و ثمرات پیدا ہوتے ہیں تو وہی خاصیت اصل تخم جذبہ پر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر محبت کا جذبہ ہے تو نتائج کے اندر محبت بھری ہو گی۔ اگر نفرت کا جذبہ ہے تو نتائج پر بھی نفرت کے آثار و خواص ہوں گے۔ جذبات خواہ کتنے بھی ہوں، لیکن ان کا بنیادی تخم محبت اور نفرت ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ مَنْ اَحبَّ لِلّٰهِ وَاَعْطیٰ لِلّٰهِ وَمَنَع لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَان۔

ان دونوں یعنی نفرت اور محبت کے ملنے سے کروڑہا جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حسد، ریا، تکبر، وغیرہ۔ کسی جذبہ کا بہت زیادہ ہونا اور کسی کا بہت کم ہونا اعتدال نہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات سے نرا خوف ہونا یا نری محبت ہونا انسانی تکمیل نہیں۔ جب تک امید اور خوف، محبت اور خوف مساوی نہ ہوں، تکمیل نہیں۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں۔ ؎

کی بھر واسہ اس آشنائی دا

ڈر لگ دا اے بے پروائی دا

لیکن بعض عرفاء خوف سے بری ہیں۔ وہ محبت ہی محبت میں سرشار ہیں۔ ان کی محبت کے چرچے اور دھن جاری و ساری ہے اور اُن کی دنیا جذب میں چلی جا رہی ہے۔ محبت جتنی بلند ہو گی اتنا دوام زیادہ ہو گا۔ ویسے کون انسان ہے جس کے اندر محبت نہیں۔ لیکن لیلیٰ فرہاد کے قصے ہر ایک کو نصیب نہیں۔ یہ انہیں لوگوں کو نصیب ہیں جن کی محبت عشق کے درجے پر پہنچ گئی اور تن من وار گئے۔ لیکن یہ تکمیلِ انسانی نہیں بلکہ تکمیلِ انسانی کے لیے یہ رخنہ ہے۔ بلکہ وہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام محبت سے بے شک بھرپور تھے، اور یقین اس درجہ

Marfat.com

پر پہنچ گیا تھا کہ مردہ چیز کو قُمْ بِاِذْنِ اللہِ کہہ کر کھڑا کر دیتے تھے۔ ان کے پیروؤں میں یہ جذبہ اتنا سرایت کر گیا کہ ابن اللہ کہنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں محبت سے بڑھ کر خوف تھا۔ لاکھوں معجزے دکھائے پھر بھی وہ لوگ بچھڑے کو خدا سمجھنے لگے۔ لیکن خود موسیٰ کو وہی کچھ سمجھتے رہے کہ جب وہ (کوہ طور پر گئے) تو ان سے منہ موڑ بیٹھے۔ ان سے کیا کچھ نہ دیکھا تھا۔ کتنی مدت ساتھ رہے تھے پھر بھی کہہ دیا۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلاَ اِنَّاهٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ اور تم جاؤ تمہارا خدا ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ دیکھئے! خوف وہ یقین پیدا نہ کر سکا جو محبت کر گئی۔ محبت سراسر یقین ہے، اور وارفتگی دنیا کو وارفتہ بنا دیتی ہے۔ اگر دنیا وارفتگی میں آجائے تو کارخانۂ قدرت تمام معطل ہو جائے۔ پھر وارفتگی کہاں تکمیل ہے؟ غرض تکمیلِ انسانی رجا اور خوف کے درمیان ہے۔

حضرت محمد ﷺ کو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے درجے پر پہنچایا، اور وہ اعتدال نصیب فرمایا، جس کی کائنات کو بنیادی ضرورت ہے۔ جہاں دن کو وہ جہاد کرتے ہیں وہاں رات کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار بھی رہتے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ ایک ہی کام جانتے ہیں۔ سرمستی۔ موسیٰ صرف تلوار اٹھانا اور خوف خدا سے ڈرانا۔ یہی وجہ ہوئی کہ ۷۰ آدمی سزا کے لیے چن لیے گئے، جن پر بجلی گری اور موسیٰ بے اختیار پکار اٹھے اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ۔ آخر یہ گستاخی کیوں؟ ایسے الفاظ نہ حضرت عیسیٰ کے منہ سے نکلے اور نہ حضرت محمد ﷺ کے منہ مبارک سے۔ حالانکہ ہزاروں تکالیف آپ پر آئیں جن پر ایسے الفاظ نکل سکتے تھے۔ اور اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں۔ "اگر تو انہیں عذاب دینا چاہے تو تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تو غفور رحیم ہے۔

## فطرتی نتائج

تکبر کی فطرت میں ذلت ہے۔ تواضع کا ثمرہ عزت ہے۔ دولت اپنے اندر

Marfat.com

اقتدار رکھتی ہے۔اور غریبی، تنگدستی، تملق اور چاپلوسی۔

اچھا لباس پہننے سے خوشی ہوتی ہے، اور کہنہ لباس پہننے سے پژمردگی اور غمی۔ یہ فطرتی چیزیں ہیں۔ محبت کو دوام ہے اور قبولیت۔ اور خوف میں قبولیت اور دوام نہیں۔ جتنی محبت زیادہ ہوگی اتنی قبولیت عامہ زیادہ۔ خوف نفرت سے بھرا ہوتا ہے، اور کشیدگی پیدا کرتا ہے۔ محبت یگانگت اور جمعیت سے بھرپور ہے۔ اس لیے نبیوں کی اُمتوں کا یہی حال ہونا چاہیے تھا، جو ہو رہا ہے۔ جیسی ان کی فطرت وجبلت یا نسبت۔

حضرت محمد ﷺ کو ساڑھے تیرہ سو سال گذر گئے، کسی نے آپ کو "ابن اللہ" نہ کہا اور نہ کہے گا۔ کیونکہ آپ کو اللہ سے محبت تھی۔ اور یہ نسبت شریفہ نظام عالم کے لیے اکسیر ہی نہیں بلکہ روح ہے۔ نہ یہاں عیسوی اور نہ موسوی نسبت کام دیتی ہے۔ یہ نسبت قیم نظام عالم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور خاتم النبیین کے درجے پر رکھے گئے۔ حضرت اجمیریؒ کا درجہ کتنا بلند محویت اور استغراقیت میں ہے۔ تمام دنیا کو اپنے زیر سایہ لائے ہوئے۔ لیکن پاک و پلید دکھانے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نسبت تھی۔ جس نے تمام معاملات دینی کو نئی زندگی بخشی، اور کسی پہلو کو واگذار نہیں فرمایا۔ یہ عین نسبت محمدی ہے۔ ہر مذہب کے پیروکار مکتوبات شریفہ پڑھ کر یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تجدید دین کی خدمت کیسی سر انجام فرمائی؟ حالانکہ چشتیہ نسبت اس وقت بھی کتنی غالب ہے۔ ہر ایک اسی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفو بندہ نواز میں

اجمیر شریف کے دربار میں ایک رنڈی گاتی نظر آتی ہے، اور اس یقینِ پختہ کے ساتھ کہ جس کے ساتھ آپؒ کا دربار عالیہ قائم و دائم ہے۔ لیکن مجددیہ دربار میں ایسوں کا گذر تک نہیں۔

موسوی نسبت اپنے وقت کے مطابق جلال سے بھرپور تھی۔ اس وقت اسی نسبت کی ضرورت تھی۔ فرعون کا مقابلہ تھا۔ لیکن جب یہودیت کا خشک زہد پروان

چڑھا اور بے محبت خدا کا تصور جم گیا۔ تو ضرورت تھی کہ محبت بھری نسبت آئے (اور) اُس کی سختی کو نرمی میں تبدیل کر دے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ اپنی جمالی نسبت سے تشریف لائے اور دم بھر میں قہر الٰہی کو رحمت الٰہی میں تبدیل کر دیا۔ لیکن ضرورت تھی کہ دونوں نسبتوں کا عظیم امتزاج دنیائے عالم کے لیے مسخر فرمایا جاوے۔ جلال و جمال سے بھرپور حضرت رسول اکرم ﷺ تشریف لائے۔ نہ جلال غالب نہ جمال۔ انسانیت اپنے تمام پہلوؤں سے مکمل۔ تمام اعضاء مساوی، اعمال، اخلاق، آداب سب میں موزونیت۔ اس موزونیت کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا جو ہو رہا ہے۔ اور اسی مساویت کی وجہ سے معتدل انسان اس کے زیر سایہ آتے رہے، اور سرکش انسانیت اگرچہ اس سے بھاگتی رہی، تاہم اس کی جلالیت اعتدال کے ساتھ اُان کے مسخر کرنے کے درپے رہی۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ اُس طریقہ پر چل رہی ہے جو ختم نہ ہوگا، اور جس کی آج ضرورت تھی، ان اشارات سے آپ تمام باتیں پا جائیں گے۔ آپ جیسے بزرگوں کو اشارہ کافی ہے۔ بلکہ مجھے یہ حیرت ہے کہ آپ کو یہ خیال پیدا کیسے ہوا؟ مسیحیت کی زیادتی کی وجہ کوئی اور وجہ قرار دی نہیں جا سکتی۔ قرآن فرماتا ہے "یہود اور مشرک سب سے زیادہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اور نصاریٰ سب سے دوستی میں قریب کیونکہ ان میں عالم اور مشائخ ہیں۔ اور خاص کر ان میں تکبر نہیں"۔ وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ محبت کی صفت شمار کی گئی، اور محبت تکبر پیدا ہونے نہیں دیتی۔ جیسے کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ تواضع اور محبت میں بقا زیادہ ہے۔

## اختلاف نسبت

توحید اپنی ذات میں دو صفاتِ متقابل اپنے اندر رکھتی ہے۔ ایک تکوین اور دوسری تشریع۔ جہانداری تکوین سے مکمل ہوتی ہے، اور جہاں بانی تشریع سے۔ اولیت تکوین کو ہے۔ کیوں کہ پہلے پیدائش خلقت ہے۔ تکمیلیت تشریع سے ہے۔ کیونکہ شر و خیر گڈمڈ ہو جائے، یعنی تمیز نہ رہے۔ (نیکی بدی کی تمیز نہ رہے) تو کارخانہ قدرت

Marfat.com

کا چلنا محال ہو جائے۔ لیکن اگر شر و خیر دونوں پیدا نہ ہوں تو خلقت نامکمل ہے۔ کیونکہ تکمیل میں خیر و شر دونوں ایک ترازو پر ہیں، اور ایک دوسرے کو چمکانے والے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں خود انسان کی ذات میں یہ دونوں صفات رکھی گئیں۔ لیکن ہر جگہ ان کا توازن الگ الگ۔ مساوی توازن بہت کم۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ میں ایک توازن بدرجہ اتم تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ۔ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنَاتِ وَاَیَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ دیکھیے! موسیٰ کے لیے صرف مَنْ کَلَّمَ اللّٰہُ کا درجہ ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ کو "بینات" کے علاوہ "روح القدس" کی تائید سے ممتاز فرمایا گیا۔ ے

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

یہی روح القدس کے کارنامے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسیحا کو وہ دولت نصیب نہ ہوئی جو نبی کریم ﷺ کو۔ اور پھر فرمایا مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ۔ فرمایا مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ...... فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی پتہ دیتا ہے کہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا جو پہلے کسی کو نصیب نہ تھا۔ اب ہم ایک منقول پیش کرتے ہیں، تاکہ ہمارا مقصد واضح ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو جن کمالات و امتیازات سے نوازا، ان میں سب سے بڑا امتیاز و کمال عبدیت کاملہ کا مقام ہے۔

عبدیت کیا ہے؟ اللہ کے حضور میں انتہائی خضوع و تذلل، بندگی و سرافگندگی، اپنی عاجزی اور لاچاری اور محتاجی اور مسکینی کا پورا پورا اظہار، اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ سب کچھ صرف اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے، اس کے در کی فقیری و گدائی۔ اس سب کے مجموعے کا نام مقام عبدیت ہے جو تمام مقامات سے اعلیٰ و بالا ہے۔ اور بلاشبہ حضرت سیدنا محمد ﷺ اس صفت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق

Marfat.com

میں کامل ترین اور سب پر فائق ہیں، اور اسی لیے افضلِ مخلوقات واشرفِ کائنات ہیں۔

قاعدہ ہے کہ ہر چیز اپنے مقصد کے لحاظ سے کامل یا ناقص سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑا جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، یعنی سواری اور تیز رفتاری، اس کا بڑھیا اور گھٹیا ہونا مقصد کے پیمانے سے سمجھا جائے گا۔ اسی طرح گائے یا بھینس کا جو مقصد ہے، یعنی دودھ کا حاصل ہونا، اس کی قدر و قیمت دودھ کی کمی یا زیادتی ہی کے حساب سے لگائی جائے گی۔ وقس علیٰ ہذا......!

انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے پیدا کرنے والے نے عبدیت اور عبادت بنایا ہے۔

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن)

اس لیے سب سے افضل واشرف انسان وہی ہوگا جو اس مقصد میں سب سے اکمل و فائق ہوگا۔ پس سیدنا حضرت محمد ﷺ چونکہ کمال عبدیت میں سب سے فائق ہیں، اس لیے آپ افضل مخلوقات اور اشرفِ کائنات ہیں۔ اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں جہاں جہاں آپؐ کے بلند ترین خصائص و کمالات اور اللہ تعالیٰ کے آپؐ پر خاص الخاص انعامات کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں معزز ترین لقب کے طور پا آپ کو عبد ہی کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ معراج کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ اسرا میں فرمایا گیا سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ پھر اسی سفر معراج کی آخری منزلوں کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ النجم میں فرمایا گیا فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی ۔اور سب سے بڑی نعمت اور دولت قرآن حکیم کی تنزیل کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ فرقان میں فرمایا گیا تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ۔ اور سورۂ کہف میں فرمایا گیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ۔

"حاصل کلام یہ کہ بندوں کے مقامات میں سب سے بلند عبدیت کا مقام ہے اور سیدنا حضرت محمدؐ اس مقام کے امام یعنی اس وصف میں سب پر فائق ہیں"۔

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رمزِ درونِ کائنات
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
آں سراپا انتظار ایں منتظر

## تتمہ توضیحی

جیسے زمین لاتعداد بے شمار قوتوں کی مالک ہے اور ہر قوت کا ظہور کروڑوں اربوں جمادات، نباتات اور حیوانات کے ذریعے ہم دیکھ رہے ہیں، جن کی تعداد کسی شمار میں نہیں آسکتی۔ اور ہر قوت ہر شئے اپنی ہی قوت نوعی سے جذب کرتی ہے مثلاً گنا مٹھاس کو، مرچ تلخی کو جذب کرتی ہے۔ ایسے ہی حیوانات تمام قوتیں اپنے اندر جذب کرتے ہیں، اور اپنی صورت میں ڈھالتے ہیں۔ مثلاً ہر جانور غذا کھاتا ہے، اس کو اپنی صورت اور اپنے قویٰ میں تبدیل کرتا ہے۔ ابتدائے آفرینش میں کوئی چیز بھی نہ تھی۔ ہر چیز مٹی سے پیدا ہوئی۔ اور جو کچھ بھی پیدا ہوا وہ مٹی کے مختلف قوتوں کے ظہور سے پیدا ہوا۔ لیکن اب ظہور کے بعد ہر پیدا شدہ مٹی سے وہی کچھ جذب کرتا ہے جو کہ اس کی اپنی استعداد ہے۔ پھلوں کو دیکھئے، درختوں کو، حیوانات، پتھر، چاندی، سونا، دیکھئے۔ حقیقتاً ان تمام قوتوں کا مخزن یا معدن مٹی ہے اور ہر چیز اپنی فطرت کے مطابق مٹی کی قوتیں جذب کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال رب العزت بارگاہ قدرت رب الارباب کا ہے۔ وہ لاتعداد صفات کا مالک ہے، جن کا کوئی اندازہ نہیں۔ جو لاتعداد مختلف متخالف و متضاد قوتوں کا مالک ہے۔ انہیں قوتوں کے ظہور کے لئے کائنات پیدا فرمائی گئی۔ اور ہر مخلوق حسب فطرت روحانی انعکاس ہر وقت ہر حال میں جذب کر رہی ہے۔ پہلے جنس ہے پھر نوع۔ نوع کے بعد افراد ہیں۔ غرض (ہر) فرد کی استعداد اور قوت الگ ہے، جیسا کہ صورت الگ۔ بہر صورت ہر تشخص اور تعین اپنا منبع فیضان الگ رکھتا ہے۔ اس لیے ہر فرد کو اللہ تعالیٰ سے الگ نسبت ہے اور اسی نسبت کے مطابق وہ انوار الٰہیہ کا مورد ہوتا

Marfat.com

ہے، اور اپنی اس فطری جبلت کے مطابق اپنی زندگی کے تشخصات اور تصورات کو رونق دیتا ہے۔ یہی حال انبیاء اور اولیاء کا ہے۔ اور اسی وجہ سے نسبتیں الگ الگ پیدا ہوتی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے وقت تشریع کی ضرورت تھی۔ تاکہ جہاں بانی کے طریقے نظام عالم میں قائم ہوں۔ جس کے اندر خصومت کا ہونا فطرتاً لازمی تھا۔ لیکن خصومت مذہبی جب انتہا کو پہنچ گئی تو رحمت اور نرمی کے خمیر کا دینا ضروری تھا۔ اس لیے عیسیٰ کی نسبت تکوینی فرمائی گئی۔ تکوین کو ہر خیر و شر سے مساوی محبت ہے۔ بخلاف شریعت کے کہ وہ خیر و شر کی تمیز چاہتی ہے۔ آخر آمد بود فخر الاولین کو دونوں صفات میں مساوی فرمایا گیا۔ ایسا امتزاج دیا گیا کہ تکوین غالب نہ تشریع۔ دونوں کو مساوی درجہ پر رکھ کر نظام عالم کو منور فرمایا گیا۔ ہر صفت اپنا فطرتی انجام رکھتی ہے۔ تکبر کا انجام ذلت ہے، اور تواضع کا انجام عزت۔ محبت جوڑتی ہے اور نفرت دور کرتی ہے۔ ہر صفت اپنے عمدہ اور برا ہونے کے ساتھ اپنے تاثرات کے مطابق عمر پاتی ہے۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ" جو صفت غالب ہو گی اسی کے مطابق زندگی عنایت ہو گی۔ کچھ بھی ہو امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی تا قیامت قائم و دائم ہے جو تمام امتوں پر از روئے خیر و شر غالب رہے گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حضرت عیسیٰ تکوینی نمونہ تھے۔ اُن کے اندر عبدیت اور عبودیت کی وہ شانِ امتیاز کہاں جو حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس میں تھی۔ ہر آن اور ہر گھڑی یہ جذبہ عبدیت کامل مکمل نظر نہ آتا ہو؟ کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے میں حتیٰ کہ معراج پر جب قاب قوسین تک نوبت پہنچ گئی، تو یہ عبدیت پہلے سے زیادہ عبدیت میں داخل ہو گئی۔ اور یہ عبدیت مطلقہ معبودیت مطلقہ کے سامنے سجدہ ریز تھی۔ زیادہ کیا عرض کیا جائے۔ لَوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادً الِکَلِمَاتِ رَبِّی لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّی وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا۔

Marfat.com

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مولانا رومؒ کے پیر نے جب شمس تبریزؒ سے باطنی حال پوچھے، تو عرض کیا کہ میرے حالات بھی وہی ہیں جو میرے پیر بھائیوں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں، لیکن میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس پر اُس کے پیر نے فرمایا۔ تمہارے سلسلہ میں کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا، جو تمہارے اسرارِ الٰہیہ ظاہر کرے گا۔ چنانچہ مولانا رومؒ نے ان کی ترجمانی فرمائی۔ قدرت کا یہ کام ہے کہ ایک کے اندر جو چھپے ہوئے جوہر ہوتے ہیں وہ بعد کی نسلوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی مسکینی میں جو سلطنت کے خواب تھے، وہ ان کی امت میں ظاہر ہوئے بخلاف حضرت محمد ﷺ کہ آپؐ کی ذات اقدس میں ایسے خواب نہ تھے۔ سراسر دین ہی دین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی اُمت میں وہ ٹھاٹھ پیدا نہیں ہوئی جو حضرت عیسیٰ کی امت میں ہوئی۔ اور پھر دیکھئے دین سے بالکل لاپرواہ ہیں۔ حتی کہ تثلیث کے قائل ہوئے، اور کفارہ جیسے بُرے عقیدہ پر بد عمل ہوئے۔ اَنَا عِندَ ظَنِّ عَبدِی بِیْ۔ ایک حدیث مقدسہ ہے کہ ہر آدمی کے ظن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کا اظہار فرماتے ہیں۔ ایک ولی اللہ، ایک نبی، ایک رسول، ایک عام بدکردار متکبر بلکہ شیطان تک اپنے ظن کے مطابق اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت دیکھ رہے ہیں، کہ اندر کی طلب کے مطابق اللہ تعالیٰ کی محبتِ عظمیٰ ساتھ دیتی ہے۔ تبھی تو تمام مخلوقات اپنے اپنے خیال میں مگن و مصروف کار ہے، اور ہر خیال کے مطابق اس کی دلجوئیاں ساتھ دے رہی ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ کیا خوب فرمایا ہے ۔

رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے اُن کی زبان پر مہر لگادی گئی ہے ۔

کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیآمد

Marfat.com

ہم جیسے بولنے والے اس دولت سے محروم ہیں۔ بھلا جس نے دیکھ لیا وہ گنگ۔ جس نے پالیا وہ کیسے بول سکتا ہے؟ حضرت عیسیٰ کی پیدائش تکوینی ہے اور تمام امورات میں تکوینی درجہ رکھتے ہیں۔ اس تکوین کی ٹھوکر نے ان کی محبت کو قائم رکھا۔

یَا عِیْسیٰ اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ وَجَاعِلُ
الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ

## حواشی

ا۔ نسبت محمدیہ ممزوجہ ہے اور دونوں نسبتوں سے بلند، معاشرہ انسانی اور نظام کائنات کے لیے باعث زینت و شرف ہے، بخلاف پہلی دونوں نسبتوں عیسوی اور موسوی کے کہ وہ ایک حصہ میں زیادہ اور دوسرے حصہ میں کم ہیں اور جس کی وجہ سے توازن نہیں۔ اس وجہ سے مقام محمدیہ بلند ترین مقامِ انسانیت ہے۔

(جنوری ۱۹۶۷)

Marfat.com

# حقیقت الحقائق کا تخیل

ڈاکٹر محمد یوسف صاحب مرحوم ہارٹ سپیشلسٹ حضرت اعلیٰ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مخلصین میں سے تھے ۱۹۶۷ میں انہوں نے حضرت ترجمان حقیقت قدس سرہ کی تصنیف ''انقلاب الحقیقت'' کا مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں خدمت عالیہ میں استفسار ارسال کیا کہ حقیقت الحقائق کا تخیل کیسے ہوتا ہے۔ اس انتہائی اہم اور دلچسپ سوال کا حضرت اقدس نے فکر انگیز اور روح پرور جواب دیا جو ''سلسبیل'' میں اشاعت پذیر ہوا۔ ذیل میں یہ اہم سوالنامہ اور جوابی طریقت نامہ دونوں دیئے جارہے ہیں۔

قبلہ محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں بہت دنوں سے ''انقلاب الحقیقت'' کا بڑے اشتیاق سے انتظار کررہا ہوں۔ انہی دنوں میرے مکرم دوست ڈاکٹر نواب الدین صاحب نے اس کا پہلا ایڈیشن مجھے دیا۔

Marfat.com

اسے پڑھااور نہایت بصیرت افروزاور دلچسپ پایا۔ اس میں صفحہ ۸۶ پر یہ بات لکھی ہے۔

۲۲۰...... ''میں نے بہت سے ایسے طالب دیکھے، کہ عمر بھر ذکر میں گزر گئی، لیکن اس سے آگے نہ بڑھے اور کچھ فائدہ بھی نہ ہوا، کیونکہ حقیقت الحقائق کا تخیل نہیں کرتے اور طوطے کی طرح صرف الفاظ کی قید میں رٹ لگاتے رہتے ہیں''۔

بد قسمتی سے میں بھی اسی گروہ میں ہوں۔ اگر جناب اس مشکل کو دور فرمادیں اور وضاحت سے فرمائیں کہ حقیقت الحقائق کا تخیل کیسے ہوتا ہے، تو میں از حد مشکور ہوں گا۔ اگر جواب زیادہ مفصل ہو تو ''سلسبیل'' کے پرچے میں شائع فرمادیں۔

(نیاز مند محمد یوسف)

# الجواب

مخلصم جناب ڈاکٹر صاحب زاد شرفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

خیریت مطلوب! دوسرے خط کے جواب میں بہت دیری ہو گئی۔ کچھ مصروفیت اور کچھ کاہلی اور کچھ عوارضات شخصی، جس وجہ سے آپ کو بہت بڑاانتظار کرنا پڑا۔

جواب یہ لکھنے کا تو نہیں، کسی کا حسن اپنا کام آپ کرتا ہے۔ علمی تحریریں یا علم یہاں کام نہیں دیتابلکہ بگاڑتا ہے۔ آپ نے کئی کتابوں میں پڑھا ہو گا۔ خصوصاً حضرت سلطان باہوؒ صاحب نے لکھاہے کہ ''مرشد وہی ہے جو پہلے دن ہی حضوری کرادے''

بہت کم لوگوں نے اس حضوری کا مطلب پایا۔ عام لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضری دلانا۔ لیکن یہ غلط ہے حضوری کے معنی یہ ہیں کہ ''ماسوا سے دل پاک ہو جائے''۔ اور اس پاک جذبہ سے دل معمور ہو جائے۔

تصور میں کسی کے کھو گیا ہوں
کوئی قلب و نظر پر چھا گیا ہے

میاں محمد صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

نظر جنہاں دی کیمیا سونا کر دے وٹ

یعنی بے جان کو جاندار بنا دیتے ہیں، مردہ کو زندہ کر دیتے ہیں، غافل کو ہشیار بنا دیتے ہیں

اندر بھی ہو، تے باہر بھی ہو، ہن باہو کتھ لبھیندا ہو

حضرت قبلہ مرشدم میاں صاحبؒ کی خدمت میں جو بھی حاضر ہوا، اس حضوری تک پہنچ گیا۔ اس کو مستقل قائم ودائم رکھنا سالک کا اپنا کام ہے۔ پیر کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ ایک بار اس جذبہ کو منور کر دے۔ لیکن کیا کیا جائے۔!

ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہ نم کیا ہے۔ وہی عشق و محبت کا جذبہ ہے۔ جس کے اندر یہ ودیعت فرمایا گیا، سات آسمان اور سات زمین کی پرواہ کیے بغیر اُس کے پاس جا بیٹھتا ہے۔ اور جس کو یہ دولت نصیب نہیں اس کی عبادت بھی ٹھوکریں ہے۔

آں جا کہ زاہداں بہزار اربعیں رسند
مستِ شرابِ عشق بہ یک آہ مے رسد

اقبالؒ کے پاس کیا تھا ؟ یہی ایک آہ، یہی سوز و گداز تھا۔ عقل والے فلاسفر بہت ہیں، جن کا نام تک نہیں۔ اُن کی عمر عقل کی گتھیاں سلجھاتے گزر گئی لیکن کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

Marfat.com

لیکن یہ مرد قلندر باوجود بے عملی کے کہاں جا پہنچا۔ ہمارے جیسے تو اب بھی اُس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر مسلمانی کی حقیقت کو کھولتا چلا جاتا ہے۔ مشہور ہے ۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّو بیان

میں نے کتنے مرشد دیکھے جنکے سالک ان سے بڑھ کر عبادت گذار تھے۔ لیکن یہ مرشد رہے اور وہ ہی مرید یعنی سالک۔ اس لیے استعداد باطنی کے ساتھ مرشدِ کامل کی ایک ہی نظر قلبِ مردہ کو جگا دیتی ہے۔

تحریری طور پر تو میں نے بہت کچھ اپنے مضامین میں لکھا ہے۔ خصوصاً ''سلوک اور مقصد سلوک'' کا مطالعہ فرمائیے اور ساتھ ''کیفیات ا ۔'' کا مضمون ''سلسبیل'' میں پڑھیئے۔ مضمون ''ستا سودا ۲ ۔'' میں سالک کے گرنے کی وجوہات میں یہ بات زیادہ واضح کی گئی ہے، کہ جب (تک) اسم مسمیٰ میں تبدیل نہ ہو تو مسمی کی ذات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً جب ہم لاہور کا نام لیتے ہیں، تو لاہور کے الفاظ میں لاہور کا مسمی یعنی شہر لاہور کا تصور سامنے آجاتا ہے، خواہ کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔ نہ دیکھنے کی صورت میں بھی ایک خیالی صورت سامنے آجاتی ہے۔ اور صفات دیکھنے والے کے تو سامنے آجاتے ہیں، اور نہ دیکھنے والے کے اندر بھی خیالی صفات ابھر آتے ہیں۔ بعینہ یہی بات یہاں ہے۔ جہاں ہم اسم ذات پڑھتے ہیں تو صرف حروف پر ہماری نظر نہیں رہتی بلکہ ''حقیقت الحقائق'' کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ ہاں یہ تصور اپنی استعداد کے مطابق الگ الگ ہے۔ عوام کا تخیل صرف ذات اقدس کے موجود ہونے تک ہے۔ لیکن خواص جوں جوں اس اسم کو پڑھتے ہیں تو ذات کی تکمیل کے صفات سامنے آتے جاتے ہیں اور وہ صفات لاتعداد ہیں۔ جس سالک کی استعداد بلند ہو گی، وہ لاتعداد صفات میں اپنی استعداد کے مطابق شرح صدر پاتا جائے گا اور صفات قدسیہ کے انعکاس کی زد میں آجائے گا۔ اور زندگی بھر یہ صفات ختم نہ ہوں گے نہ اس کا مطالعۂ

Marfat.com

قدرت ختم ہو گا۔ بلکہ ھَلْ مِنْ مَزِیْد کی تشنگی بڑھتی جائے گی۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

حَتّٰی یَاتِیَکَ الْیَقِیْن، یہاں تک کہ آخری وقت پہنچ جائے اور سیر الی نہ ہو، لیکن کم استعداد والے وَرے وَرے رہ جاتے ہیں۔ لا تعداد کو تعداد میں شمار کرتے ہیں، اور لا محدود کو محدود سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں اکثر سالک خود محدودیت میں آکر ترقی کی بجائے تنزل میں گر جاتا ہے اور بعض وقت صفاتِ حقہ سے گر کر اتنا گر جاتا ہے کہ اسم کے حروف میں مقید ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسم ذات کے حروف اور الفاظ رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حروف بھی بابرکات ہیں۔ لیکن ان کے لیے جو انہیں بابرکات سمجھے۔ عامتہ الناس اگرچہ مسمی کی صفات کی طرف منتقل نہیں ہوتے، نہ ہی ان کا یقین پختہ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی اس متبرک خیال کی برکت سے وہ کلی نجات پاتے ہیں، اور دین ودنیا کی فلاح کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مستعد سالک اگر گر بھی جائے تو اس کا علاج وہی ہے جو پہلے لکھا گیا ہے۔ یعنی نظرِ اکسیر یا وہ خود از سر نو دل کو زندہ کرنے کی کوشش کرے اور خلوت میں بیٹھ کر ذات اقدس کے ساتھ اپنا دِل وابستہ کرے، اور اُن موانعات سے بچے، جو آوارگی کا باعث ہوتے ہیں۔

آپ دیکھتے نہیں۔ تیل یا پٹرول جب تک گیس GASS میں تبدیل نہ ہو گاڑی نہیں چلتی۔ غذا کا جب تک خون نہ بنے اور خون سے روح نہ اٹھے تو چلنا پھرنا محال۔

غرض مادیت سے جب تک کوئی مادیت تبدیل نہ ہو، ارتقاء ناممکن ہے۔ اور یہ قاعدہ تمام کائنات، حیوانات، نباتات وغیرہ وغیرہ میں جاری وساری ہے۔ امید ہے ان اشارات سے آپ تسکین پا جائیں گے۔ اور آپ وہ کچھ سمجھ جائیں گے جو میرے ذہن میں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا راستہ دکھائے اور اس پر استقامت بخشے۔ آمین!

یاد رہے کہ جب تک صفات ذات کے ساتھ وابستہ دکھائی نہ دیں، اس وقت تک تعرف اور تشخص نہیں ہو سکتا۔ جب ہم کسی نام کو لیتے ہیں، اس کے صفات

Marfat.com

تشخصات کی صورت میں سامنے آجاتے ہیں، جس سے ذات متعارف ہو جاتی ہے۔ اور اسم کے حروف کی طرف بالکلیہ کبھی کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ ایسا ہی جب ہم اسم ذات پڑھتے ہیں، تو اس کے صفات کا ذات سے وابستہ دیکھنا عرفان ہے۔ کیونکہ یہاں ذات لَیسَ کَمِثلِہٖ شئیٌ ہے۔ جو کچھ ہے، یہاں صفات، کیفیات اور تجلیات ہیں۔ ایک طرف تجلیاتِ خصوصی صفات عامہ کی رہبری کرتی ہیں۔ اور جب تک صفات عامہ حالاً ذات کے ساتھ وابستہ دیکھے نہ جائیں، عرفان نہیں کہلاتا۔

عرفان یہی ہے کہ تمام اسبابِ ظاہرہ اٹھ جائیں اور صفات کو ذات کے ساتھ مطلقاً وابستہ دیکھا جائے ۔

خدا کی قسم تجھ کو موجود پایا
جہاں سر جھکایا سویرے سویرے

اللّٰھُمَّ اَوْصِلْنَا اِلٰی مَقَاصِدِ نَاوَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوابُ الرَّحِیم۔

اللَّھُمَّ ارْزُقْنَا لَذۃَ النَّظرِ اِلیَ وَجْھِکَ وَالشَّوْقَ اِلیَ لِقَائِکَ اللَّھُمَّ اَرِنَا اَلحَقَّ حَقّاًو ارْزُقْنَا اِتّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اِجْتِنَابَہٗ اللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَاھِیَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَالْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْن۔

والدعا

محمد عمر کان اللہ لہ بیربل شریف

فروری ۱۹۶۷

# تدبیر اور تقدیر کے غلط سہارے

## تدبیر و تقدیر کی آویزش!

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر میرا علمی سرمایہ، قلم فرسائی نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ تقدیر کے مسئلہ نے قرونِ اُولیٰ کی مسلم ہستی کا قالب شجاعت، دلیری، سخاوت اولوالعزمی اور دیگر فضائل میں بے مثل کر دیا تھا۔ گنتی کے آدمی ہزاروں کو جواب دے بیٹھتے، اور جس میدان میں اُترتے، کامیاب ہو کر نکلتے۔ جس شخص نے تاریخ اسلامی پر ایک نظر بھی ڈالی، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا اور جتنے جنگ خلافت راشدہ میں ہوئے، وہ اس کے شاہد حال ہیں۔ بلکہ کلام مجید نے خود فیصلہ فرمادیا۔

اِنْ يَّكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُوْنَ
صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْن
(تم میں سے بیس صابر دو سو پر غالب ہو جائیں گے)

لیکن دورِ حاضرہ میں جتنے نقائص اور کمزوریاں ہوتی جاتی ہیں، یہ بھی اس تقدیر کے مسئلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب تسخیر قسطنطنیہ [1] اور فتح مکہ غیر اقوام نے کر لیے تو پاک ہستیوں نے جذبۂ مدافعت اور انتقام پیدا کر کے اسلامی ممالک کو واپس دلانے کی

Marfat.com

تحریک جاری کی لیکن صدائے بازگشت کے سوا کچھ نہ نکلا کیونکہ جہال سے لیکر علمائے نامدار تک بہ یک زبان تقدیر کا آئینہ لے کر ٹس سے مس نہ ہوئے کہ ایسا ہی ہونا تھا اب کیا چارہ ہے۔ بلکہ قرون اولیٰ میں یہ ہی تقدیر اگر دولت، ملک، سلطنت، عزت، آبرو، جفاکشی اور محنت واستقلال کا باعث تھی، تو دور حاضرہ میں یہ ہی نکبت، افلاس، غلامی، کاہلی، آرام طلبی وغیرہ وغیرہ رذائل کا سبب نظر آتی ہے۔ پھر آخر اس کا سبب کیا ہے؟

اصل میں ہر ایک مسئلہ، ہر ایک خیال بلکہ ہر ایک ہنر مختلف نتائج پیدا کرتا ہے۔ مثلاً انفاق [۲]۔ ایک اللہ کے واسطے خرچ کرتا ہے تو دوسرا شہرت کے واسطے۔ چونکہ دونوں کی الگ الگ غرض ہے اس لیے اس کے حیثیات بھی بدل جائیں گے اور حیثیات پر نتائج اغراض کے مطابق پیدا ہوں گے۔ علی ہذا القیاس هَلُمَّ جَرًّا [۳]۔ پھر ایک فعل کے دو غرض یا مقصد قرار دیئے جاسکتے ہیں بلکہ طبیعت جتنے گھڑے۔ ہجرتِ ہندوستان کو دیکھو۔ ایک قوم تو صرف پیغمبر علیہ السلام کی پیروی کر کے ان کے پاک افعال ومقاصد کو مطمحِ نظر رکھ کر چلی۔ دوسرے وہ جنہوں نے صرف فرنگی حکومت کو ستانے کے لیے ہجرت کا وطیرہ باندھ لیا۔ تیسرے وہ یارباش لوگ نہ یہ نہ وہ، بس اس لیے کہ نیا ملک ہوگا، تعظیم ہوگی، من مانی عیش اڑائیں گے۔ اور چوتھے وہ بھی تھے جو اسی زمرۂ مہاجرین میں داخل ہو کر اس کے ارادوں کو توڑنے کے لیے ہجرت کر گئے تھے۔ اب اگرچہ اخبار پر ایک سفر تھا اور ایک فعل، لیکن نتائج کے لحاظ سے دیکھ لو یہ لوگ ایک معاشرے سے کتنے دور جا پڑے؟ چنانچہ ہر ایک نے اپنی اپنی غرض کے مطابق نتائج پیدا کیے۔ گو بظاہر کسی پر یا اکثر پر یہ راز پوشیدہ ہی رہا ہو۔

ایک شخص مزار پر دیا اس غرض سے جلاتا ہے کہ قرآن مجید پڑھا جاسکے۔ دوسرا اس لیے کہ فقیر کی روح خوشنود ہو اور تیسرے نے اس لیے شمع جلائی کہ یار لوگ آکر قمار کی مجلس رچائیں۔ حیثیات کے بدلنے کی وجہ سے اسی روشنی کے نتائج بدل گئے۔ پہلے کو ثواب، دوسرے کو بعض کے نزدیک ثواب اور بعض کے نزدیک بے فائدہ اور عبث۔ تیسرے کی حرمت میں کسی کو کیا شک ہے؟ اب دیکھئے فعل بھی ایک، مقام

Marfat.com

بھی ایک ،وقت بھی ایک ، لیکن حیثیات نے نتائج الگ الگ کر دکھائے۔

اسی طرح شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس حیثیت و غرض سے یہ مسئلہ تقدیر پیش کیا تھا، اس کی اب وہ غرض نہیں رہی جس کی وجہ سے الٹے نتائج یعنی رزائل قوم میں پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ غلطی صرف ملاں کی بے پرواہی کی وجہ سے ہوئی کہ تقدیر کے مسئلہ کو علی العوام پیش کر کے ان کی طبیعتوں کو ایسا راسخ کیا کہ جب کہیں کوئی برا کام یا برا نتیجہ پیدا ہو وہاں یہ مسئلہ سب کے لیے فیصلہ کن اور خاموش کن ہو۔ یا طبیعت کمزور ہونے کی وجہ سے بہانہ جو طبیعت نے خود حیثیت بھری۔ مرد ہو کہ زن، جب کہیں بد کام کر بیٹھتا ہے اور احباب ملامت کرنے لگتے ہیں کہ یہ کیا کیا؟ تو اس کے یہ کہنے پر کہ "تقدیر" سب بلا ٹل جاتی ہے اور جب کسی کاہل کو نیکی کی ترغیب اور عمل کی تحریک کی جاتی ہے تو جواب یہ ملتا ہے کہ مالک کی مرضی ہو گی تو کرالیویں گے ، وہ چاہے گا تو سب کچھ کرالے گا۔ مگر جب عام دنیوی کاروبار مثلاً نان نفقہ ، زراعت و تجارت اور دیگر ضروریات میں یہ مسئلہ پیش کر کے مادی فلاح کی طرف رجوع کرایا جائے تو جاہلانہ یا عاقلانہ جواب یہ دیتے ہیں کہ محنت سے مراد حاصل ہوتی ہے۔ یعنی مراد محنت کا ثمر ہے۔ حتی کہ دودھ سے اگر مکھن کافی نہ نکلے تو تعویز گنڈا کے علاوہ تمام کارن (شرک) کر کے بھی آرام نصیب نہیں ہوتا۔

اس کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ در حقیقت یہ تقدیر کوئی چیز ہے بھی کہ نہیں۔ اس کا جواب مثبت میں ملتا ہے۔ باوجودیکہ ظاہر بین مادہ پرست ہزاروں تدابیر کر کے ایک نتیجہ کے تمام اسباب و علل مہیا کرنے کے بعد اس کے نتیجہ کا منتظر ہو بیٹھتا ہے، لیکن لطف یہ ہے کہ جو اس کے گمان میں بھی کبھی نہیں آیا تھا وہ جا کر پیدا ہوتا ہے۔ دور کیوں جایئے۔ ریل گاڑی کے انتظام اور اہتمام جس تدبیر سے چلائے جاتے ہیں وہ بالخصوص ایسے ہیں کہ ایک سیکنڈ بھی وقت میں فرق پیدا نہیں ہونے دیتے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سیکنڈوں چھوڑ گھنٹوں گاڑیاں لیٹ ہو جایا کرتی ہیں۔ گو ظاہر میں اس کی مادہ پرست ہزاروں توجیہ نکالتا ہے لیکن بے فائدہ!

## گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یا انسانی زندگی بچانے کے لیے سینکڑوں تدابیر کیے جاتے ہیں، مگر جب تقدیر اپنا سر نکالتی ہے تو سب تدابیر اس کے سامنے سر بسجود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حکیم طبیعت کا ماہر بھی ہے، تشخیص میں بھی اس نے کمال کر دیا، نسخہ نویسی بھی اس کی شہرۂ آفاق ہے اور مریض کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں اور مرض بھی اس درجہ پر نہیں پہنچی جس پر لاعلاجی کا حکم دے کر علاج سے دستبرداری کی جائے لیکن مریض کی جان دواؤں کے کھانے اور پرہیز کے باوجود گھٹتی چلی جاتی ہے اور حکیم سبب دریافت کرنے میں منہمک ہے۔ مولانا روم نے کیا اچھا مختصر الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ ؎

از قضا سر کنگبین صفرا فزود
روغن بادام خشکی مینمود
چوں قضا آید طبیب ابلہ شود
واں دوا در نفع خود گمراہ شود

اس سے نیچے اتر کر اپنا روزانہ مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ تمہاری سینکڑوں تدابیر کے نتائج الٹے پیدا ہو کر تمہاری خوشی یا رنج کا باعث ہوتے ہیں اور نتیجہ و علل کے اسباب خواہ کچھ بھی زاں بعد مقرر کر لیے جائیں نتیجہ کے دلائل مہیا کرنے پر حیرت پھر بھی نہیں چھوڑتی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی تقدیر کی زبردستی! کہ جب چاہے تدبیر کو آدبائے۔

بیربل میں طاعون پھوٹنے پر میں نے گجرات کے علاقہ میں جانے کا ارادہ کیا جہاں سے مجھے پہلے ہی آنے کی دعوت اور وبائی اثر نہ ہونے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ رات اپنے اسٹیشن پر گزر رہی تھی۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ شکر ہے کہ ہم لوگ وبازدہ مقام سے نکل کر جا رہے ہیں اور فکر و تردّد کی کوئی وجہ نہیں۔ جب سٹیشن آلہ پر اترے تو سواریاں موجود تھیں۔ مقامِ شب باشی کی بابت دریافت کیا اور تسلی بخش جواب پانے پر ہم سوار ہو کر پہنچ گئے۔ لیکن شام کو جو لڑکا ہمیں لینے گیا اور اچھا خاصا عزیز تھا اس کے

Marfat.com

ران میں درد اور گلٹی نمودار ہو گئی اور زور کا بخار چڑھ گیا۔ گو گھر والوں نے ظاہر نہ کیا لیکن آخر راز کھل گیا۔ اس پر مزہ یہ کہ لڑکا میرے بغیر آرام نہ کرے۔ جب بھی بے ہوشی میں اسے گھر لے جاویں تو ہوش آنے پر دوڑ کر مسجد میں میرے پاس آ درا زہو۔ پہلے تو میرے اوسان بھی خطا ہوئے کہ دو تین آدمیوں کے ہمراہ ہم تو اس بلا سے بچنے کے لیے نکلے تھے لیکن پھر یہ غائب سے موجود۔ یہ وقت ایسا تھا کہ نہ جائے ماندن و نہ پائے رفتن"۔ پیر جی پھنسے مگر الٹے پھنسے! مگر آخر فوراً تسلی ہو گئی کہ تقدیر سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ مرنا ہے تو مرنا ہی ہے اور جینا ہے تو جینا ہے، خوشی سے چاول گوشت کھایا، بیمار بھی پاس ہی رہا اور قادر مطلق نے خیال فرار کی تردید کرنے کے بعد خیر گزاری۔ غرض اپنی بیتی مجھے سینکڑوں باتیں یاد ہیں۔ میں نے اس لیے اسے ذکر کیا کہ ہر ایک آدمی اپنی تدابیر کے نتائج خود سوچ کر تقدیر یا عدم تقدیر کے متعلق نتیجہ نکال سکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے کتنے گروہ ہیں اور وہ کس درجہ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ (۱) سب سے پیشتر اس کے دلدادہ اور اس کے فرمانبردار ہمارے صوفی بزرگ ہیں جن پر یہ نشہ ایسا چڑھا ہے کہ خواہ کسی نتیجہ کے ظاہری اسباب و علل کتنے اہم اور زبردست ہونے کے علاوہ روز روشن کی طرح بھی کیوں نہ ہوں، لیکن ان اسباب و علل کی ہستی ھَبَآء منثورًا سے بھی ان کے نزدیک کم ہے۔ ان کے اقوال اور حال نقل کرتا لیکن طوالت کی وجہ سے اشارہ ہی کافی ہے۔

دوسرے وہ جو تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن عالم اسباب میں ہونے کی وجہ سے اسباب و علل مہیا کرنے کے بعد وہ نتیجہ کو تقدیر کے ہاتھ چھوڑتے ہیں۔ جیسا کہ بعض اصحاب دنیادار اور اکثر اہل علم حضرات!

تیسرے موجودہ جاہل مسلمان، یا جاہل بے ذوق فقیر، کہ زبان پر تو ہر وقت تقدیر ہے لیکن حال اس کے برعکس ہے۔ معمولی روزانہ کے کاروبار میں تو الٹا ہاتھ پاؤں مار لیتے ہیں لیکن سوا دوسرے کاموں میں (ان کے لئے) تقدیر ہی تقدیر ہے۔ بھنگ کی

Marfat.com

تلاش میں تو بیسیوں میل طے ہو جاتے ہیں اور گداگری کے لیے کوچہ بکوچہ کشکول لیے گھوم لیا جاتا ہے لیکن پیٹ کے لیے وہ محنت جو انسانی فرض یا ہر ایک مذہب کا جزو اعمال ہے، کے لیے تقدیر کی ڈھال ہاتھ میں لیے مزے سے چٹ لیتے ہیں اور لوگ ہیں کہ توکل علی اللہ کا مجسم خیال کر کے قدم بوس ہو رہے ہیں۔

دوسری طرف عام مذاق کی تقدیر تسلیم کرنے والوں کو دیکھو کہ تقدیر جس ہستی کے حکم کا نام ہے اس سے تو ذرّہ بھر محبت نہیں، اس کی عبادت کا ذرہ بھر پاس نہیں، اس کے امورات و منہیات سے نہ تعمیل نہ بیزاری، اور سب کچھ معلوم ہے، جانتے ہیں۔ تمام ظاہری امور کے زیر نگیں ہونے کے باوجود تقدیر کے مسئلہ کو وہاں تسلیم کرتے ہیں جہاں مریض کی مرض بڑھ رہی ہو اور خرچ کرنے کو جی نہ چاہے یا جہاں قومی زوال وانحطاط کے اسباب بیان ہو رہے ہوں، یا کوئی نیکی اور عمل صالح کی ترغیب دے، یا کسی بدکام سے پرہیز کرنے کے لیے کہا جائے تو جواب میں صرف یہی الفاظ زبان سے نکالیں گے کہ "تقدیر کے آگے ہمارا کیا چارا؟ حالانکہ یہ پاک جذبہ اس کی ہستی کی خاص محبت ،اس کی خالص عبادت، اس کے حکم پر عمل کرنے اور مناہی سے بچنے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی تب جب ایک زمانہ ان امور میں مداومت پر گزر جائے اور درمیان میں فعل یا تشویش راہ نہ پائے اور اسباب و علل کی سب تاریکیاں دور ہو جائیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ان کی تقدیر من گھڑی تقدیر ہے۔ جہاں من حرامی ہو وہاں تقدیر کی اوٹ میں سب کچھ کر لیا اور لیٹ گئے۔ اس پر چند مختصر مثالیں دیتا ہوں تاکہ یہ تیسرا درجہ واضح ہو جائے۔

(۱) ایک چور کا چوری پیشہ ہو گیا۔ کئی مرتبہ وہ گرفتار ہو کر آیا۔ عدالت نے دیکھا لباس بھی عمدہ ہے، گھرانے کا بھی ہے اور اچھے خاصے زمینداروں سے ہے تو مجسٹریٹ نے کہا کہ تم کتنے طاقتور گھرانے کے رکن اور اچھے بھلے زمیندار ہو، آپ کو کسی چیز کی کمی نہیں! تو سب کچھ سن کر کہہ دیا کہ میری تقدیر اور قسمت! خدا فضل کرے۔

(۲) وبائی امراض کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں اور تقدیر کو نہ ماننے والے اس اثر کو تاڑ کر فوراً اس علاقہ سے جوق در جوق نکل جاتے ہیں اور اپنے سامان اسباب کو

Marfat.com

کرایہ دے کر اٹھالے جاتے ہیں لیکن ہمارے تقدیر کے متوالے خوش و خرم اپنی بدکرداریوں اور بداعمالیوں کے باوجود پہلے سے زیادہ آکر اس مقام اور گاؤں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ حتی کہ جو سال بھر اپنی کاشت کے لیے اپنے مزارعین میں لنگرانداز رہتے تھے وہ بھی وبائی اثر سن کر آجمع ہوتے ہیں تاکہ وبا کا اثر وہی گاؤں والے نہ لے جائیں اور کوئی یہ نہ کہہ دے کہ تقدیر سے یا موت سے بھاگے پھرتے ہیں، یا کسی کے منہ سے یہ نہ نکل جائے کہ فلاں شخص ایسے آڑے وقت میں کنبے سے الگ رہ کر جان بچا گیا۔ یہ سب دھڑتے سے جاگرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وبا پھوٹ پڑتی ہے اور گھروں کے گھر تباہ ہونے لگتے ہیں۔ اور جس نے عمر بھر کبھی کسی کی عیادت نہیں کی تھی وہ باقاعدہ ہر ایک مریض کی عیادت کرتا ہے اور صرف عیادت ہی نہیں بلکہ گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھ کر مریض کی سمع خراشی بلکہ جگر خراشی بھی کرتا ہے۔ مگر وہ پُراز اخلاص عیادت والا پُراز اخلاص توبہ کا نام تک نہیں لیتا۔ پہلے بھی جن کبیرہ گناہوں میں مبتلا تھا بدستور ان میں روزافزوں ترقی ہے۔ کیونکہ مرنا تو ایک دن ہے ہی! بچے اس سے کون! غرضیکہ جب چالیس فیصد یا اس سے زیادہ ہستیاں تباہ ہو جاتی ہیں تو کچھ آرام ہونے پر تقدیر کے نہ ماننے والے "تدبیر کے چیلے" بھی جمع ہو جاتے ہیں اور تعزیت دینے میں تقدیر کا پاک لفظ ہی زبان پر ہوتا ہے اور بس! اگر کوئی اس مسئلہ کو چھیڑے بھی کہ وہ کیوں بچ گئے تو جواب پھر وہی "تقدیر"، اور یہ کہ وبائی شہادت اس کے نصیب میں کہاں۔ غرض سینکڑوں خارجی مثالیں ہیں جو پیش کی جاسکتی ہیں۔

تقدیر کے آسان اور مختصر معنے یہ ہو سکتے ہیں مشیتِ ایزدی، ارادۂ ازلی، حکم و امرالٰہی، لوحِ محفوظ۔ تقدیر تدبیر کے آئینے میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور دونوں صورتوں میں، یعنی تدبیر کے اندر بھی وہی کام کرتی ہے، اور تدبیر کے باہر بھی وہی حاوی ہے جبکہ تدبیر کے بعد نتائج الٹے پیدا ہوں۔ مگر اس صورت میں وہ بذاتہ ایک عام صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تقدیر اور تدبیر کا تعلق وہ ہے جو لفظ کو معنے سے اور اسم کو مسمّیٰ سے اور روح کو جسم سے! جسم کے نہ ہونے سے بھی روح باقی رہتی ہے۔

Marfat.com

وبا آئی۔ ظاہر بینوں نے علاج کیے۔ بچے تو تقدیر۔ باطن بینوں نے علاج نہ کیا۔ مرے تو بھی تقدیر۔ یا دونوں کا عکس لے لو۔ مریض کا علاج کیا اور شفا پا گیا تو تقدیر۔ اگر بغیر علاج اچھا ہو گیا تو بھی تقدیر۔ اور علاج کرتے کرتے اور صدقات دیتے دیتے چل بسا تو بھی تقدیر۔ لیکن تیسرے عوام میں تقدیر کا زیادہ عمل ہے۔ کیونکہ تدبیر کے برخلاف تقدیر نے نتیجہ پیدا کیا۔ مگر پہلی اور دوسری صورت میں تدبیر کا نتیجہ حسبِ تدبیر پیدا ہوگا (یعنی علاج سے)۔ اور دوسری صورت میں تدبیر نہ کرنے کا نتیجہ بھی حسبِ اسباب کیونکہ عدمِ علاج موت کے اسباب میں داخل ہے موت پیدا ہو گیا۔ نتیجہ اس لیے اس کو تقدیر نہیں کہتے۔ الغرض عوام سے لے کر خواص تک تقدیر کی سپر وہاں ڈالی جاتی ہے جہاں واقعات اور اسباب کے برخلاف اچانک اژدہائے نتیجۂ بد پیدا ہو کر انسانی ہستی پر حملہ آور ہو کر ہمیشہ کے لیے اسے مغموم بنایا چاہتے ہیں۔

عالم اسباب میں پیدا ہونے والا آدمی تو اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ صوفی جو وحدت الوجود کے حال میں ہو گئے ہیں، وہ اول تو تدبیر کے اسباب و علل کا سرے سے انکار کرتے ہیں اور تسلیم بھی کریں تو اس کی حقیقت مکڑی کے جالے سے بڑھ کر نہیں۔ وہ بھی ظاہری نمود کے لیے۔ در حقیقت مکڑی کے گھر کے تاروں کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ مگر مادی دنیا کا مادہ پرست حصہ تو اس درجہ تسلیم کرتا ہے کہ ایسی تجویز کے سامنے ہر وقت سر بسجود نظر آتا ہے اور کوئی کام (نتیجہ) سوائے اسباب و علل ہونے کا ہرگز قائل نہیں اور پھر اس میں ترقی دکھائی کہ جو کام (نتیجہ) گاہے قدرتی طور پر جلوہ گر ہو کر قدرت کا ایک ظہور کہلاتا تھا، وہ اب مشاہدہ کے قارورہ میں نمایاں کر کے دکھا دیتے ہیں۔ بارھویں صدی کے اوائل میں چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی گاڑی کو بلا کشش کسی جانور کے چلانا اگر معجزہ تھا تو تیرہویں صدی میں فی گھنٹہ ۷۰ میل کی رفتار سے اڑنا محال خیال کیا جاتا تھا لیکن اب یہ دونوں باتیں روزانہ کے مشاہدات میں آکر ایک عام تدبیری اسباب کا نتیجہ کہلاتی ہیں، اور اب ان پر کوئی تعجب نہیں رہا۔ اسی طرح انسان کی جراحی میں دوسرے جانور کی آنکھ سے انسان کو دیدہ ور کر

Marfat.com

دکھانا، احشا کے زخم کو درست کر لینا اور انتڑی کاٹ کر بقیہ انتڑی سے کام چلانا، جوڑوں کی بناوٹ یا اس کے نقص کو معلوم کرنے کے لیے عکسی کرنوں سے کام لینا اور چھ سو میل سے بڑھ کر بات چیت اپنی آواز سے سننا، بلکہ جہاں کا گانا پسند ہو اس کے گانے کی آواز کو گھر بیٹھے اسی کے سُر سے سن لینا، جیسا کہ اب تازہ ایجاد ہے۔ علی ذالک القیاس ستاروں کی رفتار، ان کی آبادی کی دیکھ بھال، ان کی بلندی اور رنگ وغیرہ امورات کا مشاہدہ کرنا اور کرانا اور سب سے بڑھ کر وہ تجربی جو حال میں ڈاکٹر بوس نے انکشاف کیا اور نباتات کی روح، ان کے خواص، ان کی خوراک، ان کے ہنسنے اور رونے تک کو بالمشاہدہ پیش کر دیا۔ الغرض یہ وہ باتیں ہیں کہ آج سے ڈیڑھ صدی پیشتر خواب و خیال اور قصہ کے طور پر بھی بیان کردہ تسلیم نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن تدبیر پرستاروں نے انکو قارورہ میں اتار کر دکھا دیا کہ جو کچھ ہے سو تدبیر ہے۔

ان تدبیر پرستاروں کو کوئی ایسا نتیجہ دکھایا جاوے جو تدبیر کے برخلاف پیدا ہوا ہو یا بلا تدبیر پیدا ہو کر محو حیرت کرنے والا ہو تو یہ قدرت کا ظہور پھر بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ابھی اس کے اسباب و علل کا پتہ نہیں چلا، یہ ضروری نہیں کہ جس نتیجہ کے اسباب و علل کا پتہ نہ چلے اس کے اسباب و علل ہی نہ ہوں یا جن اسباب نے آکر ہمارے اسباب کی تباہی پیدا کر دی اور ہمارے برخلاف نتائج پیدا کر دکھائے اس کو ہم اسباب نتائج شمار نہ کریں یا وہ اسباب جو ہمارے قبضہ و اختیار میں نہ ہوں وہ بھی اسباب ہی نہ کہلائیں۔ لیکن ہم تو ان کو اتنا ہی جواب دیں گے کہ جو نتائج ہماری تدبیرات کے برخلاف یا ہماری تدابیر کے سوا، یا ان اسباب سے پیدا ہوا ہو جو ہماری تدابیر کے قبضہ سے باہر ہوں، ان کو اگر تقدیری نہ کہا جائے تو کس میں شمار ہوں کیونکہ تدبیر کا تعلق ان میں ہرگز نہیں اور نہ ہی تدبیر کا تعلق بنایا جا سکتا ہے۔

اس سے بڑھ کر تقدیر کی اور زبردستی دیکھئے کہ جن تدابیر سے ایک تاجر ملک التجار بنتا ہے انہی تدابیر کے وسائل نے اسے دیوالیہ کر بٹھایا اور جن فلاسفروں کے ادنیٰ کرشموں سے ہستی کائنات کو فخر حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی تدابیر معیشت میں شب و روز منہمک ہونے

کے باوجود سخت تنگ حالی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سعدیؒ نے خواب کہا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند

کہ دانا اندراں حیراں بماند

اس فلاسفی میں سب تدابیر پرست آکر حیران رہ جاتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَشَاءُ وَیَقْدِرُ

نوٹ: جو تدبیر کے قائل نہیں ان سے جو پوچھا جائے کہ اگر تدبیر کے علل و اسباب کے نتیجہ پر سزا و جزا کا دارومدار نہیں تو پھر تقدیر پر جزا و سزا کیسے! بلکہ تدبیر ہی کے نتائج پر جزا و سزا کا دارومدار ہے اور تدبیر پر دنیا کا انحصار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرماتے ہیں مَا أَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِکَ حسنات اللہ کی طرف اس لیے منسوب کیے کہ اگر وہ ذات نیک ارادے پیدا نہ کرے تو کمزور انسانی ہستی کیا کر سکے۔ کہ انسان میں غرور پیدا ہو تمام گناہوں کا سرچشمہ نہ بنائے۔ ورنہ اس کی تدبیر کی جزا خیر ملے گی۔ اور جو عمل سیئہ کو نفس کا فعل بتایا وہ اس لیے کہ جب نفس کی تدبیر سے سزا کا مزہ چکھے گا تو آئندہ کا تدارک تدبیر نیک سے کرے گا ورنہ در حقیقت حکم تقدیر تو یہ ہے۔ قُلْ کُلٌّ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ مثلاً ایک شخص نے کسی شکار پر بندوق چلائی۔ اتفاق سے ایک شخص کو جا لگی اور وہ اس سے مر گیا۔ اب یہ شخص مرا تو تقدیر سے لیکن اس میں چونکہ کسی کی تدبیر کا کچھ دخل ہے اس لیے بندوق چلانے والا جرم کا مرتکب نہیں ہوا اور نہ اسے سزا ملی۔ ہاں! اگر غلطی اس کی ہے کہ اس نے احتیاط نہیں برتی تو پھر اس غلطی کے مطابق سزا بھگتنی پڑے گی۔

اب ایک دوسری مثال دیکھو کہ ایک شخص شہادت کی غرض سے خواہ مخواہ کسی کو چھیڑتا ہے کہ وہ اسے قتل کرے یا بلا تدبیر دشمن کے کیمپ میں بلا غرض دیگر صرف شہادت کے لیے چلا جاتا ہے، تو دشمن کے مارنے سے یہ موت شہیدی نہیں کہلا سکتی، کیونکہ اس نے تدبیر سے کام نہیں لیا اور بلاوجہ جان کو دکھ دینا حکم الٰہی کے بالکل منافی ہے۔ وَلَا تُلْقُوا بِأَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ۔ تدبیر کا بیج چونکہ ارادہ (نیت) ہے

Marfat.com

اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیاتِ وَلِکُلِّ امْرِءٍ مَانَوٰی لیکن رحمت الٰہی کے لامتناہی وصف (وَرَحْمَتِی وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ) نے انسانی کمزوری پر یہ رحم کھایا کہ ارادہ ہائے بد کی سزا اسی وقت ہو گی جب کہ یہ بیج ثمر آور ہو۔ کیونکہ نتائج بد کے پیدا ہونے سے پیشتر وہ کسی ہستی کا نقصان دہ ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ نیک نیت کو بحال دکھا کر اگرچہ ارادہ کا بیج ثمر آور نہیں ہوا لیکن اس نے تو کائنات کے فوائد کے لیے بیج تیار کر رکھا تھا۔ اور جوں جوں اس بیج کا درخت اور اس کی شاخیں (اسباب د علل) پھوٹیں گی، وہ زیادہ تر انعام کے اجر کا مستحق ہوتا جائے گا، خواہ تقدیر اسے پھل دینے کی مہلت نہ بھی دے۔ الغرض انسانی دارومدار تدبیر پر رکھا گیا ہے نہ کہ تقدیر پر۔ خدائی ارادہ کا مظہر اگر تقدیر ہے تو انسانی ارادہ کا جلوہ گاہ تدبیر ہے۔

دوئم اگر تدبیری وسائل کی ضرورت نہ سمجھی جائے (جیسا کہ بعض صوفیا کا خیال ہے) تو پھر یہ مسائل ظاہری جو روحانیت (مذہب) کے لیے اختیار کیے گئے اس کی وجہ کیا؟ مثلاً پیغمبروں کا آنا، کتب سماویہ سے تبلیغ فرمانا۔ وقس علیٰ ذالک البواقی۔ اور اس میں ظاہری تدابیر کا ارشاد فرمانا۔

۱۔ وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ

۲۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

۳۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ۔

انسان کو عدل پر قائم رکھنے کے لیے پیغمبر بمع معجزات آئے اور کتاب و میزان کا وسیلہ دیا گیا۔ سوائے دیوانے، بچے، بوڑھے، فاتر العقل کے جن پر عقلاً ونقلاً کوئی گرفت نہیں۔

## حواشی

۱۔ جنگ عظیم کی طرف اشارہ

۲۔ خرچ، دولت

۳۔ هَلُمَّ جَرًّا عربی الفاظ ہیں۔ ایسے بڑھاتے جاؤ۔ خیال کرتے جاؤ۔

# الھویٰ

خواہشات سے زندگی بنتی ہے یا بگڑتی ہے؟

خواہشات زندگی ہیں یا موت؟

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس کا حل آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اہل دنیا جو بکثرت ہیں اور اہل علم میں جو چوٹی کے افراد ہیں، ان کا خیال عام و خاص یہی ہے کہ خواہش سے زندگی ہے۔ اگر خواہش اور طلب نہ ہوتی تو ایک لمحہ کے لیے دنیا زندہ نہ رہ سکتی۔ یہی خواہش انسانی زندگی کا آبِ حیات ہے۔ ہر انسان اپنی خواہش کے پورا کرنے میں سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ اپنا دل، اپنا جسم، اپنا ذہن اس میں صرف کر کے خوشی کی لذت سے ہمکنار ہوتا ہے اور جب ایک خواہش کے پورا ہونے سے بیکاری پیدا ہونے لگتی ہے تو پھر اور کے پورا کرنے میں مشغول اور مصروف ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ خود بخود ایک دوسرے کے ساتھ ایسا جکڑا ہوا ہے کہ کبھی خواہشات کا سلسلہ انسانی زندگی میں ختم نہیں ہوتا یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔ اور یہ ہے زندگی کا حقیقی سہارا، جس سے دنیا گزارنی آسان ہو جاتی ہے، اور اسی سے دنیا آباد ہے ورنہ ایک انسان جس کے اندر خواہشات کا تلاطم نہ ہو، وہ ایک بے جان، بے مزہ اور بے کیف زندگی میں سڑ رہا

Marfat.com

ہو تا ہے۔ جب ذوق نہیں تو ایسے جینے سے مرنا اولیٰ ہے اور جب ذوقِ عمل نہیں تو تعطل اور بے کاری ہو گی۔

دوسری طرف ایک مخصوص گروہ صوفیائے کرام کا ہے جو کہتا ہے، کہ زندگی کا اصل راز خواہش کے ختم کرنے سے کھلتا ہے، اور خواہشات کو جب تک سراسر ختم نہیں کر لیا جاتا، اس وقت تک اطمینانِ دل نصیب نہیں ہو تا۔ دنیا کے لاکھوں آرام پیدا کیے جاویں، لاکھوں سرور پیدا کرنے کے سامان مہیا کیے جاویں، لیکن دل کی دنیا ویران نظر آئے گی اور دل ہر آن ہر گھڑی پریشانیوں میں مبتلا ہو گا۔ یہاں تک کہ وہ ان ناکامیوں میں موت کے لیے تیار ہو جائے گا۔

ماں، باپ، خویش و اقارب اور دوست، احباب کی کوئی قیمت ایک خواہش کے مقابلہ میں نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ دین کے حلال و حرام بھی درمیان سے اٹھ جاتے ہیں اور قوم و ملت کا احترام اور وقار صرف ایک خواہش پر قربان کر کے ہمیشہ کے لیے ذلت کا داغ ماتھے پر چمکایا جاتا ہے اور قوم و ملت کی موت سے پہلے خود موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور ہمیشہ کی لعنت اپنی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے، اور صفحۂ تاریخ میں یہ داغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔

تجارت پیشہ اپنی قوم کا خون کیوں چوستے ہیں؟ رؤسا اور زمیندار طبقہ کیوں اپنی رعایا کے دشمن ہو رہے ہیں؟ یہ تمام تباہیاں کیا خواہشات کی نہیں؟ ورنہ ان کے لیے کیا کچھ نہیں؟ کھانے کے لیے اچھے کھانے، پہننے کے لیے اچھے اور عمدہ لباس، رہنے کے لیے اچھے مکان۔

"فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست"

نظر اپنی اپنی اور فکر اپنا اپنا۔

غور و فکر کیا جائے تو دونوں پہلو برابر نظر آتے ہیں۔ کسی ایک نظریہ کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ پہلے نظریہ کی مالک تمام دنیا ہے۔ اور دوسرے نظریہ کے قائل صرف چند نفوس ہیں اور بس۔

اگر صرف آرا کا مسئلہ ہوتا تو یقیناً پہلا نظریہ صحیح تھا کہ دنیا اسی کی قائل ہے اور اسی پر چل رہی ہے۔ دوسرے نظریہ کے قائل اگر چند نفوس موجود بھی ہیں تو عمل میں تو صفر ہیں۔ اس لیے جب کبھی مقابلہ ہوتا ہے تو پچھلا گروہ شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہے لیکن ایسے مسائل کی حقیقت کثرت و وحدت سے بلند ہے۔ بلکہ ان کو نظرِ حقیقت سے مطالعہ کرنا ہوگا اور وہ ہے ہمارے پاس قرآن حکیم۔ اس لیے ہم قرآن حکیم کی طرف اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے اپنا رخ موڑتے ہیں۔

## خواہش کے متعلق قرانی نظریہ

۱۔ وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَنْ النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَالْھُدٰی ہ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآئَھُمْ بَعْدَ الَّذِی جَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍ وَلَا نَصِیْرٍ۔

(ترجمہ) اور یہ کہ ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود و نصاری جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا۔ تو کہہ دے جو راہ اللہ بتلادے، وہی راہ سیدھی ہے۔ اور اگر (بالفرض) تو تابعداری کرے ان کی خواہش کی بعد اس کے جو تجھ کو پہنچا علم، تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ مددگار۔

۲۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَائَھُمْ مِنْ بَعْدِ مَاجَاءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ ہ اِنَّکَ اِذًا لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہ

(ترجمہ) اور اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا بے انصافوں سے۔

۳۔ وَلاَ تَتَّبِعْ اَھْوَآئَھُمْ وَاحْذَرْ ھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوکَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ہ

Marfat.com

(ترجمہ) اور مت چل ان کی خواہشوں پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکانہ دیں (کسی ایک حکم سے جو اتارا ہے اللہ نے تجھ پر)

۴۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآئَهُمْ عَمَّا جَآءَ كَ مِنَ الْحَقِّ ۝

(ترجمہ) اور ان کی خواہش پر مت چل، چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا۔

۵۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۝

(ترجمہ) اور بہت لوگ بہکاتے پھرتے ہیں اپنے خیالات پر بغیر تحقیق کے۔

۶۔ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۝

(ترجمہ) اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہش کے۔ اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا۔ اس پر بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے۔

۷۔ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

(ترجمہ) اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا۔

۸۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآئَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۝

(ترجمہ) اور اگر سچا رب چلے ان کی خواہشات پر تو خراب ہو جاویں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے۔

۹۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ۔

(ترجمہ) کیا بھلا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا۔

Marfat.com

۱۰۔اِنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآئَھُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوَاہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِنَ اللّٰہِ

(ترجمہ) کیا ہوا چلتے ہیں صرف اپنی خواہشوں پر، اور اس سے زیادہ کون بہکا ہوا ہے جو چلے اپنی خواہشوں پر بدوں راہ بتلائے اللہ کے۔

۱۱۔یَادَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

(ترجمہ) اے داؤد ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے اور نہ چل جی کی خواہشوں پر، پھر وہ تجھ کو بچلاوے اللہ کی راہ سے۔

۱۲۔ثُمَّ جَعَلْنَاکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَاءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ہ

(ترجمہ) اور پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک راستہ پر دین کے کام کے، سو تو اس پر چل اور مت چل خواہشوں پر نادانوں کی۔

۱۳۔اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰاوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ

(ترجمہ) بھلا دیکھ تو جس نے ٹھیرالیا اپنا حاکم خواہش کو اور راہ سے بھلا دیا اس کو اللہ نے جانتا بوجھتا اور مہر لگادی اس کے کان پر اور دل پر اور ڈال دی اس کی آنکھ پر اندھیری۔ پھر کون لائے راہ پر اللہ کے سوا۔ سو کیا تم غور نہیں کرتے؟

۱۴۔اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ

(ترجمہ) محض اٹکل پر چلتے ہیں اور جو جیوں کی اُمنگ ہے۔

۱۵۔وَكَذَّبُو اوَاتَّبَعُوٓا اَهْوَآئَهُمْ

(ترجمہ)اور جھٹلایااور چلے اپنی (خوشی) خواہشات پر۔

۱۶۔وَاَمَّامَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاوٰى٥

(ترجمہ)اور جو کوئی ڈراہوا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے

اور روکا ہو اس نے جی کو خواہش سے، سو بہشت ہے اس کا ٹھکانا۔

آیات بالا کو غور سے دوبارہ، سہ بارہ پڑھ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ "ہوا" (خواہش) کی مذمت کتنی اور کس طریقۂ بلیغانہ سے کی گئی ہے اور کوئی نقطہ ایسا نہیں چھوڑا گیا جس پر کوئی اعتراض ہو سکے۔

## خواہش کی دو قسمیں ہیں

ایک اپنی خواہش کو پورا کرنا، اور ایک دوسرے کی خواہش پر چلنا۔

قرآن کریم نے دونوں خواہشوں پر چلنے والوں کی کھلی مذمت ہی نہیں کی بلکہ عقلی اور عملی استدلال کو پیش فرمایا ہے۔ سب سے پہلے وہ آیات مطالعہ کریں جو دوسروں کی خواہش پر چلنے کے لیے ہیں اور سچ کے مقابلہ میں خواہش پر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

۱۷۔وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَ كَ مِنَ

الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْر٥

(ترجمہ)اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے ان کی

خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو آپ کے لیے اللہ (کی گرفت)

کے مقابلہ میں نہ کوئی یار رہے گا اور نہ مددگار۔

## فیصلہ آپ خود دیجئے

خود سوچیے۔ رہنمائے طریقت ہو یا پارٹی لیڈر۔ اس کے اندر جب یہ خامی

پائی جائے کہ اپنی صحیح رائے کے ہوتے ہوئے اپنے پیروؤں کے اغراض و مقاصد اور ان کی خواہشوں پر چلنا شروع کر دے تو کیا رہنمائے طریقت یا لیڈر کبھی کامیاب ہو سکتا ہے؟ بلکہ وہ اپنی پیشوائی کو اپنے ہاتھوں ختم کر دیتا ہے اور اس کا وقار اور احترام ختم ہو جاتا ہے۔ پھر جب ایک رسولِ امت ہو اور ایسی کمزوری دکھائے تو قادرِ مطلق اس سے بڑھ کر کیا تنبیہ فرما سکتے ہیں کہ اللہ کی گرفت سے کون بچائے گا۔ اور واقعی اگر دوسرے کی خواہش پر چلا جائے تو دین کے اندر کتنی خرابی پیدا ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ کتنی مہربانی ہے کہ اپنے رسول کی محبت کو اپنی ہدایات سے بلند فرماتے ہیں، اور کسی کی خواہش پر حق کو قربان کرنے سے کس بلیغ طریقہ سے اور کس زور سے اظہارِ احتراز فرماتے ہیں تاکہ رسول کسی کی خواہش پر دھیان نہ دے اور کسی کی پرواہ نہ کرے اور حق کے اظہار میں کوئی خوف نہ رکھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا خوف سامنے آجائے اور ہر خواہش سے بلند ہو کر اپنے فرائض ادا کرے۔

رہنما پیشوا، شیخ، قبلہ کو چھوڑیئے، ایک عام فردِ انسانی کے اندر جب یہ کمزوری آجاتی ہے کہ وہ دوسروں کی خواہش پر بیتا ہو تو دیکھئے اس کے اخلاق کو کون پسند کرتا ہے، اور اس پر کون اعتماد کر سکتا ہے، اس کے ایمان کی کیا قیمت ہوتی ہے اور معاشرہ میں اس کی کیا عزت ہوتی ہے بلکہ اس کی اپنی زندگی ایک الجھن ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری آیت میں علم آنے کے بعد ان کی خواہشوں پر چلنے کے بارے پڑھیئے۔
اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہ حق آنے کے بعد کسی کی خواہش پر چلنے کو ظلم سے تعبیر کیا گیا۔ کیا یہ ظلم نہیں کہ ایک حق میرے نزدیک ہے اور میں کسی کی خواہش پر اور اسے خوش کرنے کے لیے حق کو ترک کر بیٹھوں۔ اپنی خواہش پر چلنا گویا ایک گناہ ہے، لیکن پُر از لذت۔ مگر دوسرے کی خواہش پر چلنا گناہ بے لذت ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہو سکتی ہے؟

تیسری آیت میں ہے:۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآئَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ (ترجمہ) ان کی خواہش اور خوشی پر نہ چلیں اور ان کے بہکا دینے سے

ڈرتے رہیں۔ یعنی کسی مصیبت اور جنجال میں نہ پھنس جاویں۔ کیا واقعی ایسا نہیں ہوتا؟ کسی کی خواہش اور خوشی پوری کرانے کے لیے خود مبتلائے گناہ اور ذلت ہونا پڑتا ہے۔ دیکھئے کس فصاحت اور بلاغت سے کسی کی خواہش کی اتباع کے نتائج دکھائے جارہے ہیں کہ غیر کی خواہش پر چلنا کتنا خسران دے گا۔ ہر رہنمائے ملت کے لیے کھلی ہدایات اور تصریحات ہیں۔ کہ کسی کی خواہش پر چلنا جبکہ حق سامنے ہو، کتنا ظلم ہوگا۔ جس کے نتائج وہی ہوں گے جو فطرتاً ایسی کمزوریوں سے پیدا ہوتے ہیں یعنی "اَنْ یَفْتِنُوْکَ

(آیت ۳) وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآئَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ

(ترجمہ) اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے تباہ ہو جائے"۔

یہ وہ آیت ہے، جس نے تمام شکوک و شبہات کے پردے چاک کر دئے۔ فرماتے ہیں :۔

اگر حق، انصاف، عدل اور قانون خواہشوں کے مطابق چلنا شروع کر دے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ تباہ ہو جائے گا

اگر صاحب ملت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دوسروں کی خواہش پر چلے بلکہ خواہشات سے بلند ہو کر عدل وانصاف کا راستہ اختیار کرے، تو کیسے یہ ذہن میں آسکتا ہے۔ کہ جن کے لیے خواہشات کی اجازت پیشوا ہونے کی وجہ سے ہونی چاہیے، ان کو تو اجازت نہ ہو، لیکن عام فرد کی زندگی اس وقت بنتی ہے جب اس کی ہر قسم کی خواہشات کا احترام کیا جائے اور من مانی مراد کے لیے انہیں کھلی اجازت ہو۔ یہ ہے عقل پر پردہ، یہی ہے آنکھوں کا اندھا ہونا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ "خواہشات" انسان کو اندھا کیے ہوئے دنیا کی تباہی کا تماشا دیکھ رہی ہیں، اور کوئی اس تماشہ سے عبرت حاصل نہیں کرتا۔

Marfat.com

(آیت ۴) یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الۡھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ۔

اس آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے، کہ ہم نے تمہیں زمین کی بادشاہت دی، اس لیے آدمیوں کے درمیان حق و باطل پر فیصلہ دینا اور خواہشات نفسانی پر نہ چلنا کہیں وہ تمہیں انصاف اور عدل سے نہ پھیر دیں۔ سبیل اللہ، کیا ہے؟ یہی انصاف وعدل۔

یہ آیت اور دوسری آیات اصل خواہشِ نفسانی کو روکنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

غور فرمایئے! خواہش کو روکنے کا حکم کیوں ہے؟ اس لیے کہ خواہش کی اجازت پر عدل وانصاف ناممکن ہو جاتا ہے۔ آیت نمبر ۶ میں ایک خود غرض نفسانی آدمی کی حالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے کہ خواہش کے پورا ہونے، نہ ہونے میں برابر ہانپتا پھرتا ہے، نہ خواہش کے پورا ہونے میں اسے آرام ہے اور نہ اسے پورا نہ ہونے میں اطمینان ہے۔ غرض کسی حالت میں بھی اسے اطمینان نہیں۔ کتے کا پیٹ بھر دیا جائے تو، نہ بھرا جائے تو، برابر، یکساں ہانپتا رہتا ہے۔ منہ کھلا اور زبان دراز۔

دیکھئے آج اس دور میں ہر شخص کیوں پریشان حال نظر آتا ہے؟ امیر غریب اس میں یکساں۔ کیونکہ خواہشات کو قبلہ بنا رکھا ہے۔ اور ہر جائز خواہش کے لیے دل میں ایک خلش ہے اور ایک خواہش کے پورا ہو جانے پر دوسری خواہش سامنے آجاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ چلتے چلتے لاانتہا ہوتا چلا جاتا ہے، جس کی وجہ سے کبھی آرام نہیں۔ ایک پیدل آدمی سواری چاہتا ہے، وہ مہیا ہو جاتی ہے، تو پھر گھوڑے کی سواری اسے دکھ دیتی نظر آتی ہے، پھر تانگے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، پھر موٹر کی۔ حتیٰ کہ ہوائی جہاز بھی میسر ہو جائے تو پھر اس سے بڑھ کر ایسے جہاز کی خواہش پیدا ہو گی کہ وہ ایسے ہو۔ کیا یہ پریشانی اقوام زندگی ہے یا بربادی؟ فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ

Marfat.com

اس پریشانی کا نقشہ قرآن حکیم نے کیا اچھے پیرایہ سے واضح کیا ہے۔ صاحب خواہش کو ایک کتے کی مثال میں پیش کیا کہ اگر اس پر حملہ کیا جائے تو ہانپتا ہے، نہ کیا جائے تو ہانپتا ہے، یعنی زبان باہر نکالے ہوئے اور منہ کھولے ہوئے جلدی جلدی سانس لیتا ہے۔ یہ حالت کتّے کے ساتھ کتنی صحیح ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو خواہش پرست انسان کی حالت اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ آیت اَفَرءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ (ترجمہ) ''بھلا دیکھ تو جس نے ٹھیرالیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو''۔

اس جملہ کو بار بار پڑھیے اور غور کیجئے۔ خواہش کے غلبہ اور اس کے زیر اثر ہونے اور اس سے مغلوب اور اس کی الفت میں وارفتہ ہونے کے لیے اور اسے خدا بنانے کی مثال سے کتنی حقیقت صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ خواہش کو صرف معمولی چیز نہ سمجھا جائے بلکہ جب یہ خواہش سر پر چڑھ جاتی ہے تو یہ خدا بن بیٹھتی ہے۔ اس لیے فرمایا گیا :۔اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ (ترجمہ) راہ سے بچلادیا اس کو اللہ نے جانتا بوجھتا''۔

سب کچھ جانتا ہے کہ تباہی کی طرف جا رہا ہوں۔ لیکن خواہش کے غلبہ سے ہل جل نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کے کانوں اور دل پر محبت کی مہر لگ جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھ پر پردہ آجاتا ہے، نہ کچھ دیکھتا ہے نہ سن سکتا ہے وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً کا کلام اس پر پورا ہو جاتا ہے۔ ایسے حال میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بعد پھر اس کو کون صحیح راہ دکھا سکتا ہے ؟

اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ لوگو! تم غور و فکر نہیں کرتے، کہ خواہش کتنی بری ہے، اور یہ دنیا کی تباہی کا باعث ہے۔

غور فرمایئے! اس سے بڑھ کر خواہش کی مذمت کیا ہو سکتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اس کی برائیوں کی حقیقت کیا کھولی جا سکتی ہے۔ لیکن آج کا مسلمان اس حقیقت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتا اور سینکڑوں ڈھکوسلے اس کی رخصت اور اجازت کے نہیں، بلکہ ضروری ہونے کے پیش کرتا ہے، اور اس کے جواز کے فتوے دیتا اور دکھاتا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ قرآن کریم کی کوئی ایک آیت نہیں، جس کی تاویل

کی جائے۔ ایک درجن آیتوں کو کیسے ہیر پھیر دیا جائے لیکن علم کی کار فرمائیاں بھی عجیب ہیں یہ سب دیکھتے پڑھتے اپنی خواہش پر سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے اَعَاذَنَا اللّٰہُ۔ کبھی تو وَلَا تَنسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا ۱؎۔ پڑھا جاتا ہے، کبھی قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ۲؎۔ پیش کیا جاتا ہے، اور کبھی، رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ۳؎ سے مقابلہ کیا جاتا ہے اور گاہے کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعۡمَلُوۡا صَالِحًا، اور گاہے وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ۴؎ سے اپنی تسلی کی جاتی ہے اور گاہے بعض صحابہ کرام۔ کے اغنیا ہونے کے قصے پیش کیا جاتے ہیں۔ غرض تمام قرآن کو الٹ پلٹ کے رکھ دیا جاتا ہے، اور من مانی خواہشوں کے جواز کی راہ نکالی جاتی ہے۔

انسان فطرتاً کمزور ہے اور اپنی کمزوریوں کی وجہ سے بعض وقت برے کام اور فعلوں سے نہیں بچتا لیکن گذشتہ زمانے کے مسلمان اپنے برے فعل اور کام کے لیے کسی کے جائز ہونے کے دلائل پیش نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی گردنیں جھک جاتی تھیں اور ندامت آنکھوں سے ٹپکنے لگتی تھی، اور کوئی استدلال عقلی یا نقلی پیش نہیں کیا جاتا تھا۔

لیکن آج ہر طریقہ کے لیے جواز ہے اور کچھ نہیں تو اتنا تو ضرور (اتنے آیات پڑھتے ہوئے) کہہ دیں گے۔ میاں! یہ تو اخلاقی تعلیم ہے۔ تاکہ اچھے لوگ ذرا اور بلند اخلاق ہو جائیں۔ ان کے نزدیک کردار یہ نہیں، یہ "ہوا" ہیں، یہ ایک فطرتی میلان ہے، جس کے بغیر گزران مشکل۔ ان خواہشوں سے دنیا شغل میں ہے ورنہ بیکاری سے دنیا کیسی ہو جائے گی؟

گذشتہ سال کوہ سکیسر پر دو صاحبزادگانِ طریقت کے پیچھے ہم جا رہے تھے۔ بات دنیا پر چھڑ گئی۔ میں نے کہا "قرآن حکیم دنیا کی مذمت کرتا ہے"

ایک پیر صاحب نے کہا۔ دنیا کے بغیر نیکی کیسے ہو سکتی ہے؟ مسجدیں، مدرسے، راہ، پلیں، یہ سب دنیا سے بنتی ہیں۔ یہ نیکیاں کیسے کی جا سکتی ہیں؟

Marfat.com

اس پر میں نے کہا۔ "قرآن حکیم مذمت فرماتا ہے"۔ وہ ذرا اور تیز ہو گئے۔ فرمایا: سخاوت کے دریا اسی سے بہائے جاتے ہیں، لنگر چلتے ہیں، حج کا یہ کلی ذریعہ ہے، اور صدقہ اسی سے دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے پھر وہی الفاظ دہرائے "قرآن مذمت فرماتا ہے"

اس پر سہ بارہ چند اور خوبیاں دنیا کی پیش کیں :۔ زندگی کیسے گزارے ؟ آخرت کے توشے کیسے تیار ہوں ؟ وغیرہ وغیرہ۔

مگر میں نے پھر وہی الفاظ دُہرائے۔

اس پر ایک من چلے جنگل کے سپاہی نے کہا کہ یہ اور کہتے ہیں کہ قرآن مذمت کرتا ہے، اور وہ اور جواب دیتے ہیں کہ یہ ہے، وہ ہے۔!

یہی حال یہاں ہے۔ اس کا جواب کسی کے پاس کیا؟ کہ خواہشات کو اللہ تعالیٰ بذریعہ قرآن حکیم پسند نہیں فرماتا۔ بلکہ خواہشات کے روکنے کو ذریعۂ جنت بنایا ہے۔ جتنا کوئی خواہشاتِ نفسی کے روکنے پر قادر ہوا اتنا ہی اس کا درجہ دین و دنیا میں بلند ہوا اور یہ قانونِ اٹل جب سے دنیا پیدا ہوئی، چلا آتا ہے۔ اور یہ فطرۃ اللہ میں داخل ہے۔

آیت نمبر ۷ امیں فرماتے ہیں :۔

> فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ٥ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ٥
>
> (ترجمہ) سو جس نے کی ہو شرارت اور بہتر سمجھا ہو دنیا کا جینا سو دوزخ ہی ہے اس کا ٹھکانا۔ اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خواہش سے، سو بہشت ہے اس کا ٹھکانا۔

اسلام کی ابتدائی دعوت ان آیات اور ایسی دیگر آیات سے پیش کی گئی اور یہی آخری نتیجہ ایمان و عمل سے لیا جاتا ہے۔ فرعون اسی طغیان اور دنیاوی زندگی کو پسند

Marfat.com

کرنے سے ملعون و مردود ہوا، اور اسی سر کشی کو توڑنے اور خواہشات نفسی سے روکنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے مقابلے کے لیے کھڑا کیا گیا اور اسلام کی بنیادی روح اسے قرار دیا اور فرمایا:

"جس نے سر کشی کی اور دنیا کی زندگی کو پسند کیا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے"

سر کشی کے معنی وہی "منہ زور ہونا۔ اپنی خواہشات پر چلنا"۔ اور جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس وجہ سے اس نے اپنی خواہش کو روکے رکھا، وہ بہشت میں جائے گا اور رہے گا۔ اور طغٰی (سر کشی) کے مقابل خوف الٰہی کو رکھا گیا۔ دنیاوی زندگی کی پسند پر خواہش نفس کی روک تھام کو بالمقابل دکھایا گیا۔ یعنی ایک طرف دنیاوی زندگی کی عیش و عشرت، دوسری طرف خوف الٰہی کے ساتھ تمام خواہشات سے دستبرداری۔

نتیجہ فطرتی طور پر یہی ہونا چاہیے، جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تعیش کے انجام برے ہوتے ہیں۔ اور تعیش کو چھوڑ کر ایک خائف اور خواہشات سے پاک زندگی، ایک پاک پوتر زندگی دین و دنیا میں خیال کی جاتی ہے کیونکہ کوئی برائی اس زندگی میں نہ اپنی ذات کے لیے ہوتی ہے اور نہ معاشرہ کے کسی حصہ کے لیے چھپی ہوتی ہے۔ بخلاف سر کشی اور تعیش سے بھری زندگی کے کہ وہ اپنی ذات اور دوسرے معاشرہ کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں خرابیوں اور تباہیوں کا باعث ہوتی ہے، اور ایک مکروہ و ملعون زندگی ہوتی ہے۔

امت کے والی کی حیات طیبہ ہمارے لیے ایک اسوۂ حسنہ اور قابل تقلید زندگی ہے۔ آپؐ نے کیا تعیش کی زندگی بسر کی جو خواہشات سے پُر ہو، یا ایک مسکین کی زندگی؟ اور اس مسکین زندگی پر صبر ہی نہیں فرمایا۔ بلکہ ہمیشہ ایک مسکین زندگی کے لیے دعا بہ درگاہ رب العالمین کرتے رہے۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْناً وَ احْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنَ ۝

Marfat.com

فرمایئے کتنی طلب اور خواہش اس مسکین زندگی کی ہے اور مَابَعْدَ الْمَوْت بھی وہی مسکین زندگی مرغوبِ خاطر دکھائی گئی۔ ایسے حال میں ایک عالم دین کے لیے کیسے گنجائش ہے کہ وہ اس پاک زندگی کو ایک بھیانک صورت دے اور اس کے بر خلاف ایک دنیاوی زندگی کے لیے سہارے تلاش کرے اور ایک خدایاد زندگی کو رہبانیت سے تشبیہ دے۔

اس خدایاد زندگی کو رہبانیت کی زندگی کہنا، یہ بھی ایک بے علمی کا ثبوت ہے۔ ورنہ کہاں رہبانیت اور کہاں یہ پاک و مطہر زندگی۔

## "تقاضائے فطرت اور "خواہش" میں فرق

ہمارے عام احباب اس نکتہ سے ناواقف ہیں کہ "تقاضائے فطرت اور "خواہشات نفسی" میں فرق نہیں دیکھ سکے۔ تقاضائے فطرت کے پورا کرنے سے کوئی ممانعت نہیں، بلکہ کھلی اجازت ہے۔ اور وہ کھانا، پینا، رہنا سہنا اور توالد و تناسل ہے۔ اس کے سوا زندگی ناممکن ہے۔ اس لیے کھانے پینے کے لیے رزق کی طلب، رہنے سہنے کے لیے مکان کی ضرورت، اور توالد و تناسل کے لیے عورت کا وجود مسلمہ ہے۔

لیکن کھانا "کیسے" ہو؟ مکان کیسا ہو؟ عورت کیسی پسند ہو؟ یہ ہے "خواہش" اور اس کی ممانعت ہم علماً، عقلاً اور نقلاً دکھا چکے ہیں۔ یہ طلب (کہ کیسے ہو) "کیسے"؟ اس نے دنیا کو تباہ کر رکھا ہے اور یہ ہے "ھویٰ" جس کے داغ کو اللہ تعالیٰ انسانی ہستی کے لیے ناپسند فرماتا ہے، اور معاشرۂ انسانی کے لیے تباہ کن فرماتا ہے۔

غرض "ایسے ویسے اور کیسے" نے دنیائے علم کو مخمصہ میں ڈال رکھا ہے۔ اور علمی عقول پر ایک پردہ ڈال دیا ہے

یہ "ایسا ویسا" ایک نمود کے لیے ہوتا ہے، ایک سرور و کیف کے لیے جس کے لیے کوئی انتہا نہیں، یہاں تک کہ موت آجائے ورنہ بلند مقاصد کی طلب کو کون خواہش کہتا ہے۔ بلکہ حکم ہوتا ہے:۔ اُطْلُبُو الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ۔ یعنی علم کو طلب کرو، خواہ چین میں ہو، رزق کماؤ، مکان بناؤ، لباس پہنو، یہ

Marfat.com

خواہش نہیں بلکہ فطرتی تقاضا ہے۔!

ایک مولوی صاحب واعظ نے مجھے کھوڑہ میں کہا کہ آپ کوئی ایسی کلام بتلائیں جس سے روٹی مل جائے، چونکہ میں کسی کے گھر سے کھانا پسند نہیں کرتا۔ شاید ان کے خیال میں یہ آیا ہو کہ کسی کلام کی برکت سے اس کی روزی وافر ہے۔

میں نے کہا۔ "پیر بل شریف جا کر بتلاؤں گا"۔ چنانچہ میرے پیر بل پہنچنے پر مجھے خط لکھا کہ اب میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں تا کہ روزی کی فراخی اور وافر روٹی کے لیے کوئی کلام مجھے بتلائیں۔ میں نے جواباً لکھا۔ روٹی اور رزق وافر ہے، کوئی روٹی کا محتاج نہیں۔ آپ یہ خیال چھوڑ دیں کہ روٹی ایسی ہو! تو روٹی کی کمی کبھی بھی آپ کو نہ ہو گی۔ اصل بات یہ ہے کہ صرف روٹی پر قناعت نہ رہی بلکہ "ایسی روٹی" اور "ایسے کھانے" کے تخیل نے ساری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔

وَقِسْ عَلٰی ذَالِکَ اور ایسی تمام خواہشات اور تقاضاہائے فطرت زندگی بھر ہر کہ ومہ کے لیے میسر ہیں۔ اور خواہشاتِ نفسی سی دولتمند اور کسی امیر کی بھی نہ پوری ہوئیں، نہ ہوں گی۔ اسی لیے فقرا نے یہ کہہ کر دنیا کو ٹھکرا دیا۔

زہد و تقویٰ چیست اے عالی جناب
بر مرادِ خود نہ گشتن کامیاب

خواہشات روکنا اہل طریقت کا کوئی بناوٹی اصول نہیں، بلکہ اسلام کے اولین بنیادی مقاصد میں شمار ہوتا ہے، جس سے انسان اتنے اچھے اخلاق کا مالک ہو جاتا ہے اور جس کے ساتھ مٹی اور سونا برابر ہو جاتا ہے، اور حیاتِ دنیا کے سازو سامان سے نظر اٹھ جاتی ہے، اور یہ خالق حقیقی کی خوشنودی کے حصول کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے، اور تقرب الی اللہ کے حاصل کرنے کی ایک سیڑھی ہے۔ جو لوگ اس کو تصوف کا من گھڑت مسئلہ خیال کرتے ہیں، نہ تو ان کو قرآن حکیم پر عبور تام ہے اور نہ ان کا ذوق سلیم کہ وہ خود تدبر سے کام لیں، اور نہ فلسفۂ قدیم وجدید سے واقفت ہے۔ ورنہ آج اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ صرف حضرت

Marfat.com

رسالت مآب ﷺ کی زندگی پر ہی نظر دوڑائی ہوتی تو یہ خیالِ باطل سامنے نہ آتا کہ ”خواہش کے سوا زندگی محال ہے“۔

پھر کہتا ہوں ”کہ خواہش سے روکنا مطالبہٗ اسلام ہے۔ ہاں! جوں جوں ملت دنیا دار ہوتی گئی اس حقیقتِ قرآنی سے ہٹتی گئی، یہاں تک کہ اب اسے گمراہی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن صوفیوں نے تمام نہ سہی، کچھ سہی، اس پر عمل کرنے کا خیال ابھی تک قائم رکھا ہوا ہے، اور اس اصول کو تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔ اہل علم مادیات سے مرعوب ہو کر اس اصولِ اسلام ”خواہش روکنے“ کے بر خلاف متواتر پروپیگنڈا کر کے اس قرآنی حقیقت کو دلوں سے نکالنے میں کوشاں ہیں اَعَاذَنَا اللّٰہُ

ہمت بلند دار!

آیئے اصل مضمون کے آخری حصہ پر فرمایا وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا۔ کہ خواہش پر چلنے والے کا ہر ایک کام بے وزن ہو جاتا ہے، یعنی اعتدال سے گزرا ہوا، اور بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت دنیا کے تجربہ میں نہیں آچکی کہ عیاش آدمی کے کسی فعل میں متانت، سنجیدگی اور اعتماد نہیں ہوتا، اور جب انسانی ہستی سے اعتماد اٹھ جائے تو پھر اس کی قیمت ہی کیا؟

جتنے کام ہوتے ہیں اعتماد پر ہوتے ہیں، اور کسی کی اہلیت ہونا اس کے اعتماد پر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس انسانی ہستی کو قابل وقعت بنانے کے لیے ارشادِ عالی فرمایا ہے۔ جب تک مسلمان اس حکم پر کاربند تھے دنیا میں کتنا اعتماد تھا۔ کیا صلح میں کیا جنگ میں، کیا تجارت اور کیا صنعت میں، کسی کو دھوکے کا خیال تک نہ ہوتا۔

ایک سچے پاک دل انسان کی صورت و سیرت کا نقشہ علامہ اقبال نے کس خوبصورتی سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ صورت کے خدوخال کو پورے غور اور فکر سے دیکھیں گے اور اس لطف سے آشنا ہوں گے جو اس پاکیزہ صورت کے حصے میں آیا۔

Marfat.com

خاکی و نوری نہاد
بندۂ مولےٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی
اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل
اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب
اس کی نگاہ دل نواز

۱ خاک کا پتلا ضرور ہے، لیکن فطرتاً نوری ہے۔
۲ ہے تو انسان لیکن صفات الٰہی سے ممتاز۔
۳ دل اتنا بے نیاز عنایت ہوا کہ دونوں جہاں کی پروا نہیں۔
۴ امیدیں اور خواہشیں اتنی کم کہ نہ ہونے کے برابر۔

لیکن مقاصد بہت بلند۔ یعنی توحیدی تعلق اور انعکاسِ رسالت دل پر۔ اس کی ہر ادا دلفریب اور ہر نگاہ دلنواز ہوتی ہے۔ کیا اس صورت کا انسان دنیا کی زینت کا باعث ہوتا ہے اور قابل قدر و تقلید، صاحبِ احترام و عزت یا ایک بیکار و ناپسند انسان ؟

فیصلہ خود کیجئے! انسانِ کامل وہی بنتا ہے جو خواہش کو زیر کر لیتا ہے۔ بلند مقاصد کی طرف اپنی کامل قوت صرف کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جمال و جلالِ الٰہی کے پردے اٹھتے ہیں، آفتاب ہدایت بے حجاب باہر نکل آتا ہے۔ اس وقت تکالیف اٹھ جاتے ہیں محب و محبوب کا تعلق ہو جاتا ہے ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

کارنگ پیدا ہو جاتا ہے اور صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً کے انوار چمکنے لگتے ہیں ادا و نگاہ میں دلنوازی، اور دلفریبی آ جاتی ہے۔ یہی لوگ ولی اللہ کہلاتے ہیں کہ دنیا کا ہر ذرہ اپنی قوت کے مطابق ان کی طرف کھنچنا شروع ہوتا ہے۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝
فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاوٰى ۝

خلاصہ :۔ خواہشات کی پیداوار پریشانیاں ہیں۔ صغیرہ کبیرہ (چھوٹے بڑے) گناہ کا تخم خواہش ہے۔ اور اس کا ترک دنیوی واخروی فلاح ہے!

## حواشی

۱۔ اور دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھولیے۔
۲۔ جو زینت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اس کو کس نے حرام کیا ہے۔
۳۔ اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔
۴۔ اور اگر اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو ان کا شمار نہ کر سکو۔
۵۔ ضلع سرگودھا میں ایک پہاڑی مقام ہے۔

(جنوری تا اپریل ۱۹۶۳)

# القصاص

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَا أُوْلِي الْأَلْبَابِ ٥

اے عقلمندو! قصاص ہی میں تمہارے لیے کامل زندگی ہے۔

## قتل کا بنیادی تخم

عوام و خواص میں قتل کا بنیادی سبب عام طور پر دشمنی کہا جاتا ہے۔ لیکن کسی نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ دشمنی کا تخم کیا ہے؟

یہ تخم خواہش ہے جو ایک طرف ہر زندہ کی زندگی ہے اور دوسری طرف ہر جرم اور گناہ کا تخم ہے۔ جرم بڑا ہو یا چھوٹا سب کا باعث خواہش ہوتی ہے حتیٰ کہ قتل جیسا کبیرہ گناہ بھی اس ننھے سے بیج کا ثمرہ ہے۔

خواہشمند یا تو حصول خواہش میں قتل ہو جاتا ہے یا خواہش کے پورا کرنے والے کو قتل کر دیتا ہے تاکہ اس کی خواہش کی رکاوٹ دور ہو۔

## کثرت قتل

آج سے ساٹھ ستر سال پہلے قتل کی وارداتیں بہت کم ہوتی تھیں۔ ضلع بھر میں کبھی سال دو سال میں ایک آدھ قتل کی واردات ہوتی تھی، اور عوام و خواص ایک

Marfat.com

قتل سے حیرت میں آجاتے تھے۔ میرے بچپن میں ایک قتل ہمارے علاقہ میں ہوا تو اس وقت بھیرہ میں سیشن جج کی کچہری ہوتی تھی جہاں سال بھر کے بعد جہلم سے سیشن جج صاحب آتے تھے۔ چونکہ جیل شاہ پور چھاؤنی میں تھی اس لیے قاتل کو جب پیشی کے لیے لے جاتے تھے تو سڑک پر تمام ہجوم اس کے دیکھنے والوں کا ہوتا تھا۔ سزا ہمیشہ موت ہوتی تھی۔

کوئی ملزم (مجرم) بری نہ ہوتا تھا۔ ایک طرف عدالت عدالت ہوتی تھی. دوسری طرف ملزم اپنے گناہ کے انکار کو بڑا بُرا سمجھتا تھا، اور متواتر اقرار کرتا جاتا تھا، اور اسی کو اپنا فخر خیال کرتا تھا۔ جوانوں کی طرح جرم کرنے میں جب ثابت قدم رہتا تھا تو سزا کے لیے بھی ثابت قدم رہتا تھا، اور اپنی جان کو سولی پر دینے سے کچھ خوف نہ کھاتا تھا۔ کیونکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف زیادہ ہوتا تھا، کہ یہ دنیاوی سزا اور اس ابدی سزا سے کم ہے۔

مگر جوں جوں تمدن ترقی کرتا گیا، خواہشات کی پیداوار طبائع میں زیادہ ہونے لگی اور مذہب سے بیگانگی کی وجہ سے خوف خدا کم ہوتا گیا اور قانون میں موشگافی بڑھ گئی اور "قصاص" (بدلہ) کا خیال عام دماغوں سے نکل گیا، کہ قصاص ہی حیاتِ قوم ہے، تو قتل کی وہ کثرت کہ پہلے ڈویژن میں جتنے قتل ہوتے تھے اب تحصیل میں اس سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب کوئی گاؤں ایسا نہیں جس میں سال دو سال کے اندر کوئی قتل نہ ہو، اور غالباً اوسطاً ہر گاؤں میں ایک قتل سال کے اندر شمار میں آجائے گا۔

میرے اپنے گاؤں میں پاکستان بننے کے بعد چھ سات قتل ہو چکے ہیں جن کی سزا میں ایک ملزم بھی سزایاب نہیں ہوا اور تمام کا خون رائیگاں گیا۔

## حکومت اور پبلک کا فرض

ایسے حالات میں حکومت پاکستان اور اس کے ارباب حل و عقد اور مفکرینِ قوم کا فرض ہے کہ اولین فرصت میں اپنی پوری توجہ سے اس مسئلہ "کثرت قتل" کا

Marfat.com

تدارک کرنے میں مصروف ہو جائیں ورنہ امن عامہ ختم ہو کر باعثِ پریشانی دین و دنیا ہو گا اور ایسے لوگ رسوائی عالم کا باعث ہوں گے۔

## لاپروائی

جب سے پاکستان قائم ہوا اور قوم نے پاکستان اور اہل پاکستان کی ترقی اور آرام کے لیے سینکڑوں نہیں ہزاروں تجاویز پیش کیں، اور حسب ضرورت بہت کچھ پاس ہوئیں۔ مثلاً صحت عامہ کے لیے کروڑوں روپے کے اخراجات منظور ہوئے، کئی ہسپتال کھولے گئے، کئی ڈاکٹری پڑھانے کے کالج قائم ہوئے، ادویہ کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ لیکن آج تک اگر توجہ نہیں دی گئی تو اس نفس انسانی کے مارے جانے اور خون رائیگاں بہہ جانے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

انسانی قتل کوئی ایسا معمولی جرم نہیں جس سے کوئی عقلمند بے پرواہو سکے۔ کیونکہ کائنات کی زندگی انسانی زندگی کے تحفظ پر ہے۔ اگر انسانی زندگی کا تحفظ قائم نہ ہو تو پھر دوسرے املاک کا تحفظ کیونکہ قائم رہ سکتا ہے اور جب کسی ملک میں تحفظِ جان و مال نہ ہو تو معاشرہ کی زندگی محال ہو جاتی ہے اور امن مفقود ہونے کی صورت میں حکومت کا وقار ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے امن عامہ قائم کرنے کی طرف سب سے بڑھ کر توجہ کرنی چاہیے، اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ قتل کی وارداتوں پر قابو پا لیا جائے اور کوئی قتل ضائع و رائیگاں نہ جائے۔ جہاں ملک کی دیگر ضروریات پر کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں وہاں اس کار خیر کے سر انجام دینے میں ایک پائی بھی خرچ نہیں کرنی پڑتی۔ پولیس موجود ہے، عدالتیں قائم ہیں، صرف ایک فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر آج ہم صرف اس بات میں کامیاب ہو جائیں کہ قتل کا بدلہ ضروری ہے اور قاتلِ حقیقی کو ہر صورت سزا دینا لازمی ہے تو میرے خیال میں ہم لوگ ایک سال کے اندر قتل کی واردات پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور ایک سال کے اندر صرف ایسی تجاویز پاس ہونے سے ہی قتل کی تعداد نصف رہ جائے گی۔ آپ

Marfat.com

یہ نہیں دیکھتے کہ جب کسی قتل میں ایک دو کو پھانسی ہو جاتی ہے تو فوراً فضا بدل جاتی ہے اور واردات یکدم کم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے قوم و ملت کو ایک گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ ایک ایسا قانون پاس کرایا جائے جس سے کوئی قتل رائیگاں نہ جا سکے۔

اب ہم ان امور کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو قتل اور کثرتِ قتل کا باعث ہو رہے ہیں۔

### ا۔ مذہب سے بیگانگی

موجودہ دور میں جوں جوں مادیات میں ترقی ہوئی مذہب سے بیگانگی پیدا ہونے لگی۔ تو سب سے پہلے وہ عقیدہ یا تصور جو مذہب پیش کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ ذہنوں سے اٹھتا گیا۔ یعنی وہ "تصور الٰہ" یعنی "خدائی تصور" دل و دماغ سے نکل گیا۔ اس تصور پاک کے اٹھ جانے سے دنیا بے لگام ہو گئی، اور کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہ رہی۔ ہر آدمی کا مذہب "خواہش" اور صرف "خواہش ہو کر رہ گیا۔

قرآن کریم فرماتا ہے :

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ

(تو نہیں دیکھتا کہ جس نے اپنی خواہش کو خدا بنا لیا۔ یعنی خواہش پر قربانی دینے لگا اور خواہش کے پورا کرنے میں تن من کی بازی لگا دی)

خود سوچیے خواہشات کتنی ہیں اور پھر ہر انسان کے اندر الگ الگ قسم کے خواہشات کے تلاطم چل رہے ہیں۔ اب یہ تلاطم خواہشات اگر ٹکر کھا کر ایک دوسرے کو تباہ نہ کریں تو خواہش کیسے پوری ہو، جبکہ ایک دوسری خواہش اس کے مقابلے میں ڈٹی ہوئی سامنے کھڑی ہے۔ اس لیے تصورِ الٰہ ہی ایک ایسا تصور ہے جو انسان کو کسی ضابطہ کے اندر لا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو تصورات یکجہتی پیدا کرنے کے لیے آج تک قائم کیے گئے وہ ناکام ہوئے، اور ایسے ناکام ہوئے کہ ان کا نام بھی ذہن میں آنا پسند نہیں کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

## تصورِ الٰہ (خدائی تصور)

یہ تصور الٰہ ایک ایسا پاک تصور ہے کہ جس کے پیدا ہونے سے نیکیاں خود بخود پیدا ہوتی جاتی ہیں اور بدیاں دور بھاگتی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس تصور پاک سے ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جو سینکڑوں صفات کی مالک ہے۔ ایک طرف خالق ہے تو دوسری طرف رازق کی صفت سے موصوف ہے۔ پھر وہ بِکُلِّ شَیٍ عَلِیمٌ بِکُلِّ شَیٍ خَبِیرٌ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَہِیدٌ کے ساتھ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیرٌ بھی ہے۔ دیکھتا ہے، سنتا ہے، جانتا ہے، پھر صاحب قوت بھی ہے۔ المقتدر اور المتکبر ہو کر نمودار ہے۔ بَدِیعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرضِ وَخَالِقَ کُلِّ شَیءٍ اور وَھُوَ بِکُلِّ شَیْئٍ عَلِیمٌ بھی ہے۔ پھر لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ خود تو دکھائی نہیں دیتے لیکن وہ سب کچھ دیکھتے ہیں۔

غرضیکہ (یہ) ایک ایسا تصور جامع ہے کہ ہر نیکی کے کرنے کی طرف توجہ پیدا کرتا ہے اور ہر برائی سے بچنے کے لیے خوف پیدا کرتا ہے۔ اگر مذہبِ اسلام کا یہ عقیدہ بھی کسی کے دل و دماغ پر چھا جائے تو یقیناً اس کے پاس کوئی برائی نہیں پھٹک سکتی، اور ہر نیکی کا رخ اس کی طرف پھر جاتا ہے۔ آج جب یہ تصورِ پاک مسلمانوں اور دیگر اہل مذاہب سے اٹھ گیا اور اٹھ رہا ہے تو کوئی صورت ایسی سامنے نہیں آتی کہ معاشرہ نیک اور بااخلاق ہو سکے اور بدیوں اور بدکاریوں سے بچ سکے۔ ضرورت ہے کہ اہلِ مذہب اسے حقیقی طور پر زندہ کریں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ عقل سے زندہ نہیں ہوتا بلکہ اسی طریقہ سے زندہ ہوتا ہے جو اہلِ مذہب لائے، جو نبیوں اور رسولوں کا طریقہ تھا، جس کے اندر خود ذاتِ حق سامنے آکر بولتی تھی۔ اِنِّی اَنَا اللّٰہُ میں اللہ ہوں۔ لَااِلٰہَ اِلَّا اَنَا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھ سے کسی نے کچھ پوچھ گچھ نہیں کرنی ہے، اور من مانی کاروائی کرنا ہی ہماری زندگی ہے جو نشاناتِ الٰہی ان کو پیش آتے اور دکھائی دیتے

Marfat.com

تھے، ان کو جھٹلا دیتے تھے۔

وَكُلَّ شَىْءٍ اَحْصَيْنَاهُ كِتٰبًا۔ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا۔

اور ہم نے ہر چیز کو قلمبند کر رکھا ہے۔ ازاں جملہ ان کے اعمال کو بھی۔ تو (ہم ان لوگوں سے کہیں گے کہ اب اپنے کئے کا) مزہ چکھو۔ اور ہم تو (روز بروز) تمہارے عذاب ہی بڑھاتے جائیں گے۔

لیکن یہاں ہم نے سب کچھ لکھ رکھا تھا۔ اس حساب سے سراسر ان کے لیے عذاب ہی عذاب ہے۔ دیکھیے اس کو پڑھنے کے بعد کس مسلمان کا دل دہل نہیں جاتا؟ اور کس کا گردہ ہے کہ اپنے اعمال کا محاسبہ نہ کرے؟

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا حَدَائِقَ وَاَعْنَابًا وَكَوَاعِبَ اَتْرَابًا وَكَاسًا دِهَاقًاه لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَلَا كِذّٰابًا

بیشک جو لوگ پرہیزگار ہیں ان کو (آخرت میں بڑی) کامیابی ہو گی۔ (یعنی رہنے کو) باغ اور کھانے کو انگور اور (دل بہلانے کو) نوجوان عورتیں ہم عمر۔ اور پینے کو شرابِ طہور کے چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں یہ لوگ نہ تو کسی کے منہ سے کسی طرح کی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ ردو قدح۔

ترہیب قیامت کے بعد ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگار رہے اور حدود الٰہی کے پابند رہے، ان کے انعام اور اکرام کا ذکر آیاتِ بالا میں کر دیا گیا ہے: باغ ہوں گے، انگور ہوں گے، ہم عمر جوان لڑکیاں ہوں گی، اور چھلکتے پیالے ہوں گے اور کوئی لغوبات اور جھوٹ سنائی نہیں دے گا۔

جَزَاءً مِنْ رَبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنُ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًاه يَوْمَ يَقُوْمُ

الرُّوحُ وَالْمَلاَئِكَةُ صَفّاً لّایَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا

اے پیغمبر یہ ان کے اعمال کا کافی انعام ہے (جو ان کے اعمال کے) بدلے میں تمہارے پروردگار کی طرف سے (ان کو ملے گا) کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا، اور جتنی مخلوقات ان دونوں میں ہے، ان کا۔ بڑا مہربان، قیامت کے دن (لوگ مارے ہیبت کے) اس سے بات تک نہیں سن سکیں گے۔ جبکہ جبریل اور فرشتے ان کے حضور میں صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کسی کے منہ سے بات تو نکلنے ہی کی نہیں مگر جس کو خدائے رحمٰن اجازت دے اور وہ بات بھی معقول کہے۔ کیونکہ بدلہ صرف اللہ تعالیٰ دیں گے اور اپنی مہربانیاں فرماویں گے، اس دن جب روح اور تمام ملائکہ صفوں میں کھڑے ہوں گے اور اس کے اذن کے بغیر ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکیں گے۔ اور کچھ بولیں گے تو اچھا ہی بولیں گے۔

سزا کا وقت آپہنچا۔ اور سزا کے لیے شہادت کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں شہادت کتنی پختہ ہے۔ خود ہاتھ پاؤں شہادت دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں مجالِ انکار کیسے ہو سکتی ہے۔

اور پھر جس طرح پر یہ شہادت دی گئی اور اس پر جرح ہوئی وہ غور طلب ہے، اور ایک انسان کے لیے عبرت ہے۔ فرماتے ہیں :۔

وَیَوْم یُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللهِ اِلَی النَّار فَهُمْ یُوْزَعُوْن حَتّٰی اِذَا مَا جَاءُ وْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ ، وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْ تُمْ عَلَيْنَا قَالُوْ ا اَنْطَقَنَااللهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْئٍی وَهُوَ خَلَقَكُمْ

Marfat.com

اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝ (پارہ ۲۴ حم سجدہ ۲)

جس دن جمع ہوں گے دشمن اللہ کے دوزخ پر، تو ان کی جماعتیں بنائی جائیں گی، یہانتک کہ جب پہنچیں گے اس پر بتائیں گے ان کو ان کے کان، ان کی آنکھیں، ان کے چمڑے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ وہ کہیں گے اپنے چمڑوں (اعضا) سے تم نے کیوں شہادت دی ہم پر! وہ بولیں گے ہم کو بلوایا اللہ نے جس نے بلوایا ہر چیز کو۔ اسی نے پیدا کیا تم کو پہلی بار اور اسی کی طرف پھیرے جاتے ہو۔

آج سے پہلے تو اس شہادت کے الفاظ دلوں میں کھٹکتے تھے، کہ یہ کیسے ہو گا۔ سائنسی انکشافات اتنے اس وقت پہنچ چکے ہیں کہ اب ہاتھ پاؤں کا بولنا اور چمڑے کا کہنا عجب نظر نہیں آتا۔ جبکہ ایک دنیا اپنے مشاہدات میں لا چکی ہے کہ یہ چیزیں زندگی اور احساس رکھتی ہیں اور ہر چیز بول سکتی ہے۔ اور جب مردہ کو زندہ کر کے اس سے پوچھا جا سکتا ہے، تو یہ کارنامہ تو انسانی ہے۔ خدائے قدوس جو تمام طاقتوں کا مالک اور تمام اشیاء کا پیدا کنندہ ہے، جس نے ہر چیز کو گویائی دی، وہ کیسے یہ طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ عجوبہ اس دن عجوبہ نہ ہو گا۔ جب اعضا خود بیان کریں گے۔ اَنۡطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ پھر اس پر مزید اور تقویت سے کہا وَّہُوَ خَلَقَکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ یہ دوسری دلیل بولنے کے لیے دی۔ پھر تیسری دلیل اور پیش کر دی وَیَشۡہَدُ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ یعنی جب پھر زندہ کر کے سامنے لائے تو پھر ہمارا بولنا کیا عجب۔ اس پر اور فرماتے ہیں :-

وَمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَتِرُوۡنَ اَنۡ یَّشۡہَدَ عَلَیۡکُمۡ سَمۡعُکُمۡ وَلَا اَبۡصَارُکُمۡ وَلَا جُلُوۡدُکُمۡ وَلٰکِنۡ ظَنَنۡتُمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَعۡلَمُ کَثِیۡرًا بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝

اور تم پردہ نہ کرتے تھے اس بات سے کہ تم کو بتلائیں گے تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے چمڑے، یہ کہ تم کو خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کاموں سے بہت کچھ نہیں جانتا۔

Marfat.com

موجودہ مسلمان اس وجہ سے پس ماندہ اور راندہ ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا یہ پختہ عقیدہ نہیں رہا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ویسے تو عام عقیدہ یہی ہے کہ سب کچھ جانتا ہے لیکن عملاً یہ عقیدہ ختم ہو رہا ہے۔ اگر یہ عقیدہ انسان کا قائم رہے تو پھر گناہ کا ارتکاب کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ہو بھی، جیسے کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے، تو بہت کم ہو گا۔ قرونِ اولیٰ میں جب یہ عقیدہ پختہ تھا تو اول گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ہو جاتا تو دنیاوی سزا کے لیے تیار ہو جاتے اور یہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی سزا، آخرت کی سزا سے ہلکی ہے اور آج یہ حالت ہے کہ دنیا کی سزا کو سزا خیال کیا جاتا ہے اور آخرت کی سزا کا تصور تک نہیں آتا۔ اگر آبھی جائے تو ایسے جیسے کچھ فطرتی بخار وغیرہ ہو جاتا ہے، ایسے یہ بھی ہو گا۔ اس سے آگے فرماتے ہیں :۔

وَذَالِکُمْ ظَنُّکُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّکُمْ اَرْدَاکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ

اور یہ وہی تمہارا خیال ہے جو رکھتے تھے اپنے رب کے حق میں، اس نے تم کو غارت اور برباد کیا اور پھر آج رہ گئے ٹوٹے اور نقصان میں۔

اب فیصلہ ملتا ہے :۔

فَاِنْ یَّصْبِرُوْ فَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ وَاِنْ یَّسْتَعْتِبُوا فَمَا ھُمْ مِنَ الْمُعْتَبِیْنَ۔

پھر اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کا گھر ہے۔ اگر وہ منانا چاہیں تو انکو کوئی نہیں مناتا۔

منت سماجت سے بلا ٹل جاتی ہے لیکن یہاں منت سماجت کچھ مفید نہ ہو گی۔
حساب کے وقت دفترِ اعمال جب پیش ہو گا تو فرماویں گے :۔

اِقْرَاْ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا

اپنی کتاب خود پڑھو۔ آج کے دن تو ہی کافی ہے اپنا حساب لینے والا۔

یعنی اپنا حساب خود دیکھو۔ اور خود ہی فیصلہ کرو۔ کیا کچھ تم نے اچھا کیا اور کیا کچھ تم نے برا کیا۔

اب کتاب تیار ہونے کی بابت فرماتے ہیں کہ یہ کتابِ اعمال کیسی تیار ہوتی ہے۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ٥
مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ٥

(سورہ ق، پارہ ۲۶)

جب لیے جاتے ہیں دو لینے والے۔ داہنے بیٹھ اور بائیں بیٹھا۔
نہیں بولتا کچھ بات، لیکن ہوتا ہے اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار یعنی لکھنے کو تیار۔

اب ٹیپ ریکارڈ تیار ہو گئے ہیں۔ جو کوئی کچھ بولتا ہے بعینہ اسی آواز سے ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ مذہبی ڈھکوسلے ہیں۔ بلکہ اب مذہبی معلومات عین حقیقت نظر آ رہے ہیں۔ پہلے عام خیال تھا کہ سائنس کے آنے سے مذہب کی بنیاد اکھڑ جائے گی لیکن جتنے مشاہدات اور انکشافاتِ سائنس بڑھ رہے ہیں، اتنا ہی مذہب اور سائنس قریب ہو رہے ہیں اور اکثر فلاسفہ کا خیال ہے کہ اب بہت جلد مذہب اور سائنس ایک مقام پر اکٹھے ہو جائیں گے۔ مذہب نے اس حقیقتِ حقہ کو بار بار دہرایا ہے کہ عمل کی جزا سزا ضرور ہو گی۔ سورہ زلزال میں قیامت کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں :۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

ذرہ برابر بھی اگر کوئی نیکی کرے گا تو دیکھے گا۔ ایسے ہی ذرہ برابر اگر کوئی برائی کرے گا تو دیکھے گا۔

قیامت کے ہولناک مناظر کے پس نظر کے بعد جزا و سزا کے وقوع پر قرآن حکیم کے اعلانات اتنے ہیں کہ کوئی صفحہ اس حقیقت کے عیاں کرنے سے خالی نہیں۔ ایسے

Marfat.com

صورت میں جو انسان مذہب پر ایمان رکھتا ہو، اس سے صدورِ خطا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

## فردِ جرم قتل

اس سزا و جزا کے بعد قتل کا فرد جرم آگے دیکھئے۔ مذہب نے اس کے بارے میں کیا سزا تجویز کی ہے :۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ٥

جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان بوجھ کر تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس کو لعنت کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب۔

متمدن سے متمدن ریاست محرکاتِ گناہ کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتی جتنی توجہ ضروری ہے لیکن مذہب سب سے پہلے محرکاتِ گناہ پر نظر رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے گناہ کے ارتکاب کو مختلف طریقوں سے روکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر سزا کا وہ منظر پیش کرتا ہے جس سے کبھی بھی خلاصی نہیں۔

## سزا گناہ کے برابر

سب سے بڑے گناہ دنیا میں قتل اور زنا شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ انفرادی گناہ، کبیرہ گناہ ہیں۔ مذہب میں زنا سے بھی بڑھ کر قتل کا گناہ ہے جس کے لیے ایسی وعید اور سزا تجویز کی گئی جو زنا میں بھی نہیں کی گئی اور ایسے کھلے الفاظ میں جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔

پہلے نمبر پر دوزخ۔ دوسرے نمبر پر ہمیشگی سزائے دوزخ۔ تیسرے نمبر پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور لعنت اور پھٹکار۔ چوتھے نمبر پر دردناک عذاب۔ گویا سزائیں بیک وقت چار قسم کی تکالیف دی جاویں گی۔

شاید غضب الٰہی اور لعنت کو کوئی سزا نہ خیال کرے۔ لیکن جو آدمی کسی بڑے

Marfat.com

آدمی کا معتوب علیہ ہوتا ہے اسے ٹھکانہ نہیں ملتا۔ پھر بادشاہ کا معتوب علیہ، اسے ساری سلطنت میں جگہ نہیں ملتی، اور زمین باوجود وسعت کے اس کے لیے تنگ ہو جاتی ہے۔ اس پر خیال کریں کہ جب اللہ تعالیٰ کے غضب کے پنجے میں کوئی آجاوے، تو اس کا کیا ٹھکانہ؟ دوزخ سے بڑھ کر یہ دوزخ یعنی غضب الٰہی ہے اور یہ غضبی مارا ایسی ہے جس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ اب غور فرمائیے۔ یہ فردِ جرم جس مسلمان یا صاحبِ مذہب کی آنکھوں کے سامنے ہو، وہ کبھی کسی طیش اور غصہ میں ارتکابِ قتل کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جب کسی سے ایسے دکھ پہنچتے ہیں جن کا معالجہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو سکتا ہے تو صرف قتل سے، تو ایک مسلمان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر قتل کا ارادہ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم کی یہ سزا اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ اپنی تمام تیاری کو چھوڑ کر استغفار اور توبہ پر اتر آتا ہے کہ اے الٰہ العالمین! مجھے اس گناہ سے بچائیو اور اے اللہ تو خود اس ظالم کا علاج کر۔ اگرچہ ایسے ظالم کا قتل فی نفسہٖ جائز ہوتا ہے، لیکن مصالحِ معاشرہ جب اجازت نہیں دیتے تو مولیٰ کریم کیسے اجازت بخشیں۔ وہ تو سراسر مصالح ہی مصالح ہیں۔ بلکہ مذہبی نقطہ نگاہ سے کوئی بھی کسی سزا کو خود دینے کا مجاز نہیں۔ بلکہ ہر سزا کے لیے عدالت اور ریاست ہی مجاز ہے۔

اندازہ فرمائیے۔ مذہب معاشرے کا کتنا نگہبان ہے۔ اور کیسے ایک فرد کے قتل کو سزاؤں سے روکنا چاہتا ہے۔

یہ سزا اور یہ احکام اس شخص کے لیے تجویز کیے گئے جو دنیا کے بدلہ، قصاص سے نکل جائے۔ ورنہ اس کا حکم تو یہ ہے:۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ

قصاص میں تمہارے لیے کامل زندگی ہے۔

قصاص کو قتل خیال نہ کرنا۔ بلکہ قصاص جو مقتول کا لیا جاتا ہے، یہ قوم و ملت کی ایک زندگی ہے مبادا قصاص کو چھوڑ کر قوم و ملت کی زندگی کو برباد کر بیٹھو۔ تبھی تو آخری حصہ میں فرماتے ہیں يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ عقلمندو!

Marfat.com

تا کہ قصاص لینے کے بعد بچ جاؤ۔ کس سے ؟ قتل و غارت سے۔

بالفاظ دیگر قرآن حکیم :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ امَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

ایماندارو! بدلہ (قتل کا) لینا تم پر واجب ہے، آزاد شریف کا آزاد شریف سے اور غلام کا غلام سے۔

## قتل کیوں زیادہ ہوتے ہیں ؟

قتل کا بنیادی محرک خواہش بتلائی گئی ہے۔ جہاں پہلے خواہشیں کم تھیں، اب زیادہ ہیں، اس لیے قتل کی بنیادی صورت میں زیادتی ہو رہی ہے۔ دوسری وجہ مذہب سے ناواقفی ہے۔ جتنی مذہب سے دوری ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی انسان آخرت سے لاپرواہ ہو کر زیادہ قتل کرنے لگا ہے۔ تیسرا محرک، موجودہ عدالتی سسٹم ہے۔ اب ہم موجودہ سسٹم کو پہلے بیان کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تنقیدی طور پر اس کے نقصان پیش کریں گے۔

(۱) قتل کے بعد ورثا کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مقتول کی رپورٹ تھانہ میں کریں۔ لیکن یہ رپورٹ ایسی مکمل ہو کہ بطور بنیاد یہ آخری فیصلہ تک چلے اور اس میں کسی لچک کی اجازت نہیں ہے۔

(۲) اور یہ رپورٹ فوری ہو۔

(۳) شہادت اس رپورٹ میں مکمل ہوتی ہے اور اسی شہادت کی بنیاد پر مقدمہ چلتا ہے۔ اسے کیوں تجویز کیا گیا؟ تا کہ مدعی مشورہ کے ساتھ بعض بے گناہوں کو بوجہ عداوت داخل جرم نہ کر دے لیکن یہ نہیں سوچا گیا کہ فطرتاً جرم کرنے والا ایسے موقع کی تلاش کرتا ہے کہ شہادت نہ ہو سکے۔ اور اگر ہو بھی تو مکمل نہ ہو۔ اول تو قتل کے لئے زیادہ موزوں رات کو خیال کرتے ہوئے

Marfat.com

زیادہ تر رات ہی کو قتل کیے جاتے ہیں۔ دن کو اسی صورت میں قتل کیا جاتا ہے کہ یا تو قاتل بہت طیش میں ہو۔ مثلاً زنا وغیرہ کی صورت میں۔ یا کوئی فوری اقدام قتل کی کوئی صورت پیدا ہو گئی ہو۔ یا کسی راہ کی آڑ میں قتل کنندہ چھپا ہوا ہو اور اچانک یکہ و تنہا پر حملہ کر دے۔

خود سوچئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رات کے قتل کی فوری شہادت مل سکے، یا دن کے اچانک قتل کے لیے شہادت مہیا ہو، در آں حالیکہ مدعی کا قتل کی وجہ سے دماغ صاف نہ ہو اور مشورہ دینے والے اپنی عداوتوں کی وجہ سے غلط مشورہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت کامل میانہ ہونے کی وجہ سے عموماناقص رپورٹیں دی جاتی ہیں اور قاتل حقیقی بھی بری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شہادت صرف اعتماد پر تیار کی جاتی ہے۔ بلکہ بعض وقت حقیقی شہادت کے شاہد کہنے سننے سے عین مقدمہ کے دوران میں قاتل کی منت سماجت کی وجہ سے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر جو شہادت تیار کی جاتی ہے، وہ پولیس اپنے مقدمہ کے کامل کرنے کے لئے خود تیار کرتی ہے۔ عام شہادت سچی تو موجودہ سسٹم میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ بلکہ مرچ مصالحہ لگانے سے بھی بہ مشکل کامیاب ہوتی ہے۔

## عدالت

عدالت کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں۔ ابتدائی عدالت اور اعلیٰ عدالت۔ ابتدائی عدالت پہلے شہادت لے کر مقدمہ کو ایک درجہ دیتی ہے کہ فلاں دفعہ پر مقدمہ ثابت ہے، اور اس کے مطابق وہ فیصلہ کر کے عدالت اعلی یعنی سیشن جج کے سپرد کرتی ہے۔ پہلی عدالت میں کئی مہینوں مقدمہ چلتا ہے اور شہادت پر ہر طرح کی جرح ہوتی ہے اور وکلا کی جرح سے مقدمہ کی چولیں ڈھیلی پڑتی جاتی ہیں۔ مقدمہ کی شہادت کے تین حصہ ہیں: پہلا حصہ عام شہادت عینی کا۔ دوسرا حصہ تفتیشی عملہ کا۔ تیسرا حصہ معائنہ ڈاکٹری وغیرہ کا۔ اگر مقدمہ کی شہادت کے کسی حصہ میں بھی کمزوری

Marfat.com

آجائے تو اصل مقدمہ زد میں آجاتا ہے اور اس طرح مقدمۂ قتل ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر شک کا فائدہ قاتل کو دینا عدالت کا حق خیال کیا جاتا ہے۔

خود سوچیے۔ اگر ایک نالی کا پانی ایک میل سے زیادہ دور لے جانا ہو اور راستے میں کئی پستیاں بلندیاں واقعہ ہوں تو پانی کو لے جانے میں کتنی مشکلات ہیں۔ لیکن جب کئی آدمی اس پانی کی رکاوٹ کے لئے ہتھیاروں سے مسلح اسی خیال میں ہوں کہ جہاں موقعہ ملے توڑ دیا جاوے تو اس کا لے جانا کتنا مشکل ہے۔

پھر مقتول مقتول ہو چکا۔ اس کے ورثا پیروی میں ہیں اور وہ اپنی ہمدردیوں کے ساتھ مر چکا ہے۔ بخلاف قاتل کے کہ وہ اپنی جان کے لئے خود لڑتا ہے اور اس کے ورثا اس کی زندگی کے لئے ہر طور روپیہ صرف کر کے اس کی خلاصی کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ عام دیکھا گیا ہے، عام ہمدردی بھی قاتل کے ساتھ ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کی زندگی بچے۔ مقتول کے لئے موجودہ وقت میں عام ہمدردی بہت کم ہوتی ہے جس کا اثر عام مقدمہ اور اس کی شہادت اور عدالت پر کسی نہ کسی صورت میں پڑتا ہے۔ اس لئے موجودہ عدالتی سسٹم اور موجودہ حالات قاتلوں کی سزا کے بر خلاف چلتے ہیں۔

اگلے دن "امروز" میں ایک مقالہ شائع ہوا جس کا عنوان تھا "قتل کیوں زیادہ ہوتے ہیں"؟ دیکھنے کے بعد خیال ہوا کہ شاید کوئی خاص وجہ صاحبِ مقالہ بیان کریں گے۔ چونکہ مجھے بھی اپنے خیال کی وجہ سے دلچسپی تھی اس لئے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ مضمون نگار نے یہ سرخی تو لگا دی لیکن زیرِ عنوان کیا لکھا کہ قتل کی اصل وجہ جہالت ہے اس لئے کسی قاتل کو قتل کی سزا موت نہیں دینی چاہیے۔ بلکہ قاتل کی اصلاح کے لئے اس کی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے۔

غور فرمائیے جس ملک کے اہل علم کی یہ کیفیت ہو وہاں کیسے قتل جیسے بڑے گناہ کا ارتکاب بند ہو سکتا ہے بلکہ یوماً فیوماً یہ اقدام بڑھے گا اور عام جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ قتل کی سزا جب بہت کم ملتی ہے تو کسی کو زدو کوب کرنے سے قتل ہی اچھا ہے۔

Marfat.com

کیونکہ زدوکوب کی صورت میں اکثر سزا بھی ہوتی ہے۔

پہلے ورثا اپنے مقتول کے قتل کی داستان میں جھوٹ ملاتے ہیں۔ پھر جب یہ کہانی پولیس کے اڈے چڑھتی ہے تو اسے مکمل کرنے کے لئے پوری احتیاط برتی جاتی ہے اور پوری احتیاط کے ساتھ رپورٹ درج ہوتی ہے۔ پھر اس درج شدہ کہانی کے مطابق ضمنی چلانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وکلا کا نمبر آتا ہے۔ وکیل استغاثہ پھر ان کی کمیاں پوری کرتا ہے۔ لیکن فریق ثانی اس تمام کہانی کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے موقع بموقع کہانی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے اور جو رخنہ یا خلا ہوتا ہے اسے وہ باہر نکالتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ تمام کہانی کو فرضی خیال کراتا ہوا مقدمہ کو جعلی، بناوٹی بنا کر قاتل کو بری الذمہ قرار دیتا ہے اور ایک ایک نکتہ پر توجہ دلاتا ہوا قاتل کی بریت کے نشانات قائم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ عدالت کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ایسا جھوٹا مقدمہ کسی عدالت کے پیش نہیں ہوا۔

عدالت ایک طرف استغاثہ کی کہانی دیکھتی ہے۔ دوسری طرف فریق ثانی کی طرف سے شہادت پر جرح کے الفاظ سامنے رکھتی ہے۔ مزید بر آں قانونی نکتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ حقیقتاً یہ مجرم ہے لیکن جرح کے بعد جو خلاء کہانی میں پیدا ہو جاتا ہے وہ بھر نہیں سکتی۔ اگر خوش قسمتی سے وکیلِ استغاثہ قابل ہوا تو اس نے وہ خلا پورا کر دیا جو فریق ثانی نے ڈالا تھا اور مقدمہ استغاثہ کے مطابق سیشن سپرد ہو گیا۔

## عدالت سیشن جج

اب مقدمہ کو پھر از سر نو دیکھا جاتا ہے اور تمام کہانی کو دہرایا جاتا ہے۔ رپورٹ سے لے کر شہادت تک ہر ایک نقطہ پر دوبارہ نظر ڈالی گئی۔ فریقین مقدمہ کے وکلا پھر از سر نو جنگ اور بحث میں آ گئے۔ کہانی کا موازنہ پہلی عدالت کا اور موجودہ عدالت کا قائم کیا گیا۔ پہلی رپورٹ پر پھر بحث ہوئی۔ ڈاکٹر دوبارہ اپنے بیانات بولنے لگا

Marfat.com

اور وکیل کی بوچھاڑ اس پر اور پولیس کی شہادت پر ہونی شروع ہو گئی۔ اگر سیشن جج اصل واقعات سے متاثر ہو گیا تو اس نے کچھ قانون کو لچک دے کر مجرمین کو سزا کر دیا۔ ورنہ اگر اصل قانون کی طرف سرک گیا یعنی قانون کا احترام پہلے اور واقعہ کا درجہ دوسرا رکھا، تو حکم ہوا سب ملزم بری۔

اب تیسرا نمبر عدالت عالیہ کا آجاتا ہے۔ ملک بھر کے نامور وکلا جمع ہیں۔ استغاثہ اگر ایک چوٹی کا وکیل دو ہزار میں کرتا ہے تو ملزمین کے وکلا ہزاروں تک کھڑے نہیں ہوتے اور سال بھر کی کمائی ایک دن میں حاصل کر لیتے ہیں۔ مقدمہ پر نظر دوڑاتے ہیں۔ کسی خامی پر گرفت تیز کر دیتے ہیں اور عدالت کو بار بار اس کی طرف متوجہ کر کے مقدمہ کا تختہ الٹا دیتے ہیں۔

یہ نہیں کہ جج صاحب اصل مجرم اور جرم سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ اپنی عقابی نظر سے جائز ناجائز سب کچھ دیکھ جاتے ہیں۔ لیکن قانون کا احترام اپنے لئے اور اپنی عدالت کے لئے واجب جانتے ہیں اور سرِ مو قانون سے تجاوز کرنا ناجائز خیال کرتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ جس کے لئے تختۂ دار کل تیار تھا آج وہ بے گناہ ہو کر ایک دن کی قید سے بھی آزاد اور رہائی پا کر اپنے گھر میں پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو کر ھل من مبارز" کوئی ہے مدمقابل، کا آوازہ بلند کرتا ہے۔ ہاں فریق ثانی میں کچھ جذباتی طاقت ہو اور کچھ قوتِ مقابلہ ہو تو پھر کچھ خوف چند دن رہتا ہے۔ اور نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ دوبارہ ایک اور قتل نتیجہ کے طور پر ہو جاتا ہے۔

غرض یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہو جاتا ہے۔ ہاں! کوئی بد قسمت یا خوش قسمت قاتل اتنی رہائیوں سے نہ بچ سکے تو پھر وہ ایک نشان عبرت ہو کر چند دن کیلئے فضا کو باامن بنا دیتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بھی ایک ناپختہ روکاٹ ہے اور قتلِ مقابلہ کی رو عام چل رہی ہوتی ہے اس لئے حقیقی امن قائم نہیں ہوتا اور بدستور اندر اندر ہنڈیا پک رہی ہوتی ہے۔

Marfat.com

## تہی دستی قانون

اس سے بڑھ کر قانون کے لئے کتنی تہی دستی ہے کہ جب قاتل قانونی نکتہ ہائے جرح سے خلاصی پا جاتا ہے تو قانون کے پاس پھر کوئی ایسی ہتھکڑی نہیں کہ جس سے اصل قاتل کو از سر نو ماخوذ کرے اور اور اس پر مقدمہ چلائے۔ بلکہ بس قتل دفن ہو گیا اور قانون خاموش مقتول کی سڑی لاش کو دیکھتا رہا اور اپنی بے بسی کی وجہ سے وہ امن عامہ کی بربادی کا تخم اپنے ہاتھوں خود دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس پہ دنیائے قانون خوش ہے۔ اللہ اکبر! اسلامی قانون کی فراخ حوصلگی دیکھئے، وہ اپنے مقتول کے لاشے اس وقت تک دفن نہیں کرتا جب تک قاتل کا کامل سراغ نکال کر اسے سزا نہیں دے دیتا۔ اور برابر اس کا خون کھولتا رہتا ہے، جب تک مقتول کے ورثا کا دل اور آنکھیں ٹھنڈی نہیں کر لیتا۔

## مثال

ویسے تو کئی قتل دن دہاڑے ہوتے ہیں۔ شہادت عام طور پر مکمل رہی، لیکن کسی ایک قانونی نکتہ کی وجہ سے قاتل اپنی سزائے قتل سے بچ گیا۔ لیکن بعض وقت تو حیرت ہو جاتی ہے، جب تمام قانونی پہلو مکمل دکھائی دیں اور پھر بھی ایک قاتل نہیں کئی قاتل یک دم خلاصی پا جاتے ہیں۔

نور پور تھل کا سب انسپکٹر پولیس ایک زمین کی بید خلی کے لئے ایک سپاہی کے ساتھ جاتا ہے اور بید خل ہونے والے پورے مشورہ کے ساتھ تیار کھڑے رہتے ہیں اور گھوڑے کی لگام تھام لی جاتی ہے اور ساتھ ہی وار کر کے گرا لیا جاتا ہے اور ایک انبوہِ کثیر دور کھڑے دیکھتا ہے جو بے دخل کرنے والے کا ممد و معاون تھا۔

افسران پولیس پورے مشورہ کے ساتھ رپورٹ درج کرتے ہیں اور مقدمہ چالان ہوتا ہے۔ چھ سات اصل ملزم قرار دیئے جاتے ہیں اور باقی معاون ٹھہرائے جاتے ہیں۔ لیکن سیشن جج بلند اخلاقی سے کام لیتا ہوا معاونین سے ضمانت لیتا ہے اور

Marfat.com

مقدمہ کی کاروائی شروع ہوتی ہے۔

فیصلہ میں ایک کو پھانسی اور دوسرے ملزموں کو عمر قید کا حکم سنایا جاتا ہے۔ لیکن ہائی کورٹ کے فاضل جج نے صرف اس نکتہ سے کہ پہلی ضرب پر پھانسی جو ملزم کو دی گئی تھی وہ صرف ڈیڑھ انچ گہرا زخم ہے، جس سے موت واقع نہیں ہو سکتی۔ فاضل وکیل نے اسی پر اپنی جرح کا مدار رکھا۔ آخر فاضل جج اس کے نرغے میں آگیا اور تمام مقدمہ کو شک آجانے سے بری کر دیا۔

اب سوچیے۔ فاضل جج کتنا قانون کا احترام کر رہا ہے اور اصل واقعہ کو کتنا پس پشت ڈال کر ایک حکومت کے افسر کو ڈانٹتا ہوا قانون کی داد دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس قانونی احترام سے امنِ عامہ کو کتنا دھچکا لگا اور حکومت کی بندھن کتنی ڈھیلی اس بارے ہو گئی۔

لیکن افسوس بہت کم دور اندیش ایسے ہیں جو اس قانونی احترام کو امن سوز قرار نہ دیتے ہوں۔

## امن عامہ

امن عامہ کی بنیاد اچھی ریاست پر ہے اور اچھی ریاست کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے۔ لیکن ریاست کا قیام اقتدار کے رعب اور خوف پر ہے۔ اگر کسی ریاست میں اقتدار قائم نہ ہو اور اقتدار کا خوف نہ رہے تو بد نظمی پیدا ہونی لازمی امر ہے اور بد نظمی سے بدامنی پیدا ہوتی ہے، جس سے ریاست کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، چہ جائیکہ امن عامہ قائم ہو۔ اس لئے سب سے زیادہ ریاست کے لئے یہ ضروری ہے کہ عدل و انصاف یعنی حق دلانے کی طاقت اس میں پوری پوری ہو اور ہر وہ رخنہ جس سے انصاف و عدل کا رشتہ ٹوٹتا ہے اسے بند کیا جاوے۔

موجودہ صورتِ انصاف و عدل پر توجہ کی جائے تو گو ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اپنے پورے جوبنِ اقتدار پر ہے لیکن جب گہری نظر ڈالی جائے اور دیکھا

Marfat.com

جائے کہ حق دلانے میں کامیاب نہیں، خواہ یہ حق قانونی شکنجہ کی وجہ سے حاصل نہیں ہو سکا، تو ایسی صورت میں ریاست کے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا ہو گیا ہے جس کے اندر سراسر بے خوفی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے عوام و خواص کے سامنے قتل کی سزا کی بھیانک صورت نہیں آتی، تا کہ وہ خوف زدہ ہو کر اس صورت مذمومہ سے بھاگتے۔ ایسی صورت میں حکومت کا فرض ہے کہ اپنی پوری توجہ قتل اور قتل کے محرکات پر صرف کرے اور قانون کے ایک ایک جزو پر پورا دھیان دے اور قانون دان ماہرین کی مہارت سے فائدہ اٹھائے اور ایسے قانون کی ترتیب دے، جس سے نہ تو بے گناہ لپیٹ میں آجاویں اور نہ ہی گنہگار ملزم خلاصی پا جاوے تا کہ رعایا پورے امن کے ساتھ اپنے فریضہ کو سرانجام دے اور قتل جیسا ناپاک گناہ کامل طور پر بند ہو جاوے۔

میں کوئی قانون دان نہیں۔ تاہم اپنے خیال کا اظہار کرتا ہوں، تا کہ میری اس تجویز کو بنیادی حیثیت سے مطالعہ کیا جاوے اور حسبِ ضرورت ترمیم اور تصحیح کر کے عوام و خواص سے امداد طلب کی جائے۔

## تجاویز

(۱) قتل کے استغاثہ کی رپورٹ کا تفصیلی ہونا غیر ضروری قرار دیا جاوے اور ورثا یا کسی کی طرف اسے مختصر یہ رپورٹ ہونی چاہیے کہ "فلاں قتل ہو گیا" اور بس۔

## تفتیش

(۲) تفتیش کے لئے پہلا طریقہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ بلکہ تفتیش کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جاوے جس کے افراد ذیل ہوں (۱) سب انسپکٹر تھانہ (۲) انسپکٹر پولیس (۳) علاقہ مجسٹریٹ (۴) ڈاکٹر اور چیدہ (۵) ممبر کونسل علاقہ

(۳) یہ بات مشورہ طلب ہے کہ علاقہ کے افسر ہوں یا ضلع کے مرکزی افسر ہوں۔ بہتر یہی ہوگا کہ صاحب ضلع کے خاص تجویز کردہ افسروں کا مجموعہ ہو جسے اس وقت تجویز کیا جاوے۔

Marfat.com

(۴) اپریشن روم کی گاڑی میں ڈاکٹر اپنے عملہ اور ادویہ کو لے کر اپنی پارٹی کے ساتھ فوری طور پر پہنچے اور افسروں کے لئے اس اپریشن روم میں جگہ ہو یا الگ ایک گاڑی ہو۔ میرے خیال میں ایک ہی گاڑی دونوں خدمات سرانجام دے۔ جو مرکز ضلع میں اس صورت حال کے لئے ہر وقت مہیا ہو۔

## روانگی

کمیشن پارٹی رپورٹ پہنچنے کے بعد دو گھنٹہ کے اندر روانہ ہونا ضروری ہے، تاکہ موقع پر تحقیقات کرے۔ ڈاکٹر سب سے پہلے پوسٹ مارٹم کرے اور کمیشن کے سامنے اپنی رپورٹ مکمل کرے۔

اس کے بعد پولیس تفتیشی کاروائی شروع کرے اور ہر نتیجہ کو فوری طور پر کمیشن کے سامنے پیش کرے اور کمیشن باقاعدہ مسل تیار کرتی جائے اور ہر رطب و یابس کو تحریر میں لایا جاوے۔ جس وقت تفتیش مکمل ہو جاوئے اور شہادت کاملہ یا ناقصہ سامنے آجاوے تو کمیشن ایک رپورٹ لکھے۔ اگر کچھ اختلاف رائے ہو تو اس کا نوٹ ہونا بھی ضروری ہے۔ تفتیش کے دوران کمیشن روزانہ اصل موقع سے واپس مرکز پر اپنی مخصوص گاڑی کے ذریعہ آیا جایا کرے اور دورانِ تفتیش کوئی الگ تخلیہ کرنے نہ پایا جاوے۔ انفرادی تفتیش کے لئے پولیس ہر فردِ سے الگ پوچھ گچھ کر سکتی ہے۔ شہادت میسر نہ ہونے کی صورت میں ہر رکن تفتیش میں حصہ لے سکتا ہے۔

## مکمل رپورٹ

تفتیشی رپورٹ تین دن کے اندر مکمل کرنی ضروری ہے۔ اگر کسی صورت نہ ہو تو عدالتِ سیشن جج سے ریمانڈ حاصل کیا جاوے۔ لیکن جب مکمل ہو جاوے افسر پولیس قانون دان کے پاس بھیج دی جاوے تاکہ وہ ایک بار تکمیلی صورت دیکھ لے۔ اس کی تصدیق کے بعد براہِ راست سیشن جج کی عدالت میں پیش کر دی جائے۔

Marfat.com

## عدالت سیشن جج

بہتر تو یہ ہے کہ اس عدالت کے لئے دو سیشن جج مقرر کر دیئے جاویں۔ ایک ہونے کی صورت میں بھی جج مجازِ سماعتِ مقدمہ ہو سکتا ہے۔ رپورٹ پہنچتے ہی پہلے سیشن جج خود رپورٹ ملاحظہ کریں۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ تین دن کی مہلت ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اگر رپورٹ مکمل ہو تو مقدمہ کو پیشی کا حکم دیا جائے ورنہ تکمیل کے لئے واپس کر دی جائے جو صرف تین دن کے وقفہ کے بعد پیش کر دینی ضروری ہو۔

رپورٹ مطالعہ کرنے کے بعد ممبرانِ کمیشن کے سامنے رپورٹ کو ایک بار مقدمہ کی صورت میں دیکھا جاے اور حسب ضرورت ممبروں سے سیشن جج توضیح حاصل کرتا جائے۔

## وکلاء

جب یہ مرحلہ طے ہو جائے تو سرکاری خرچ پر دو وکیل فریقین کے لئے رکھے جائیں تاکہ ہر جزِو مقدمہ پر پوری توجہ دی جا سکے اور رپورٹ کے ہر حصہ کے لئے حسب ضرورت جرح قدح ہونی ضروری ہے۔ اگر کسی حصہ میں ابہام ہو تو اس کے لئے بعض افراد کو خود عدالتِ سیشن جج طلب کر سکتی ہے۔ لیکن کسی دوسرے کے لئے مطالبہ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

## فیصلہ

اگر سیشن جج رپورٹ کے ساتھ کامل اتفاق رکھتا ہو تو فوراً حکم سنا دیا جاوے اور اگر اختلاف رائے ہو تو ایسی صورت میں ایک دوسرے جج کے ساتھ مل کر فیصلہ دے دیا جاوے۔

## سزا

سزا کی صورت میں ملزمین کو اس کا حق ہو گا کہ وہ عدالت عالیہ میں اپیل کریں۔

## بریت

بریت کی صورت میں کمیشن پر فرض عائد ہوگا کہ وہ ازسر نو تحقیق کریں اور ہر صورت مقدمہ کو ازسرنو شروع کر کے عدالت میں چالان پیش کریں۔ غرض جب تک قتل کے ملزموں کی سزا میں کامیابی نہ ہو، اس وقت تک اس قتل کو زندہ خیال کیا جاوے۔ مقدمہ صرف اس صورت میں دفن ہو گا جب قصاص عملاً دنیا کے سامنے آجائے اور ورثاء مقتول کی تسلی ہو جائے۔ یا دیت دلا کر جبکہ شہادت مکمل نہ ہو، وہ مقتول دفنایا جائے۔

## قصاص

موجودہ دور میں اگر قانون میں ایک ملزم مجرم ٹھہر جائے تو اس کے لئے کسی قسم کی معافی نہیں۔ لیکن قتل کے بارے میں جو شریعت غرا اور قرآن حکیم نے معافی کے بارے میں فیصلہ دیا اس کو جاری کرنا ازبس ضروری ہے مثلاً (۱) قصاص (۲) معافی (۳) کچھ معافی، کچھ ادائیگی۔

یعنی ورثائے مقتول پر تمام مدار رکھا جائے۔ جس طرح وہ راضی ہوں ان کو راضی کیا جاوے۔ موجودہ وقت میں یہ رعایت بہت ضروری ہے۔ جبکہ ہم نے یہ فیصلہ کر دیا کہ قتل رائیگاں کوئی نہیں جائے گا۔ اس رعایت کی وجہ سے عام قتل سامنے آجاویں گے اور مجرم اور ملزم اپنی پوری کوشش سے ورثائے مقتولین کو راضی کریں گے۔ اس صورت میں ایک تو مجرم کی زندگی بچ جائے گی اور ایک دشمنی کا تخم ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ صلح ایک لازوال نعمت ہے۔ مجرم کو جرم کے بدلے سزا دینے سے خوف تو پیدا ہو جائے گا، لیکن دشمنی کا تخم ختم نہ ہو گا۔ لیکن صلح کی صورت میں تاوان بھاری کے ذریعہ بھی اگر صلح ہو گی یا رشتے دے کر جیسے عام رواجِ قوم ہے تو رشتۂ اخوت پیدا ہو جائے گا۔ اور نہیں تو دشمنی کم ضرور ہو جائے گی۔

اس طرح ایک تو مقدمہ بازی ختم ہو جائے گی اور ایک طرح صلح کا دروازہ

Marfat.com

کھل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے کتنے بلند آواز سے بلیغانہ طور پر فرمایا:

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ۔

"بس جس کو اپنے بھائی سے کچھ معافی مل جائے تو اس کے بعد دستور کی پیروی کی جائے اور بھلائی کے ساتھ باقی ادا کر دیا جائے"...... کیوں؟

ذٰلِکَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَرَحْمَةٌ۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی ہے اور مہربانی۔ یہ تخفیف الٰہی شفقت ہے اور رحمت۔ اس سے معاشرہ میں محبت واخلاص بڑھے گا۔ ساتھ ڈانٹ فرمائی کہ کوئی ناجائز موقعہ پر فائدہ اٹھا کر پھر اندھا ہو جائے اور نافرمانی سے باز نہ آئے یعنی دوبارہ دشمنی پر اتر آئے تو فرماتے ہیں۔

فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ پس یہ آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد رحم اور تخفیف نہ ہوگی اور کامل سزا دی جائے گی۔

# خلاصہ

(۱) عام گناہوں کی طرح قتل کا بنیادی محرک بھی خواہش ہے۔

(۲) قیامت اور احوالِ قیامت اور جزا سزا کے تخیل کے مذہبی طور پر عام نہ ہونے کی وجہ سے لاپرواہی اور گناہوں سے بے فکری کی وجہ سے قتل عام ہو رہے ہیں۔ اس لئے مذہبی معلومات اس بارے عام کئے جاویں اور عوام کو جزا و سزائے قتل سے واقف کیا جاوے۔

(۳) موجودہ طریقۂ تفتیش اور قانون ناقص ہے۔ کیونکہ قاتل شواہد اور گواہ بنا کر قتل نہیں کرتا اور اکثر رات کو قتل ہوتے ہیں۔ جرم خود اخفا چاہتا ہے۔ اس لئے موجودہ طریقہ کہ پہلی رپورٹ مکمل ہو جس پر تمام مقدمہ کی بنیاد ہے غلط ہے۔

(۴) ورثائے مقتول کے ذمہ صرف رپورٹ قتل ہو اور بس۔

(۵) تفتیش اور رپورٹ ایک کمیشن کرے جس کے افراد ذیل ہوں۔

Marfat.com

مجسٹریٹ، آفیسر پولیس، ڈاکٹر، اور ایک علاقہ کا اچھا آدمی۔

(۶) یہ رپورٹ بنیادی طور پر مقدمہ کی پیروی کے لئے ہو۔

(۷) اس کے بعد کوئی شہادت مقدمہ کے بارے نہ کی جائے اِلا یہ کہ کسی شہادت کی توضیح عدالت کو مطلوب ہو۔

(۸) مقدمہ کی پیروی کمیشن کرے۔ اور بنیاد جرم ہو، نہ کہ قانون، یعنی سزا جرم پر ہو۔

(۹) عدالت دو سیشن ججوں پر مشتمل ہو۔

(۱۰) وکلا سرکاری خرچ پر فریقین کے لئے خود حکومت مقرر کرے۔

(۱۱) بری ہونے کی صورت میں عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کیا جاوے۔

(۱۲) اگر وہاں بھی مجرم بری ہو جائے تو از سر نو تفتیش کمیشن کرے۔

(۱۳) کسی صورت میں بھی سزا کے بغیر مقدمۂ قتل ختم نہ ہو۔

(۱۴) سزا کی صورت میں ورثاء کو حق دیا جائے کہ وہ صلح معافی سے کریں، یا اپنا معاوضہ لے کر یا رشتہ کی وجہ سے مصالحت کر لیویں۔ یا قصاص پر رہیں اور مصالحت ہر صورت عدالت کرائے تا کہ تخم دشمنی ختم ہو۔

(مارچ و اپریل ۱۹۷۵)

# حصہ دوم

# مشاہدات و تاثرات

# اچھا قاری

قرآن حکیم سراسر رحمت ہے۔ لیکن جب اچھا قاری ہو، تو اچھا وقت بھی پیدا ہو جاتا ہے، اور وہی آیات جن کو سینکڑوں بار سنا سنایا جاتا ہو اور جن کے اندر کوئی خاص حال پیدا نہ ہوتا ہو اور کوئی خاص چیز نظر نہ آتی ہو، یکدم ایک حال پیدا کر دیتی ہیں، اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قرآن حکیم اپنی پوری رہنمائی اور ہدایت کے لیے اتر رہا ہے اور سننے والے کو یہ یاد تک نہیں آتا کہ میں کیا ہوں اور کہاں ہوں، اور پڑھنے والا کون ہے اور کس کے لب، لہجہ میں سنایا جا رہا ہے۔

۱۴ اکتوبر کا واقعہ ہے کہ شام کی نماز کے بعد جب فارغ ہو کر مسجد میں بیٹھا تھا، حافظ بدر الدین صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ قرآن حکیم کی چند آیات آپ مجھے سنائیں۔

حافظ صاحب نے حسبِ عادت پہلے تو بہت دھیمی آواز میں پڑھنا شروع کیا مَثَابَةً لِلنَّاس وَاَمْنًاه نہایت دھیمی آواز سے پڑھنی شروع کی۔ لیکن قراء کی طرح آہستہ آہستہ آواز بلند ہوتی گئی۔ اسی طرح سے اگلی آیت وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا سے اور بلند آواز میں پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ وَاِذْ یَرْفَعُ

Marfat.com

اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ پر آواز اپنی شان اور لہر میں آگئی اور حافظ صاحب پر اپنی قرأت کا حال وارد ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ ایسے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام سامنے بیت اللہ اٹھا رہے ہیں، اور رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ان کی دعا ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔ سبحان اللہ سننے والے محو ہو گئے۔ نہ حافظ جی کا پتہ اور نہ اپنا پتہ۔ آواز ہے تو ابراہیمی اور سننے والے ہیں تو حضرت رب العزۃ!.......... پھر کیا تھا۔ ایک طرف دعا کے کلمات نکل رہے تھے۔ ایک طرف یہ محسوس ہوتا تھا کہ قبولیت خاصہ قبولیت عامہ کا جواب دے رہی ہے۔

پھر کلمات دعا کیا تھے۔ سب سے پہلے اس کار خیر کی قبولیت کی دعا کہ جو کچھ بنا رہے ہیں اے اللہ اسے قبول فرمائیے۔ کیا کوئی آج بھی اس محبت و اخلاص سے اللہ کا گھر بناتا ہے؟ پھر کیا ہی اچھے الفاظ ہیں "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا" کیونکہ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ تو سنتا ہے اور ہمارے اخلاص و محبت کو جانتا بھی ہے۔ اس کے بعد پھر وہی طلب، جس کے لیے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام پیدا ہوئے تھے۔ باآواز بلند نہایت التجا سے فرمانے لگے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ۔ اے الہ العالمین، اے پروردگارِ عالم ہمیں ہمیشہ اپنا (مطیع) مسلمان رکھیو اور ہماری اولاد سے بھی ایک مسلمان (فرمانبردار) قوم بنا۔ یہ محبت کا ایک فطرتی تقاضا ہے کہ جو اپنے کو مرغوب و محبوب ہے اور جس پر اپنا ایمان ہے اسی پر اپنی آئندہ نسل کو لانے کی بھی دعا ہے کہ وہ مسلمان ہی رہیں۔

پھر اس کے بعد یہ الفاظ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ اے اللہ ہمیں عبادت کے طریقے سکھا اور دکھا (کہ کیسے تیری عبادت کو بجا لاویں) اے اللہ تو در گذر کرنے والا بڑا رحیم ہے۔

یہ دعا بیشک بہت بڑی دعا تھی کہ ہمیں مسلمان بنا، اور ہمیں طریقہائے عبادت سکھا، اور ہماری نسل سے ایک فرمانبردار قوم پیدا کر! لیکن دعا کا آخری وہ ٹکڑا ہے، جو تمام دعا کا تاج اور آخری اور چوٹی کا پھول ہے، جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم

Marfat.com

علیہ السلام پوری ملت کے مورث اعلیٰ قرار دیئے گئے ،اور جس کی وجہ سے فرمایا گیا اِنَّ اِبرَاہِیمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا للہِ۔ کیونکہ یہ وہ الفاظ فطرت سلیمہ کے ہیں کہ ہر بشر سے تو کیا، کسی برگزیدہ ہستی انسانی کے خیال و وہم میں بھی نہیں آسکتے۔ طلب کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ!

رَبَّنَا وَابُعَثُ فِیُھِمُ رَسُوُلًا مِنُھُمُ یَتُلُوُا عَلَیُھِمُ آیَاتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الُکِتَابَ وَالُحِکُمَۃَ وِیُزَکِّیُھِمُ اِنَّکَ اَنُتَ الُعَزِیُزُ الُحَکِیُمُ

"اے پروردگار ان (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجئو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے، اور کتاب و دانائی سکھایا کرے، اور ان کے (دلوں) کو پاک صاف کیا کرے۔ بیشک تو غالب اور صاحب حکمت ہے"۔

مولا کریم سے ایک برگزیدہ انسان کی طلب فرمائی، جو اس کا پیغام لانے والا ہو، اور جس کے اندر یہ اوصاف کامل ہوں جو اپنی قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کے آیات پڑھا کرے۔(۲)۔ پھر اللہ تعالیٰ کی کتاب پاک کی تعلیم دے اور عقل و رشد کی حکمتیں بتلائے، اور آخر ان کے دلوں کو پاک کرے۔

سوچیے اور غور فرمایئے۔ کتنا بلند جذبہ لے کر حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی۔ شخصیت سے اٹھ کر قومیت کے تقاضوں سے بھی آگے نکل گئے، اور رحمتِ مطلقہ طلب فرمائی، اور ایک ایسے رہنما کی طلب میں جوش کھایا، جو کائنات انسانی کے لیے سراسر رحمت، حکمت، علم اور پاکیزگی ہو۔ یعنی انسانی دنیا کی فلاح کی طلب کے سوا اللہ میاں سے کچھ طلب نہ فرمایا۔ یہ طلب وہ ہے، جو خود ذات اقدس کے اندر موجزن تھی اور خود چاہتے تھے کہ ہم اپنا ایسا برگزیدہ بندہ اور پیغمبر بھیج کر کائناتِ دنیا کو اپنی ہستی نور سے منور اور معمور فرمائیں۔

جب انسان شخصی تقاضوں سے نکل کر تقاضائے انسانیت میں آجاتا ہے، بلکہ

Marfat.com

انسانی تقاضوں سے بھی بلند ہو کر رضائے مولا کریم کا طالب ہو جاتا ہے تو رحمت الٰہیہ اس پر برس پڑتی ہے، اور جو چاہتا ہے وہی دلایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہم السلام کی دعا کیا تھی، ایک تیر تھا جو نشانہ پر جا بیٹھا۔ مولیٰ کریم نے انسانیت کا معلم، مربی، مزکی، مبعوث فرمایا جو آیا تو تھا آخر میں لیکن جو اولین کا فخر تھا۔ ؎ آخر آمد بود فخر الاوّلین (عطار)

اس دعا کی قبولیت کیا ہوئی۔ مولیٰ کریم نے اس دعا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا منصب اور بلند فرمادیا۔ اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً فرماتے ہوئے اس پر مزید اضافہ فرمایا اور کہا۔ وَمَنْ یَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاهِیمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔ ابراہیم کی ملت (طریقہ) سے وہی منہ پھیرتا ہے جو بیوقوف ہو۔ کیوں؟ فرمایا ولقد اصْطَفَیْنَاهُ فِی الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِیْنَ ہ دنیا میں اسے ہم نے چن لیا، اور آخرت میں بھی صالحین سے ہے۔ یعنی دین و دنیا میں ممتاز ہو چکے۔ یہ وہ تصدیق ہے۔ جب سے وہ تشریف لائے، اور آج تک اس کی تصدیق انسانی ہستی میں ہو رہی ہے اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ پروردگار عالم نے فرمایا۔ مسلمان ہو جا۔ عرض کی، میں پروردگارِ عالم کے سامنے سربسجود ہوتا ہوں۔

غرض یہ کلمات قاری صاحب کے منہ سے نکل رہے تھے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ خود ذات اقدس یہ کلماتِ طیبات اپنی ازلی وبدی آواز سے بول رہی ہے۔ سننے والے تمام مسحور تھے اور محوِ حیرت تھے۔

اچھا قاری، اچھا حال اور اچھی قرأت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ خدا کرے یہی کچھ میرا وسیلۂ آخرت ہو جائے وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(جنوری ۱۹۶۴)

Marfat.com

# اچھا نغمہ

## سماع پر ایک لطیف تبصرہ!

جہاں عام حیوانات کے مقابلہ میں فطرتِ انسانی کے جذبات کو قدرت خدائی نے بلند رکھا، وہاں جذبۂ محبت والفت بھی تمام جانداروں سے بہت بڑھ کر اسے ودیعت فرمایا۔ کسی نے خوب کہا

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

یعنے فرشتے عبادتِ الٰہیہ کرنے کے لیے کیا کم تھے، جو انسان کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا؟ اس کے اندر عبادت کے ساتھ جذبۂ محبت و بیقراری اور سوز و گداز رکھا۔ عبادت اور کچھ نہیں، صرف جذبۂ محبت کے اظہارِ فطرتی کا نام ہے۔

ہر انسان کم و بیش اس جذبۂ پاک سے اپنا حصہ رکھتا ہے۔ اور اپنے جذبۂ محبت کے مطابق جب کبھی کچھ جوشِ محبت اٹھتا ہے، تو محبت قلب سے نکل کر زبان پر الفاظ و حروف کی صورت میں باہر نکلتی ہے، اور اپنے دل کی کیفیت کو اپنی زبان کے ذریعہ باہر

Marfat.com

نکالتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ کوئی متاثر ہو، بلکہ اپنی قلبی تسکین کے لیے اور اپنے دل کو ہلکا کرنے کے لیے یہ بخاراتِ قلبی اپنی راہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ الفاظ و حروف ہی نہیں، بلکہ یہ سوز و گداز کے قمقمے ہوتے ہیں، جو اپنی دلنواز اور منور صورت سے دل میں آگ لگا دیتے ہیں، اور دلوں میں محبت کی چنگاری ڈال دیتے ہیں تو بجھا دل بھی محبت سے روشن اور کیفِ محبت سے بھرپور ہو جاتا ہے۔

مذہب یا طریقت کی بنیاد محبت پر ہے۔ جب تک کسی کا دل محبت سے بھرپور نہ ہو، اس وقت تک فطرتِ کمال اپنا چہرہ نہیں دکھاتی۔ یہ فطرتِ کمال کیا ہے؟ فطرت کائنات کی روح ہے! فطرتِ انسانی اپنی فطرتِ کمال میں جب حیران ہو کر تلاش مجہولانہ میں محو اور سرگردان ہو جاتی ہے، تو فطرت کاملہ محبت سے بھرپور ہو کر اپنی انعکاسی فطرت کے سامنے آجاتی ہے، اور اس سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔

ایسے وقت فطرت کاملہ خود بول اٹھتی ہے، اور فطرتِ جزئیہ نبی کی زبان پر حروف کی صورت میں آوازِ بلند سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور اپنے انعکاس قلوب انسانی پر ڈالتی ہے۔ یہی چیز ہے جسے تورات و انجیل اور قرآن سے تعبیر فرمایا جاتا ہے، اور جب انہیں کوئی صاحب، محبت اور لے سے پڑھتا ہے تو وہ صرف اپنے دل کی تسکین نہیں پاتا بلکہ کئی محبت بھرے دِل کھل جاتے ہیں۔ اور محبت میں فنا ہو جاتے ہیں۔

کہتے ہیں جب داؤد علیہ السلام زبور پڑھا کرتے تھے، تو انسان تو کجا حیوانات بھی چلنے پھرنے سے رک جاتے اور کھڑے سنتے رہتے، حتی کہ پانی بھی اپنی روانی چھوڑ دیتا تھا۔

مذہب کا یہ پھیلاؤ کتنا بڑا ہے۔ اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہی نہیں کہ خدا کی کلام پڑھی جاتی تھی اور دلوں میں بیٹھ جاتی تھی، اور دل خدائی محبت میں جکڑے جاتے تھے اور مخمور ہو کر خدائیت کا اقرارِ زبانی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ دل و جان قربان ہو جاتے تھے، اور ہر فعل و عمل میں اس کا اظہار ہوتا تھا۔

قرآن کریم کے معجزات لاکھوں ہیں۔ لیکن سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ

Marfat.com

سننے والے کے دل کو ہلا دیتا ہے اور خدا اور سولؐ کے احکام کی تعمیل کے لیے سر فروشانہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

عشق و محبت دیکھنے ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ گاہے محبت کی بات سننے سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

عام مشہور ہے کہ اسلام کے اندر جذبۂ محبت کم ہے، اور اس کے اندر خوف سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ صرف خوف سے کبھی کام نہیں چلتا۔ خصوصاً اعمال صادقہ پیدا کرنے کے لئے خوف کام نہیں دیتا۔ بلکہ جیسے فطرت انسانی محبت و خوف سے مرکب ہے اسی طرح مذہب بھی وہی کامل ہوتا ہے جس کے اندر یہ دونوں جذبے مساوی رکھے گئے ہوں، خوف کے ساتھ محبت اور محبت کے ساتھ خوف۔ خود قرآن حکیم فرماتا ہے۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ ایمان دار محبت الٰہیہ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ خوف کے اندر جاں فروشانہ جذبہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟ حالانکہ مذہبِ اسلام میں سب سے زیادہ جذبۂ جاں فروشی موجود ہے اور اسی پر مذہب کی بنیاد ہے جس کو جہاد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے مذاہب والے اس سے محروم ہیں۔

ابتدائی ایام اسلام کا مطالعہ کیا جائے۔ اس وقت کیا خوف تھا؟ بلکہ خود مذہب ناتوانی کی حالت میں نزار تھا اور نام لینا بھی گناہ تھا، اور نام لیوا پٹے جاتے تھے اور کئی جانیں شہید ہو گئیں۔ آخر کیا یہ محبت تھی یا خوف تھا؟

غرض مذہب کی بنیاد محبت اور صرف محبت پر ہے اور بس۔ ہاں! جہاں محبت ہوتی ہے وہاں خوف بھی پیدا ہونا لازمی ہے۔ عاشق کو جہاں محبت ہوتی ہے، وہاں اپنے معشوق سے خوف بھی ہوتا ہے کہ کسی بات سے وہ ناراض نہ ہو جائے اور کوئی کلمہ گستاخانہ خیال نہ کیا جائے، یا اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو اور اس کے حکم کی تعمیل

Marfat.com

میں دیر نہ ہو جائے۔

فطرت کاملہ ایک ہے لیکن کسی تشخص اور تعیّن میں جب آجاتی ہے، تو تعین و تشخص کے فطری رجحانات سے بھی متأثر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک پانی مختلف، ظروف، مٹی، کانسی، لوہا، تانبا، چاندی اور سونا میں رکھا جائے، تو باوجود پانی کی ایک حقیقت کے رنگ وبو میں فرق آجائے گا، کیونکہ ظروف مختلفہ کی فطرت الگ الگ ہے۔ ایسی ہی فطرت کاملہ ایک ہے۔ لیکن جب تشخصات میں آکر ڈیرا لگاتی ہے، تو تشخص کا رنگ خواہ کتنا ہی ہلکا ہو، رنگدار تشخص ہو جاتی ہے۔

انبیاء اور اولیاء کرام پر نظر ڈالیے۔ ہر ایک کا مذاق الگ ہے، حالاتِ شخصی الگ ہیں، طرز گفتگو الگ ہے، اور پھر خصوصاً وقت کے تقاضے الگ ہیں۔ اس لیے ہر امت کا مذاقِ نوعی الگ ہے۔ یہودیت اور عیسائیت کا مزاج ایک نہیں۔ ایسے ہی اسلام اور عیسائیت کا مزاج الگ الگ ہے۔ اور اپنے مزاج کے مطابق تمدن مذہبی پیدا ہوتے ہیں۔

بہت سے مذاہب میں گانا بجانا عبادت میں داخل ہے اور ان کی عبادت کا انحصار اسی میں ہے کہ جذبات کو ابھارا جائے، اور فطرت کاملہ کی تعریف کی جائے اور بس، خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔ لیکن فعالی اور عملی مذاہب میں ایسے نہیں۔ بلکہ حمد و ثنا کے ساتھ عملیّت و فعلیّت بھی ساتھ دیتی ہے۔

نماز کو دیکھئے، صرف حمد و ثنا ہی نہیں بلکہ حمد و ثنا کا تمام نماز میں عملی ظہور بھی لازمی ہے۔ قیام، رکوع، سجود فرض قرار دیئے گئے۔ لیکن بعض مذاہب میں عمل کو کوئی دخل نہیں، صرف دلی جذبات کے ظہور تک عبادت محدود ہے۔ لیکن یہ محدودیت صرف عبادت میں ہی نہیں بلکہ زندگی اور معاشرہ کے ہر عملی پہلو پر کوئی عام قدغن نہیں۔ بخلاف اسلام کے، کہ یہ سراسر عمل ہے، اور ہر موڑ پر چوکیدارِ شریعت ہدایت دہندہ اور رہنما ہے، اور ہر عمل پر قدغن ہے، اور اس پر داروغۂ قانونِ شریعت پاسبانی کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں جذبات کی رو صرف زبان پر نہیں ہوتی، بلکہ عملی صورت کی

Marfat.com

طرف رخ کیے ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب عمل کی صورت میں ہو جاتا ہے اور وارفتگی کم ہو جاتی ہے اور سر مستی کو سر نکالنے کا موقع میسر نہیں آتا، جسے لوگ محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر قرآن حکیم صفات وذات کے جلوں سے پر ہے، احکام و قوانین سے لبریز ہے، سیاست و تمدن سے بھر پور ہے۔ اس پر یہ حکم کہ اسے ہر نماز میں دُہرایا جاوے، اور بندۂ خدا اپنی پیاس محبت اس کے پڑھنے سے پنج وقتہ بجھاتا رہتا ہے، تو اس صورت میں نغمے اور گیت کا مقام اسلام میں کیسے بلند ہو سکتا ہے؟

تاہم جب کسی سالک یا عارف کی طبیعت محبت الٰہیہ میں مدھم ہوئی تو اہل دل نے اس کا علاج اسی گیت اور بول (سخن) سے کیا، جسے عام طور پر قوالی کہا کرتے ہیں۔ اور یہ علاج حقیقتاً بڑا موثر ہے۔ سوتی طبیعت جاگ اٹھتی ہے۔ گیا زمانہ حال میں واپس آجاتا ہے اور یکدم کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

سات چیت کا واقعہ ہے؟ میں اپنی طویل علالت کی وجہ سے نڈھال تھا اور طبیعت مردہ ہو چکی تھی، مذہبی احساسات مدھم ہو گئے تھے، تصور پاک کے نقوش دھندلے ہو رہے تھے کہ اس دن اخویم مولانا فخر الدینؒ کے عرس کی تقریب تھی۔ حسب معمول آٹھ بجے کے قریب باہر آیا تو دو نعت خوان آگئے، اور کہا کہ کچھ سنائیں؟ چونکہ میں نے فطرتاً طبع سرد پائی ہے، بے دلی سے کہا، کچھ کہہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک نعت پڑھنی شروع کی۔ خدا معلوم رات کے تھکے ماندے تھے یا طبیعت ہی مدھم تھی۔ کچھ مجھ پر اثر نہ ہوا۔ بلکہ کہہ بھی دیا۔ اتنے میں دو قوال خوشاب کے بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ کہنے لگے، کچھ کہیں۔ میں نے کہا کہ میرا مشرب توحیدی ہے۔ اگر کچھ توحید پر بول سکتے ہیں تو پڑھیے۔ کیا کہوں! اس وقت ان کی طبیعت بھرپور تھی۔ انہوں نے قوالی کے طور پر ایک فارسی غزل پورے ذوق اور شوق سے ادا کی اور ایک ایک شعر اور بعض وقت ایک ایک مصرعہ کو کئی بار دہرایا۔ سبحان اللہ! ہر بار ایک نیا لطف آیا، اور ہر بار ایک نیا حظ اٹھایا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ خود جناب عز اسمہ تشریف فرما ہیں، اور عیاناً سامنے آرہے ہیں۔ ان کے جلوہ ہائے جہاں تاب دنیا پر چمک رہے ہیں، اور ہر چیز سے وہ

Marfat.com

نمودار ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد دوسری غزل کی فرمائش کی گئی، کہ کچھ اور سنائیے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اردو غزل پڑھنی شروع کی۔ غرض جوں جوں وہ پڑھتے تھے، اور جس طرح سے وہ دہراتے تھے، طبیعت ایک اور انداز میں چلی جارہی ہوتی تھی، اور یہی وہ نقشہ میرے سامنے جم گیا جس کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا۔

خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

چنانچہ آج دو ماہ ہو گئے، وہ کیفیت اکثر اوقات مجھ پر وارد ہوتی ہے، اور بعض اشعار تو کسی وقت بھی دل سے نہیں اترتے، اور جب زبان پر آتے ہیں تو ایک کیفیت وارد ہو جاتی ہے۔ ایک شعر تو مجھے کھا گیا۔

تصور میں کسی کے کھو گیا ہوں
کوئی قلب و نظر پہ چھا گیا ہے

ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے ؎

تو میرا راز ہے میں راز تیرا
نگاہوں سے کوئی سمجھا گیا ہے

اور کہتے ہیں ؎

جو تو ہوتا ہے میں ہوتا نہیں ہوں
یہی دیوانے کو غم کھا گیا ہے

تصوف اسلام کے تمام سلاسل میں نغمہ کو وہی مقام حاصل ہے، جو فطرتِ اسلام کے اندر ہے۔ یعنے بہت اہمیت نہیں دی گئی۔ ہاں چشتیہ بہشتیہ اپنے ذوق توحید ذاتی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، بلکہ اب نغمہ و سرود انہوں نے لازم کر رکھا ہے۔ کیونکہ دوسرے سلاسل خصوصاً نقشبندیہ مجددیہ میں تو بنائے طریقت صرف اتباع سنت پر رکھی گئی ہے، اور ہر فعل و حرکت کو اور ہر عمل کو سنت کے ترازو اور سانچے میں

Marfat.com

ڈھالنے کی کوشش رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے سالک صفات میں مشغول رہتا ہے، اور صفات کی رات دن پاسداری کرتا ہے۔ گویہ صفات ذات کے حصول کے لیے اور اس کی رضا کے لیے ہوتے ہیں، لیکن آئینہ کی صورت کجا اور خود صورت کجا۔

صورت ذات میں جو محو ہوتے ہیں، وہ صفات کی طرف گو توجہ نہیں کرتے، لیکن صفات ذات کے جلووں سے خود بخود اندر بیٹھ جاتی ہیں، اور اپنا اپنا مقام حاصل کرتی جاتی ہیں۔

قلندریہ صفات سے لاپرواہ ہو کر ذات پر اس قدر وارفتہ ہو جاتے ہیں کہ عین ذات کا پرتو ہو جاتے ہیں اور شریعت سے نکل کر تکوین میں چلے جاتے ہیں۔ تبھی تو یہ فقرہ ان پر عام و خاص چسپاں کرتے ہیں۔ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ یہ سخن کسی دوسرے کے لیے موزوں خیال نہیں کیا جاتا۔ کیا وہ کم ہیں؟ نہیں۔ بلکہ ان سے بڑھ کر۔ کیونکہ وہ ذات و صفات کے یکساں حاشیہ بردار ہیں۔ لیکن ان کو یہ بات میسر نہیں کہ اس درجہ پر تیقن ہو کہ نیست کو ہست کر دیں۔ یہ لوگ نیست سے ہست کرنے کی قوت اپنی ذات سے نہیں پاتے، بلکہ اس ذات وحدہ لاشریک کے ذاتی انعکاس سے حاصل کرتے ہیں۔

خود سوچیے، قلندریہ گو سراپا انعکاس ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے حیات انسانی کو وہ فائدہ نہیں پہنچا جو سالکینِ راہِ ہدایت سے خلق اللہ کو پہنچا کہ کروڑوں انسان ان کی بدولت کامل انسان ہو کر خلق اللہ کی رہبری کا باعث ہوئے جن سے معاشرہ میں صالحیت پیدا ہوتی رہتی ہے اور عملِ اصلاح جاری رہتا ہے۔ قلندریہ صرف نشان الہٰیہ ہوتے ہیں، کن فیکون کے تماشے دکھانے والے۔ ایک طرف زبان ہلی دوسری طرف موجود.........ذاتِ اقدس کے نشانات ہوتے ہیں اور بس۔

قرآن حکیم کے بارے میں یہ ارشاد، مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَيْسَ مِنَّا، جو قرآن کو گن گنا کر نہیں پڑھتا وہ ہم سے نہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ فطرتی گانے کا رخ اسلام نے کس طرف موڑ دیا اور وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ

Marfat.com

اُلغاوٗنَ ہ۔ جب قرآن حکیم کا فیصلہ ہے اور اَلَمۡ تَرَ اَنَّھُمۡ فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّھِیۡمُوۡنَ ہر صحرا میں بھٹکتے پھرتے ان کو دیکھا جاتا ہے، تو شعریت کی اور بھی قیمت گر گئی۔ صرف قرآن حکیم کی تلاوت کے بارے ہی رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا فرمادیا گیا۔ پھر جب ایک مؤمن جس کے اندر جذبۂ ایمانی ہوتا ہے، وہ اُسے پڑھ کر خود ہی تسکینِ خاطر پیدا نہیں کرتا بلکہ کئی خوابیدہ خاطر اور پریشان دلوں کو تسکین پیدا کر دیتا ہے۔

ہاں یہ الگ بات ہے، کہ جذبۂ ایمانی ہی کم ہو اور توحیدِ الٰہی کا جذبہ ماند پڑ گیا ہو، تو ایسی صورت میں جذبۂ محبت کو بڑھانے اور پیدا کرنے کے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے، کہ اپنی زبان کے اشعار توحیدیہ جو کسی کامل توحیدیہ کے سوز کا ثمرہ ہو پڑھے جائیں اور ان کی لے میں توحیدی جذبہ اٹھے اور بڑھے۔

بعض وقت جذبۂ توحید تو ہوتا ہے، اور بلند تر ہوتا ہے، لیکن صاحبِ جذبہ اس سوز و گداز کی وجہ سے زیادہ اشتیاق، زیادہ سوز چاہتا ہے، تو لازمی ہے کہ ایسے وقت کے لیے سماع و سرود اختیار کرے تاکہ شوق و محبت ابھرے اور متاعِ دل کو جلا کر خاکستر کر دے۔ کیونکہ محبت بھرا دل یہی چاہتا ہے کہ متاع دل جل اٹھے، اور دنیا و مافیہا کو جلا کر خاکستر کر دے۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے کہ افلاطون و جالینوسِ ما

لیکن یہ ضرورت کی چیز ہے کہ جب بھوک لگے، کھایا جاوے۔ ہر وقت کھانے والا پیٹ کی بیماری سے مرتا ہے۔ ایسے ہی سماع اپنے آپ پر لازم کرنے والا سالک جب ہمیشہ اپنے لیے سماع لازم کر لیتا ہے، تو فائدہ کی بجائے بہت بڑا نقصان اٹھاتا ہے اور یہ ذات حق اور قدس کاملہ کا حجاب ہو جاتا ہے۔ یعنی اسی لذت سماع میں گرفتار ہو کر مطلوب سے غافل ہو جاتا ہے۔ آپ قوالوں کو نہیں دیکھتے، کہ توحیدی نغمے گاگا

Marfat.com

کر سراسر حجاب میں آجاتے ہیں اور شرائع تک سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں، اور شکل و صورت میں گر جاتے ہیں، اور بھونڈی سی شکل پیدا کر کے صرف قوال کہلاتے ہیں، اور کوئی دینی جذبہ ان کے اندر نہیں رہتا۔ ہوتا ہے، تو پیٹ، اور پیٹ۔ ایسے گانے بجانے سے کیا فائدہ؟

اس لیے گاہے گاہے ضرورت پر کچھ سننا تو مفید اور بہت مفید ہے، جیسے طبائع ہوں۔ لیکن مستقل سننا سراسر خرابی اور بربادیٔ دین و دنیا ہے۔ پرانے بزرگ ایسے ہی تھے۔ جب وقت اور کوئی حال آجاتا تھا، تو سنا کرتے تھے۔ لیکن حال کے بغیر ایک حرف بھی سننا پسند نہ تھا۔ غرض حال کے بغیر سننا سنانا مفید نہیں۔

واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک پر صابریوں نے فیصلہ کیا کہ ہم صابری الگ مجلس سماع قائم کریں گے۔ یہ بات حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے گوش گذار ہوئی۔ آپ اس وقت سر خیلِ سلسلہ تھے۔ آپ نے فیصلہ کیا، مجلس سماع ایک ہی کافی ہے۔ چنانچہ آپؒ مجلس سماع میں شریک نہ ہوئے۔

صابری مجلس شروع ہوئی۔ قوال بھی ہندوستانی اور پنجابی، بڑے نامی تھے، اور حسب دستور توحیدی گیت گا رہے تھے۔ قوالی بھی زور پر تھی۔ لیکن کسی ایک کو بھی وجد و جذب نہ ہوا، اور مجلس میں رنگ وحدت کے نشے نہ آئے۔ جب وقت بہت گزر گیا اور ہاؤ ہو سے مجلس خالی رہی اور کامل بے ذوقی پیدا ہو گئی، تو دیوان صاحب، حضرت مہارویؒ کی خدمت میں آئے اور مجلس شریف میں حاضر ہونے کی استدعا کی۔ آپ نے فرمایا، مجلس ہو رہی ہے، میری کیا ضرورت؟ عرض کیا گیا، مجلس تو ہو رہی ہے لیکن مجلس کے اندر روح پیدا نہیں ہوئی، اور نہ ہی وحدت کا رنگ سامنے آیا ہے۔ حضور تشریف لے گئے۔ ایک طرف قدم مبارک مجلس شریف میں رکھا، دوسری طرف تمام مجلس پر جذب و وجد طاری ہو گیا؟ اور آسمان تک چیخیں نکلنی شروع ہو گئیں۔

Marfat.com

کیوں؟ صرف اس لیے کہ صاحبِ حال تشریف لائے، جن کی آنکھیں مخمورِ محبت تھیں، اور جن کا دلِ پاک عرش معلیٰ بنا ہوا تھا، اور جن پر خدائی جلوے مینہ کی طرح برس رہے تھے۔

غرض یا تو خود سالک صاحب حال ہو، تو سنے۔ یا کسی صاحب حال کی صدارت میں کچھ سنے۔ آج قوالیوں کی کیا کمی ہے۔ مناسب یا غیر مناسب موقع پر ہو رہی ہیں۔ لیکن خالی۔ جذب و وجد تو کیا ہلکی سی جنبشِ قلب بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کیا کہوں۔ اب تو تصوف پر بھی علمی رنگ آگیا ہے، اور علمی تصوف ہو گیا ہے۔ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، کیا علمی تصوف ہی نہیں۔ بھلا اس سے حال کیسے پیدا ہو؟ حسن جوانی کے نشہ سے بھر پور آنکھ ہی کسی کو سر مست کر سکتی ہے۔ کاروباری آنکھیں کیسے کسی کو مچل دیں۔ وہ خود جیسے روکھے سوکھے ہیں، ویسے ہی ان کی آنکھیں بھی روکھی پھیکی۔ حسرت و حرماں کا لطف ان میں کہاں۔ علم بے شک جاننا ہے۔ اور علم ہے۔ لیکن یہ پہچاننا نہیں۔ جاننا کچھ اور ہے۔ پہچاننے والا جاننا ضرور ہے، لیکن جاننے والا پہچان نہیں سکتا۔ اس لیے علم کا جاننا جب علم تک ہی محدود ہو اور معرفت کی طرف قدم نہ اٹھے تو یہی علم حجابِ معرفت ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا العلم الحجاب الاکبر...... مدرسوں اور خانقاہوں میں یہی فرق ہے، کہ مدرسہ جاننے تک علم کو محدود کر دیتا ہے، اور معرفت اس سے نکل کر شناخت تک بلند ہوتی ہے۔ مثلاً لندن کو ہم جانتے ہیں، لیکن پہچانتے نہیں۔ جاننے کا ذوق الگ اور پہچاننے کا ذوق اور لطف الگ۔ کیونکہ شناخت مشاہدہ کے سوا نہیں اور علم کے لیے شناخت ضروری نہیں۔

اہل مدرسہ اور اہل خانقاہ کا یہی تفاوت ہے، کہ پہلے خدائی علم تک اپنی زندگیاں خرچ کر رہے ہیں۔ اور دوسرے، علم سے بڑھ کر خود ذات اقدس کے جمال و جلال کے متمنی ہو رہے ہیں، اور اس خیال میں محود غرق ہیں۔

Marfat.com

ایسی صورت میں اہل مدرسہ پر سماع کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ دید کے کرشمے سے ہی پتہ نہیں رکھتے۔ بخلاف اہل حال کے، کہ وہ ہر آن چشم شہود سے متاثر ہو رہے ہوتے ہیں۔ اور اس کے دیدار کی طلب میں جانسوز آہوں سے بھرپور ہوتے ہیں، اور دلی پیاس کے بجھانے کے لیے غزلوں سے آگ بجھاتے ہیں، کون کہتا ہے کہ پہلے فریق کے لیے سماع حرام نہیں اور کسے جرأت، کہ دوسرے گروہ کے لیے کوئی حرام کہے۔ بلکہ اُن کی روحانی غذا ہے، جس سے سرمست ہو کر وہ دریائے وحدت میں ڈوب جاتے ہیں۔ حضرت قطب الاقطاب دہلویؒ کے ذوق سماع سے کون واقف نہیں۔ مرتے تھے، جیتے تھے، اور ہر زماں از غیب جانِ دیگر است کا کامل نمونہ ہو کر واصل بحق ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اب قارئین کرام کی خدمت میں وہ تین غزلیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ گن گنا کر خود پڑھیے، یا کسی قوال کی زبان سے سنئے۔ پھر دیکھئے کہ تصور پاک کتنا نکھر کر واضح اور روشن نظر آتا ہے۔ اللہ اکبر!

# غزل ۱

بہر آئینہ روشن جمال یار می بینم
بہر ذرّہ نمودارے ازاں دلدار می بینم
رموز نکتۂ دانش ز ہر لوحے ہمی خوانم
جمال معنی پائیش بہر رخسار می بینم
نہ پنداری کہ بے مرغ ست ایں باغِ وجودِ من
ہزاراں طائرِ قدسی بہر گلزار می بینم

Marfat.com

زشاہاں ملکِ وحدت رلبہ ملکِ خویش منصور اند
برائے جلوۂ ایشاں بہر سو دار می بینم
رموز ھُوَ مَعَکُمۡ را بر ذاتے ہمی خوانم
ہمہ اسرارِ ربانی ازاں اظہار می بینم
بچشم احمد بنگر کمالِ حسن معنی را
کہ من ایں صورت و معنی بچشم یار می بینم

# غزل ۲

میرے ظرف کے مطابق ذرا بجلیاں گرانا
مجھے تاب ہو جہاں تک اتنا نقاب اٹھانا
تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تیرے عشق نے بنایا میری زندگی فسانہ
مجھے اس کا غم نہیں ہے کہ بدل گیا زمانہ
میری زندگی تمہی ہو، کہیں تم بدل نہ جانا
تو جلا سکے جلا دے، تجھے انتظار کیا ہے
تیرے پاس بجلیاں ہیں، میرے پاس آشیانہ
تیری یاد ہی میں گزرے میری زیست کا زمانہ
یہ نہ ہو تو تنگ تر ہے یہ جہاں کا کارخانہ
تیری اک نگاہ کے صدقے، میری ساری زندگانی
تو اگر قبول کر لے یہ ہے تیری مہربانی

Marfat.com

# غزل ۳

کوئی پردے کو یوں سرکا گیا ہے
کہ خود کو دیکھنے خود آگیا ہے
تصور میں کسی کے کھو گیا ہوں
کوئی قلب و نظر پر چھا گیا ہے
نگاہوں سے کوئی اُترا ہے دل میں
تڑپ کر خود مجھے تڑپا گیا ہے
تو میرا راز ہے، میں راز تیرا
نگاہوں سے کوئی سمجھا گیا ہے
یہ میرا مجھ میں تو کچھ بھی نہیں ہے
وہی خود ہے خودی کو پا گیا ہے
یہ پردہ خوب ہے پردے اُٹھا کر
میری صورت میں کوئی آگیا ہے
وہ ہوتے ہیں تو میں ہوتا نہیں ہوں
یہی دیوانے کو غم کھا گیا ہے

(جولائی ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

# ایک دُعا

## "اے اللہ مجھے مسلمان بنا"!

رات کو اُٹھا۔ بیماری کی وجہ سے تیمّم کیا، نماز بیٹھے گذارنے لگا۔ جوں جوں میں قرآن پاک اور تسبیحات کو پڑھتا جاتا تھا، اس کے معانی میرے اندر آتے جاتے تھے۔ لیکن میں دیکھتا رہا کہ جو کچھ زبان پر ہے وہ دل میں نہیں۔ بار بار میں توجہ کرتا تھا کہ میرے دل کے اندر یہ حقائق بیٹھیں اور دل تصدیق ہی نہ کرے، بلکہ دل کے جذبات ہی منہ سے ادا ہوں۔ لیکن تمام نماز گذار دی، یہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ اور جب میں سلام پر آیا اور نماز سے نکلا تو میرے منہ سے یہ الفاظ بار بار نکلے کہ "اے اللہ مجھے مسلمان بنا!" میں نے کئی بار غور کیا تو اپنے تمام نقائص اور کمزوریوں کو اسی وجہ سے پایا کہ میں حقیقتاً مسلمان نہیں۔ میں مسلمان ہوتا تو مجھ میں کیا کمی تھی۔ نہ رزق کی پریشانی تھی، نہ تکلیف سے خوف تھا۔ نہ میرے دشمن کچھ بگاڑ سکتے تھے، نہ میرے دوست کچھ بنا سکتے تھے، جن، پری اور بھوت کا خوف نہ ہوتا، کارسازی کے فکر اور دھندوں سے پاک ہوتا، علاج کو لا علاجی سمجھتا اور لا علاجی کو عین علاج خیال کرتا۔ کیونکہ جو کچھ زمین و آسمان کے اندر ہو رہا ہے، وہ کون کر رہا ہے؟ میں کر رہا ہوں یا تم؟ کرتے ہو

Marfat.com

میں کرتا ہوں۔ تو ایک گھنٹہ کرتے ہیں دو گھنٹہ کرتے ہیں یا ایک دن کرتے ہیں۔ متواتر سال اور قرنوں گذر گئے، یہ سب کیسے ہو رہا ہے اور کس موزونیت سے وقت پر گذران ہو رہی ہے۔!

پھر میں نے سوچا۔ دن میں، میں سب کچھ ہوں، پیر ہوں، مولوی ہوں، حاکم ہوں، زمیندار ہوں، رئیس ہوں اور سب کچھ ہوں، لیکن رات کے اندھیرے میں جب میں سونے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں اور دُنیا مجھ سے الگ ہو جاتی ہے، خادم چلے جاتے ہیں، رشتے الگ ہو جاتے ہیں تو اس وقت میں کیا ہوتا ہوں؟ صرف ایک عاجز، ایک ناتواں۔ میں کا پتہ تک نہیں۔ غرور، تکبر، ہستی و پندار غائب ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جب میں اٹھتا ہوں، نیم خوابی میں دیکھتا ہوں کہ میری حقیقت ایک ہوا کے جھونکے سے بڑھ کر نہیں، بلکہ میں کچھ بھی نہیں۔ ایک احساس ہے اور بس، کہ ہوں!

تمام سامان، تمام خیالات و جذبات غرض کچھ بھی ایک حقیر ہستی کے سوا مجھے نظر نہیں آتا۔ میں سمجھ گیا کہ میں یہی کچھ ہوں کہ سانس آئے یا نہ آئے۔

اس وقت میری توجہ پھر پلٹ گئی، کہ میرا سہارا صرف ان الفاظ کے سوا کچھ بھی نہیں کہ میں بار بار کہوں "لا الٰہ الا اللہ، لا الٰہ الا اللہ"۔ لیکن جب پھر بار بار دوہراتا ہوں تو پھر میرے سامنے وہی حقیقت آجاتی ہے کہ تیرے اندر تو حقیقتِ خدا کچھ نہیں، تیرا دل تو اس حقیقت سے خالی ہے، اور تو کیوں بار بار کلمہ دوہرا رہا ہے؟ تو بے اختیار منہ سے نکلتا ہے، کہ الٰہ العالمین! مجھے مسلمان بنا! مسلمان بنا! کاش مسلمان ہو جاتا تو میرا بیڑا، اِس اُس جہان میں پار ہو جاتا، اور میں تمام تکالیف دنیاوی اور اُخروی سے نجات پا جاتا۔ اقبالؒ کا یہ شعر ؎

اگر گویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

کی حقیقت کو ہمیشہ بیان کرتا رہا اور لوگوں کے سامنے دوہراتا رہا، لیکن اصل حقیقت اس وقت کھلی جب یہ دیکھا کہ اس کے پڑھنے کی مشکلات بھی بہت ہیں۔ لیکن

مشکلات ایک نفی سے جب دور ہو جاتی ہیں، تو پھر انسان جہنم سے نکل کر خود بہشت بریں میں چلا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ کی زندگی پاتا ہے۔ آخر میں میری دعا ہے کہ اے اللہ مجھے اور میری قوم کو مسلمان بنا!

جوانوں سے پوچھو! اسلام کیا ہے؟ وہ ڈاڑھی مونچھیں کٹوانا، عیش و عشرت کے سامانوں سے کھیلنا، ناول پڑھنا، بے حیاؤں کے ناچ دیکھنا دکھانا اسلام بتلائیں گے۔ اور بوڑھوں سے پوچھو گے تو زر کمانا، دھوکا دینا، لالچ کرنا اور ہر حیلے کو استعمال کرنا، جس سے ان کی بات بنے اور پیسہ کمایا جائے۔ اس پر بس نہیں۔ قائدین ملت، اپنی سٹیجوں پر قوم کو للکارتے ہیں کہ وہ سب کچھ اختیار کرو جو یورپ کی اقوام نے اختیار کر رکھا ہے اور جیسے مذہب ان کی زبان پر ہے، ایسے ہی مذہب کی تسلیم زبان پر ہونی چاہیے۔ زبان تو اسلام کے نام سے تر ہو اور اندر وہ تمام کچھ سکیڑ لیا جاوے جو سراسر مخالفِ اسلام ہے، اور جو اسلام کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔

سنا ہے کہ اسلام کے نام پر ''ثقافت اسلامی'' ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، جو ایک طرف تو ثقافت کے لیے اولیائے کرام کے حالات چھاپتا ہے اور دوسری طرف نوجوان عورتوں کے گلے سے راگ کی دھنیں سنتا ہے، اور خاص و عام کو دعوت دی جاتی ہیں کہ یہ گانا ہمارے فنون لطیفہ کا ایک جزو ہے۔ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اب ان کو اسلام پر فخر ہے، اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر۔ پوچھو تو کلمہ شریف کو دہرانا بھی ان کے لیے فعلِ عبث اور جہالت۔ یہ کبھی کسی نے نہیں سوچا کہ ہر لفظ کی ایک حقیقت جامعہ ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسے الفاظ جو ایک قوم کے بنانے اور اس کو بلند کرنے کے لیے اصطلاحاً گھڑے گئے ہوں مثلاً یہود، ہندو، عیسائی، مسلمان۔ یہ ایسے الفاظ ہیں کہ انکے اندر تخم کی طرح تمام خدو خال بھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور ایک ایک نقطہ و نشان صرف نام لینے سے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً سنی، حنفی، وہابی، شیعہ۔ ایسے ہی اقوام

Marfat.com

کے نام سے ان کی خوبو ان الفاظ کے اندر چمکتی ہوتی ہے۔ مثلاً ٹوانہ، راجپوت۔ اگر ایک راجپوت دلیر نہیں، تو وہ راجپوت نہیں۔ ایسے ہی اگر مسلمان کے اندر وہ تمام خوبیاں جو اسلام نے پیدا فرمائی ہیں، آ نہیں گئیں، اور وہ تمام کمزوریاں جو انسانی ہستی سے اسلام نے دور فرمائی ہیں، دور نہیں ہوئیں تو مسلمانی نہیں، اور مسلمان کہلانا اس کا حق نہیں۔ اس لیے ہمارا تمام نقطہ نگاہ اس پر ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور اسلام کا ایک ایک نشان اپنے دل میں بٹھالیں۔ ؎

زبان سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبالؒ نے کیا خوب کہا! مسلمانی کی حقیقت پیش کر دی، کہ اگر ہیبتِ حق دل پر طاری نہیں تو پھر لا الٰہ پڑھنے کا کیا فائدہ؟

ہیبتِ حق ہی ایک مسلمان کو مسلمان بناتی ہے، برے کاموں سے خلاصی بخشتی ہے اور نیک کاموں پر راغب کرتی ہے۔

خود عزاسمہ فرماتے ہیں۔ اے ایماندارو! میری عظمت و جبروت کے مطابق مجھ سے ڈرو۔

ایک مسلمان جہاں اس ذات حقہ سے محبت وانس رکھتا ہے، وہاں اس ذات سے محبت سے بڑھ کر خوف بھی رکھتا ہے۔ بلھے شاہؒ کہتے ہیں ؎

کی بھروسہ اِس آشنائی دا
ڈر لگدا اے بے پروائی دا

عام مسلمان سے بڑھ کر اس کے ولی اس سے خوف کھاتے ہیں۔ اور پھر ولیوں سے بڑھ کر اس کے رسول اس کی ذات اقدس اور اس کی بے نیاز ذات سے ڈر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ان سے باتیں کرتا ہے، محبت کرتا ہے، انس کرتا ہے لیکن بعض اوقات ایسے الفاظ بھی فرماجاتا ہے جن سے دل تھرا جاتا ہے، آسمان و زمین پھٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کی رحمت ہر صورت غالب رہتی ہے۔ تبھی تو ہم زندہ پھرتے ہیں اور اسی وجہ سے بے تکی

Marfat.com

باتیں کرتے ہیں اور افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں، ورنہ ایک گھڑی بھی ہماری زندگی محال ہو جائے۔ ذرا انجلیوں کی کڑک دیکھو، کیا یاد ہوتا ہے؟ کیسے پکارتے ہوتے ہیں؟ اور کیسا خوف دل پر طاری ہوتا ہے؟ کہ اعضا سن ہو جاتے ہیں اور دل دھڑک رہے ہوتے ہیں۔

بڑے سے بڑا دہریہ بے دین بھی اس حال میں اپنا آپ چھوڑ جاتا ہے اور رب رب پکارنے لگتا ہے۔ ورنہ ایک ایسی حیرت میں ہوتا ہے کہ دم گھٹتا ہوا اسے دکھائی دیتا ہے اور مرنا سامنے آجاتا ہے۔

بہر صورت ہیبت حق جب تک دل پر طاری نہ ہو، مسلمانی نہیں ہوتی، کچھ اور حالت ہوتی ہے۔ منافق کہیں یا غافل یا جاہل۔ لیکن غور و فکر کیا جاوے تو ایک ہزار چھوڑ ایک سو مسلمان بھی ایسا ملتا ہے، جس پر ہیبت کا اثر کامل نہ سہی ہلکا سا ہی ہو اور ہیبت کے اثر کا ظہور کچھ اس کے دل و جان پر بھی ہو؟

ہر انسان کا چہرہ خصوصاً آنکھیں بتلاتی ہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ خصوصاً ہیبت کے اثرات تو کسی صورت پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن جسے دیکھو، بے حیا آنکھیں، گستاخانہ مجرے کر رہی ہوتی ہیں۔ اور نیاز و شکستگی کا نام تک نہ ہوگا۔ بلکہ ہر دیکھنے والے کو بھی اپنی نگاہِ مستانہ و عیاشانہ سے گستاخ بے حیا کرتی چلی جاتی ہیں۔

مسلمان کو مسلمان بننے کے لیے پہلے اپنا حیائے انسانی چاہیے۔ اس کے بعد حیائے ربی۔ اگر یہ حیا مکمل ہو جائے تو مسلمانی مکمل۔ حدیث پاک میں آتا ہے اَلْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیمَان (حیا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے)

لیکن مسلمان سے یہ دولت چھن چکی ہے، اور بے حیا قوموں کی طرح یہ بھی بے حیا ہو رہا ہے، اور حرکاتِ اخلاق سوز کی وجہ سے بدنام ہو رہا ہے۔ جسے یہ فطرت انسانی اور مقصد حیات خیال کیے ہوئے ہے۔

حضرت غوث الاعظم جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جہاں اسباب غفلت اپنے خطبات میں گنتے ہیں، وہاں فرماتے ہیں، یاد رکھ، کہیں تیری نماز، تیرا ذکر ہی خدا سے

Marfat.com

غفلت کا باعث نہ بن جائے۔

دیکھئے کتنی بلند بات فرمائی۔ عوام نماز کو یاد حق خیال کرتے ہیں۔ خواہ، وہ نماز میں کسی شکارِ دنیا میں ہی کیوں نہ پھرتے ہوں۔

لیکن حقیقت شناس جانتے ہیں، کہ ایک وقت نماز ہی ایک حجاب بن جاتی ہے، اور نماز کی صورت میں ایک نمازی ملکوں کی سیر کر رہا ہوتا ہے، اور سودے خرید رہا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اس کی نشاندہی فرمائی۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ

ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنی نماز سے غافل ہوتے ہیں۔

نماز تو وہی ہے۔ جس کا نقطۂ نگاہ براہ راست اس درگاہ اقدس پر سر نیاز جھکا رہا ہو، جس سے دنیا پیدا ہوئی اور جو ہماری ہدایتِ ظاہری و باطنی کا سبب ہے ۔

میری آس امید دی دنیا اندر تیری یاد دا دیوا بلدا رہے

اے محبوباندیا محبوبا ایہہ سارا ای چانن تیرا اے

ہر نماز میں شیطانِ رجیم سے اس لیے پناہ مانگنے کا حکم ہے، کہ کہیں یہ دشمنِ انسان نماز میں ہی کہیں اور جگہ ہمیں نہ لے جائے، اور بارگاہ ربوبیت سے غافل نہ کر دے۔ لیکن اس مکار کے پھندوں سے بڑھ کر اپنے نفس امارہ کی فطرت ہی ایسی ہے، کہ ہر وقت آوارگی پر تلا ہوا ہے، اور نقطہ توحید پر قائم نہیں رہتا۔ اور نہ پلید ہمیں رہنے دیتا ہے۔

اس لیے ہر آن ہر گھڑی دل پر دھیان رکھنا چاہیے کہ یہ کہاں جا رہا ہے اور کس کی طرف جا رہا ہے۔ ایک منٹ کی غفلت بھی ہو گی تو یہ سرکش کہیں کا کہیں جا نکلے گا، اور جاتے جاتے ایسی لات مارے گا کہ ہمارا کیا کرایا سب برباد کر دے گا، اور ہم جیسے تھے ویسے ہی رہ جائیں گے۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اعضا شکستہ اور چور ہو جائیں گے۔ اور کوئی سہارا نہ پائیں گے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

Marfat.com

# ضرورت تحریر

یہ بات جو لکھی گئی ہے۔ یہ تو اپنے دل کی بات تھی اور اپنا روگ تھا، اور اپنے روگ کا علاج کرنا تھا۔ اور وہ تھی دعا اور صرف دعا۔ لیکن یہ روگ صرف میرا نہ تھا، تمام قوم کا ایک ہی روگ اور ایک ہی مرض تھا۔ اور مسلمان اس مرض، پندار مسلمانی میں بتلا ہے۔ عوام تو عوام رہے، خواص، دینداار، عالم، متقی، پرہیز گار اور صوفی تمام اس مرض میں گرفتار ہیں۔ خصوصاً جن لوگوں پر کشتی اسلام کا سہارا ہے، میرے خیال میں وہ بھی اس مرض، پندارِ مسلمانی میں بتلا ہیں۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ میں اپنے دینی بھائیوں اور اپنی برادری کے نوجوانوں کو اس نامراد مرض کا نشان دے دوں۔ کیونکہ یہی مرض ہمیں کھائے جارہا ہے، جس کی وجہ سے ہماری دینی فلاح نہیں، بلکہ دنیاوی ترقی بھی رکی ہوئی ہے۔

عام مسلمانوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دین آخرت کے لیے ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ایک مدت سے یہ بات آگئی ہے، کہ دین صرف قالبِ دنیا ہے، جس میں دنیا کو ڈھال کر ایک خوبصورت دنیا بنانا ہے۔ جیسے مٹی کو قالب میں ڈال کر ایک اینٹ بنائی جاتی ہے، پھر اس اینٹ کو پختہ کیا جاتا ہے، اور پختہ ہونے کے بعد دیوار کی چنائی کی جاتی ہے اور دیواریں بنا کر اس پر چھت ڈالی جاتی ہے، اور چھت کے بعد فرش فروش لگا کر اس میں ہم آرام حاصل کرتے ہیں۔

غرضیکہ اینٹ کا قالب جتنا صاف اور ستھرا ہو گا اتنی عمارت خوبصورت ہو گی۔ ورنہ مٹی کے ڈھیر سے بھی عمارت بنائی جاسکتی ہے۔ البتہ یہی صورت دین کی ہے۔ یہ دنیا کا قالب ہے۔ جب دنیا کے تمام امور اس میں ڈھل کر نکلتے ہیں، تو انسانی تعمیر کا نقشہ تیار ہونے لگتا ہے، اور جب تمام امورِ دنیا اس کے اندر رہ کر ایک معاشرہ قائم کرتے ہیں اور معاشرہ کے بعد ایک قومیت تیار ہوتی ہے تو انسانیت کی دائمی زندگی کا محل تیار ہو جاتا ہے، جس میں انسانیت دائمی زندگی کے لطف اٹھاتی ہے۔

Marfat.com

آخرت بھی اسی دائمی زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس کے اندر کوئی غم اور کوئی پریشانی نہ ہوگی۔

بہر صورت میرا یہ کہنا ہے، کہ میرے نزدیک ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دعا نہیں کہ "الٰہ العالمین! مجھے مسلمان بنا"، کیونکہ اس میں تمام وہ باتیں آجاتی ہیں جن کو ہم شب و روز اللہ میاں سے طلب کرتے ہیں اور ایک ایک کے لیے پریشان ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا (یہی) مطلب ہے، کیونکہ صراط مستقیم زندگی کے ہر حصہ میں مطلوب ہے۔ چلنے پھرنے تک محدود نہیں۔ بلکہ معنوی لحاظ سے ہر اس امر پر حاوی ہے جو بھی ہم کرنا چاہتے ہیں۔ شادی ہو، بیاہ ہو، تجارت ہو، صنعت و حرفت ہو، غرض کوئی بھی کاروباری سلسلہ ہو۔ اس میں آجاتا ہے، اور ہر طرح کے لین دین اس میں شامل ہیں، اور ہر خیال جو کسی انسان کو پریشان کرتا ہے، وہ اس میں آجاتا ہے۔

غرض مسلمان بننا، تمام مصائب اور افکار سے خلاصی پانا اور بے غم زندگی بسر کرنا ہے۔ پھر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

اللہ بس، باقی ہوس

(جولائی ۱۹۶۴)

# حقیقت ایمان

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ

برادرم حضرت صوفی محمد رمضان صاحب ا؎ سے وعدہ تھا کہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے عرس شریف کی حاضری پر آپ کے پاس گوجرانوالہ پہنچوں گا۔ لیکن گرمی کی شدت کی وجہ سے جب عرس شریف سے فارغ ہو کر لاہور آیا تو طبیعت نڈھال ہو گئی۔ دوسرے، وقت کم تھا اس لیے وعدہ خلافی کی توجیہہ کی تلاش میں تھا کہ اچانک میرے سامنے یہ آیۃ مبارکہ آگئی۔

اِنِّی تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّی وَرَبِّکُمْ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ

اٰخِذٌ بِنَا صِیَتِھَا اِنَّ رَبِّی عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

میں اپنے اور تمہارے رب پر کامل بھروسہ رکھتا ہوں۔ ہر چلنے والے کا وہی راہبر ہے یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔

خط کے عنوان پر یہ آیۃ لکھی اور معذرت کا بہانہ مل گیا۔

لیکن اس کے بعد جب خیال نے دوبارہ نظر دوڑائی تو ایک اور حقیقت سامنے آگئی۔ کہاں وہ وعدہ خلافی کی آڑ، اور کہاں یہ حقائق۔ سبحان اللہ، قرآن حکیم

Marfat.com

بھی کیا لازوال دولت مسلمانوں کو دی گئی۔ ہدایت کا کامل سرچشمہ ہے۔ جس طرح دیکھو، سراسر نور و ہدایت ہے۔ جہاں تمام قرآن حکیم ایک ہے، وہاں ہر سورہ کی ایک ایک آیۃ مبارکہ کو الگ دیکھو تو ہر آیت اپنے اندر مکمل ہے۔ ایک طرف تو وہ سورہ اور قرآنِ حکیم کا ایک جزو ہے اور دوسری طرف کامل و اکمل، اپنی کامل ہدایت کا سامان لیے نظر آتی ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام کو جب اپنی قوم عاد نے نرغے میں لے لیا تو آپ کو اپنی حقیقتِ ایمانی واشگاف الفاظ میں پیش کرنی پڑی۔ یہی حق ہوتا ہے کہ جب کسی پر نازک سے نازک گھڑی بھی حق کے اظہار کے لیے آجائے تو وہ خوف سے بالا ہو کر اپنی آوازِ حق بلند کرتا ہے، اور ساری دنیا پر اپنی حقانیت روز روشن کی طرح عیاں کر دیتا ہے۔ یہ آیۂ مبارکہ اپنے وقت کا بہترین نمونۂ حق ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام کی ایمانی حقیقت کو اپنی صحیح شکل و صورت کے ساتھ قرآن حکیم کے الفاظ میں بیان فرمادیا، تاکہ ہر ایمان والے کو اس واضح مثال سے تقویتِ ایمانی نصیب ہو۔

مطالب واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاق و سباق پر غور کیا جائے اور وہ منظر سامنے لایا جائے کہ ایک نبی سے اس کی قوم کیسے بوچھاڑ کر رہی ہے۔

قَالُوْ ایاھُوْدُ ما جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ ہ

قوم نے کہا: ہود! تو ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لایا اور تیرے کہنے سے تو ہم کبھی اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے اور ہم کبھی بھی تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرَاکَ بَعْضُ اٰلِھَتِنَا بِسُوْءٍ قَالَ اِنِّیْ اُشْھِدُ اللّٰہَ وَاشْھَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ہ

ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کی تم پر مار پڑ گئی ہے (تو جواباً حضرت ہود نے کہا) میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ

رہو کہ جن کو تم خدا کے سوا، خدااور معبود بناتے ہو میں بالکل ان

سے بری اور بیزار ہوں۔

دیکھیے۔ اِلَّا اعْتَرَاکَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْءٍ، کا کیا خوب جواب دیا۔ بجائے اس کے کہ بوکھلاتے، ایک حقیقت مندانہ جواب دیا...... میں بیزار ہوں تمہارے معبودوں سے۔ پھر ساتھ ہی اور فرمایا:۔

فَکِیْدُوْنِی جَمِیْعاً ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنَ۔ یعنی تم تمام میرے خلاف چالیں چلو۔ پھر مہلت بھی نہ دو۔ اللہ کی شان! اگر کچھ خوف ہوتا تو ایسے الفاظ ایک اکیلے ہو کر کیسے پوری قوم کے سامنے کہتے؟ یہ نبوت ہی کی شان ہے۔

غور فرمایئے: فَکِیْدُوْنِی کا ایک جملہ ہے۔ اس کی تاکید پھر جَمِیْعًا سے کرتے ہیں۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنَ کہہ کر اپنے کامل یقین کا ڈنکہ بجادیا۔

ازاں بعد اپنے یقین کامل اور ایمان کامل کو بایں الفاظ ظاہر فرمایا:۔

اِنِّی تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ رَبِّی وَرَبِّکُمْ

میں تو تمہارے اور اپنے پروردگار پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں۔

رَبِّی کے ساتھ وَرَبِّکُمْ ملانے سے کیا خوب ان کی بحث کو خارج از عقل قرار دیا۔ دوسرے بند میں فرمایا۔ مَامِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَا صِیَتِهَا۔ کوئی جانور بھی نہیں جس کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ یعنی جیسے چاہیں چلائے۔ جدھر کسی کو پھیرے، پھرے۔ تم کو شرک کی طرف پھیر دیا اور مجھے توحید عنایت فرمادی۔ پھر تیسرے بند میں یہ فرمایا اِنَّ رَبِّی عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ٥ میرا پروردگار تو سیدھے راستے پر ہے۔

یعنی تین یقین محکم میرے ایمان کامل میں ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ۔

۲۔ خیر و شر کا مالک اللہ تعالیٰ ہے

Marfat.com

۳۔ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کر رہا ہے اور وہ تمام درست ہے۔

ظاہراً تو یہ کہا کہ خدا تعالیٰ پر مجھے بھروسہ ہے اور وہی میرا رہبرِ حقیقی ہے۔ اور وہ عین روشِ اعتدال پر ہے۔ یعنی کائنات کی چلن صحیح اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔

خود سوچیے، جس کا یہ ایمان ہو اسے کوئی پریشانی آتی ہے اور وہ کسی دوسرے کا سہارا چاہتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ تمام افعالِ الٰہی کو حق جانتا ہے۔ دکھ سکھ کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ہدایت کی تبلیغ میں خواہ کتنا ہی کوئی ستائے وہ اپنے قبلۂ مقصود یعنی حکم الٰہی سے سرتابی نہیں کرتا اور کسی خوف سے متاثر ہو کر کام چھوڑ نہیں بیٹھتا۔ چنانچہ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ

اگر تم اللہ سے پھرے رہو تو رہو۔ میں نے تو وہ سب کچھ تمہیں پہنچا دیا، جس کے لیے بھیجا گیا تھا۔ (ہاں یاد رکھو) اگر اب تم نے اسے نہ مانا تو میرا اللہ تمہارے سوا ایک اور قوم کو تمہاری جگہ لا کھڑا کرے گا۔ لیکن تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔

یعنے اس کا بگاڑ کیا بلکہ اس قوم کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے جو تمہاری جگہ لائی جائے گی۔

جب کوئی اللہ کا بندہ تبلیغی کام کو کماحقہٗ ادا کر بیٹھتا ہے اور قوم نہیں مانتی اور اس کی سرکشی میں پہلے سے بھی زیادہ ابال آجاتا ہے، تو پھر غیرتِ الٰہی جوش کھاتی ہے، قوم پر ہلاکت ڈال دی جاتی ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد عاد کو تباہ کر دیا گیا اور اس پر ہمیشہ کے لیے پھٹکار برسا دی گئی۔

بہر صورت حقیقی ایمان کے تین جزو دکھائے گئے۔ اللہ پر بھروسۂ کامل۔ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى پر ایمان اور یہ خیر و شر، سراسر حکمت الٰہیہ

Marfat.com

(ہے) پر ایمان ہوتا ہے۔ یہ "ایمان کامل" بہت کم کسی کو عملاً نصیب ہوتا ہے۔ الفاظاً یا بطورِ عقیدہ تسلیم کرنا تو آسان ہے لیکن وقت آنے پر جب امتحان سامنے آجائے تو اس پر قائم رہنا حقیقی ایمان کا ثبوت ہے۔

قدرت خدا! ہر نبی کے مقابلہ پر قوم ہوگئی اور ہر نبی امتحان گاہ میں لایا گیا لیکن باوجودیکہ ایک طرف ایک ذات ہے اور دوسری طرف ساری قوم۔ پھر پرانے زمانے میں تو قوم ایک کامل قوت ہوتی تھی۔ اور خود ہی ریاست ہوتی تھی۔ جو چاہتی کرتی تھی اور کوئی دوسرا پوچھنے والا نہ ہوتا تھا۔

مگر اللہ کے نبی ہر امتحان میں ڈٹ کر مقابل ہوگئے اور کبھی عجز ظاہر نہ کیا۔ اپنی دعوت کو برابر دہراتے رہے۔ آخر وہ لوگ جو مخالفت پر کمر بستہ رہے وہ سرکشی پر اترے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلاکت ڈالی، کبھی آندھی آئی، کبھی اولے برسے، غرضیکہ آسمانی قہر کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

آج جب سراسر امن ہے اور تبلیغ میں کوئی رکاوٹ نہیں، کوئی جدال نہیں اگر اللہ تعالیٰ کے بعض بندے انبیاء کے نقشِ قدم پر چل نکلیں تو کیا تعجب ہوگا کہ کوئی مسلمان جو خود مسلمان ہے، مسلمان نہ بنے گا؟ ایک کیا، دنیا بنے گی۔ لیکن دعوت کے اس طریقے پر اترنا بڑا مشکل ہے۔ خصوصاً موجودہ وقت میں جب تک دعوت میں دنیاوی طرز اختیار نہ کی جائے، دعوت میں کوئی شامل نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ داعی کے اندر یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ وہ اولاً دنیا میں سرخرو ہونا چاہتا ہے اور ثانیاً عاقبت کی کامیابی کا طالب ہوتا ہے۔ بخلاف انبیاء اور ان کے نائبین کے، جو اول درجہ آخرت کو دیتے ہیں اور ثانی درجہ دنیا کو دیتے ہیں۔

جہاں تک دیکھا گیا، یہی حال عام و خواص کا ہے اور ماشاء اللہ! میں خود اسی ورطہ میں پھنسا ہوا ہوں، ایسی دینداری پسند ہے جس کے اندر دنیا کی چمک موجود ہو اور جس کا لباس دنیاوی ہو۔ پھر کہتا ہوں۔ بیشک ایسے ہو لیکن اصل روح دین ہو اور کام دنیا کا ہو، نہ کہ جسم دین ہو اور روح دنیا کی ہو۔

Marfat.com

اب ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالیے۔ یہی آیت جو ایمان کے بنیادی امور کو پیش کرتی ہے، ایک بدکار اپنی بدکاری کی آڑ لیتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے، وہ اسی پاک پروردگار کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ سراسر روشِ پاک پر ہے۔ جو کچھ شر و فساد دنیا میں قائم ہے اور ہو رہا ہے، یہ سب اس کے حکم سے ہے۔ ہم کیا کریں، جب وہ خود ایسا کرنے والا ہے۔ نعوذباللہ۔ کہاں ایک نبی کا کہنا کہ تم جو چاہو سو کرو میں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ وہی مجھے اس راستۂ ہدایت پر لانے والا ہے۔ جس پر مجھے کامل یقین ہے، اور پاک روش پر ہے۔ تم میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ مجھے اس پر ہر طرح کا بھروسہ ہے کیونکہ جو کرتا ہے صحیح اور درست کرتا ہے۔ آج ہر مطلب پرست ایسی صاف آیات کو بھی توڑ موڑ کرنے سے نہیں کتراتا۔ کیونکہ خوفِ الٰہی دل میں نہیں۔ خوف کیسے ہو؟ جب خوف والے کا یقین اندر سے کھوکھلا ہو۔ پرانی رسوم کی طرح یہ ایک رسمی توحید ہمارے ہاں پیدا ہو گئی ہے اور ہم اس رسمی توحید پر قائم ہو چکے ہیں گویا اس سے آگے کوئی درجہ توحید میں نہیں۔ توحید تو یہ ہے کہ سب کچھ لٹ جائے لیکن ایماندار کو پریشانی نہ ہو۔ اگر فطرتاً آبھی جائے تو جب اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کا خیال ہے کہ اس حقیقی کارساز کا کوئی کام بھی غیر حکمت نہیں تو فوراً پریشانی رفع ہو جائے۔ لیکن اب ایک پیسے کا زیاں برداشت نہیں خواہ تمام متاعِ دین لٹ جائے۔

دنیاوی ساز و سامان دنیاوی ادب و احترام ہر طرح کے ہر صاحبِ منصب کے لیے بجالانے فرض خیال کیے جاتے ہیں۔ حتےٰ کہ کھانے پینے کے طریقے دنیاوی آداب والوں کے سکھائے جاتے ہیں اور معاشرت کے تمام طریقے صرف دکھائے نہیں جاتے بلکہ ایک مدت تک عمل کروا کر امتحان لیا جاتا ہے تاکہ موجودہ روش پر کوئی نکتہ چین نہ ہو لیکن ادب نہیں تو اللہ کریم کا، اس کے انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کے آداب نہیں۔ ہر روش کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ مگر عبادت جو آدابِ الٰہی میں سے ایک بڑا ادب ہے، اس کی ضرورت بہت کم محسوس کی جاتی ہے۔ علماو صلحاء سلف رحمہم اللہ تعالیٰ اسی پر جان دیتے گزر گئے۔ اب ان کے خلفا، فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ کے

مطابق عبادت الی اللہ ہونے کو اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں اور عبادت بالا نہماک کو پاگل پن خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ نبیوں، اولیاؤں اور عالموں کو ہر وقت یہ خیال تھا۔ اب یاد خدا میں بیٹھنے والوں پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں۔ حالانکہ موجودہ وقت میں تو کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا۔ تمام اہلِ خلوت کے سلسلے ختم ہو رہے ہیں اور سلسلہ خانقاہیت چھوڑ کر مدرسوں کے انتظام میں مصروف ہیں۔ اس لیے نہیں کہ الٰہی خدمت ہو، بلکہ اس لیے کہ مدرسہ جاری رہے اور کسی کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔ اور قرآن حکیم سے وہی کام لیا جاتا ہے جو کسی دنیادار نے لیا ہے۔ یعنی آڑ بنانا۔

اللہ تعالیٰ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی طفیل قرآن حکیم پر عمل کرنے اور انبیاء کے طریقے اور روشِ صادقہ پر چلنے کی توفیق عنایت کرے۔ (آمین)

## حواشی

ل صوفی محمد رمضان صاحبؒ حضرت اعلیٰ میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ملنے والے اور محکمہ ڈاک میں انسپکٹر تھے۔ پنشن کے کچھ دیر بعد ایسے بیمار ہو گئے کہ صرف کھڑے ہو سکتے تھے یا لیٹے رہتے تھے۔ اس بیماری کی حالت میں وہ مسجد میں نماز باجماعت پڑھتے رہے اور بازار میں چلتے ہوئے بارہا ٹھوکریں کھائیں، جس سے سخت چوٹیں آئیں۔ آخر چلنا پھرنا بند ہو گیا اور گھر میں بیٹھ گئے۔ لیکن نماز، نوافل اور ذکر و فکر میں ہر وقت منہمک رہتے تھے۔ چہرہ نہایت متیمّن تھا۔ میرے ساتھ انہیں قلبی محبت تھی۔ میں سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتا اور شرف و نیاز حاصل کرتا۔ پرانے بزرگوں کی طرح تھے۔ توکل علی اللہ اور تسلیم و رضا کا نمونہ تھے۔ ان کے چہرے سے ایمان و حیاء ٹپکتی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون

(اگست ۱۹۶۴)

Marfat.com

# اعلائے کلمۃ الحق

۸ مئی کو جب نماز مغرب کی تکبیر مکبرؔ نے کہی اور اللہ اکبر، اللہ اکبر کہنے کے بعد جب لَا اَلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا تو میں نے دیکھا کہ تمام کثرت کے سر کٹ گئے اور توحید کا سر اتنا بلند ہوا کہ تمام کائنات کو گھیر گیا اور ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

کی حقیقت سامنے آگئی۔ اللہ اکبر!

کثرت کے ہر فرد کا مقصود اپنی خواہش ہے اور یہ خواہش دوسری خواہش کے مقابل جنگ میں مصروف۔ ایسی صورت میں ہر فرد کا معبود الگ کھڑا نظر آتا ہے۔ اسی تعبیر کو قرآن حکیم نے بدیں الفاظ ادا فرمایا اَفَرَأیتَ مَن اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ (کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہش کو خدا بنا رکھا ہے۔)

ایسی صورت میں انسانیت اپنی تذلیل پر تلی کھڑی ہے لیکن جب وحدت اپنا سر بلند کرتی ہے تو تمام کثرتیں گم ہو کر ایک وحدت میں سما جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور وحدتِ انسانیہ بلند ترین مقام پر جا پہنچتی ہے۔

اس وقت تمام معبودانِ باطل گم ہو جاتے ہیں اور معبود؛ مقصود ہو کر سامنے

Marfat.com

آجاتا ہے اور بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔ لَا مَقْصُودَ اِلَّا اللّٰہُ، کیونکہ معبود ماننے سے کام نہیں چلتا، جب تک معبود کو ہی مقصود خیال نہ کیا جاوے۔اور لَا مَقْصُودَ اِلَّا اللّٰہُ پر ذہن و قلب نہ آجائے تو پھر ہر کثرت ایک ہی مقصود اور مطلوب پر دوڑتی ہے اور کثرت وحدت میں تبدیل ہو کر اختلاف و انتشار کو مٹادیتی ہے اور ہر فرد کی سمت ایک ہو جاتی ہے جس پر وہ دوڑ رہا ہے اور ٹکر کا خدشہ نکل جاتا ہے۔ غرض کثرت یک جان ہو جاتی ہے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو نجات کا واحد راستہ ہے اور آرام واطمینان زندگی کا سہارا ہے اس کے بغیر تشتت و افتراق اور پریشانی و تردد ہے جو انسانیت اور معاشرۂ ایمانی کی موت ہے۔

یہ وحدت جب پیدا ہو جائے تو کثرت کثرت نہیں رہتی بلکہ وحدت ہو جاتی ہے اور ذہن و قلب لَا مَوْجُودَ اِلَّا اللّٰہ پر اتر آتا ہے۔ایک مسلمان کے لئے کلمے کے تین درجے ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| پہلا درجہ | لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ | لا مَعْبُودَ اِلاَّ اللّٰہ |
| دوسرا درجہ | لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ | لَا مَقْصُودَ اِلَّا اللّٰہ |
| تیسرا درجہ | لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ | لَا مَوْجُودَ اِلَّا اللّٰہُ |

اول پر عام کا ایمان ہے، دوسرے پر متوسلین چلتے ہیں اور تیسرے پر عارفین کی حقیقت کھلتی ہے۔ بہر صورت الفاظ ایک ہیں۔ تعبیرات اپنے حال کے مطابق سامنے آتی جاتی ہیں اور ہر تعبیر اپنے حال کے مطابق ہے۔ لیکن آج ابتدائی درجہ (لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَعْبُودَ اِلَّا اللّٰہ) پر بھی کوئی نہیں۔

ہر ایمان کو اگر ٹٹولا جائے تو باعتبار کم و کیف الگ ہو گا اور وحدت نوعی یا جنسی کا پتہ تک نہیں لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اعمال میں اختلاف و انتشار ہے۔ تمام اذہان ایک دوسرے کے مقابلے پر نظر آتے ہیں۔ پہلے مذاہب، پھر ہر مذہب کے اندر فرقے ہیں۔ لیکن اب تو ہر ایک فرقہ بھی شخصیت میں تقسیم ہے اور بڑے چھوٹے کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ عالم و جاہل یکساں اور نیک و بد ایک ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ یہ کلمہ الحق دیکھنے میں چھوٹا، پڑھنے میں آسان لیکن حقیقت میں تمام کائنات اور خصوصاً انسانیت کی فلاح کی جڑ اور معاشرۂ انسانی کی روح ہے۔

یہ افراد ہی کو جمع نہیں کرتا بلکہ افراد سے لے کر اقوام و ملل کو ایک وحدت میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ جغرافیائی حدود سے باہر، لسانی قیود سے پاک، رنگ و نسل سے بلند۔ یہ وہی جس کے لئے خدائے قیوم نے اپنی بے مثل اور بے مثال کتاب میں فرمایا ہے۔

مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِي اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔

(پاک کلمہ کی مثال پاک درخت کی مثال ہے۔ جس کی جڑ ثابت اور قائم اور شاخیں آسمان تک پہنچ گئی ہوں اور اللہ کے حکم سے ہر وقت تازہ بتازہ پھل دیتا ہو۔)

غور کیا جاوے تو اس کلمہ کی حقیقت اس سے بھی بلند ہے اور معاشرۂ انسانی کو ہر وقت اپنی ایمانی حرارت سے تازہ رکھنے کا موجب یہی ہے، اور ہر اتحاد انسانی کا واحد فطرتی رشتہ ہے۔ ہر وقت اور ہر حال اس کی برکات ظاہریہ و باطنیہ سے اخوتِ ایمانی معاشرہ میں بھرپور نظر آتی ہے۔ بشرطیکہ اس کو اپنا ایمان خیال کیا جاوے ورنہ صرف زبانی پڑھنے سے کیا فائدہ؟

بر زبان تسبیح، در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح، کے دارد اثر

غرض ایمان کی جان یہ کلمہ ہونا چاہیے۔ جیسے جان سے تمام اعصاب میں حرکت ہوتی ہے اور جس طرح جان چاہتی ہے، ویسے ہی حرکات ہوتے ہیں۔ اسی طرح معاشرۂ انسانی کی جان اسی کلمہ سے ہو اور اس جان کے مطابق حرکات و اعمال ظہور پذیر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی عمل بے راہ اور بے جان نہ ہو گا۔

زبان سے پڑھنے کے ساتھ دل بھی تصدیق کرے پھر تصدیق قلبی کے ساتھ اعمال کی جان اور اعمال کا محرک بھی یہ کلمہ ہو تو کلمہ حق ہے۔ ورنہ صرف کلمہ ہی کلمہ ہے۔ لیکن اس کلمہ کا بھی کیا کہنا۔ یہ بھی ایک درخت ہے، ایک سلسلہ ایقان ہے اور ایک عمل ہے جس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ لیکن حقیقت پانے والے اسی اشارہ میں سب کچھ پالیں گے اور دیکھ لیں گے۔ ان کو نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے اور نہ سننے سنانے کی۔!

(جولائی ۱۹۶۵)

Marfat.com

# سستا سودا

جے سر دتیاں ۔ راقب ملے اوہ پیارا
بڑا سستا سودا خریدار نوں ہے

## محبت اور قربانی

محبت قربانی مانگتی ہے۔ محبت کی فطرت میں قربانی رکھی ہے۔ جب کسی کے ساتھ آنکھ لڑتی ہے تو پہلی ہی نظر میں تن من وار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بہترین چیز جو محب کی نظر میں ہوتی ہے وہ پیش کش کر کے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے، تاکہ محبوب کی التفات ہو، اور اسے محبت کی نگاہ سے دیکھا جاوے۔

ہر محبت اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔ خصوصاً شاعرانہ زبان کا تو پہلا سبق ہی یہ ہے کہ اظہار محبت کے انوکھے اظہار بھڑکائے جاویں تاکہ معشوق کا دل متاثر ہو۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں

کر قتل تو جانی عاشق دا تیرے قدماں اُتے ساہ نکلے
ایسی پھیر چھری توں حلق اُتے ناں سی نکلے تے ناں آہ نکلے

دیکھئے، قتل کے طریقہ کو بھی ایک عاشقانہ ادا مطلوب ہے۔ نہ "سی" نکلے نہ

Marfat.com

آہ نکلے۔ یعنے خاموشی سے مرا قتل ہو جاوے۔ مجھے میری آواز نہ آئے۔ ؎

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کس مزے سے قتل کے بعد بول رہا ہے۔ ہائے اس زور پشیماں کا پشیماں ہونا۔ مقتول اور پھر بولنا۔ ایک مجذوب لیٹے ہوئے تھے۔ خادم نے کہا، آپ جاگتے ہیں؟ جواب دیا، سوتا ہوں۔ کیا خوب! جواب بھی دے رہے ہیں اور سوتے بھی ہیں۔

جب ہم پشاور تھے، تو نواب دِیرِ کی بابت یہی سنا تھا کہ جب ان کو نوکر جگانا چاہتے تھے، تو بار بار یہی کہتے نواب صاحب جاگتے ہیں۔ لیکن نواب صاحب کا جواب ہوتا تھا، میں سوتا ہوں۔ یہاں بھی یہی حال ہے قتل بھی ہو گئے اور بول بھی رہے ہیں ؎

وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب اُلٹا

دیکھئے عاشق اپنی ذبح پر معشوق کو ثواب کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

؎ بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

نیم ذبح کے پھڑکنے کو کیسے پسندیدہ الفاظ میں رقص کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا موت نہیں بلکہ ایک خوشی کا میلہ ہے۔

مقصد یہ ہے کہ محبت سب سے زیادہ قربانیٔ ذات کی عاشق ہے۔ اور اسی وجہ سے عشاق اپنی قربانی کے لئے ہر وقت، ہر حال تیار رہتے ہیں۔ لیکن یہ جذباتِ محبت کا اظہار ہے۔ اور عملی طور پر اس جذبہ پر پورا اترنا کسی منصور کا کام ہے۔ ہر کہ و مہ یہاں تک نہیں پہنچتے، محبت کے راستے میں ہی گم ہو جاتے ہیں اور محبت ختم ہو جاتی ہے۔ ابتدائی جوشِ محبت جسے کچے اُبال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یہ ہر محبت والے کے اندر آتا ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے، اور محبت پختہ ہوتی ہے، یا کمزور، اُبال کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ محبت کی پختگی میں بھی اُبال نہیں رہتا، اور ہیجان محبت کم ہو جاتا ہے۔ اور راستہ کے تکالیف یا تو محبت کو کم کر دیتے ہیں یا پختہ کر کے ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ آخر میں جا کر کوئی سسی پنوں بنتا ہے، اور کوئی ہیر رانجھا کہلاتا ہے، اور کوئی سوہنی بن کر کچے گھڑے کو

Marfat.com

دیکھتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگاتی ہے۔ ورنہ عام حوصلے ہار جاتے ہیں۔

یہ سستا سودا نہیں بلکہ بہت مہنگا سودا ہے۔ لیکن ابلتے دل کے لئے بے شک آسان ہے۔ ورنہ ناکامِ محبت بیشک زندگی سے موت کو ترجیح دیتا ہے اور موت کی آغوش کو جنت خیال کرتا ہے۔

انیس مرحوم جو ایک مدت سے وادئ محبت میں تلاش یار کے لئے آوارہ گردی کر رہے تھے، لگتا ہے کہ وہ آخر محبت کی بھینٹ میں مہنگے سودے کو سستا سودا کی صورت میں لے کر واصل بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مرحوم جوان تھے۔ کلاس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد حاجی مختار احمد صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے کہ اتنے میں محبت الٰہی کی پیاس پیدا ہوئی۔ وہیں سردارپور میں میرے ایک عزیز عبدالقادر بھی مویشی ہسپتال میں رہا کرتے تھے۔ وہ بھی زیادہ خلوت پسند تھے۔ دونوں کی رفاقت ہو گئی، اور تلاش مرشد میں چل دئے۔ کئی بزرگ اور صالح ہستیوں کے پاس گئے لیکن طبیعت کسی جگہ نہ بیٹھی۔ آخر کھوڑہ ضلع جہلم میں ایک حاجی صاحب سرحدی (جو کئی سالوں سے وہاں مقیم اور صاحب ارشاد ہیں) کے پاس گئے تو طبیعت کو سکون آیا۔ حاجی صاحب نے حسبِ دستورِ طریقت تعلیم و تربیت شروع کی۔ رفتہ رفتہ دونوں سالک دنیا سے بیزار ہوتے گئے ......... اور خلوت پسندی پر اُتر آئے۔

گذشتہ سال وہ میرے پاس آئے۔ کہا، کھوڑہ میں کوئی مکان دلا دیجئے کیونکہ گرمی ہے اور میں روزے رکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ رہائش کا بندوبست ہو گیا۔ اور وہ مردِ مجاہد وہاں چلا گیا۔

اگست میں میں خود بھی چند دن گزارنے کے لئے جب گیا۔ تو وہ دن کو روزہ رکھتے تھے اور رات عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اور شکل و صورت ایک غریب کمزور کی سی ہو گئی تھی۔

میں نے سنا ہے کہ میر صاحب نے ان کو شادی کا بھی مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی ان کو یہی مشورہ دیا لیکن وہ اپنی لے میں ہی رہے۔ بعد میں طبیعت اور تیز ہو

Marfat.com

گئی اور آوار گی اختیار کر گئی۔ اور بعض وقت جنون کے درجہ پر ہو جاتی۔ اور بے اختیار ہو جاتے تھے۔ اور وہ مشاغل طریقت سے دست بردار ہو گئے۔ حاجی صاحب جب کبھی ان کے علاج پر توجہ دیتے تھے، تو انہیں کہتے تھے کہ مجھے کچھ بھی نہیں۔ اب میرا کیا علاج کرتے ہیں۔ ایک بار اسی غرض کے لئے لاہور بھی گئے۔ لیکن کسی وقت اتنے صحیح ہو جاتے تھے کہ کسی کو کوئی شبہ اُن کی بیماری کا نہ رہتا تھا۔ لیکن اچانک پھر اسی حال پر ہو کر قابو سے باہر ہو جاتے۔ اور ساتھ ہی کہتے کہ مجھے کوئی مرض نہیں، میں تو صرف حق کا طالب ہوں۔ جب وہ مل جائے گا تو میرے تمام ہوش ٹھیک ہو جاویں گے۔

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر حاضر ہوئے۔ ایک طرف کچھ دیر باپ بیٹا بیٹھے رہے۔ لیکن انیس بر بر قبر پر ٹکٹکی باندھے ہوئے قبر مبارک کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک ہی چھلانگ سے روضہ شریف کے اندر جا بیٹھا۔ حاجی صاحب حیران اور دیکھنے والے بھی حیران۔ بڑی منت سماجت سے باہر نکال لائے اور خیر پائی۔ غرضیکہ مزاج میں وحشت آگئی۔ گاہ گاہ بوتلیں توڑنے میں بھی لطف اٹھاتے۔ اور پھر کئی دن نہایت آرام وسکون سے دکان پر کام کرتے۔

واقعہ کے دن بار بار کہتے رہے کہ آج مکان کو ضرور خالی کرنا اور کسی مکان میں جانا ہے۔ اور مکان واقعی تبدیل بھی کرنا تھا۔

## خاموش بے صبری

کسی صاحب مقصد کو جب اپنے کام اور مقصد میں مایوسی ہو جاتی ہے تو لازما بے صبری آجاتی ہے۔ مرحوم انیس صاحب بہت سے وجوہ سے مایوس ہو گئے۔ بے صبری کی انتہا نہ رہی۔

## ا۔ احتیاط

اس راہ سلوک میں تو احتیاط بڑی لازمی ہے کہ سالک کو کسی صورت مایوسی نہ ہو۔ بلکہ امید اور کنارہ نظر آتا جائے یا بامید قرب چلتا جائے اور بڑھتا جائے۔

لیکن موجودہ وقت رہبرانِ ہدایت لوگوں کی بے توجہی سے اس مشکل راہ کو

Marfat.com

نہایت آسان دکھاتے ہیں اور سالکین راہِ تصوف و فقر کے ذہن میں بٹھایا جاتا ہے، کہ جلد ہی مقصد حاصل ہو جائے گا۔ بخلاف قرون اولیٰ کے کہ وہ سالک کو وصل و مشاہدہ کا نام تک پیش نہ کرتے تھے بلکہ رضائے مولیٰ کا تصور اور مقصد پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں یہ عام طور پر معمولی مقصد خیال کیا جاتا ہے اور سالک کو بلند مینار مشاہدہ اور وصل اپنا مقصد قرار دینے کی تحریر پیش کی جاتی ہے۔

۲۔ اعتدال

مجاہدہ و ریاضت میں اعتدال قائم رکھا جاتا ہے۔ اور عام سالکین کے لئے مجاہدے تجویز نہیں کئے جاتے۔ مستعد اور باہمت سالکین خود بخود مجاہدہ کی طرف ڈھلکتے جاتے ہیں۔ لیکن موجودہ وقت میں سرپٹ گھوڑے کی طرح سالک کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن ؎

اسپ تازی رود دو تگ بہ شتاب

کے مطابق آخر تک سدھار جاتا ہے۔ متقدمین کا معمول تھا کہ "اشتر آہستہ می رود شب و روز" کے مطابق وہ اپنے معمولات سے تھکتے نہ تھے۔ عجلت پسندی بھی پہلے نہ تھی۔ بلکہ زندگی بھر چلنے کو مقصد کا انجام خیال کرتے تھے۔ وصال الی المطلوب ہو یا نہ، راہ عشق میں طلب مقصود تھی۔

۳۔ ربط مرشد

پہلے زمانے میں ربط مرشد قائم رکھنا سالک کا اولین سبق ہوتا تھا۔ کچھ حاصل ہو یا نہ ہو لیکن مرشد کا رابطہ ایسے مضبوط ہوتا تھا کہ عمر بھر نبھاؤ کرنا سالک کے مقصد حیات میں ہوتا تھا۔

۴۔ علمی تربیت

مجاہدہ کے ساتھ تعلیم تصوف و فقر ساتھ ساتھ ہوتی تھی، جس سے عقائدِ سالک صحیح رہتے تھے اور سالک کسی وہمی غلطی میں مبتلا نہ ہوتا تھا۔ ایک پیر کی صحبت کی

Marfat.com

تربیت اور پھر دوسری علمی تربیت دونوں مل کر سالک کو بے راہ نہ ہونے دیتی تھیں۔

## ۵۔ صحت مزاج کا خیال

کہ سالک کسی وہمی بیماری میں مبتلا نہ ہو جائے۔ مثلاً دیوانگی، جنوں وغیرہ۔ کیونکہ اکثر مجاہدہ، بھوک، خلوت سے یہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً امراض دماغی۔ کیونکہ چلتے پھرتے جب سالک رک جاتا ہے اور ہر وقت خلوت میں بیٹھا ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے، تو قوت ہاضمہ میں لابدی فتور آجاتا ہے۔ خصوصاً جب ترک طعام اور ترک منام (نیند) ہو، تو لامحالہ قبض ہو جاتا ہے، اور تبخیر معدی شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے دماغ متاثر ہونے لگتا ہے۔

## ۶۔ سننا سنانا

سننے سنانے سے بھی طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ بہت سننے سنانے سے تو دل مر جاتا ہے۔ لیکن جب دل تنگ ہو جائے تو تیسرے چوتھے دن کچھ اشعارِ محبت سن لئے جائیں تو تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ویسے بعض وقت عام گفتگو کرنے کرانے سے جسم ہلکا ہو جاتا ہے۔

## ۷۔ گناہ

چھوٹے موٹے گناہ جسے لغزش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہ بعض وقت ندامت لاتے ہیں اور طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور سالک پہلے سے زیادہ مجاہدہ و ریاضت کے لئے اپنے آپ کو باہمت پاتا ہے، اور استغفار ظاہری و باطنی پر توجہ مصروف ہو جاتی ہے تو فضل ربی کا پہلے سے زیادہ امیدوار ہو جاتا ہے۔

## نوجوان انیس کا انجام

ہمارے نوجوان انیس کی یہ تمام دمسازیاں اٹھتی گئیں۔ پیرو مرشد سے رابطہ کم ہو گیا۔ ساتھی اور رفیق منزل الگ ہو گیا۔ کیونکہ یہ پہاڑ پر چلے گئے اور اس کا تبادلہ ہو گیا۔ جہاں تک مطالعہ کا تعلق تھا وہ بھی صفر کے برابر۔ صرف ذکر کچھ تھا۔ نہ دینی کتب

Marfat.com

دیکھنے کا شوق نہ، اخبار بینی کا ذوق۔ کتب تصوف کا مطالعہ اور اشعار فراقیہ ایسے وقت سالک کے لئے تسلی بخش ہوتے ہیں، جب کہ بندہ انتہائی خلوت میں ہو۔ لیکن یہاں وہ بھی صفر کے برابر تھے۔

## ایک اہم بات

طریقت کی بنیاد ذکر و فکر پر ہے۔ پہلے سالک کو ذکر بتلایا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں ذکر ترقی کرتا ہے اور قلب کو گرماتا جاتا ہے، تو ذکر سے اسم، مسمی کی صفات میں تبدیل ہو کر قلب کو آفتاب بنا دیتا ہے، اور صفات، مسمی کے ساتھ قلب کے اندر پھیلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تمام مسمات کے تمام صفات کے انعکاس باطن سالک پر وارد ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اور سالک کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ سالوں کا راستہ دنوں، دنوں کا راستہ منٹوں میں طے ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور رفتار میں کئی گنا تیزی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ سالک کی استعداد بلند ہو۔ اور رفتار اور قوۃ قلبی وسیع تر ہو۔ اور اگر طبیعت یا قلب کو اسم کے صفات میں تبدیل کرنے کی قوۃ نہ رکھتا ہو، تو سالک اپنے ذکر سے بھی گرنا شروع ہو جاتا ہے، اور ذکر کی لذت سے محروم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جیسے پہلے تھا ویسے ہی رہ جاتا ہے۔

جن لوگوں کو سلوک میں چلنے کا موقعہ ملا ہے، وہ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن عام سمجھانے کے لئے ایک ظاہری مثال پیش کرتا ہوں۔

بولنے والے یا گانے والے جب ریڈیو سٹیشن پر گاتے ہیں تو آواز ریڈیو سٹیشن کے والوؤں پر جا کر لہروں میں بند ہو جاتی ہے بلکہ اس کو والوؤں سے گرمی پہنچتی ہے۔ پھر گرمی پہنچنے پر آواز لہروں میں منتقل ہو کر نشر ہونے کے لئے دھائی راڈ (ستون) میں داخل ہو کر نشر کے لئے اٹھتی ہے۔ اگر والوؤں میں طاقت کم ہو تو وہ آواز لہروں میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور نہ نشر ہو سکتی ہے!

بعینہ یہی حال قلب کا ہے۔ ذکر جب تک صفاتِ اسم کو قلب میں تبدیل نہ کرے کام، نہیں بنتا۔ اور وہ اسم، اسم ہی رہتا ہے، مسمّٰی نہیں بنتا۔ ضرورت تو ہے مسمّٰی

کے آثار صفات وانوار و نشانات پیدا کرتے تا کہ سالک ان اوصاف سے بہرہ ور ہو سکے، اور اس رنگ سے متاثر ہو۔

عام مجازین اپنے متوسلین کو ابتدائی طور پر جب ذکر میں لاتے ہیں، خود بھی بڑے گرم ہوتے ہیں اور سالک کو بھی بڑا گرم کرتے ہیں، اور ساتھ ہی منزل مقصود کو بڑا قریب دکھانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ سالک اپنی ہمت پوری صرف کرے لیکن جب وقت ذکر سے فکر میں تبدیل ہونے کا آتا ہے تو نہ اپنے پلے کچھ ہوتا ہے نہ سالک کے لئے کچھ پیش کر سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک بد ذوق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سالک اپنے ذکر اذکار کو ایک خواب وخیال تصور کرنے لگتا ہے۔

صاحب ولایت

بخلاف صاحب ولایت کے کہ اس کی ابتدا خواہ پہلے ہی سست ہو اور عام منسلکین پر توجہ خواہ کتنی ہی کم ہو اور ذکر داذکار سالکین پر توجہ بھی کم ہو۔ لیکن جو سالک ایک بار چل نکلے گا اور ذکر سے جذبہ بڑھا لے گا، تو پھر اس کی لے کبھی بھی ٹوٹنے میں نہیں آئے گی، اور اپنی وسعتِ قلب کے متعلق صفات ذات سے انوار حاصل کر لے گا۔

کامل بزرگ

اکثر کامل ولی اللہ کو دیکھا کہ عام طور پر اپنے متوسلین کی طرف ابتدا توجہ کم ہوتی ہے، اور ذکر کی طرف بھی توجہ کم دلاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی صاحب استعداد ذکر و فکر میں آجاتا ہے تو پھر اس کی منزل کبھی ختم نہیں ہوتی، اور ہر آن تازہ دم نظر آتا ہے اور ہر آن اس کی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ موت آجاوے حتیٰ یَاتِیَکَ الْیَقِیْنُ

تیرے نقش پا کی تلاش میں میں تو جھک رہا تھا نماز میں
تیری یاد نے وہ ستم کیا کہ مجھے چھیڑا آکے نماز میں

(دسمبر ۱۹۶۵)

Marfat.com

# احساس

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یوں تو ہر گھڑی ہر آن اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور انعام واکرام انسان کے جسم و جان پر بارش کی طرح برس رہے ہیں، آب و ہوا کی طرح ایک گھڑی بھی ان کے بغیر جینا مشکل ہے، لیکن ان انعام واکرام کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اور گاہ گاہ جب احساس پیدا ہوتا ہے تو پھر انسان پر ایک ایسا حال وارد ہوتا ہے کہ اس احساس میں دنیا بھول جاتی ہے۔

ایک دن بعد دوپہر کڑکتی دھوپ میں ایک آدمی بھاگا بھاگا آیا۔ میں نماز سے فارغ ہو کر مکان کے اندر بیٹھا تھا۔ سلام و دعا کے بعد دو روپے میرے سامنے رکھے اور کہا کہ ماڑی سے آیا ہوں۔ ایک عرصہ سے مقدمہ چل رہا ہے اور ختم ہونے کو نہیں آتا۔ آج یہ خیال آیا کہ مرشد کے پاس نہیں گیا، ورنہ ختم ہو جاتا۔ میں فوراً یہاں آپہنچا ہوں۔ آپ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ خلاصی بخشے۔ اتنا کہنے کے بعد کہا۔ اب میں رخصت چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پانی پی لو۔ کہا نکلنے پر پانی پی لیا۔ ایک طرف وہ رخصت ہوا۔ دوسری طرف میں شان ربوبیت کی جلوہ آرائیوں سے حیران ہو بیٹھا۔ سبحان اللہ! صرف

Marfat.com

دو روپیہ مجھے دلانے کے لئے ایسا کیا، اور کس انداز سے اس کے دل میں یہ خیال پیدا کیا، کہ تم وہاں جاؤ۔ ورنہ میں کیا اور میری ہستی کیا۔ میں کوئی تقدیر پلٹنے والا نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے گا۔

ایسے ہی ایک دن صبح سویرے بیٹھا تھا، کہ بلووال کا ایک آدمی نور محمد آیا، اور کہا کہ ہمارے گاؤں میں لڑائی ہو گئی ہے۔ دُعا کریں کہ رپٹ میں میرے بچے کو نہ لکھادیں، ہم بے گناہ ہیں۔ اور دو روپیہ دے کر چلتا بنا۔ اور میں اس خیال میں ہو گیا، کہ الٰہی تیری قدرت ہے۔ یہ دو روپیہ دلانے کے لئے کیا تجویز فرمائی گئی۔ ورنہ رپٹ رپورٹ سے میرا کیا واسطہ؟ غرض ہمیشہ عنایات تو ہوتے ہیں۔ لیکن احساس کبھی کبھی ہوتا ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُالْحَکِیْمُ

(ترجمہ :۔ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر انہیں بخش دے تو تو عزیز و حکیم ہے)

## حال و مقام

حال آنی جانی چیز ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ حال مداومت اختیار کرتا ہے، تو پھر یہ مقام میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور بندہ اسی حال میں غرق ہو جاتا ہے، اور اپنے پرائے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں یا تو خود حال میں گم ہو جاتا ہے، اور اپنی ہستی کی ہوش نہیں رہتی۔ اسے فنائیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ ہے فنا۔

اور یا پھر حال فنائے "انا" کے بعد خود انا کی جگہ لے لیتا ہے[1]۔ اور اپنی ہستی کو ہستی مطلق خیال کرتا ہے۔ اسے کہتے ہیں "بقا"۔ بہر صورت بات ایک ہی ہے۔ لیکن دونوں کے پہلو الگ الگ۔ جیسے کوٹ کے ابرہ اور استر، باہر اور اندر اس کے دو کپڑے یا رضائی کے اندر اور باہر کے دو پردے۔ جب رضائی کے سامنے کو دیکھو تو عجب قسم کی گلکاری اور خوش منظر چھینٹ زیب نظر ہوتی ہے۔ ایسے ہی جب اُلٹ دی جائے۔ تو دوسرے پردے پر کچھ اور نقش و نگار، یا سادہ سیاہ و سفید رنگ نظر آتا ہے۔ لیکن چیز ایک

Marfat.com

ہی ہے۔ صرف الٹ پلٹ کا فرق ہے۔ یہی حال فنا وبقا کا ہے۔ یہ دونوں پرت توحید خالص کے ہیں۔ کسی کے حال پر سامنے والا طرف پہنایا گیا۔ اور حقیقتاً الٹا ہی وہ حصہ ہے، جو جسم پر ہوتا ہے۔ باہر کو جسم کے ساتھ خصوصی تعلق وہ نہیں جو اندرس کو ہے یعنے اندرونی پردہ کو۔ منصورؒ کا کیا گلہ۔ یہ جبہ توحید الٹ کر پہنایا گیا، اور خود ذات ہو کر بولنے لگا۔ اور جو سیدھے اور نقش دار جبے پہنتے ہیں، ان کے اندر بھی تو وہی کچھ ہوتا ہے، جو اُلٹے پہن کر دکھاتے ہیں۔

الغرض جو کچھ ہے احساس ہے۔ جب احساس انسانیت کامل ہو جاتا ہے، تو خدائے قدوس سامنے آجاتے ہیں۔ اور ان کی ہر ادا انسان کو کھائے جاتی ہے، اور ہر آن تجلی ذات میں انسان غرق ہو جاتا ہے، اور عبدیت اور معبودیت قوسین کے مطابق آمنے سامنے ہو جاتی ہے۔ ایک طرف عبودیت ہوتی ہے اور دوسری طرف معبودیت۔ اور دونوں قوسین مل کر موجودات کا ایک دائرہ ہوتی ہیں۔ اور اس کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اس وقت زمین وزماں سب ان قوسین کے اندر نظر آتا ہے۔ اور وہ وقت ہوتا ہے کہ جب ارشاد ہوتا ہے۔ بی یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ۔ مجھ سے سنتا اور مجھ سے دیکھتا ہے۔

## قرب وبعد

قرب وبعد کا مدار بھی اس احساس پر ہے۔ اگر کسی کا احساس قرب خداوندی میں کامل ہو جاوے۔ تو اسے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِہ پر ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ اور دُنیا کے سامنے اس کے مشاہدات پیش کرتا ہے۔ اور دُنیا کو اس قرب حق کے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر یہ احساس اس درجہ پر نہ آئے تو اَقْرَبُ اِلَی الْوَرِیْد ذات حقیقی کو لاکھوں بلکہ کروڑوں درجہ کی مسافت سے بھی زیادہ دُور دیکھتا ہے ۔بلکہ دیکھنا تو کجا اس کے تسلیم کرنے سے بھی شک در شک پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک رسمی طور پر تسلیم رہ جاتی ہے۔

Marfat.com

## زندگی احساس ہے

ہماری زندگی کا قیام بھی احساسِ زندگی پر ہے۔ جب کافر میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے، تو وہ اپنی زندگی بہتر بنانے میں اپنی تمام زندگی صرف کر دیتا ہے، اور ہر آن اور ہر حال اپنے احساس کے مطابق زندگی میں دوڑتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس نہ ہو، تو زندگی، انسانی زندگی نہیں رہتی، بلکہ ایک جانور کی زندگی ہو کر بلا شعور ختم ہو جاتی ہے۔ گو وہ کھاتا پیتا ہے۔ لیکن روحانی زندگی ختم ہو کر اسے بے جان بنا دیتی ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

غمِ زندگی رمِ زندگی غمِ زندگی سمِ زندگی
غمِ دم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

یہی احساس قوم کے بنانے کا محرک ہے۔ جب یہ پیدا ہوتا ہے تو قوم ترقی کے منازل اتنی جلدی طے کرتی ہے کہ سالوں کی راہ دنوں میں نکل جاتی ہے۔ لیکن جب یہ احساس قومیت قوم سے نکل جاتا ہے تو ترقی یافتہ قومیں بھی بیٹھنی شروع ہو جاتی ہیں۔ حتی کہ ہمیشہ کے لئے اپنی لحد میں گر جاتی ہیں، اور نام و نشان کے سوا کچھ دنیا میں نہیں رہتا۔ خود جاتی ہیں، ان کی تاریخی عظمت جاتی ہے اور صرف انسانوں میں ذکر رہ جاتا ہے۔

نبی اور رسول اسی احساس کے پیدا کرنے کے لئے تشریف لائے، اور کتب سماویہ اسی احساس کو زندہ کرنے کے لئے روح رواں ہو کر نازل ہوئیں، اور جس دل نے یہ آبحیات پی لیا، اور اس کے اندر رہے احساس، روح پیدا ہو گئی گیا تو وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا۔ اور جس نے سرمدی چشمہ کی سیرابی سے فائدہ نہ اٹھایا، اور اس کا احساس زندہ نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ کے لئے جہالت کی پستی میں دفن ہو گیا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَابِاَنْفُسِهِمْ! اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں بدلتا، جب تک اس کا اندر (باطن) نہیں بدلتا۔ مسلمانوں کی قوم کی کوئی سٹیج پچاس برس سے ایسی نہیں جس پر اس آیۃ شریفہ کے اس ٹکڑے کو کئی بار نہ دہرایا گیا ہو، اور

Marfat.com

جس کی تشریح میں گھنٹوں قوم کو مخاطب نہ کیا گیا ہو۔ لیکن جب دھیان کیا گیا تو آج تک نہ ہمیں یہ خیال آیا کہ مَابِاَنفُسِہِمْ سے مولیٰ کریم کی کیا مراد ہے، اور نہ کسی واعظ یا لیڈر کو غالبا یہ خیال آیا ہو، کہ یہ ٹکڑا کس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے۔ اور کس صورت کے لئے یہ آیۃ پیش کی جارہی ہے۔ مسلمانوں سے یہ ذوق اٹھالیا گیا کہ قرآن حکیم کو تدبر اور ترتیل سے پڑھا کریں۔ لیکن اب تو مطلب پرستی کے لئے قرآن حکیم کے معانی کو ڈھال لینا کوئی مشکل امر نہیں خیال کیا جاتا۔ بلکہ الٹا کمال خیال کیا جاتا ہے، کہ کتنا علم ہے اور کتنا بلند ذہن ہے کہ ضرورت کے مطابق قرآن کا جملہ پیش کردیا گیا۔ حتی کہ سیاق و سباق کی توجہ کجا صرف پوری آیۃ پر بھی غور نہیں کیا جاتا اور اپنی غرض کے لئے صرف آدھا ٹکڑا آیۃ کا (لا تقربوا الصلوٰۃ) کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔

حَتّٰی یُغَیِّرُوْ مَابِاَنفُسِہِمْ میں وہی چیز مراد لی گئی ہے، جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے۔ یعنے احساس۔ لیکن خود غور فرمایا جاوے، کبھی کسی کو یہ احساس ہوا کہ اس سے کیا مراد ہے اور کس تغیر نفس کی طرف اشارہ ہے جو قوم کو تبدیل کردیتا ہے۔ قوم کا تبدیل ہونا کوئی آسان امر نہیں۔ افکار و کردار، اخلاق و اعمال بلکہ تمام جذبات جب تک کلی بدل نہ جاویں، قوم کیسے بدل سکتی ہے۔ لیکن دیکھئے۔ کیا ننھا سا بیج ہے، جو اتنے انقلاب کا باعث ہوتا ہے۔ ایک نہیں دو نہیں، تمام قوم کو یکسر بدل دیتا ہے۔ اللہ اکبر! ایک شرر بھی کسی کی خاک میں ہو، تو تمام خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کردیتا ہے۔

خدا نے آج تک اس کی قوم حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آہ! افسوس!! لیکن کوئی یہ نہیں دیکھتا، کہ اللہ تعالیٰ کس حقیقت کو مسلمانوں کے سامنے فرمارہے ہیں، آیئے تمام آیت کو ایک بار پڑھیے گا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَابِاَنفُسِہِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْءً فَلَا مَرَدَّلَہٗ وَمَا لَہُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک اس کے اندر احساس نہیں بدلتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو برا بنانا چاہتا ہے تو پھر اس کے لئے اپنے

Marfat.com

مقام پر واپس ہونا مشکل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔ سیاق و سباق کے جملے دیکھ لیجئے۔ کیا یہ صاف نہیں بتلا رہے کہ قوم جب گرنے پر ہوتی ہے تو پہلے اس کے اندر یہی احساس کم ہو تا جاتا ہے اور اس کے باطن کے جذبات بدلتے ہیں۔ اور اس جملے کی تاکید میں پھر فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو گرانا چاہتا ہے تو اس کے لئے پھر اپنی نسبت اور مقام پر قائم رہنا بڑا ہی مشکل ہے۔ یعنی وہ قوم گر کر رہے گی۔ کیونکہ اللہ جل شانہ اس کا مددگار ہے، اور کوئی دُوسرا نہیں۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ تو اس کے احساس اور شعور کو گرا چکے ہیں۔ اور جب یہ احساس گم ہو چکا ہے۔ تو خود سوچئے جب روح جسم ختم ہو جاوے تو جسم کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ فوراً گل سڑ کر بدبودار اور پھینکنے کے قابل ہو جائے گا۔

تصوف کو تو برا کہا جاتا ہے لیکن اس آیۃ پر ہی غور فرمایا جاوے۔ اس لدی رحمت الٰہی کے فیوض کے بغیر کون یہاں سے پار نکل سکتا ہے اور کسے سمجھ میں آتا ہے۔ ایک طرف تو فرمایا جاتا ہے۔ اللہ کسی کو از خود نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ بدلے۔ اور پھر ساتھ ہی فرما دیتے ہیں، کہ جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی چاہے تو اس کا قیام پھر مشکل ہو جاتا ہے۔ فرمائیے پہلا جملہ صحیح یا دوسرا؟ اور کس پر دھیان و ایمان قائم کیا جاوے۔ پہلے جملے پر، جیسے قوم کے رہنما کہتے ہیں کہ خود بدلو تو خدا تم کو بدل دے گا۔ یا دوسرے جملے پر ایمان رکھا جاوے کہ جب اللہ کسی کو مٹانا چاہتے ہیں تو پھر کھڑا رہنا اور نہ مٹنا مشکل ہے۔ اور پھر آخری جملۂ آیۃ نے تو کمال ہی کر دیا۔ نہ یہ نہ وہ۔ کھلا فرما دیتے ہیں وَمَا لَھُمْ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ ہ اس کے سوا اس کا کوئی مددگار نہیں، بلکہ ان کا والی نہیں۔ خیال فرمائیے۔ ولایت کے اندر جذبہ محبت ہوتا ہے یا جذبہ نفرت۔ اور جذبہ محبت بڑھانا چاہتا ہے۔ یا گرانا اور مٹانا۔ اور خصوصاً جب خود والی یہ بھی سمجھے کہ میرے سوا ان کا کوئی نہیں۔ پھر کیونکر اپنے بندوں پر ہاتھ اٹھائے گا اور کیونکر انہیں برباد کرنے کے لئے تیار ہو گا۔

یہ ایک آیۃ نہیں۔ بلکہ سینکڑوں ہیں۔ جن کے حال کے لئے وہی تعلق باللہ کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے باطنِ مصفّی کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کی کلام معجز (نظام)

خود بخود اندر آکر روز روشن کی طرح روشن ہو کر مطالبِ روشن سے انسانی ہستی کو سراسر فلاح تک پہنچاوے۔

سچ تو یہ ہے، کہ دنیا ایک مرکب ہے، جس کے اجزا وہ اور یہ دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ایک طرف مولائے کریم کی جلوہ فرمائی ہے، تو دوسری طرف انسان کی کارگزاری۔ دونوں مل کر دنیا کو چلا رہے ہیں۔ بیشک وہی خالق ورازق۔ لیکن اس کو پھر ہاتھ پاؤں پھیلانے کی کیا ضرورت۔ اور یہ کیوں لہو اور پسینہ ایک کر دیتا ہے۔ اور کیوں ؟ وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی اور کیوں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ فرمایا گیا ؟ اور پھر آخر احساس کون پیدا کرتا ہے۔ وہی نہیں کرتا ؟ جو کہتا ہے کہ جب تک تم خود نہ اندر سے بدلو گے تو میں تمہیں نہیں بدلوں گا۔ کیا وہی نہیں کہتا ؟ جب میں کسی کی برائی پر اتر آتا ہوں تو پھر کوئی صورت اس کے ٹھکانے کی نہیں رہتی۔ اور پھر وہی نہیں فرماتا کہ میں ہی تمہارا مددگار ہوں۔ کسی کے پیدا کرنے میں یا فنا کرنے میں یا بگاڑنے میں، عزت پر لے جانے میں یا ذلت میں۔ کاش کسی کے سامنے خود تصور ذات اقدس کی کوئی حقیقت ہوتی، اور یہ الجھن دُور ہو جاتی۔

بہر صورت کچھ بھی ہو "احساس" کوئی تھوڑی دولت نہیں۔ اگر انسانی ہستی کو یہ دولت نصیب ہو جاوے، تو فلاح ہی فلاح ہے اور اگر یہ دولت حاصل نہ ہو، یا نہ رہے، تو پھر ضلالت و گمراہی ہے۔ جس کی آخری کڑی موت ہے۔ اور موت سے بھی زندہ قوموں کا احساس زندہ ہوتا ہے۔ اور مردہ قومیں بھی اپنے اندر احساس تو بہت کر سکتی ہیں۔

سالک کا جب تک یہ احساس رہے گا، اپنے سلوک کی ترقی کرتا جائے گا۔ اور جب احساس شعوری بلاشعوری میں گرنا شروع ہو گا، تو سالک ہر قدم پر پیچھے گرتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کی حد تک پہنچ جائے گا۔

## حواشی

ا۔ پرانے تخیل فنا اور بقا سے ہٹ کر ایک نئے زاویہ نگاہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ مقلد اصحاب یہ نگاہ فرماویں منہ ۱۲ (مارچ ۱۹۶۶ء)

Marfat.com

# خودی

## اقبال کا ایک شعر اور میرے تاثرات

ایک دوست کا خط آیا اور لکھا کہ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟ گستاخی معاف ۔

یہ ذکر نم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

شعر پڑھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ کیا بلند سبق دیا ہے۔ اور جو کچھ کہا گیا کتنا صحیح کہا گیا ہے۔

صوفیت میں کیا کچھ نہیں؟ ذکر ہے، فکر ہے، مراقبہ ہے، کیفیات ہیں، تجلیات ہیں، اور خلوتیں اور چلے ہیں۔ لیکن اگر نہیں تو شعور خودی نہیں اور پاس خودی نہیں۔ اور حقیقتاً یہ ہی روحِ صوفیت تھی۔ اس کے بغیر پوری صوفیت بے جان، بے روح ہے۔

اس دورِ تنزل میں اگر چہ ہر نیک عمل میں کمی آگئی ہے اور بہت کم حقیقتِ روحی رہ گئی ہے۔ تاہم ظاہری صورتِ عمل کچھ نہ کچھ چل ہی رہی ہے۔ لیکن خودی

(بے نیازی) جو انسانیت کے لیے روح رواں تھی بالکلیہ مفقود ہو گئی ہے۔

ہر خواہش کو روکنا ایک مسلمان کے لیے لازم ہے۔ پھر صوفیت جو مقتدا اور رہنمائے انسانیت ہے، اس کے لیے کیسے خواہشات کے پورا کرنے کا جواز بنایا جا سکتا ہے۔

صوفی وہی ہے جو خواہشات کو ذبح کر کے، اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی اس کی رضا میں صرف کرے ورنہ اس میں اور ایک عام آدمی میں کیا فرق؟ ایک ایک خواہش انسان کے دل کو ڈستی ہے۔ اور بیقراری پر بیقراری بڑھتی جاتی ہے۔ جس سے آخر میں موتِ روح ہے۔ لیکن اگر خواہشات کے طومار کو لا الٰہ کی نفی سے اڑا دیا جائے تو الا اللہ کے اثبات میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ اور جب اثبات الا اللہ ہو جاتا ہے تو پھر کیا کسی چیز کی کمی رہ جاتی ہے؟

محمود نے جشن منایا اور رنگارنگ لباس چنوادئے، اور کہا لوٹ لو۔ ایاز بھاگا بھاگا آیا، اور محمود سے لپٹ گیا۔ بادشاہ نے کہا، دولت لٹ رہی ہے ایاز! وقت ہے کچھ لوٹ لو۔ کہا، جہاں پناہ سے بڑھ کر کیا لوٹ لوں۔ سرکار کو پالیا تو سارے جہان کو پالیا۔

سو جس نے خدائے قدوس کو اپنے اندر سمو لیا۔ اس کو پھر کس دولت اور کس خواہش کی تڑپ باقی رہ جاتی ہے۔!

پیرو مرشد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آخری دور میں دنیا کو اس اعلیٰ خودی کا نمونہ دکھادیا تھا۔ نہ لباس کی فکر نہ مال مویشی کا خیال۔ گھوڑا بھینس بکری کچھ نہیں۔ ایک مسجد ہے اور ایک بیٹھک۔ چٹائی بچھی ہے۔ جو آئے بیٹھ جائے۔ اندھیرا۔ پنکھا نہیں۔ پانی کا نل موجود ہے۔ یہ ہی کھانے کا کمرہ۔ یہ ہی مجلس خانہ۔ یہی تسبیح خانہ اور لیٹنے بیٹھنے کی جگہ۔ یہی ملاقات گھر ہے۔ اور ہے صرف چارپائی کی جگہ۔ لیکن اس اندھیر خانے میں سراسر نور الٰہی کے جلوے تھے۔ خودی اور بے نیازی برس رہی ہوتی تھی۔ اور لطف یہ جو بھی داخل ہوا۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا (جو اس میں داخل ہوا امان میں ہو جاتا) کے مطابق تسکین و تسلی سے بھر جاتا تھا۔ غم کافور ہو جاتے اور دکھ دور ہو جاتے تھے، اور خیال جلوہ ہائے الٰہی کے اندر اڑتا نظر آتا تھا۔ کیوں؟ صرف اُس بے نیاز کے ایک نیاز مند نے دنیا سے نیاز اٹھالی

Marfat.com

تھی، اور صرف اس وحدہ لاشریک کے بھروسے تھے اور بس۔

شاہ و گدا میں تمیز نہ تھی، اور نہ کسی کو بڑے چھوٹے ہونے کا احساس تھا۔ ایک رکابی میں بڑے صاحب لوگ اور درویش گودڑی پوش کھارہے ہیں۔ کسی کو نفرت نہیں اور نہ کسی کو کہتری و بہتری کا احساس ہے۔ بلکہ اندر اندر دل شکر الٰہی ادا کر رہا ہے کہ کتنا بڑا بلند بخت ہوں کہ مجھے یہ کھانا نصیب ہوا ہے جو سراسر نور ہے۔

صوفیت، مولویت سے اسی وجہ سے ممتاز چلی آرہی ہے کہ صوفیت نے کسی موقع پر بھی اپنی خودی کو شرمندۂ نیاز نہیں کیا۔ بڑے بڑے شاہی درباروں میں جب اس کی پیشی ہوئی تو اس نے جان پر کھیل دیا، اور اپنی خودی کو نیچے گرنے نہ دیا۔ مولویت شریعتِ حقہ کی آبدار تلوار لے کر اس کے سر پر چڑھی تو کھال اتروادی اور جان سولی پر دے دی۔ لیکن اپنی خودی کی شان پہلے سے بھی دگنی تگنی دنیا کو دکھا کر اپنے کھیل سے دنیا کو محو حیرت کر گئی۔

بے نیازی دنیا کا وہ گراں مایہ جوہر ہے، جس کے مقابلے میں ساری دنیا رکھ دی جائے تو کم ہے، اور بہت کم ہی دنیا میں دنیاداروں کے حصے میں آئی۔ لیکن یہ بے نیازی صوفیت کا پہلا سبق استاد ازل نے صوفیت کو پڑھا دیا ہوا ہے اور آج تک صوفیت اس سے مست حال رہی۔ اور دنیا اس کے سامنے اپنے سامانوں سمیت سر بسجود رہی۔ لیکن آہ! جب دنیا کی کایا پلٹ گئی اور صوفیت مادیات کے ماحول سے متاثر ہو گئی، تو صوفیت کی وہ بے نیازی ہاتھ سے نہیں، قلب سے اٹھ گئی۔ وہ صوفی جو سارے جہان کے متاع گراں مایہ پر سر نہ جھکاتا تھا، اب ایک گلاس شربت اور ایک پیالہ چائے پر نظر جمائے ہوئے ہے اور اپنی اس متاعِ گراں مایہ خودی کو ہر خواہش پر ذلیل و خوار کر رہا ہے۔ بو علیؒ قلندر کہتے ہیں ؎

چیست تقویٰ زہد اے عالی جناب
بر مرادِ خود نگشتن کامیاب

Marfat.com

چیست تقویٰ زہد اے مردِ فقیر
لا طمع بودن ز سلطان و امیر

یہ بو علی قلندرؒ کی زبان نہیں صوفیت کی زبان بول رہی ہے۔ کاش ہماری صوفیت پھر اپنی خودی کا احساس زندہ کرلے!

خودی کیا ہے؟

احساسِ حمیت نفس یا وقار نفس، پاس نفس۔ جامع مانع تعریف تو مشکل ہے۔ لیکن سمجھانے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہر اس خیال اور فعل سے بچنا جو شرافتِ نفس اور وقارِ نفس کے خلاف ہو اور شایانِ شانِ نفس نہ ہو۔ یہ جذبہ خودی عامہ نہیں، جسے تکبر سے عوام تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے سمجھنے کے لیے یہ شعر کافی ہے۔

سر داد نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہٰ است حسین

ترجمہ: سر دے دیا لیکن یزید کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا (بیعت نہ کی)۔ قسم بخدا حسین علیہ السلام لا الہٰ کی بنیاد ہیں۔ یعنی معبودیت باطلہ کی نفی کی حقیقت حسین علیہ السلام نے دکھا رکھی ہے

ترجمان حقیقت علامہ اقبالؒ اپنے ایک دوسرے شعر میں اس کو بایں الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کمال خودی کو کمال بے نیازی سے تعبیر کیا۔ کہ بندہ اپنے رب تک سے سوال نہ کرے بلکہ اس بے نیاز کی اس بے نیازی کی وجہ سے مولیٰ کریم خود اپنے بندے کی رضا جوئی میں اُتر آویں۔

یہ کمال خودی الصمد کا عکسِ نورانی ہے۔ اور یہ ہر کہ ومہ کی قسمت میں کہاں؟ یہ خاصہ صرف اولیاللہ کے نصیب ہے۔ جو اس بلند منصب پر کمال فنائیت کے بعد اپنی بقامیں حاصل کرتے ہیں۔

## اقسام خودی

یہ نفس کی خودی اپنے نفس کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ چمار کی خودی اور ایک زمیندار کی خودی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح ایک نبی اور ایک امتی کی خودی میں بہت بڑا فرق ہے۔ غرض جس طرح یہ نفس اپنے خواص میں ممتاز ہے اسی طرح ہر نفس کی خودی میں امتیاز ضروری ہے۔ اور اپنے فرقِ مراتب کے مطابق خودی کے بھی مراتب ہیں۔ علامہ کا جو شعر پیش کیا گیا وہ اعلیٰ خودی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جس کے اندر خواہشات کو بالکلیہ ترک کر دیا گیا ہے، اور سوال منہ پر لانے کو حرام خیال کیا گیا ہے۔ سعدیؒ نے اس کا ایک حل یہ پیش کیا ہے۔ ؎

رازِ دل با تو بگویم کہ خداوند من توئی
یا نہ گوئم کہ خود مطلعی بر اسرار

ترجمہ: میں اپنے دل کی بات تجھ سے کہوں کیونکہ تو میرا خدا ہے یا نہ کہوں کہ تو خود تمام بھیدوں سے واقف ہے۔

خدا سے طلب کے لیے کچھ نہیں کہنا، بلکہ خدا اور رب ہونے کی حیثیت سے اظہارِ عجز کے لیے عرض کرنا۔ اگر کچھ کہنا ہو تو، اور نہ کہا جائے تو اور بہتر کہ وہ تمام اسرار اندروں سے واقف ہے۔ اللہ کے بندوں کا یہی حال ہے۔ جو کچھ بھی عرض کیا جاتا ہے، صرف نیاز عبودیت کے اظہار کے لیے کیا جاتا ہے، نہ کہ طلب کے لیے۔ اور وہ اپنے تصور سے بڑھ کر علیم و حکیم ہے۔ آپ اتنے مہربان ہیں کہ اپنے بندے کی خواہش کے مطابق مشیتِ ایزدی کو چلاتے ہیں۔

علامہ موصوف نے جہاں اہل اسلام کو صوفیت کی طرف متوجہ کیا اور اس کے حقائق سے روشناس کرایا۔ وہاں صوفیت کی مردہ روح کو زندہ کرنے اور خوابیدہ فطرت کو بیدار کرنے کی بھی پوری کوشش کی ہے اور موقع بموقع ایسے اشعار کہے کہ جس سے صوفیت اپنی گم شدہ متاع کے واسطے جاگے اور تلاش کرے۔ خدا اس پر

Marfat.com

رحمت برسائے۔ بڑا کام کیا۔ ایک سوئی ہوئی دنیا کو جگایا اور اٹھایا، کہ تمہارا سامان ایمان لٹ رہا ہے، کچھ فکر کرو۔ شعر سر عنوان میں یہی حقیقت بیان کی کہ صوفیت کے ذکر و اذکار، مراقبے، کیفیات تو خودی کی نگہبانی کے لیے تھے۔ یہ موجود ہیں لیکن خودی گم ہے۔ اور جب خودی (روح صوفیت) گم ہے، توان کے کرنے کا کیا فائدہ، لیکن مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ خودی کے گم ہونے کے بعد مراقبے اور کیفیات بھی خود بخود مر جائیں گے۔ آج زندہ ہوتے توان کو ان کے مرنے کا رنج ہوتا اور دیکھتے کہ صوفیت کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ نہ صورت نہ سیرت، نہ جسم نہ روح۔ اب نام ہی نام ہے، جو خود چند دن کا مہمان ہے۔ ہاں! خدائے قدوس رحم فرمائیں، اور اپنی فطرت اللہ کے مطابق صوفیت کو ایک نئی زندگی عنایت فرماویں توان کے فضل و کرم سے کیا دور؟

کل کی بات ہے، تصوف اور صوفیت کا نام لینا شرم تھا۔ لیکن حضرت شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے وجود باجود کو عزت بخشی گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو کچھ روایات تصوف اور صوفیت کے بارے میں چلے آتے تھے، وہ بالکل صحیح ہیں۔ ایسے ہی جب وہ چاہیں گے کسی اپنے بندے کو عزت دیں گے اور دنیا کی ظلمت میں اپنی مشعل روشن فرما کر اس جوہر آبدار کو تاقیامت زندہ رکھیں گے۔

خیر علامہ موصوف ترجمان حقیقت تھے۔ لیکن بندہ جی کو کیا سوجھی کہ مجھ جیسے کو بیدار کرنے کے لیے خودی کا حقیقت آموز شعر لکھ کر سوال کر دیا کہ اس کے کیا معنے ہیں؟ کوئی کچھ کہے۔ میں نے یہی سمجھا، میرے غافل دل کے لیے اس نے لکھ دیا۔ خدا تعالیٰ میری خودی کو زندہ فرماویں اور میں ایک مسلمان ہو کر اس کے دربار میں حاضر ہوں۔ البتہ یہ حقیقت ضرور ہے کہ خواہ کتنا ہی شقی القلب کیوں نہ ہو، حقائق اس کے سامنے حقائق ہی رہتے ہیں، اور کوئی دھوکہ نہیں لگتا۔ جب صوفیت کی خودی مر چکی ہے، تو علامہ اقبال کی فطرت شناس طبع پر کیا منحصر، ساری دنیا کی فطرت بول اٹھی ہے کہ اب صوفیت کی جان مر چکی ہے۔ ایسے ہی جب جان آجائے گی بلا تاخیر دنیا اس کے زندہ ہونے پر فخر کرے گی۔ لیکن میری طبع ناہنجار نے کیا گھڑا؟ ہمارے ایک صوفی

Marfat.com

دوست یہاں آئے ہوئے ہیں اور اپنا نذرانہ نہیں نیازانہ وصول کرتے ہیں۔ تمام سلوک مجددی طے فرما چکے ہیں۔ مراقبات، اذکار میں دن رات مشغول، لیکن بیچارے کی خودی گم اور ایسی گم ہے کہ ان کو اپنا پتہ تک نہیں۔ چند پیسوں کے لیے ناموسِ طریقت کو ذبح کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خط دیکھا تو ان کی طرف متوجہ ہوا، اور التجا کی کہ آپ یہ شعر یاد کر لیں ؎

یہ تیرا ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور اپنے تمام صوفی بھائیوں کی خدمت میں پہنچایا کریں، کہ شاید کسی کو احساس ہو اور یہ اس ذلت ورسوائی سے نجات پائیں۔

کوئی انسان اپنے آپ کو مریض نہیں دیکھتا، بلکہ دوسرے کو مریض دیکھتا ہے، اور اس کے علاج میں منہمک ہو جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ میں خود موت کی گھاٹ میں جا رہا ہوں اور اس زندہ کا علاج کر رہا ہوں۔ مولا کریم ہمیں آنکھیں دیں کہ اپنے مرض کو دیکھیں اور دوسرے کے علاج کی جگہ اپنا علاج کرائیں۔ ہماری صوفیت اپنا علاج کر لے تو اس کی زندگی آبحیات ہے جس سے دنیا کی زندگی ہے۔ لیکن دوسروں کے علاج میں زندگی جب ختم ہو جائے گی تو دوسرے کیسے زندہ رہیں گے؟ خدائے قدوس مجھ پر میرے دوستوں پر رحم فرماویں۔ ہماری صوفیت کی روح کو زندہ فرمائے کہ اپنی قیومیت کے وصف کا اظہار فرماویں۔

## انسانی خودی کا بلند مقام

کائنات کا ایک ایک ذرہ دیکھو تو انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ کیا حجر اور کیا شجر، کیا زمین اور کیا زمان، دن رات، چاند سورج، دریا اور سمندر، صحرا اور جنگل، غرض جو کچھ بھی نظر آتا ہے، انسان کے لیے اور قرآن حکیم اس پر شاہد۔ فرماتے ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَلَكُمُ الْأَنْهٰرَهٗ وَ سَخَّرَ

Marfat.com

لَکُمُ الشَّمسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَینِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ اللَّیلَ وَالنَّھَارَ وَاٰتیٰکُمْ مِنْ کُلِّ مَاسَأَلْتُمُوہُ وَانْ تَعُدُّ وانِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا۔

ترجمہ: کشیوں کو تمہارے لئے مطیع کر دیا کہ وہ اس کے امر سے دریا میں چلتی ہیں، اور ندیوں کو تمہارے لیے مطیع کر دیا گیا، اور سورج و چاند بھی تمہارے تابع کر دئے گئے کہ چکر کھا رہے ہیں، اور رات دن بھی تمہارے لیے مسخر بنائے گئے۔ جو کچھ اس (رب) سے تم نے طلب کیا وہ دے دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ایسا نہ کر سکو گے۔

لیکن یہ انسان شریف جب اپنی خودی کو گم کر لیتا ہے اور اسے احساس خودی نہیں رہتا تو کتنا ذلیل و خوار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ورنہ اس کے اندر جو ہر شریف انسانیت اتنا بلند رکھا گیا ہے کہ کسی ہستی کو اپنے مقابل نہیں پاتا، اور ذات ربی جس نے اسے پیدا کیا اور اچھی صورت و سیرت سے نوازا اور دنیا کی ہر چیز کا مالک بنایا۔ لیکن یہ اتنا محسن کش اپنی خودی بھول جانے سے ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہیں ہوتا تو رب العالمین کے سامنے۔ جبھی تو فرمایا گیا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ یہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور نا شکرا ہے۔ کیونکہ جس نے سب کچھ جان و جسم دل و آنکھ، سمع و بصر، غرض کیا کیا گنا جاوے، دئے تھے، جس نے کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لیے پیدا فرمایا تھا، اس کے خیال کو تو بھول گیا، لیکن اس کے سوا انسان تو انسان رہا۔ گائے بھینس اور گھوڑے تک کا پجاری ہو بیٹھا۔ رات دن اس کی فکر میں ہے۔ یہ انسان ذلیل سے ذلیل کے سامنے اپنی تکلیف اور اغراض کے لیے ماتھا ٹیکتا ہے، اور یہ نہیں جانتا کہ یہ ماتھا تو رب العالمین کے سوا کسی کے سامنے ذلیل ہونے کے لائق نہیں۔ رب لعزت کے سامنے گرنا تو انسان کے لیے شرافت ہے، لیکن کسی دوسرے کے سامنے گرنا اس کی ہی ذلت نہیں بلکہ اس کے ابنائے جنس کے لیے ذلت ہے۔

پھر مسلمان! یہ دنیائے کائنات کا والی ہو کر آیا تھا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْف وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

ترجمہ : تم بہترین امت ہو جو آدمیوں کو نیک کاموں کے لئے حکم دیتی ہو اور برے کاموں سے روکتی ہو

لیکن معاملہ اُلٹ گیا۔ اب مسلمان کو برائی کے لیے تو ترغیب دیتا ہے، اور نیکی کے لیے نفرت دلاتا ہے۔ ایسے حال میں جب ہماری خودی گم ہو چکی ہے تو ہماری دنیا میں عزت کیا ہو؟ خود انسانیت دنیا میں کیوں ذلیل ہو ہی ہے؟ صرف اس لیے کہ انسانیت نے اپنی انسانیت کو چھوڑ دیا اور جانوروں کی طرح صرف پیٹ پوجا پر اتر آئی، عزت نفس اور ناموس روح کی اسے پرواہ نہ رہی۔ گندگی کھانے کو فخر جانتا ہے اور لہو پینے کو عزت جانتا ہے، جس سے روح ہمیشہ کے لیے گندی اور پلید ہو کر دنیائے عالم میں ذلیل و خوار ہو رہی ہے۔ مولیٰ کریم ان پاک نفوس پر رحم فرمائے، جنہوں نے اپنی بے سرو سامانی میں بھی خودی کو ذلیل نہ ہونے دیا، بلکہ شرف و عزت کے بلند مقام پر بٹھایا۔ پیرو مرشد رحمۃ اللہ علیہ کیا تھے؟ ایک سادہ مسکین درویش تھے۔ لیکن خودی کا یہ عالم تھا کہ دو جہاں سامنے رکھے جاتے تو آنکھ میں نہ سماتے۔ دنیا سب کچھ پیش کرتی، لیکن اس کی طرف توجہ تک نہیں۔ اتنا حکم ہوتا لے جاؤ۔ ہمت کسی کو نہ ہوتی کہ کچھ نذر و نیاز پیش کرے۔ اگر کسی نے جرأت سے کام لیا بھی تو آنکھ سے فوارے نکلتے تھے، اور شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت کے افسر اور مملکت کے کارندے بھی جب حاضر ہوتے تو دل دھڑکتا لے کر داخل ہوتے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے اور جسم میں جان نہ ہوتی۔ مہربانی کے الفاظ جب زبان مبارک سے نکلتے تو خوشی سے دل بھر پور ہو جاتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ ساری دنیا کی دولت آپ کی ایک مسکراہٹ میں آگئی۔

حضرت قبلہ تو تھے سالک۔ میں نے تو مجاذیب کو دیکھا کہ ان کی خودی نے دنیا کو اپنا گرویدہ کر رکھا ہے۔ لاکھوں تحائف سامنے آتے ہیں، لیکن نظر تک نہیں

Marfat.com

اٹھاتے۔ اور اگر کسی خوش قسمت کا تحفہ قبول کر لیا گیا تو دنیا نے اسے مبارکباد پیش کی، کہ تو بڑا خوش نصیب ہے کہ تیرا تحفہ قبول فرمالیا گیا۔

دنیا تو مجاذیب کو بے وقوف جانتی ہے۔ لیکن جب وقوف والوں کو دنیا میں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی تو ان بے کس درویشوں اور مجذوبوں کے سوا نہیں چارہ نظر نہیں آتا۔ جاتے ہیں اور سر بسجود ہو کر خودی کو ذلیل کرتے ہیں اور اسی کو اپنی کامیابی کا راز خیال کرتے ہیں اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ یہ اس مالک الملک حقیقی کے انعام ہیں کہ درویشوں کے سامنے شاہوں کی گردنیں خم کرادیتا ہے اور ان کی خودی کو درویش کی خودی سے ذلیل و خوار دنیا کو دکھاتا ہے۔ لیکن ہمارے بعض دوست پھر بھی نہیں سمجھتے کہ یہ کرشمۂ قدرت کیوں کر ہے؟ صرف اس لیے کہ ان درویشوں نے اپنی خودی کو گرنے نہیں دیا۔ اگر ان کی خودی گری ہے تو خالق اللیل والنہار کے سامنے، جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے، ورنہ اپنے جیسے کسی انسان کے سامنے ان کی آنکھ بھی نہیں جھکی۔ چہ جائیکہ ان کی روح گرتی۔ آج اگر صوفیت اپنا پرانا طریقہ اپنالے تو دیر نہیں لگتی۔ خلق خدا چشم براہ منتظر ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ نکلے اور ہم اس کے قدموں پر گریں۔

ہاں دنیا حقیقت پسند ہے۔ یہ نہیں کہ کسی بناوٹی فقیر پر اب دنیا سر تسلیم خم کر لے۔ بلکہ بناوٹی فقیروں کا وقت چلا گیا ہے۔ اب سراسر حقیقت کے بغیر صوفیت روشن نہیں ہو سکتی۔ لیکن یاد رکھیئے۔ جب وہ صوفیت اپنی خودی کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی تو دنیا ایک منٹ بھی ضائع نہ کرے گی۔ جب آفتاب نکل آتا ہے تو ایک آن میں دنیا روشن ہو جاتی ہے اور دنیا والوں کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ہمیں بے پرواہ ہو کر دنیا سے الگ اپنی دنیا بنانی چاہیے۔ اور یہ دنیا ہو خدائی محبت و عشق کی دنیا۔ چاہے اپنی دنیا میں ہمیں کسی سے کام نہ ہو۔ ہم ہوں اور ہماری غربت۔ وہ ہوں اور ان کی دولت۔ لیکن اس دولت کی قیمت ہمارے سامنے ذرّہ بھر نہ ہو۔ اور ہمارا حال یہ ہو۔

Marfat.com

نخوت و ناموس دارند چوں شہاں
چاکری جویند از اہل جہاں

سب کچھ جائے لیکن اپنی صوفیت کی آن بان میں ذرہ بھر فرق نہ آنے پائے۔ پھر دیکھیں دنیا کیا ہماری صوفیت کے حق میں کہتی ہے۔ یہ جو کچھ کہا گیا۔ یا وہ جو اقبال مرحوم کہہ گئے۔

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

شاہ دکن امیر عثمان علی جشن تاجپوشی پر دہلی آئے۔ شاہ ابو الخیر صاحب کا زمانۂ عروج تھا۔ استدعا کی کہ زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ میں ملاقات پسند نہیں کرتا۔ لکھی پڑھی دنیا تو کہتی ہو گی کیسے تھے کہ شاہ دکن کی نیاز مندی کو ٹھکرا دیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ ایسی نیاز مندی کو ٹھکرانا ہی فقر کی خودی ہے۔ ورنہ عاجزوں مسکینوں کے لیے در کھلا تھا۔ گو ہر کہ و مہ کا داخلہ نہ ہو سکتا تھا اور خواص کو داخل ہونے کی اجازت تھی۔ لیکن ان کو اجازت دے دیتے، تو فقر کی کجکلاہی کہاں رہتی؟

۲

ملک عمر حیات خان، ٹوانہ حضرت غلام مرتضیٰؒ میرے جد امجد کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے آیا تو خادم نے عرض کیا ملک صاحب آرہے ہیں۔ فرمایا اچھا۔ پھر اُس نے عرض کیا۔ پھر یہ ہی فرمایا۔ پھر خادم نے کہا کہ دری بچھا دی جائے۔ فرمایا اس چٹائی پر ہی بیٹھ جائیں گے۔ چنانچہ ملک صاحب آئے اور بے تکلف بیٹھ گئے۔ اور ان کو خیال تک نہ آیا کہ کہاں اور کیسے بٹھایا گیا ہوں۔ یہ کیا وقار تھا۔ صرف صوفیت کی خودی تھی، جس نے ملک صاحب کے احساساتِ خودی کو اڑا دیا تھا۔

حضرت حیدر شاہ صاحبؒ کو ایک مقدمہ دیوانی پیش آگیا۔ جس کے فریقِ مقابل (ہندوؤں) نے بڑی کوشش کی کہ عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کریں۔ لیکن وہ اللہ کے پیارے اپنے سجادہ سے نہ اٹھے۔ لاکھوں جتن عدالت نے کیے۔ مگر بدستور سجادہ پر استقامت سے بیٹھے ہیں۔ اور ہر تاریخ کو بیس حافظ صاحبان سے قرآن کا

Marfat.com

ختم کراتے۔ اور پیٹ بھر حلوہ کے علاوہ ایک روپیہ فی حافظ عنایت فرماتے اور یہ سلسلہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ یہ تھی حیدر اسد اللہی کی استقامت۔

حضرت مہر علی شاہ رحمت اللہ علیہ کا کوئی نیاز مند ڈاکو تھا۔ وہ مارا گیا تو حضرت نے نماز جنازہ اس پر پڑھی۔ انگریز کا وقت تھا۔ جاسوسوں نے خبر کر دی۔ پیر صاحب کو حکومت کی طرف سے بلاوے پر بلاوا آیا۔ لیکن آپؒ مسند سے نہ اُٹھے۔ اس پر زیادہ شکائتیں شروع ہوئیں۔ لیکن آپ کی آنکھ بغداد کی طرف اُٹھ گئی۔ آخر کمشنر نے خود خانقاہ پر ڈیرہ ڈال دیا، کہ شاہ صاحب اس صورت میں حاضر ہونے پر مجبور ہوں گے۔ خدام متعلقین اور اہلکاروں نے عرض کیا، کہ آپ ملاقات کے لیے تشریف لے چلیں، کمشنر کے خدشے دور ہو جائیں گے۔ لیکن آپ نے پریشان ہو کر کہا، مجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ آخر کمشنر بمعہ لیڈی کے آپؒ کے کمرہ میں داخل ہوا تو پیر صاحب اپنی مسند پر اٹھے۔ صاحب نے ہاتھ بڑھایا اور مصافحہ کیا۔ اس کے بعد میم صاحبہ نے جو ہاتھ بڑھایا تو پیر صاحب قبلہ نے ہاتھ کھینچ لیا، اور کہا کہ ہمارے مذہب میں عورت سے ہاتھ ملانا ناجائز ہے۔ اتنا سنتے ہی صاحب کا غصہ دور ہو گیا۔ اتنا ہی کہا کہ یہ تو پادری ہیں۔ یہ واقعات عام ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ دنیا ان کو کچھ سمجھے۔ لیکن یہ لوگ دنیا کو کچھ نہیں سمجھتے ہیں، اور اس دنیا سے اپنی دنیا الگ بنائے ہوئے ہیں ؎

نخوت و ناموس دارند چوں شہاں
چاکری جویند از اہل جہاں

سوہنی اندھیری رات میں اٹھی اور دریا کے کنارے پہنچی۔ گھڑا اٹھایا تو کچا تھا۔ لیکن عشق و محبت کی دیوی، خودی نے کہا، اب پھرنا لوٹنا حرام ہے۔ دریا پر گئی اور "بسم اللہ مجریہا و مرسہا" کہتی ہوئی کود پڑی۔ دریا طغیانی پر تھا۔ کچھ دیر ہاتھ پاؤں مارے اور ڈوب گئی۔ اور اس کی خودی ستارۂ عرش ہو کر تخت شہرت پر بیٹھ گئی، اور رہرو عشق کے لئے نشان گاہ محبت اور سنگ میل ہو گئی۔ کہ عاشق اپنا آپ کھو دیتے

Marfat.com

ہیں لیکن اپنے عشق کی خودی پر الزام نہیں آنے دیتے۔ مرتے ہیں، مگر جیتے ہیں۔ اور جینا بھی لازوال۔ سوہنی لوٹ آتی، گھر جاتی لیکن دنیائے عشق تو کیا کسی خطہ زمین میں اس کا نام نہ ملتا۔

منصورؒ اپنی خودی کی مستی میں انا الحق بول اٹھے۔ جانتے تھے کہ یہ نشانِ موت ہے۔ چوبدارِ شریعت آئے اور منصورؒ سے پوچھا کہ کیا کہتے ہو۔ کہا انا الحق۔ حکم ہوا سولی چڑھا دو۔ لیکن منصورؒ پہلے سے بھی خوش۔ جان تو جا رہی ہے لیکن خودی عشق کو چار چاند لگا رہی ہے۔ منصورؒ سولی دے دیئے گئے۔ لیکن ان کی خودی منصور کی سولی کا تماشا دکھانے کے لیے آسمان پر چڑھ گئی۔ اور آج تک صوفیت کے تخت پر جلوہ آرا ہے، اور آنے والے صوفی کو صوفیت کے آخری نشان سے آگاہ کرتی ہے۔

روایاتِ قوم وملت، قوم وملت کو زندہ رکھتی ہیں۔ جو قوم وملت اپنی روایات کو فراموش کر بیٹھتی ہے وہ اپنی خودی فنا کر لیتی ہے۔ کوئی زمانہ تھا کہ صوفیت کی روایات کا چرچا گھر گھر تھا۔ خود صوفی اپنے طائفہ سے اُتر گئے۔ بزرگوں کے حالات سے باخبر ہوتے تھے اور دوسروں کو سناتے تھے اور مقولہ عِندَ ذِکرِ الصَّالِحِینَ تَنزِلُ الرَّحمَۃُ کا نمونہ انکی مجلس ہوتی۔ لیکن آہ! آج ہم لوگ صوفیت کی روایات بھی فراموش کر چکے ہیں اور اسلاف کی سیر توں تک (کو) بھول گئے ہیں۔ ورنہ ہمارے گروہ میں اس قدر روایات عشق و محبت اور جذب ہیں کہ کسی دوسرے گروہ میں نہیں ملتیں۔ قدم بقدم ضبط نفس کے نمونے ملتے ہیں، اور معیارِ خودی کی مثالیں قائم ہیں۔

لیکن صوفی بھائی ہیں کہ نہ تو کتبِ قوم کا مطالعہ کرتے ہیں نہ قرآن و حدیث کے اسباق پڑھتے ہیں اور نہ ہی اپنے اپنے دل کا خیال رکھتے ہیں ؎

تامل در آئینہ خود کنی
صفائی بتدریج حاصل کنی

(سعدی)

اپنے آئینہ میں دیکھ۔ تاکہ تو صفائی ترتیب وار حاصل کر سکے۔

کھانے پینے کے سوا شغل نہیں۔ ایک انتظار کے بعد انتظار ہے۔ چائے کے بعد کھانا۔ کھانے کے بعد چائے۔ یہ دور چلتا ہے اور زندگی کٹتی ہے۔

اپنی خانقاہوں اور پیر خانوں میں بھی اب ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمیں لنگر کیا کھلاتا ہے؟ ایسی صورت میں ہماری صوفیت بدنام نہ ہو تو کیوں کر؟ کسی دوست کے پاس بھی جاتے ہیں، تو یہی خیال غالب ہوتا ہے کہ کیسے کھلاتا پلاتا ہے؟۔!

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں :۔

''میں اُن لوگوں پر قربان ہوں، جو تمام دنیا کی خواہشوں سے قانع ہو کر اپنی خواہشات کو روٹی کے صرف چند لقموں پر لے آئے''۔

واقعی کیسی بلند بات فرمائی۔ ہماری تمام خواہشیں اسی خواہش پر جب قربان ہو جاتی ہیں تو ہم نے کتنی منزلیں طے کر لیں۔ لیکن یہ قناعت اگر مردانہ وار ہوتی، تو بہت بڑی قربانی تھی اور بہت بڑی عزت۔ نامردانہ طور پر جب ہم اس پر اتر آئے تو عزت کی بجائے ذلت ہو رہی ہے۔ اور قربانی کی جگہ جان پروری خیال کی جاتی ہے۔ آج یہ صوفی قناعت منش نہیں۔ قوم پر بار گراں ہے۔ اس کے برکات سے کیا حاصل کریں گے۔ بلکہ اس کو قوم کا وبال خیال کیا جاتا ہے۔

ایک درویش نہر پر بیلدار ہو گیا۔ جب ایس۔ ڈی۔ او آئے، اور اُن کی نظر اس درویش کے باتمکین چہرے پر پڑی، تو اُس کے پاس آگئے۔ پوچھا تم کون ہو؟ کس کے پاس رہتے ہو؟ اُس نے کہا درویش ہوں اور فلاں کے پاس رہتا ہوں۔ ایس۔ ڈی۔ او صاحب چلے گئے۔ اور پھر دورہ پر آئے تو دریافت کیا، وہ کیا کرتے ہیں، جن کے پاس تم رہتے ہو۔ کہا کچھ نہیں، ویسے اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔ پھر چلے گئے اور اگلے دورہ پر پھر آگئے، اور دریافت کیا کہ ان کے دوسرے بھائی رشتہ دار کیا کرتے ہیں۔ اُس نے کہا وہی کچھ، وہی مولویت و صوفیت۔ کہا، کتنا بوجھ قوم و ملت اور گاؤں پر ان بے کاروں کا ہے۔

Marfat.com

درویش نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ جب وہ دوبارہ آئے اور موقع ملے تو اسے کہنا کہ ہم قوم اور خاص کر گاؤں پر بوجھ نہیں بلکہ رحمت ہیں۔ جو کچھ ہمیں آتا ہے باہر سے آتا ہے۔ اور جو کچھ ضروریات ہم لیتے ہیں، یہاں سے لیتے ہیں۔ جو سبزی، گوشت کوئی نہیں خریدتا وہ ہمارے ہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ جو ناقص چیز کوئی نہیں خریدتا ہمارے لیے رکھی رہتی ہے۔ غرض باہر کا روپیہ سینکڑوں نہیں ہزاروں گاؤں والوں کے پیٹ میں ہماری معرفت سے جاتا ہے۔

بات ہے بھی صحیح۔ ہم کیا بے کار ہیں؟ جب دنیا میں کسی کو کوئی سہارا نہیں ملتا، تو وہ ہمارے پاس بھاگا بھاگا آتا ہے اور ہم اسے تسلی دیتے ہیں۔ کچھ بنے یا نہ بنے۔ قاتل پھانسی سے بچے یا نہ بچے۔ کچھ وقت تو اُسے ایسی تسلی ہو جاتی ہے کہ اس کا دم آرام سے نکلتا ہے۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ لاکھوں روپوں سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی، جو ہم ایک دو روپے کے نذرانے سے دل میں ڈالتے ہیں۔ ایسا سستا سودا دنیا میں نہیں ہوگا۔ لیکن عجب ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے اور بلا ٹل جاتی ہے تو پھر ہماری شکایت، کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں، یہ قوم پر بوجھ ہیں۔

لیکن یہ اپنی اندھی عقل کو نہیں دیکھتے کہ کل کس طرح تم ہماری منت سماجت میں مصروف تھے۔ ہماری کتنی خوشامدیں کی گئی تھیں کہ ہم ایک حرف منہ سے نکالیں۔

امراء وزراء سا ایک طرف اور غریب و مسکین ایک طرف۔ ذرا غور سے دیکھئے کس کو ہماری صوفیت کے سوا چارہ ہے؟ سر کے بل گرے پڑتے ہیں اور ناجائز فعل تو ہمارے لیے احتراماً کرتے ہیں۔ لیکن بقول ربی؟ کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ کے مطابق کل کا واقعہ بھول جاتے ہیں۔ یہ لوگ کتنے ناشکرے ہیں۔ کام بھی لیتے ہیں اور گلے بھی کرتے ہیں۔

غیر شعوری طور پر صوفیت کی خودی کو گرانے کے سامان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً دعوتیں، عقیدت مندی کا اظہار، نذرانے اور تحائف، ظاہراً تو سب کچھ احترام و وقار اور تشکر کے اظہار کے لیے ہوتے ہیں، لیکن ان کا ردعمل ہماری خودی

Marfat.com

کو ذلیل کرنا ہوتا ہے۔

صوفیت کو بڑی منت سماجت سے مخلص گھر لے جاتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں صوفیت تشریف فرما ہو جاوے تو چند روپے بطور نذرانہ کے پیش کیے جاتے ہیں۔ بس ان کے لینے اور پکڑنے کی ایک طرف نوبت آئی۔ دوسری طرف ان کے دل میں خیال پیدا ہو گیا کہ ہم نے کتنا نذرانہ پیش کیا ہے۔ لیکن اگر ذرا ہمت ہو جاوے اور اس نذرانے کو ٹھکرا دیا جائے تو صوفیت کی خودی کتنی بلند ہو جاتی ہے۔

شرقپور شریف کی واپسی پر میں رات کے تین بجے گاڑی سے اُترا، اور سات بجے پھر سوار ہو کر ایک چک میں ایک مخلص کے فاتحہ کی رسم ادا کرنے کے لیے پہنچا۔ رات گزری۔ صبح گھر والے تیس روپے لائے۔ میں نے کہا کہ میں فاتحہ کے لیے آیا ہوں، روپے واپس کر لیں۔ لیکن انہوں نے اصرار کیا اور میرے کہنے پر زیادہ مصر ہوئے تو میں نے کہا، سردی کے موسم میں آدھی رات سے سٹیشن پر پڑا رہا۔ اب یہاں آیا ہوں۔ کیا میری یہی قیمت ہے؟ خاموش ہو گئے اور انہیں سمجھ میں آگیا، کہ واقعی ہماری کتنی غلطی ہے۔ روپیہ تو نہ لیا گیا۔ ان کے اندر صوفیت کا مقام پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ صرف پیسے کے لیے نہیں پھر رہے۔

ایک سٹیشن پر مجھے ٹکٹ لینا تھا۔ ایک واقف کو کہا گیا کہ ٹکٹ میرا بھی لینا، اور یہ کرایہ ہے۔ اُس نے کہا لے لوں گا اور ٹکٹ لے آیا۔ پیسے کرایہ کے پیش کیے۔ کہا، میں تو موقع تلاش کرتا تھا۔ میں نے دوبارہ کہا، لے لو، یہ میری طبع کے خلاف ہے۔ پھر بھی اُس نے یہی جواب دیا۔ اس پر میں نے کہا، کہ میری قیمت یہی پیسے ہیں؟ میں اپنے آپ کو پیسوں سے بلند قیمت جانتا ہوں۔ لینے سے نظر نیچی ہو جاتی ہے۔ اور جب اپنا وقار اپنے اندر سے گر جاتا ہے، تو پھر کوئی دوسرا کیا عزت کرے گا۔

غرض حضرت قبلہ میاں صاحبؒ نے اس آخری زمانہ میں صوفیت کو زندہ کرنے میں بڑی ہمت سے کام لیا، اور ہر اس چیز سے نفرت کی جو صوفیت کی خودی کو گراتی ہے۔ بفضلہ تعالیٰ آپؒ کی طفیل میں اور آپ کی اتباع میں بہت سے

Marfat.com

دوستوں نے آپ کے طریقہ پر عمل کر کے صوفیت کی قدر بڑھائی۔ جان جائے مگر انسان کی قیمت کیوں گرے ؟ یہ انوکھا طریقہ حضرت کے طبعِ نازک کا رہینِ احسان ہے، کہ ضبط نفس سے کام لیتے ہوئے ہر اس چیز سے لاپرواہی لازم ہے جو ہمارے وقار نفس کی ذلت کا باعث ہو۔

ہمیں اگر زندہ رہنا ہے اور اپنی صوفیت کو زندہ رکھنا ہے، تو سب سے پہلے اپنی توحید و رسالت کو زندہ کرنا ہے۔ اور ایسی زندگی پیدا کرنا ہے کہ اپنے سے بڑھ کر دوسروں کے اندر زندگیٔ توحید و رسالت پیدا کر دیں۔ اس کے بعد صوفیت کی خودی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ جوں جوں توحید و رسالت کے جذبے بلند ہوں گے، خودی اپنا مقام خود بخود پیدا کرتی جائے گی۔ یہاں تک کہ دنیا کی خودی ہماری خودی کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جائے گی، اور ہر وقت صوفیت کی خودی کے سامنے سجدہ کرتی دیکھی جائے گی۔

خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

(اپریل ۱۹۶۳)

## حواشی

ا۔ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری۔

# حصہ سوم

# اشارات

Marfat.com

# سیرت کا مطالعہ

## تعلق باللہ کی روشنی میں

یَاصاحِبَ الجمالِ وَ یَاسَیّدَ البَشَر
مِن وَجُھکَ المنیر لَقَدْ نُوّرَ القَمَر
لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقّہ
بعد ازخدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلق ذاتی کے سب سے بلند درجے کا نام رسالت ہے اور اس سے نچلے درجے کا نام نبوت ہے اور سب سے آخری درجے کو ولایت کے اصطلاحی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ تعلق کسی ظاہری شکل و شباہت، ڈیل ڈول یا کسی اعلیٰ خاندان کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا بلکہ جسے ذات اقدس عزاسمہ، اپنے لیے (واللہ یختص برحمتہ من یشاء) کے مطابق چن لے اور جس درجہ پر چن لے، اس کے فضل و کرم کی عنایت ہوتی ہے۔ لیکن جب اسے اپنے انتخاب میں لے لیا جاتا ہے تو پھر اس تعلق اور نسبت کی وجہ سے اس کے تمام افعال و حرکات، عادات و اخلاق، افکار و خیالات اتنے

بلند ہو جاتے ہیں کہ اس زمانے کا کوئی آدمی ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہ شمع ہدایت ہوتا ہے اور اس کی ہر حرکت اور ہر فعل، اس کی ہر عادت اور ہر خلق، اس کا ہر فکر اور ہر خیال انسانوں کے لیے نمونہ کامل ہو کر (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ) عوام و خواص کو اپنی پیروی میں جذب کرتا ہے۔ اور ایک پوری ملت اس کی تابعداری اور اتباع کو حیات ظاہری اور باطنی خیال کرتی ہے اور اپنی نجات دینی اور دنیوی اسی اتباع میں تصور کرتی ہے، لیکن یہ سب کچھ کیوں ہے

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تیرے عشق نے بنائی میری زندگی فسانہ

صرف اس تعلق الٰہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تعلق رگ و ریشہ میں جا کر دل و دماغ کو اتنا روشن کرتا ہے کہ جسم خاکی بھی تمام ہی نوّر علی نور نظر آتا ہے۔ ہر انسان سخت دل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بلکہ اس کی بشری صورت خدائی جلوہ گاہی کا نظارہ پیش کرتی رہتی ہے اور ایک دنیا سر تسلیم خم کرنے پر فطرتاً مجبور ہو جاتی ہے۔

نبی کریمؐ کی ذات اقدس اس تعلق الٰہیہ کا آخری اور بلند ترین درجے کا نمونہ ہے۔ نہ اتنا تعلق الٰہیہ پہلے کسی کو نصیب ہوا۔ بعد کا تو ذکر ہی کیا۔ جب کہ آپ خاتم النبیین ٹھیرے۔ ؎ آخر آمد بود فخر الاولین کے شرف کی مہر آپ کی ذات اقدس پر دنیا میں لگ چکی اور یہ شرف مخصوص آپ کی ذات انور پر ختم ہو چکا ہے۔

جب سے دنیا قائم ہوئی، اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور نبی آتے رہے اور ہر رسول اور نبی کے پیرو ہو کر اہل عالم ہدایت پاتے چلے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ کی اُمتیں آج تک زندہ ہیں اور مسیحی دنیا تو اتنی ہے کہ کوئی امت اس کے مقابلے پر تاایں دم نہیں آسکی۔

ہر امت کے پیرووں نے اپنے ہادی، اپنے پیغمبر کے حالات لکھنے میں کمی

نہیں کی اور اس کے اسوۂ حسنہ کو پیش کرنے میں پورا پورا زور لگایا ہے لیکن جو افضلیت اور جو شرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کو اس اسوۂ حسنہ میں ملا کسی دوسرے کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں سے بھی بڑھ کر آپ کے سوانح حیات لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ اور آپ کی حیات طیبہ کا کوئی ایک واقعہ بھی نظر انداز نہیں ہوا۔ بلکہ معمولی معمولی حالات بھی قلم بند ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست، کے مطابق یہ شرف حاصل کرنے والا ہر ایک شخص اپنے اچھوتے نظریے سے حضورؐ کے حالات اور سوانحات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا چلا آرہا ہے۔

لیکن موجودہ دور سے پہلے تمام کے تمام مؤلفین نے جو کچھ لکھا، اس تعلق الٰہیہ کے ماتحت لکھا یعنی نبی کے حالات کو نبوت کے بلند ترین درجہ کے اساس پر لکھا اور نبوت کو محور فکر بنائے رکھا۔ بد قسمتی کہوں یا عیاری زمانہ سے تعبیر کروں کہ مادی دنیا نے اتنا پلٹا کھایا کہ اس دنیوی زندگی میں وہ روحانی رشتہ ہی نظر سے اٹھ گیا اور روح کو چھوڑ کر جسم یا ظاہر کو سامنے رکھ لیا گیا اور اب جو کچھ آنحضرتؐ کی پاک سیرتوں میں لکھا جا رہا ہے وہی کچھ ہے جو دنیادی سیرتوں میں سجایا جاتا ہے۔ جن اخلاق کو دنیاداری پسند کرتی ہے، نبی کے اخلاق کو بھی اسی درجے پر گرانے کو کوشش کی جاتی ہے تاکہ دنیاداروں کے دل متوجہ ہوں۔ بے شک یہ بھی موجودہ دور کا ایک پسندیدہ کارنامہ ہے لیکن جسم میں جان نہ ہو، تو جسم کس کام کا، بجلی کے قمقمے میں بجلی کی لہر نہ آئے تو قمقمے کی خوبصورتی سے اور شیشے کے رنگ برنگ ہونے سے دل پر اور آنکھوں پر کیا اثر ہو گا؟ اب مسلم دنیا اس پر اتر آئی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایک جرنیل کی صورت میں پیش کیا جائے، ایک سیاسی اور انقلابی لیڈر دکھایا جائے۔ ایک دوسرا اٹھتا ہے اور اپنا کمال یہ دکھاتا ہے کہ آپ بہت بڑے تاجر تھے۔ کیا نبوت کی یہی شان ہونی چاہیے کہ اپنے نبی آخر الزمان کو ایک اچھا گڈریا ثابت کرنے میں اپنا قلم توڑا جائے۔

یہ جرنیلی، یہ لیڈرشپ تو ساری دنیا میں پھیلی پڑی ہے اور کوئی ملک اس

Marfat.com

سے خالی نہیں، لیکن وہ تعلق جو آپ کی ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا اور جس درجے کا تھا، آج تو کیا جب سے آپ گزرے کوئی دوسرا دکھا سکتا ہے؟ معجزات، ہم کلامی وغیرہ جو کچھ انبیاء علیہم السلام سے اس تعلق الٰہیہ کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے، وہ بھی اپنی جگہ بہت بلند درجہ کے تعلقات ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو کر ہمکلامی کا شرف حاصل ہونا، یہ آخری اور بلند ترین عرفان کسی کو نصیب ہوا؟ اور فَاَوْحیٰ اِلیٰ عَبْدِہٖ مَا اَوْحیٰ کے پاک الفاظ تو اس درجہ بلندی پر لے گئے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مَا اَوْحیٰ میں کیا کچھ رازہائے درونِ خانہ (حرم قدس) سے آشنا فرمایا گیا اور اپنے علوم سرمدیہ سے کس درجے تک نوازا گیا۔ تاآنکہ یہ بھی فرمانے کی ضرورت ہوئی۔ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغیٰ ہ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْریٰ۔ یہ شناسائی یہ معرفت الٰہیہ آپ کے جسم وجان پر اس درجہ غالب ہوگئی کہ آپ کی ذات اقدس کے ہر فعل اور ہر حرکت کو ذات الٰہی کی طرف منسوب فرمایا گیا، اور فرمایا وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَویٰ۔ اور دوسری جگہ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللہَ رَمیٰ فرمایا گیا۔

غرض آپ کے افکار، آپ کے علوم اور آپ کے اخلاق وعادات سب کچھ اس نشۂ معرفت کی روشنی میں چمکتے اور دمکتے تھے اور تمام کی آبیاری ذات عزاسمہ کی ذات اقدس سے ہر گھڑی اور ہر آن ہو رہی ہوتی۔ اپنا کچھ نہ تھا، سب کچھ ان کا تھا جن کی یہ ساری دنیا ہے اور جن کا بنایا یہ سب کھیل ہے۔ وہ خود شہنشاہ نہ تھے بلکہ خلیفۃ اللہ تھے۔ قل کا لفظ اس پر شاہد ہے۔ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ ہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ ہ قُلِ اللہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ ہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ وغیرہ۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ مثل کیسے؟ ہم سب کچھ خود ہیں۔ اپنے ارادے سے سب کچھ کرتے ہیں اور اپنے خیال سے جیتے، مرتے ہیں، لیکن وہاں یہ کہاں۔ خود کہاں؟ جو کچھ ہیں وہی کچھ نہیں۔ اپنا پتہ تک نہیں، جینا مرنا سب ان کے لیے۔ اپنے لیے نہیں۔

Marfat.com

دنیاوی لیڈر شپ خود ہی خود ہے۔ اس کے اندر کسی کا انعکاس نہیں ہوتا۔ بلکہ سب سے اچھا لیڈر وہی ہے جو اپنے افکار بلند سے سب کچھ بنائے اور بگاڑے، لیکن نبوت و رسالت میں ایک قدم بھی اپنی مرضی سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ ہے حکم کی تابعداری۔

ایسے حالات میں دنیاوی رہنماؤں اور سیاسی پیشواؤں کے ساتھ نبوت کو کھڑا کرنا، ایک مسلمان کو کتنا دکھ دینے والی بات ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس تقابل سے آپؐ کی ذات اقدس کو روشن کرنا مقصود ہو۔ پھر بھی جب تک اصل رشتہ الٰہی کو روشن تر کر کے نہ دکھایا جاوے، یہ تقابل بھی حرام ہے۔ ہمیں تو نبی کریمؐ کی ذات اقدس ایک فقیرِ بے نوا کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ جس کے فقرِ بے نوا نے شہنشاہیت کے پرخچے اڑا دیئے اور جس کے سایۂ ہماپایہ نے دنیا کے ہر خطرہ کو امن میں تبدیل فرما دیا۔ اور جس کی شیریں کلامی نے دنیا کو ذات الٰہی کی طرف متوجہ کر دیا، جس نے دنیا کی خوبصورتی کو ایک بدصورت بڑھیا سے تعبیر کر دکھایا، اور جس نے برائی سے بچا کر ہمیں ہر نیکی کی طرف متوجہ فرمادیا، کفر سے نکال کر مسلمان بنایا۔ اور اس دنیاوی زندگی سے نکال کر اس پاک زندگی کی راہ دکھائی، جو ہمیشہ کے سرور و خوشی سے پرُ ہے۔

کس خوشی کی خبر سنا کے ہمیں
غم کا پتلا بنا دیا تو نے

دنیاوی نظم و نسق کے لیے عقل سب سے بڑی منتظم و مہتمم ہے، لیکن روحانی زندگی یا روح کیلئے اس کے استدلال، اس کے افکار بیکار ہیں۔ لیکن جیسے جسم جان کے بغیر کسی کام کا نہیں ہوتا، اسی طرح عقل قلب و دل کے بغیر کسی کام کی نہیں۔

اقبال مرحوم کہتے ہیں

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

یہ کیوں کہا؟ صرف اس لیے کہ صرف عقل پریشانی کے سوا کچھ نہیں۔ جب

Marfat.com

تک عقل کے ساتھ قلب پاک نہ ہو وساوس و خطرات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ دنیاوی کارسازی کے لیے عقل بڑی دولت ہے۔ لیکن روح کے اطمینان و آرام کے لیے قلب پاک ہی ایک سہارا ہو سکتا ہے۔

خدائے قدوس جو سراسر جان عالم ہے اور ہر مادیت سے پاک ہے اس کو اگر تعلق ہے تو جسم اور مادیات کے ساتھ نہیں، بلکہ روح اور جان کے ساتھ ہے اور روح و جان کا تعلق قلب کے ساتھ اتنا ہے کہ اس کے بغیر زندگی نہیں رہتی، بلکہ موت طاری ہو جاتی ہے۔

نبوت بھی سراسر جان عالم ہوتی ہے اور دنیا کی تمام روحیں، کیا انسان اور کیا حیوان، کیا اشجار اور کیا احجار، تمام کی روحی زندگی نبوت کی روح سے آبیاری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ گو مادی اسباب پر ایمان رکھنے والا اس تخیل پر ایمان نہیں لا سکتا۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے منتخب فرمایا اور جن کو اس راہ محبت میں لگایا اور جن کو اپنی ہستی مطلق کی لو لگائی، وہ پورے اطمینان کے ساتھ دنیا کو یہ راستہ دکھانے میں تازہ دم پائے جاتے ہیں، کہ دنیاوی اسباب و علل کے پیچھے کچھ ایسی روح مطلق کارفرما ہے جس کی عکاسی کے بغیر دنیا ایک منٹ زندہ نہیں رہ سکتی۔

کسی زمانے میں ہر مسلمان کا یہی عقیدہ تھا۔ صرف لفظی نہیں، بلکہ پورے یقین کے ساتھ وہ دنیا کو اس کی دعوت دیتا تھا اور آن کی آن میں مخاطب کو اس پر لے آتا تھا۔ کس سے؟ زبان سے نہیں؟ بلکہ اپنی قلبی شعاؤں سے اور اپنے کامل یقین اور اپنی مستانہ نظر سے۔ لیکن آج کا مسلمان کیا۔ ایک عالم بھی عالم اضطراب میں پھنسا نظر آتا ہے اور دنیاوی علل و اسباب کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہو کہ خدائے ذوالجلال بھی اس کو علل و اسباب کے اندر جکڑا نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں جو کچھ بھی نبوت و رسالت کی بابت کوئی لکھے تو اسی نظریہ کے ماتحت نہ لکھے، تو کیا لکھے۔ جب خود اندھا ہے، تو دوسرے اندھوں سے وہی کچھ کہے گا، جو ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھے گا۔ نہ اپنی نظر ہے اور نہ کسی دوسرے کی نظر سے کام چل سکتا ہے۔ ایسے لوگوں سے

Marfat.com

رہبری کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ لیکن آج کی دنیا بے کار نہیں بیٹھ سکتی۔ اپنی فکر و نظر پر کچھ نہ کچھ دکھانا اپنا فرض خیال کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی آخر الزمان کی صورت و سیرت کا نقشہ مادی خاکے اور سانچے میں ڈھال کر ایک خدمت دین تصور کرتی ہے۔ نہیں، دین کی خدمت تو کجا قومی اور ملی خدمت تصور کرتی ہے۔ نہ خدائے قدوس سے تعلقات کی ضرورت، نہ نبوت سے واسطہ پیدا کرنے کا خیال۔ اپنی نظر و فکر اپنا اللہ ہے اور اپنا شک و گمان اپنا نبی ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

ایسے حال اور وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا اٹھے، جو تعلق باللہ کے ساتھ نبوت سے بھی واسطہ رکھتا ہو اور جس کے افکار و خیالات پورے ایک مسلمان کے خیالات و افکار کی جھلک میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ وہ عالم با عمل ہونے کے باوجود صاحب فکر بھی ہو اور سیرت نبی کریم کو ایک ایسی دلکش صورت میں پیش کرے کہ ہر مسلمان پڑھنے کے بعد حقیقی صورتِ نبوت سے آشنا ہو جائے اور عقل کے پردوں کو ہٹا کر نورِ نبوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے خدو خال سے آشنا ہو کر دین کا حقیقی مفہوم سمجھے اور دین الٰہیہ کو اسکی واحد ذریعۂ نجاتِ دنیا و آخرت سمجھے اور اس پر ایمان لائے۔

فطرت صحیحہ اپنے عمل کو وقتی طور پر چھوڑ سکتی ہے لیکن فراموش نہیں کر سکتی۔ رسالت کی حقیقت اور اس کی تاثیرات نے ہمیشہ قلبی انقلاب پیدا کیے اور ہمیشہ دل کی یہ پیاس اندر ہی اندر ہدایت کا پانی طلب کرتی رہتی ہے اور ہدایت کی خاموش آواز قلوب کو گرماتی رہتی ہے۔ راز فطرت کھولنے والے کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ظاہر فرماتے رہتے ہیں۔ تاثیرات نبوت کیا ہیں؟ کتاب ہدایت کا یہ ایک مضمون ہے۔ ہدایت کے اسی روشن خیال کو ہمارے عزیز مولانا حاجی فضل احمد صاحب خطیب جامع مسجد نور نے روحی تربیت کے بعد اپنے دل و دماغ میں لیا اور ہمیشہ اپنے خطبۂ جمعہ میں بیان کیا۔ ان کی حالت بفضلہ تعالیٰ۔

Marfat.com

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

(خدا معلوم اقبالؒ کا "اسرار شہنشاہی" میں کیا تصور ہو ہمارا تصور و خیال تو یہ ہے کہ اسرار شہنشاہی سے مراد اسرار الٰہیہ ہیں۔ باقی اسرار کیا ہوں گے، افکار ہوتے ہیں اور خیالات) اس مضمون کے عین مطابق ہے۔ جن لوگوں نے آپ کو دیکھا اور آپ سے کچھ سنا، یا جمعہ کی اقتدا کی، ان کو زیادہ بتلانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دوسرے ناظرینِ کتاب خود دیکھ لیں گے کہ ان کی تحریر جادو بھری کیا کچھ لکھ جاتی ہے، جو لکھنے میں نہیں آتا اور کس طرح وہ عقلی حجابات کو ہٹا کر نور مطلق کے اندر چلے جاتے ہیں، اور کس درجہ پر رسالت و نبوت علی صاجہا الصلوٰۃ کے ساتھ ان کو وابستگی ہے، اور کیسے دین حق کی حقیقت کو دیکھتے ہیں اور کس درجہ پر رسالت و نبوت علی صاجہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان کو وابستگی ہے، اور کیسے دین حق کی حقیقت کو دیکھتے ہیں، اور کس درجہ آخرت و قیامت پر ان کا ایمان ہے، اور جنت و دوزخ کے تصور کو یقین کے کس درجہ پر رکھتے ہیں۔ ایک مسلمان کا راس المال یہ کچھ ہی ہے کہ دین کے ہر عقیدے پر حقیقی طور پر ایمان لائے اور دنیاوی معاملات کی طرح ان پر یقین رکھے، اور وقت کے تقاضوں سے بلند ہو کر دین کے تقاضوں کو مقدم خیال کرے اور کسی قسم کی لچک اس کے دل میں نہ ہو صدیقؓ و عمرؓ کے ایمان کی روشنی اس کے دل و جان پر مستولی ہو۔ عثمانؓ و علیؓ کے کردار کا نمونہ ہو۔

کتاب کے نام کئی تجویز ہوئے۔ لیکن ایک دوست کا تجویز کردہ نام انوار الھدے فی سیرت المصطفیٰ اس تالیف و تصنیف کے ساتھ زیادہ موزوں نظر آیا۔ اس نام کا ایک پہلو ظاہر ہے۔ یعنی یہ کتاب انوار الہدیٰ سیرت نبی کریم ﷺ میں لکھی گئی۔ لیکن حقیقی اور باطنی معنے یہ ہیں، کہ مصطفیٰ ﷺ کی سیرت پاک کے اندر ہدایت کے انوار بھرے ہیں۔

Marfat.com

اَللّٰهُ يَجْتَبِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔

اللہ تعالیٰ اپنی (محبت کی) طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہنمائی فرماتا ہے جو اس کی طرف مائل ہو۔

اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہدایت کا سارا سازو سامان ہے۔ لیکن اس نور ہدایت کو حاصل کرنے کے لیے انسانی توجہ اور توجہ کے بعد جدو جہد نہایت ضروری ہے ورنہ ایمانی کیفیات اور صراط مستقیم کا حصول مشکل ہے۔ بزرگوں کا فرمان ہے، کہ "فیض حق ناگاہ مے رسد ولیکن بر دل آگاہ مے رسد"

در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے

اس لیے ایسی کتابوں کا مطالعہ جن سے ہدایت کے اسباق ملتے ہیں اور روحانی بیداری پیدا ہوتی ہے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ازبس ضروری ہے۔

آخر میں مولیٰ کریم سے التجا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صدقے اس روشن کتاب کو قبول فرمائے اور قبولیت عامہ سے اسے سرفراز فرمائے اور اس کی طرف مسلمانوں کو متوجہ فرمائے اور پڑھنے کی توفیق بخشے اور پڑھنے کے بعد اس درجہ ہمارے ایمان کو روشن فرمائے جو ایک مسلمان دل کے لیے ضروری ہے اور جس سے ہماری دینی و دنیاوی فلاح ہو۔ بلکہ وہ دل ہو جاوے جو مؤلف اور مصنف کا دل ہے، تاکہ یہ رشتۂ الٰہی ہمارے دلوں میں پختہ ہو جائے اور نجات اخروی میں کامیاب ہو۔ یہ چند حروف احباب اور مؤلف صاحب کی خواہش پر لکھے۔ ورنہ میں کیا اور یہ لکھنا کجا۔ شاید کہ ان کے ساتھ ہم بھی تل جائیں اور پار نکل جائیں۔ وآخرُ دعْوانا اَنِ الْحمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعالَمِیْن۔

(مقدمہ انوار الہدیٰ فی سیرۃ المصطفی ﷺ)

Marfat.com

# مکتوبات امام ربانی کی تحقیق

## ایک مستحسن کوشش

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ السامی کے مکتوبات ان چند کتب تصوف میں سے ایک ہیں، جو تصوف کا علمی سرمایہ کہلاتا ہے۔ مثلاً "کتاب اللمع"، "فتوحات مکیہ" اور "مثنوی مولانا رومؒ" وغیرہ۔ لیکن مکتوبات قدسی آیات میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان میں شریعت و حقیقت کو ایک کر دیا گیا ہے۔ جسم (شریعت) اور جان (طریقت) کا جو تصور عام ہو چکا تھا، اسے رفع کر دیا گیا اور یہ ثابت کیا کہ شریعت، طریقت ہے اور طریقت شریعت۔ اس طرح علماو صوفیا کو چشمۂ فیضِ رسالت پر مجتمع کر دیا گیا۔ شریعت کے رموز، طریقت کے ذریعہ اور طریقت کے حقائق، شریعت کے آئینہ میں دکھائے گئے ہیں۔

اس چشمۂ ہدایت یعنی مکتوبات مجدد الف ثانی میں مرور زمانہ اور نقل در نقل کے باعث بہت سے اغلاط واقع ہو گئے تھے۔ اور جو نسخے طبع بھی ہوئے وہ بھی ناشرین کی لاپرواہی کے باعث بغیر تصحیح ہی کے شائع ہوئے۔ اس حالت کو دیکھ کر روح مجددیا فیضان قدسی کو جوش آیا اور حضرت مولانا نور احمد نور اللہ مرقدہٗ کے دل میں یہ داعیہ

Marfat.com

پیدا کیا کہ وہ اس سرچشمۂ حیات پر اپنی توجہ اور کوشش صرف کر کے تصحیح اور تحشیہ کے بعد ایک آبگینی صورت میں ان کو شائع کرائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عمر کا ایک حصہ اس پر خرچ کر کے مکتوبات کو نہایت قابلِ قبول صورت میں پیش کیا اور ان کو ان کی معنوی حیثیت کے مطابق ظاہری زینت بخشی۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی اس خدمت جلیلہ کو بنظر استحسان دیکھا گیا۔ اکابر صوفیا اور اہل علم حضرات میں سے جس نے ان مکتوبات اور ان کے قیمتی حواشی سے فائدہ اٹھایا وہ مولانائے مرحوم کے حق میں دعا گو ہوا۔

ایک مدت سے یہ مکتوبات نایاب ہو چکے تھے اور تلاش پر بھی نہیں ملتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے صاحبزادے مولانا محمد سلیمان صاحب نے اپنے والد بزرگوار کی اس خدمت کے فیض کو جاری رکھنے کی غرض سے مکتوبات کو دوبارہ زیور طبع سے مزین کر دیا ہے۔ اور وہ اس کار خیر کو سر انجام دے کر حضرات صوفیا اور علمائے کرام کے شکریہ کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ آمین!

مصحح، مرتب و محشی کتاب کے بارے میں بھی کچھ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے ایک مرتبہ ان کی زیارت کی ہے.......... سرہند شریف آتے جاتے جب موقع ملتا تو میں اپنے شفیق استاد مولانا محمد عالم آسی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ انہوں نے ہی مجھے مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کے تصحیح کردہ مکتوبات کا نسخہ بغرض مطالعہ عنایت فرمایا تھا۔ مگر ان دنوں میری حالت کچھ اور تھی "یعنی صد کتاب و صد ورق در نار کن" ذہن میں تھا۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ استاذی مولانا آسی کی خدمت میں حاضر ہوا، (غالباً قبلہ مرشدم رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے فوراً بعد)، تو مجھے مولانا آسی اپنے ساتھ لے کر مولانا نور احمد نور اللہ مرقدہ کے پاس پہنچے۔ ہم مسجد کی سیڑھیاں چڑھے تو سامنے حجرے میں حضرت چشمہ لگائے تشریف فرما تھے۔ میں تو اسی گوشہ

Marfat.com

صحن میں کھڑا رہا اور میرے شفیق و مہربان آسی صاحب صحن سے گزر کر ان کے پاس پہنچ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس لوٹے تو فرمایا کہ مولانا صاحب فرماتے ہیں۔

"یہ مجذوب کہاں سے لائے ہو"؟

میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ میں کیسا مجذوب ہوں۔ مجھے مجذوب کیوں کہا گیا ہے۔ مگر اب میں مولانا علیہ الرحمۃ کے اس ارشاد پر غور کرتا ہوں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا مرحوم نے صحیح فرمایا تھا اور ان دنوں فی الحقیقت میری حالت ایسی ہی تھی۔

مطلب یہ کہ مولانا صاحب علوم ظاہری کے ساتھ باطنی علوم کے بھی ماہر تھے ......... یہ چند سطور اس لئے لکھ دی ہیں کہ محشی اور مصحح کتاب کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکا ہوں۔

محمد عمر کان اللہ لہ

بیربل شریف

۱۶۔ شعبان ۱۳۸۴ء

(اپریل ۱۹۷۳ء)

(تعارف مکتوبات امام ربانی

تحقیق مولانا نور احمد امرتسری)

Marfat.com

# حضرت میاں شیر محمد شرقپوری اور آپ کا مشرب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ

تذکرہ کا مسودہ مجھے گذشتہ سے پیوستہ سال عرس کے موقعہ پر دیا گیا، تاکہ میں اسے ترتیب دیکر پیش کروں۔ لیکن واقعات اور حادثات نے مجھے اتنی فرصت نہ دی کہ میں احباب سے سرخرو ہو سکتا۔

سب سے پہلے سیلاب عظیم کی قیامت خیز بلا سے واسطہ پڑا اور کئی ماہ تک اس کے غارت کردہ مکانات اور سازو سامان کی مرمت رہی۔ لیکن ابھی یہ مصیبت نہ ٹلی تھی کہ موسمی بخار کی وبا نے آگھیرا، اور تمام کے تمام چارپائیوں کے اوپر سوار ہو گئے۔ پورے چھ ماہ کے بعد جب مسودہ اٹھانے کی فرصت ہوئی تو تشیع کی عالمگیری وبا نے ضلع بھر بلکہ پنجاب بھر میں سر اٹھایا۔ طبیعت نے غیرت کھائی۔ چنانچہ کئی سو صفحے اس

Marfat.com

بارے میں لکھنے پڑے۔ آخر رمضان سے پیشتر چند دن فرصت ہوئی تو مسودہ کتاب پر نظر دوڑانی شروع کی۔ اور کئی بار دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم ہوئی کہ کتاب بعینہ اپنی اصلی صورت میں بلا تغیر الفاظ بلا تبدیل معانی رکھی جائے تاکہ حضرت مصنف (سلمہ ربہ) کے خیالات پر کسی قسم کا غبار نہ آئے۔ اور جس سلسلہ میں آپ نے ذکر رکھا ہے اسی سلسلہ میں اسے رکھنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن چونکہ مسودہ میں کوئی علمی و عملی ترتیب نہ تھی اس لیے مجبوراً ایک علمی ترتیب دینے کی ضرورت پیش آئی۔ اور تمام مسودہ حصہ ثانی (سوانح حیات طیبہ) کو اس کے اندر ترتیب دیا گیا۔

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جس جامعیت کے انسان کامل تھے، اس جامعیت سے آپکی ذات بابرکات پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ حضرت صوفی صاحب سلمہ ربہ مؤلف کتاب ہذا تمام یاران طریقت سے اپنے اندر زیادہ قابلیت رکھتے تھے، کہ یہ فرض طریقت سرانجام دیں۔ کیونکہ جہاں وہ حضور قبلہ علیہ الرحمۃ کے ایک سچے اور برگزیدہ عقید تمند تھے، وہاں آپ کے ایک مونس اور یار غار بھی تھے۔ ساتھ ہی ایک زمانہ ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہونے کا آپ کو فخر حاصل رہا۔ اگرچہ حضرت صوفی صاحب مدظلہ حضرت قبلہ عالم حافظ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے، لیکن حضرت میانصاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پیرومرشد سے کم نہ جانتے تھے۔ اور حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت و محبت کا بھی یہ حال تھا کہ جب کبھی صوفی صاحب سلمہ ربہ آجاتے تو حضرت قبلہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے۔ گھنٹوں نہیں پہروں خلوت رہتی۔ جلوت کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آخری سفر کی تیاری کا ذکر اپنے ان دو مخلصوں سے بیان فرمایا جس میں تیسرے کی گنجائش نہیں۔ ایک یہی ہمارے صوفی صاحب سلمہ ربہ، اور دوسرے قاری اللہ بخش صاحب علمہ ربہ۔ اور ہر دو نے مجھ سے باین الفاظ ذکر کیا کہ آپ نے ہم دونوں کو الگ الگ فرمایا کہ جی تو چاہتا ہے کہ کسی وقت تم دونوں کو بلا کر خود قبرستان (ڈاہرانوالہ) میں چلا جاؤں اور باہر ہی کیکروں کے

Marfat.com

نیچے بیٹھے لیٹے کام ہو جائے ،اور تم خاموش مجھے کسی جگہ ڈال دو۔

اندازہ فرمایئے کہ یہ کس قسم کا دوستانہ تھا، کس قسم کی محبت تھی اور کس قسم کی معیت ذاتیہ تھی۔ کہ مرے ہوئے بھی یہ چاہا کہ ان دوستوں کے ہوتے ہوتے رفیق اعلےٰ سے وصال کیا جائے۔ اللّٰہُ اکبرُ!!!

ایسے حالات کے ہوتے ہوئے حضرت صوفی صاحب سلمہٗ ربہ سے بڑھ کر کون تھا، جو اس فرض کو انجام دیتا۔ آپ جہاں یار غار ہیں وہاں صاحب دل اور اہل بصیرت بھی ہیں، اور خدا کے فضل و کرم سے دماغ بھی عالی رکھتے ہیں۔

ان حالات نے حضرت مؤلف مدظلہ کو مجبور کیا کہ اس میدان میں کود پڑیں۔ باوجودیکہ آپ اہل قلم تو کجا محض امی ہیں۔ لیکن جہاں عرفانی علوم اپنا قدم جماتے ہیں وہاں رسمی علوم کی واقفیت اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ رسمی علوم علم لدنی کے لیے دھبہ قرار پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات نے رسمی علوم سے فارغ رکھا۔

حضرت مؤلف بھی ان پاک نفوس سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خاص امتیاز اس امر میں بخشا ہے۔ باوجودیکہ آپ نے ایک حرف بھی کسی سے سیکھا نہیں، لیکن ہزاروں عالموں سے بڑھ کر آپ کے معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اگر ایک طرف آپ کو نقلی علوم کا بحر ذخار دیکھا جاتا ہے، تو دوسری طرف عقلی علوم کا بحر بے کراں کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب ہذا خود اس کی شہادت دے گی۔

لیکن خیالات صاف اور ستھرے اسی وقت تختہ قرطاس پر آتے ہیں۔ جب صاحب خیال اپنے خیال اپنے قلم کی نوک سے سمجھائے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی قلم کی نوک جنبش سے کسی کے خیال کو ستھرا یا صاف کرنا چاہے تو یا کمی ہوگی یا بیشی۔ صاف آئینہ وار انکا اصلی چہرہ اصلی خط و خال ہرگز نظر نہ آئیں گے۔

یہی دقت ہمارے مہربان مکرم مؤلف صاحب کو پیش آئی کہ ان کے خیالات پر کئی ایک دوستوں کے تحریری لباسوں سے ایک نرالی حالت پیدا ہوگئی۔ سرورق خود

بتلا رہا ہے، کہ کسی ایک کاریگر کی گلکاری کی یہ کتاب رہین منت نہیں۔ بلکہ "ہر گلے را رنگ وبوے دیگر است" ہر ایک نے ایک ایک تازہ رنگ بھر دیا، اور مشورہ دینے سے کتاب کی صورت میں ایک تغیر عظیم پیدا کر دیا۔

اس لیے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اب کسی قسم کا تصرف کتاب ہذا میں کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی میرے لیے مشکل تھی کہ کسی ایک موقعہ کی تحریف و تبدیلی سے کئی دوسرے موقعوں کو ردوبدل کرنا پڑتا تھا جس کے لیے میری طبیعت میں اس قدر مضامین نہ تھے۔ اس لیے ترتیب کے بغیر کسی لفظ کو چھوا نہ گیا۔ بلکہ عبارات جوں کی توں نکال کر جما دی گئیں۔

ترتیب میں بہت جگہ کمی باقی ہے۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق اکثر اذکار کو کرامات تصرفات وغیرہ سے نکال کر اوصاف میں شمار کر دیا، تاکہ وہ پوشیدہ پہلو (جس کی طرف سوائے باریک بین صاحب بصیرت کے کسی دوسرے کی توجہ مشکل تھی) ظاہر وباہر اور عام فہم ہو جائے۔ ورنہ تمام اذکار تمام حالات وواقعات باب الولایۃ کے نیچے آسکتے تھے۔

اسی طرح وہ تمام اذکار جو دو رخہ سہ رخہ عنوانات کے اندر آسکتے تھے کسی کو تو کسی مناسبت سے ایک باب میں داخل کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اسی جیسے ایک دوسرے ذکر کو دوسرے باب میں منتقل کر دیا تاکہ دونوں پہلو روشن ہو جاویں۔ مثلاً تبلیغ ہے تو پہلے کمالات میں دکھایا گیا کہ ایسے طریقہ سے تبلیغ فرماتے تھے جس کی نظیر آج مشکل ہے۔ پھر عادات کے اندر یہ تبلیغ دکھا کر آپ کی عادت مبارکہ کا نقشہ دکھانے کے لیے ذکر کیا گیا۔

بعض اذکار ایسے ہیں کہ اصل ذکر کا تعلق تو ایک باب سے ہے لیکن اس کے مالہٗ وما علیہ کا تعلق دوسرے باب سے۔ تو کسی میں ابتدا کا خیال کر کے اسے ایک باب میں شامل کیا گیا، اور کسی میں انتہا پر نظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے باب میں رکھا گیا۔ مثلاً ارشادات کے اندر شاید دوسرا یا تیسرا ذکر اوصاف کی سرخی لیے ہوئے ہے، لیکن حضرت مؤلف کی طرف سے جو اضافہ ہوا وہ اس کو معارف میں لے نکلا۔ چنانچہ ہم نے

Marfat.com

اس کو معارف کے اندر رکھ دیا۔

کتاب کے اندر ایسی فوری تبدیلی دیکھتے ہوئے ناظرین نہ گھبرائیں، بلکہ اس کی مصلحت پر توجہ فرما کر ہمیں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے معذور بھی خیال فرمائیں۔

کتاب ہذا کا گو ظاہراً مقصد یہی قرار دیا گیا ہے کہ یہ اعلیٰ حضرت قبلہ مرشدم میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات طیبہ ہے۔ لیکن در حقیقت یہ ایسا نہیں بلکہ تصوف حقیقی اور اسلام مجازی کا خاکہ دیا گیا ہے یا بالفاظ دیگر یہ ''خزینۃ التصوف'' کہلانے کی مستحق ہے۔

حضرت مؤلف نے زیادہ زور اپنا اسی میں صرف فرمایا کہ حضرت قبلہؒ کے حالات و کیفیات کو دیگر حضرات متقدمین کے ساتھ وابستہ کر کے دکھایا جائے اور احادیث نبویؐ سے ان کی تفسیر کی جائے۔ اگرچہ کتاب حقیقی معنوں میں نہایت مفید اور کامیاب تصنیف ہے لیکن حق یہ ہے کہ اصل میں جس غرض اور مقصد کے لیے قلم اٹھایا گیا تھا اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

بیشک ہمارے حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر یہ فاخرانہ الفاظ ہوتے تھے کہ ''خان صاحب محمد حسن خاں (مؤلف حالات نقشبندیہ) نے حالات نقشبندیہ لکھ کر بڑا احسان کیا کہ تمام مشکوٰۃ کو اس کے اندر بھر دیا''۔ یعنے طریقہ نقشبندیہ کے تمام سلف و خلف رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے حالات کو سنت نبویہ علیہ التحیۃ والسلام کے ساتھ منطبق کر دکھایا۔ اور یہی بات آنقبلہ بابرکات کو منظور بھی تھی، کہ آپ کے حالات میں بھی یہی رنگ دکھایا جائے۔ لیکن جس جامعیت اور کمال کی، آپ کی ذات بابرکات تھی اس حیثیت کی سوانح کا لکھا نہ جانا باعث افسوس ضرور ہے۔

یوں تو متعدد کتب آپ کے حالات میں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں، اور لکھی جائیں گی۔ لیکن ہمارے دل کی پیاس تو اس وقت بجھے گی جبکہ آپ کا ایک ایک حال ایک ایک عمل بلکہ ایک ایک حرکت و جنبش اوراق کے اندر ضبط ہو کر ہماری بینائی کا باعث ہوگی۔

کسی کو آپ کے حالات و کیفیات کے جوڑ توڑ تعلق و بے تعلقی سلف اور خلف علیہ الرحمۃ کے ساتھ دیکھنے کا شوق ہو تو ہوا کرے۔ لیکن ہمیں تو صرف عشق و محبت ہے تو آپ کے حالات سے، آپ کی کیفیات سے۔

کسی بزرگ نے کسی بزرگ کے خادم سے پوچھا تھا کہ تم اپنے پیر کو اچھا جانتے ہو یا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو۔ اس نے عرض کیا کہ اپنے پیر کو۔ اس پر فقیر صاحب بہت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا، کیوں؟ اس نے عرض کیا کہ مدت سے حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر تھا لیکن جیسا تھا ویسا تھا مگر جس دن سے حضور کی غلامی کا فخر حاصل ہوا تو انسان ہو گیا۔ فقیر صاحب کا یہ جواب سننا تھا کہ خوش ہو کر ان سے بغل گیر ہوئے کہ واقعی تمہارا خیال درست ہے۔

سو اپنی حالت تو یہ ہے کہ کتابوں کے ڈھیر پڑھے تھے، تراجم و تفاسیر کی اوراق گردانی کی تھی، تصوف کے ذخیرے الٹے تھے، لیکن جب سے اس مایۂ ناز ہستی کے قدموں کی شرف یابی ہوئی انہی کتابوں اور انہی تفسیروں سے کچھ اور نظر آنے لگا۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

اب ہم حیران ہیں کہ کس کو مقدم رکھ کر اپنا ایمان دیکھیں۔ تصوف کا بے بہا ذخیرہ یا آپ کی ذات ستودہ صفات!

آج ساڑھے تیرہ سو برس کا زمانہ گزر گیا، کہ حضرت خیر البشر ساقی حوض کوثر فخر موجودات ﷺ اس دار فانی سے رحلت فرما کر مدینہ طیبہ کی مقدس زمین میں سو گئے۔ لیکن جس دن سے حضرت قبلہ میاں صاحب کی زیارت نصیب ہوئی، اسی دن سے خیال ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے کمال فضل و کرم سے اپنے حبیب ﷺ کی زیارت سے اس آخری زمانۂ پر فتن میں بہرہ ور فرمایا۔ مولانا سوہاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیر کی صفت میں کیا خوب فرمایا ؎

Marfat.com

مدینے تک نہیں پہنچن جسے دا
ویکھے وچ بیربل نائب نبی دا

سو دوستو ہم نے بھی نائب نبی ﷺ کو دیکھا! اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ!!!

ایک بار حضرت میروی رحمۃ اللہ علیہ تذکرۃ الاولیاء مصنفہ حضرت مولانا عطار رحمۃ اللہ علیہ سن رہے تھے کہ قاری (کتاب خوان) نے یہ الفاظ پڑھے "کہ جنید رادیدہ بود"۔ ایک طرف یہ پاک الفاظ نکلے۔ دوسری طرف حضرت قبلہ کے آنسو پھوٹ آئے۔ آپ بار بار اس جملہ کو دہراتے تھے اور آنسو چھم چھم برس رہے تھے۔ کیونکہ حضرت قبلہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا چہرۂ پاک آپ کے سامنے آگیا تھا۔

سو ہم نے بھی دنیا میں آکر کچھ دیکھا سنا نہیں، اور نہ کچھ کیا کرایا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ جنید رادیدہ بود کا فخر حاصل ہے۔ ہمیں کیا ضرورت کہ کسی دوسرے جنید سے اپنے جنید کے نازوادا ملاتے پھریں اور مناسبت دیکھتے پھریں۔ عشق ہو مصلحت آمیز تو ہے خام ابھی"۔ ہمیں مناسبت سے کیا واسطہ۔ وہ لوگ جانیں جن کے وساوس باقی ہیں۔ ہمارے ہاں تو وساوس کی دھجیاں بھی نہیں۔ اس عشق جنون آمیز نے اڑا کر بکھیر دیں! اللہ اکبر!

آپ کی ذات بابرکات میں اللہ تعالیٰ نے وہ کچھ چن چنا کر رکھا تھا، جو دوسرے بزرگوں کے لیے فرداً فرداً عنایت فرما کر انہیں سرفراز فرمایا۔ کسی کو بقا کے انتہائی مرحلہ پر جا بٹھایا۔ کسی کے ہاتھ میں ہمت کا بلند جھنڈا دیا۔ اور کسی کے سر پر "عقل کلی" کا تاج رکھا۔ کسی کو دم مسیحائی دیا۔ اور کسی کو عصاء موسوی سے سرفرازی بخشی۔ لیکن ماں باپ کا کوئی ایک بیٹا ہوتا ہے جس کو ان تمام انعامات سے سرفراز فرماتے ہیں۔ پیغمبر لاکھوں گذرے لیکن حضرت عبداللہ کے صاحبزادے اور حضرت آمنہ کے فرزندار جمند کے لیے روز میثاق نے فیصلہ کر دیا تھا ؎ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ کسی دوسرے کو یہ دولت نصیب نہ ہوگی۔

میری بات سن کر ناظرین کہیں گے "منہ چھوٹا بات بڑی" لیکن جو زبان پر

Marfat.com

آجائے اسے روکنا بھی تو منافقت کا ملہ ہے۔ لیکن اپنی زبانی نہ سہی، کسی کی زبانی تو آپ کتاب ہذا کے اندر دیکھ لیں گے کہ جو راہ چار آدمیوں کو دیا گیا ہے وہ کسی دوسرے کو عنایت نہیں ہوا، (۱) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ (۲) حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ (۳) خواجہ ابوالحسن خرقانی رضی اللہ عنہ (۴) وہ جن کے بارہ میں آپ خاموش ہو گئے۔ یعنے آنجناب قدوۃ السالکین رضی اللہ عنہ۔

یہی وجہ تھی کہ تمام سلاسل عالیہ کے متوسلین جب آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، تو آپ کی ذات گرامی میں اپنے سلسلہ کی پوری مناسبت اور اپنے پیر و مرشد کی کامل نسبت دیکھتے تھے۔

اخوی ام مولوی فخر الدین صاحب چشتی سلمہ،جب آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے تو آپ پر توحیدی مشرب اتنا غالب پایا، کہ نقشبندی نسبت (بیخودی و بے کیفی) بالکل معدوم نظر آئی۔ پورے ذوق وشوق میں آپنے کئی اشعار توحیدی اپنی محویت تامہ میں پڑھے۔ ایسا ہی جب قادری نسبت کے بزرگ آپ کی خدمت عالیہ میں تشریف لاتے تھے، تو بعینہٖ قادری نسبت کا نور آپ کے وجود سے ٹپکتا تھا، اور "اندر بھی ہو اور باہر بھی ہو" نظر آتا تھا۔

اس دور متاخرین میں کوئی ایسا ولی اللہ (بلند ہستی) نظر نہیں آیا جس میں تمام نسبتیں یکساں چشمہائے آب حیات کی طرح موجزن ہو کر ہر سلسلہ کے لیے "فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ" کے مطابق ہر سلسلہ کے تشنہ لبوں کے لیے سیرابی بخشیں اور راندے فاندے اپنا حصہ ازلی مناسبت کا کامل طور پر حاصل کریں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ کا معاملہ ہے اور بس!

اسی موہبت عظمیٰ کا نتیجہ تھا کہ موجودہ وقت کے اکثر متوسلین حق تلاش نے اپنے شیخ الطریقت کی حیات طیبہ میں بھی آپ کی زیارت اور آپ کے القاء کو اپنے لیے آب حیات خیال کیا۔ اور آنقدوۃ السالکین نے بھی جبلی فطرت عالیہ کی وجہ سے یگانہ و بیگانہ میں کوئی تمیز نہ فرمائی۔ لیکن واہ رے کمال نسبت!! کہ کسی کو اپنے شیخ الطریقت

Marfat.com

کے اور اد واذ کار کے علاوہ کبھی بھی کچھ نہ فرمایا۔ بلکہ نسبت القائی کا عکس ڈالتے ہوئے اتنا فرمادیتے کہ اپنے پیر و مرشد کا کہا کیئے جاؤ، برکت ہو گی۔ اور اگر کوئی بلند نسبت بزرگ پیر و مرشد ہوتے تو ان الفاظ سے اپنی کسر نفسی کی شان ادا فرماتے کہ ''ذرا اسوچو تو سہی! کونسا دل چیر کر تم کو انہوں نے تلقین فرمائی! کرتے جاؤ ضرور فائدہ ہو گا۔ لیکن ان الفاظ کے اندر وہ فیض اور برکت ہوتی کہ فی الفور سالک کی حالت بدلتی ہوئی اسے محویت کے عالم میں لے جاتی اور استغراق تمام اسے گھیر لیتا، اور جو سالہا سال میں اپنے پیر و مرشد کے جوش قلبی سے اسے حاصل نہ ہوا تھا، وہ ایک منٹ کے اندر حاصل ہو کر اسے محو حیرت کر دیتا۔

اکثر محبت بھرے الفاظ کے ساتھ گاہے پیشانی طالب پر ہاتھ مبارک پھیرتے۔ اور گاہے سینہ پر اور کبھی قلب کو اپنی شہادت کی انگلی سے ذرا سی ٹھینس لگاتے۔ لیکن شہادت کا لگنا بارود کو آگ لگنا ہوتا تھا، کہ قلب اپنی حرارت سے مشتعل ہو کر اپنی ہستی کو خاک سیاہ کر بیٹھتا، اور خود ماسوا اللہ سے فارغ (ہو کر) مشعل نورانی کی طرح چمکنے دمکنے لگتا، اور عینی مثال العشق نار یحرق ماسوی اللہ کی نظر آجاتی۔

اسی مناسبت لم یزلیہ نے آپ کے تعلقات روحانی تمام سلاسل کے بزرگوں کے ساتھ وابستہ کر رکھے تھے۔ اگر ایک طرف مکان شریف کو اپنا پیر خانہ خیال فرما کر متوجہ رہا کرتے تھے، تو دوسری طرف خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو سر تاج عرفا دیکھتے ہوئے آپ دوچار رہتے۔ شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ سے اتنی محبت تھی کہ ہر گھڑی ان کے اشعار پڑھ کر حاضرین کے دلوں کو چیرتے تھے۔ اور جہاں سرہند شریف کے پاک روضے کی محبت آپ کو بے تاب کر رہی ہوتی، وہاں علی احمد صابرؒ کی فنا پسند مزار آپ کو اشتیاقانہ نگاہ سے بھی بلاتی تھی۔

اگر حضرت پیر بلوی علیہ الرحمۃ کی پاک صورت و سیرت کے بیانات سے آپ کے لب مبارک متحرک رہتے تھے، تو خواجہ اللہ بخش صاحب تونسوی علیہ الرحمۃ کے اس ملفوظ کا بھی بار بار تکرار فرماتے، کہ خواجہ اللہ بخش صاحب فرمایا کرتے تھے، کہ

Marfat.com

"صفاتی اسماء میں بے انتہا برکات ہیں۔ اور یا کریم یار حیم پڑھنے کا ارشاد اپنے متوسلین کو فرمایا کرتے تھے" آغا سکندر شاہ صاحب کے کمالات کے اگر آپ ہر موقعہ پر معترف نظر آتے تھے تو حضرت قبلہ شمس العارفین سیالوی کا ذکر بھی درد بھرے الفاظ میں فرماتے کہ وہ انگریزوں کے اندر بھی رہے، اور انگریزوں سے باہر بھی۔ یعنے باوجودیکہ انگریزی حکومت کے اندر تھے، لیکن حکومت انگریزی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گویا کہ ان کی حکومت سے باہر تھے۔ حضرت للہی کے متوسلین اگر سامنے آجاتے تو جوش محبت سے انہیں اپنی بغلگیری کا شرف بخشتے، تو ساتھ ہی حضرت میروی علیہ الرحمۃ کے دامنگیروں پر نگاہ الفت کی توجہ سے کام بالاتر فرمادیتے۔

اسی نسبت کو دیکھتے ہوئے حضرت شاہ ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع عام میں بمقام مزنگ فرمایا کہ "اس بوڑھے سے تو یہ بچہ ہی بڑھ گیا"۔ حضرت شاہ صاحب کے کمالات میں کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن یہ جنبش کچھ اور تھی، اور وہ جنبش کچھ اور۔ گو جلال و جمال متقابل صفات سے ہیں، لیکن کون ہے جو جمال کی آبیاری اور سیرابی کے مقابل جلال کی آتش فشانی اور تپش کو پسند کرے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ایثار جو کمالات ولایت اور کمالات نبوت کی جڑ ہے، اتنا بارگاہ ربوبیت سے نصیب ہوا تھا کہ فی زمانہ یہ دولت اتنی بڑی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ جو کچھ آیا راہ مولا پر خرچ کیا۔ اپنی گذران ایک سادہ اور معمولی انسان کے سوا نہ تھی۔ جمع و خرچ کا خیال تک عمر بھر نہ رہا۔ پہلے خرچ کیا، پھر ادا کیا۔ باقیات الصالحات (تعمیرات مساجد واشاعت کتب) کے سوا ایک حبہ بھی کسی جگہ کے مصرف پر خرچ نہ کیا۔ شان کریم کی بے انتہا جلوہ گری کا یہ عالم تھا کہ انسان تو انسان کتوں اور پلید جانوروں تک کا خیال دامنگیر رہا کرتا تھا۔

ایک خادمہ نے گذشتہ عرس کے موقعہ پر ذکر کیا کہ جاڑے کے موسم میں ایک بار صبح سویرے گھر پر تشریف لائے اور فرمایا جلدی حلوئی تیار کرو لیکن تر و تازہ ہو اور بہت سا۔ خیال آیا کہ شاید کسی مہمان کے لیے ہو گا۔ ہم نے جلدی عمدہ اور تر و تازہ حلوئی تیار کر رکھا۔ آپ آئے اور فرمانے لگے کہ ایک چوڑے برتن میں ڈال کر ٹھنڈا کر

Marfat.com

دو اور آپ یہ کہہ کر باہر تشریف لے گئے۔واپس آئے تو ایک کتیا مع بچوں کے اپنے ہمراہ لائے۔ حلویٰ اس کے سامنے رکھ دیا۔ جوں جوں وہ کھاتی تھی آپ کی طبیعت ہلکی ہوتی جاتی تھی اور بار بار فرماتے تھے کہ بیچاری تمہیں سردی نے بہت تکلیف دی! اور کھالے !اور کھالے !!

الغرض جب وہ پیٹ بھر چکی تو چپکے سے آپ کے بستر پر جا بیٹھی۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا یہ بستر یہ برتن تیرے ہی ہیں۔ مزے سے لیٹی رہ !اور مزے سے کھاتی رہ!!

اگر بایزید علیہ الرحمۃ کو جنگل میں کوئیں سے پانی پگڑی اور ٹوپی سے نکال کر کتے کو پلانے سے ولایت اور قطبیت نصیب ہوئی، تو کون باانصاف انسان ہو گا کہ اس واقعہ کو اس واقعہ سے بڑھ کر دیکھتا ہوا آپ کی اولوالعزمی اور آپ کے ایثار اور محبت کو ان سے کم دیکھے گا۔ ایک واقعہ نہیں سینکڑوں درد بھرے محبت بھرے واقعات ہیں، جن سے آپ کی طبیعت کی جبلی فطرت، انکساری اور ایثار نفسی کا پتہ لگتا ہے۔

ولی جب اخیر عمر میں پہنچتا ہے، تو ولایت اپنے انتہائی کمالات پر پہنچ جاتی ہے اور وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی اور وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی کی صحیح تعبیر ولی کی ذات ہو جاتی ہے۔ اس وقت کسی قسم کی کمی نہیں رہتی۔ ابتلا و فقر کا زمانہ گذر چکتا ہے اور فراخی و غنا آکر پاؤں چومتے ہیں۔

حضرت قبلہ مرشدم رحمۃ اللہ علیہ بھی اس آخری زمانہ میں ان آیات کی ہو بہو عینی تفسیر ہو چکے تھے اور سینکڑوں روپے اور بیسیوں تھیلیاں روزانہ آپ کی دست بوسی کے لیے تڑپا کرتی تھیں۔ لیکن آپ اتنا ہی قبول فرماتے جس سے مصارف لنگر کا قرض ہی اُترتا۔ اور وہ بھی جو با اخلاص مرید کے اخلاص سے بھرپور ہوتی تھی۔ ورنہ جیسے بھری آئیں ویسے بھری جائیں۔

غرض نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات کی طرح کبھی ایک حبہ بھی گھر میں نہ رہنے دیتے۔ اور تمام یارانِ طریقت و مخلصانِ حقیقت سے بھی اسی کی امید رکھا کرتے تھے۔ ایک دن کسی صاحب مجاز سے گفتگو میرے سامنے ہوئی، کہ لطائف کیا ہیں؟

آپ نے تمام وجود کے ذرہ ذرہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ یہ تمام لطائف ہی لطائف ہیں۔ لیکن یہ کہا کہ نسبت تو ہو صدیقی۔ لیکن گھر ہو پیسوں سے بھرا ہوا۔ کیا صدیقؓ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟ یا ایک دمڑی بھی گھر نہ تھی؟

کمالات نبوت کی یہ شان تھی، کہ اتباع سنت کے سوا ذرا سی جنبش بھی پسند نہ فرماتے اور اس کے بر خلاف کسی کو دیکھنا پسند بھی نہ فرماتے۔ اکثر آپ کی زبان پر یہ جاری رہا کرتا، کہ اگر سنت نبی کریم ﷺ کے سوا کسی غیر مشروع فعل کو مسلمان دیکھے تو ایسے ہو جائے جیسے بھوکا بھیڑیا بکری پر۔ اس میں یگانے اور بیگانے برابر تھے۔ ظاہر و باطن میں یکساں۔ خلوت اور جلوت میں مساوی۔ غرض ایک قلیل عرصہ میں اتباع سنت کی روح تازہ کر دی۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے اس مہتمم بالشان فرض کی ہدایت فرمائی، اور شاہ راہ سنت پر قدم زن ہونے کی تاکید فرمائی۔ اور حقیقی اسلام کی ایک ٹھوس اور سادہ عمارت قائم فرما کر رخصت ہوئے۔

لیکن یہ وہ وقت تھا جب کہ دنیائے اسلام سنت اور اتباع سنت کے نام سے بھی ناواقف ہو چکی تھی۔ اور دہریت و فلسفیت کی فضا نے حلقۂ اسلام کو اندھا کر رکھا تھا۔ ایسے وقت اتباع سنت کی دعوت دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور مشیت ایزدی کی سنت جاریہ نے ایک ایسی ہستی پیدا کر دی جو اس کفر و الحاد کا مقابلہ کر سکے۔ اور اپنے اندر اتنا جوش اتباع سنت رکھے کہ ہر کہ ومہ سے جہاد فی سبیل اللہ کر کے اسے اتباع سنت کے مسلک پر چلانے کی ہمت کرے۔

چنانچہ آپ نے اپنی عمر کا تمام وقت تمام خیال اسی پاک جذبہ کی تکمیل اور تعمیل میں صرف فرمایا۔ کشف اور کرامات اور تصرف جو کچھ بھی آپ سے ظہور پذیر ہوئے وہ اسی اتباع سنت کی تکمیل کے لیے ظہور پذیر ہوئے۔ ورنہ آپ کو جذب و خروش سے، اور کشف و کرامات سے بہت نفرت تھی۔ کسی خادم کو اگر جذبہ الفت بیقرار کرتا ہوا یا اشعار توحید سے اپنی گرمی بجھاتا ہوا یا نعت رسول ﷺ سے اپنے دل کی تسلی کرتا ہوا آپ دیکھ پاتے تو نہایت بے تابانہ فرماتے کہ کبھی مجھ پر بھی یہ بھوت

Marfat.com

سوار تھا۔ ہو ہائے سے کیا فائدہ ؟ انسان سر اسر حال اور سر اسر عمل ہو جائے۔ زبانی جمع و خرچ سے کیا فائدہ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کا دستور چلا آتا ہے کہ نبی اور ولی کو اپنے زمانہ کی ہدایت کے لیے ایسے معجزات و کرامات عطا کیے جاتے ہیں جن سے اس زمانہ کے لوگ متاثر ہو کر خدائے ذوالجلال کی توحید کے سامنے سر بسجود ہوتے چلے جائیں اور انکار کا چارہ نہ رہے۔

حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ والصلوۃ السلام کو عصائے موسوی اور ید بیضاء سے شرف بخشا۔ اور حضرت عیسے علی نبینا علیہ السلام کو بے پدر پیدا فرما کر گہوارہ میں گویا کیا۔ پھر دست مسیحائی کا وہ دلربا معجزہ دیا کہ اندھے بینا ہوتے گئے، لنگڑے چلتے گئے۔ اور کوڑھی اچھے ہوتے گئے۔ لیکن حضرت خیر البشر ﷺ کو وہ معجزانہ کلام مجید عنایت فرمائی جس کی آج تک نظیر پیش نہ کی جا سکی اور نہ کی جا سکے گی۔ یہ کیوں ؟ صرف اپنے زمانہ کے مذاق اور معاشرت کے مطابق انہیں معجزات بخشے گئے، تاکہ کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔

نبوت ختم ہوئی اور ولایت کا زمانہ آیا، تو اولیاء اللہ بھی اسی سنت اللہ کے مطابق اپنے اپنے وقت کے موافق کرامات سے سر فراز کیے گئے۔ کوئی توحیدی مشرب میں نغمہ زن ہدایت ہوا، اور کوئی رسولی طریقہ پر دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دہندہ ہوا۔

مجددی زمانہ میں بدعات نے زور پکڑ لیا، اور عقاید کی اندر فتور واقع ہو گیا۔
حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو علمی جہاد کی سخت ضرورت تھی تاکہ بدعات کا قلع قمع کیا جائے اور عقاید کو درست اور صحیح مسلک پر لایا جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تمام عمر صرف اسی جہاد میں خرچ فرمادی۔ تاہم اسلامی دنیا فقر و ولایت کی منکر نہ تھی، اور توحید و رسالت کی بھی مقر تھی۔ البتہ فروعات کے اندر بہت کچھ اختلاف واقع ہو گیا تھا۔ ظاہری علمائے کرام اہل باطن پر بدظن تھے اور اہل باطن اہل ظاہر سے متنفر۔

Marfat.com

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ والغفران نے دونوں کو یک جا کر دکھایا، اور اختلافی حیثیت کو دور کر کے ایک ہی مسلک پر قدم زن ہونے کی دعوت دی۔

لیکن موجودہ وقت نے کچھ اور ہی رنگ اختیار کیا کہ اسلامی دنیا بالکلیہ اسلام اور صاحب اسلام سے ناواقف ہو چکی تھی۔ ولایت تو کجا، خود اسلام پر ہزارہا طعنے، ہزاروں شکوک ان کے دلوں میں پیدا ہو گئے تھے اور ہر ایک امر میں تقلید فرنگیانہ پیش نظر ہو گئی تھی۔ جس کسی کو دیکھو، وہ سائنس و فلسفہ سے استدلال طلب کرتا ہے، قول و فعل رسول ﷺ بھی ایک فلسفیانہ حیثیت سے پرکھے جانے لگے اور خدائی کلام بھی فلسفیانہ نگاہ سے سمجھی اور پڑھی جانے لگی۔

ایسے وقت میں ایک ایسے کامل ولی اللہ کی ضرورت تھی جو فلسفہ واستدلال کی دھجیاں اڑا دے، اور عقل و فکر کے پرخچے کر دے، اور دنیا کو اپنی آنکھوں وہ کچھ دکھانے جو فلسفہ واستدلال سے بالاتر ہو، اور جس کے دیکھنے کے بعد خدائے ذوالجلال کے وجود باجود کی ہستی میں ذرہ بھی تردد نہ رہے، اور نبی کریم ﷺ کے رتبہ "لولاک" میں ذرہ بھر شک نہ رہے، اور معراج جیسے بلند از خیال واقعہ کو اپنی ایمانی بصارت سے تسلیم کرا دے۔

سو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات نے اپنے محض فضل و کرم سے اپنے برگزیدہ ولی یعنی حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات کو اس درجہ بلند کے لیے منتخب فرمایا، اور وہ کچھ آپ کی ذات بابرکات کے اندر رکھا جو ولایت کی جان تھی۔ اوصاف تھے تو یگانہ، اخلاق تھے تو فاضلانہ، کمالات تھے تو واہبانہ۔ کشف و کرامت اور تصرف والقا کا یہ انداز تھا کہ ہر ایک دیکھنے والا حیرت میں آجاتا تھا۔ اور اپنی پوری تشفی کے بعد اپنے ایمانی تیقن کو اس درجہ پر دیکھتا تھا، جس درجہ متقدمین لوگ اپنے اندر دیکھا کرتے تھے۔ گو سائنس و فلسفہ نے موجودہ دور کی باطن بین آنکھوں کو اندھا کر رکھا تھا۔ لیکن جب کبھی کوئی آکر پیش ہو جاتا تو آپ کا نورِ ولایت اس کے تمام حجابات ظلمانی فوراً دور کر دیتا۔ اور وہ گھڑی کی گھڑی میں اپنی تمام نفسانی ذمائم کو داغہائے سیاہ کی طرح اپنے وجود کے اندر ایک ایک کر کے دیکھ پاتا اور از سر نو نور اسلام کے اندر

Marfat.com

داخل ہونے کے لیے تڑپتا۔

دنیائے اسلام میں لاکھوں ایسی پاک ہستیاں ہو گذری ہوں گی اور گذرتی رہیں گی، جو ولایت کے بلند مرتبہ پر فائز ہوں۔ لیکن اس درجہ کی پاک ہستی جو ان اوصاف یگانہ اور کمالات متفردانہ کی مالک ہو، محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ اس راہ ولایت میں تمام معاملہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ الآیہ پر ہے اور بس! کسب کو اس سے کیا نسبت!!!

فنا وبقاء جو ولایت کے درجہ کی جان ہے اس کی بابت کیا عرض کیا جائے۔ دیکھنے والوں کو خود معلوم ہے کہ آپ کس درجہ کی فنا سے ممتاز تھے۔ آپ کی زبان مبارک ہر وقت حضرت علی احمد صابر کی فنا کا سبق دیتی تھی۔ "ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے۔ تیری ہستی کی رنگ وبو نہ رہے"۔ آپ کی بلند فنا ہی تھی کہ بازاروں میں جاتے جاتے بے اختیار زبان سے کہلاتی کہ یہ کب فنا ہونگے۔ اور یہی فنائے بلند تھی جس نے اپنے جسمانی کون وفساد کو ان سادہ لفظوں میں ادا کر دیا کہ جی تو چاہتا ہے کہ ڈاہڑانوالہ (قبرستان) میں کیکروں کے نیچے اٹھتے بیٹھتے لیٹتے کام ہو جائے"۔ یہی فنا تھی کہ زائرین کی آنکھوں سے خون کی ندیاں بہانے لگتی اور آن واحد کے اندر تمام دنیا فنا ہی فنا نظر آتی اور تمام کائنات اور اپنی ہستی ایک کھلونا دکھائی دیتی' اور پانی کے بلبلے کی طرح اپنی ہستی پر از ہوا نظر آجاتی۔ اور یہی فنا تھی جس نے مسند مصلیٰ سے اٹھا کر آپ کو چٹائی پر دو زانو ہمیشہ کے لیے بٹھادیا۔ مشہور ہے، جتنی کسی کی فنا بلند، اتنی ہی اس کی بقا بلند۔ جس کی یہ فنا ہو اس کی بقا کا کیا ٹھکانا!!!

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۱؎ کا بقائی ملکہ اتنا بلند آپ کی ذات بابرکات میں ہر وقت موجزن رہتا کہ ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں اسی جذبہ سے بھرپور رہتے۔ اور بہت کم وقفہ ایسا پیدا ہوتا جس کی طرف مَا ۲؎ وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کی پر از اسرار آیت اشارہ کرتی ہے۔

ایک بار آپ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کے کئی احوال ہوتے ہیں لیکن میں تو کہتا ہوں ایک ہی حال (یعنے حالت بسط) ہوتا ہے اور ان ہی الفاظ کی تائید

Marfat.com

کشف المحجوب میں بھی ملتی ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ دونوں باتیں صحیح اور درست ہیں۔ ہر ایک نے اپنے حال کی خبر دی۔ جس کی بقا بلند ہو وہ کیونکر اپنی زبانی کسی کی پست حالت کا بیان دے۔ وہ تو صرف اپنی عرفانی حالت کی نبر دے گا۔

سو میں نے اپنی پنج سالہ حاضری میں کبھی کوئی ایسا وقت نہیں دیکھا جس میں آپ کی حالت قابضانہ ہو۔ بلکہ ہر وقت طبیعت شریف اپنے جذبۂ بقا میں روز افزوں ترقی میں ہی جلوہ گر نظر آئی۔

اسی جذبۂ بقا نے آپ سے وہ تمام حالات سلب کر لیے جو ماورائے بقا سالک کو پیش آتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنی مصیبت و بیماری یا کسی دوسرے دکھ میں کوئی خاص صدقہ نہ دیتے اور کوئی خاص عمل تجویز نہ فرماتے۔ اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس طرح کی تلقین فرماتے۔ لیکن وہ شاہراہ صداقت جس پر پہلے روز عہد الست باندھ چکے تھے اس میں ذرہ بھر فرق نہ آنے دیتے اور جو کچھ آتا راہ مولیٰ خرچ فرماتے۔ جو کرتے، صرف للّٰہیت کے لیے کرتے۔ غیر اللہ کا خیال اٹھ گیا تھا۔ دم بدم آپ کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے

یقیں بداں کہ تو با حق نشستہ شب و روز

چو بخیال تو باشد خیال نام خدا

فنا و بقا سے تمام اولیاء اللہ گذرنے کے بعد ولی کہلاتے ہیں۔ لیکن فنا و بقاء بھی تو ایک درجہ کی نہیں ہوتی۔ تب ہی تو حضرت نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ حضرت صاحب (جد امجد رحمۃ اللہ علیہ) کی فنا دیکھو اور بقا دیکھو! وہ کیسی فنا تھی اور وہ کیسی بقاء!!! یعنے عام فنا و بقا کی طرح اس فنا و بقا کو خیال نہ کرنا۔ بلکہ یہ فنا و بقاء کچھ اور ہے!!!۔

تمام کائنات ولایت کا معیار اگر فنا و بقا کو قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی ولی اللہ کی فنا اس کی بقا سے بلند ہوتی ہے اور کسی کی بقا اس کی فنا سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہ سمجھنا کہ فی حد ذاتہ ایسا ہوتا ہے بلکہ سالک فنا و بقا کے بعد خاص کسی ایک وصف میں اپنا طیران جاری رکھتا ہے۔ یا فنا میں یا بقا میں۔ اسی وجہ

Marfat.com

سے ولایت کی حالت مختلف ہوتی ہے۔ درحقیقت ولایت کا خمیر ان دو پاک جذبوں سے تیار ہوتا ہے۔ لیکن کامل ترین ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس کے ضمیر میں یہ دونوں جذبے مساوی رکھے جائیں۔ حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ میں جذبۂ فنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا تھا۔ لیکن حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ جذبۂ بقا سے زیادہ بھرپور تھے۔ دونوں کے احوال دیکھو! اقوال دیکھو! دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ کسی کی اصل ولایت میں کمی نہیں۔ لیکن دونوں کی حیثیات ولایت مختلف ہیں۔

صاحب فنا مغلوبانہ حالت رکھتا ہے۔ اور صاحب بقا غالبانہ حالت کا مالک ہوتا ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ بقائی جلوہ میں ظہور پذیر ہوئے۔ لیکن حضرت شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ فنائی صورت میں نمودار ہوئے۔ غوث الثقلین محبوب سبحانی سرکار بغداد رحمۃ اللہ علیہ اپنے اندر دونوں اوصاف (فنا و بقا) برابر کے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ آپ اپنی خاموشی سے ہزاروں کو حیران اور مبہوت کر دیتے۔ اور اپنی گویائی سے لاکھوں کو شفا بخشتے۔ ایک طرف وہ عالم ملکوت سے متکلم ہوتے کہ "اَنَا الْجَامِعُ وَاَنْتَ الْمُشَتِّتُ" اور دوسری طرف کعبۃ اللہ کا غلاف پکڑے ہوئے فرماتے کہ الٰہی اگر تو اپنی چادر ستاری سے میرے گناہائے سیاہ کو نہ ڈھانپے تو مجھے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھانا! تاکہ میں تیری مخلوق سے رسوا اور شرمندہ نہ ہوں"!

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی قسم کی فنا و بقا سے سرفراز کیے گئے تھے۔ کبھی تو نماز نیاز ادا کرنے کے بعد اپنے اندر وہ حالت دیکھتے جو ایک ذلیل ترین فعل کے بعد کسی انسان پر وارد ہوتی ہے۔ لیکن کبھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"۔ اور عالم ارواح کا ذکر اس طرح فرماتے جس طرح کوئی عالم اسباب کے رہنے والوں کا ذکر کرتا ہے۔ مرنا جینا آپ کے نزدیک ایک خیالی تصویر کے دو رخ تھے اور دونوں برابر۔ اسی وجہ سے آپ نے کبھی بھی مابعد الموت کے حالات سے کسی کو خوف نہ دلایا۔ بلکہ اس دنیا کی تفسیر ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ فرما کر عبرت آموز سبق کی تصویر سامنے کر دکھاتے۔

Marfat.com

اسی توازن فناوبقاء نے آپ کی ولایت کواس درجہ پر پہنچادیاکہ کسی کو آپ کی ولایت کے انکار کی مجال نہ رہی جس مذہب کا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا وہی آپ کی ولایت حقہ کا مقر ہو گیا۔

آج مسلمانوں میں سینکڑوں فرقے ہیں، اور ایک دوسرے سے سخت بد ظن۔ بلکہ ایک دوسرے کو کافر تک کہنے سے نہیں ڈرتے۔ لیکن جو بھی کسی فرقہ کا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوااور آپ نے اس سے دو چار باتیں کیں۔یا صرف آپ کی نگاہ مسحور نے اسے دیکھا، وہی آپ کی ولایت حقہ کا معترف ہو کر آیا۔ایک بار شرقپور شریف سے واپسی کے وقت ایک بڑی فرم کا ایجنٹ میرے ہمراہ آیا، جو غیر مقلد تھا۔ اور اپنی زبانی قصور پر نور کے قضیہ نامرضیہ یعنے سنیوں وہابیوں کے مقدمہ کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میاں صاحب کی ذات بابرکات بھی مسلمانوں میں عجیب چیز ہے۔ کہ میاں صاحب نے اپنے متوسلین کو لکھا، کہ قبروں کی وجہ سے کیوں عدالتوں میں کافروں کے سامنے ایڑیاں رگڑتے پھرتے ہو۔ فوراً صلح کر لو۔ اگر تم صلح نہ کرو گے تو میں تم سے بیزار۔ بلکہ خواص کو یہاں تک لکھ دیا کہ کسی قسم کی شہادت عدالت میں مہیا نہ ہونے دی جائے"۔

مقدمہ توسُنیوں نے آپ کے کہنے سے نہ چھوڑا لیکن نتیجہ وہی ہوا جو آپ کو منظور تھا۔ یعنے باوجودیکہ غیر مقلد ملزموں پر فرد جرم قائم کر دیا گیا، لیکن فیصلہ سنانے کا وقت آیا تو مجسٹریٹ نے اتنا پوچھنے کے بعد کہ یہ جرمانہ کون ادا کرے گا، صاف بری کر دیا۔ کیونکہ اسے یہی جواب ملا کہ مسلمان ادا کریں گے۔

بھلا خود اندازہ فرمائیے۔ آج اس درجہ کا کوئی مغلوب الحال ولی ملتا ہے، جو اپنے اندرونی جذبات پر ایسے قادر ہو کر اپنے مذہبی مسلک کے برخلاف اعتدالِ حقیقی قائم رکھنے کے لئے ایسا فیصلہ دلوائے۔

اسی طرح ہندو، عیسائی، اور سکھ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن اس موحدانہ صورت میں آپ ان سے ملتے جلتے تھے کہ

کسی کو اپنے گرو کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ اور اپنے دیگر متوسلین کی طرح آپ ان پر مہربان دکھائی دیتے تھے۔ اور وہی سلوک فرماتے جو برگزیدۂ نبوت فخر الرسل والانبیاء ﷺ اپنے وقت کے کفار زائرین سے فرماتے۔ مگر جب اپنے مذہب کے متوسلین اور زائرین حاضر ہوتے تو آپ کے وجود باجود میں سراسر نور رسالت ہی چمکنے لگتا۔ ہر امر ہر واقعہ میں فعل رسول ﷺ اور قول رسول اللہ ﷺ سے تنبیہ فرماتے۔ اور غیرت اسلامی کا پورا پورا جوش آپ کی طبیعت میں موجزن ہوتا۔ بات بات پر فرماتے "کہ ہم فقیری وقیری نہیں جانتے۔ ہم تو صرف اتباع نبی کریم ﷺ کو ہی اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔

فناوبقا کے ساتھ جلال و جمال بھی برابر کا تھا۔ جلال اگرچہ کشف و کرامت اور تصرفات کا سرچشمہ ہے۔ لیکن اس میں بیگانگی حد سے زیادہ اور توحیدی رنگ غالب ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہر چیز سے بے نیازی اور بے مہری پیدا ہو جاتی ہے، اور ہر چیز اس سے خوف کھاتی ہے۔ لیکن جمال اپنی دلربایانہ ادا کی وجہ سے ہر ایک چیز پر اپنا جاذب اثر ڈالتا ہے۔ اور اپنے اندر اتنی کشش و محبت رکھتا ہے، کہ جاندار چھوڑ بیجان اشیاء بھی اس کی طرف کھچی چلی آتی ہیں۔ اور القائی اثر اس میں غالب ہوتا ہے۔ جو چیز بھی اس کے مقابل ہو جائے اس کو اپنے رنگ میں رنگنے کی ہمت اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب جمال کے پاس تمام اشیاء متنفس اور غیر متنفس، ذوی العقول اور غیر ذوی العقول خود بخود جذب ہوتی چلی جاتی ہیں، اور اس کے قلبی اثر سے فوراً متاثر ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر جنبش کے اندر ایک محبوبانہ جذبہ ہوتا ہے، جو دیکھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے اور اسے وارفتہ بنا دیتا ہے۔ بخلاف صاحب جلال کہ ہر چیز اس سے خوف کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ گو وہ توڑ جوڑ کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن جاذبانہ کشش اور محبوبانہ ادا اس کے اندر نہیں ہوتی۔ صاحب جلال خدائی عظمت و جلال کے اندر ہر وقت حیران رہتا ہے۔ لیکن صاحب جمال اس کے کریمانہ جمال کے اندر لذت گیر مشاہدہ۔ پہلا خائف دوسرا امیدوار۔ جس طرح فناوبقا کے بغیر تکمیل ولایت نہیں ہوتی، اسی طرح جلال و

Marfat.com

جمال کے بغیر تکمیل ناممکن۔بلکہ درحقیقت جلال و جمال اسی فنا و بقاء کے تاثیرات اور لوازمات کا نام ہے، اور بس۔ البتہ اس کی کمی وبیشی پر مدارج ولایت کا اختلاف ظہور پاتا ہے۔ جس کسی ولی اللہ پر جلال غالب ہوتا ہے۔ وہ اس ذات اقدس جل وعلیٰ کا مظہر ہو جاتا ہے۔ اور جس ولی اللہ پر جمال غالب ہو جاتا ہے، وہ اس کے جمال کا منبع بن جاتا ہے۔ ایک خوف سے لرزاں اور دوسرا محبت سے خنداں۔ پھر کسی کی محبت میں درد وسکون ہے اور کسی کے عشق میں سوز وبے تابی۔ غرض صاحب ولایت کے اندر جو کچھ رکھا ہوگا اسی کا ظہور اس کی ذات سے ہوگا، اور اس کے اخلاص مندوں پر وہی رنگ غالب ہوگا۔ اس میں بناوٹ اور تکلف کو دخل نہیں۔ درحقیقت یہ سب کچھ کار فرمائی موہبت عظمیٰ کی ہے، اور بس۔ صاحب فنا یا صاحب جلال سے خود بخود تصرفات عجیبہ ظہور پذیر ہونگے اور صاحب جمال سے خود بخود توجہ اپنا القائی اثر دکھائے گی۔

میں نے ''انقلاب الحقیقۃ'' میں لکھا ہے کہ حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جمال ذاتی تھا، اور جلال عارضی۔ جمال اندر تھا اور جلال باہر۔ جمال باطن تھا اور جلال ظاہر۔ اس لیے آپ کی خدمت میں جو بھی حاضر ہوا خالی واپس نہ آیا۔ جلال کی وجہ سے تصرفات اور کرامات ظاہر ہوتے تھے۔ اور جمال کی وجہ سے باطن فیوضات باطنی سے بھرپور ہو جاتے تھے۔ بلکہ اندر اندر تمام جمالی طبیعت تھی اسی وجہ سے تمام زائرین پر آپ کا جمالی جذبہ فوری اثر کر جاتا، اور دل فوراً متوجہ بارگاہ الوہیت ہو جاتا۔ ایک طرف جلال کی وجہ سے عوارضات قلبی کو دور کر دیتے تھے اور دوسری طرف جمال کی وجہ سے محبت الٰہیہ کا جوش اندر بھر دیتے تھے۔ ورنہ کیونکر یہ ممکن تھا کہ آنِ واحد میں طالب کا دل صاف ہو کر متوجہ بارگاہ صمدیت ہو جائے۔

حضرت قبلۂ عالم مولانا پیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آپ کی طبیعت مبارک نہایت مناسبت رکھتی تھی۔ فرق تھا تو اتنا، کہ حضرت صاحب کا ظاہر جمال سے آراستہ تھا، اور باطن جلال سے۔ اور آپ کا ظاہر جلال سے بھرپور تھا اور باطن جمال سے۔ یہ صاحب جذبہ تھے، وہ صاحب سلوک۔ حضرت قبلہ جد امجد رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

جلال الٰہیہ کے اندر حیران تھے اور حضرت میانصاحب رحمۃ اللہ علیہ جمال ربوبیت کے اندر بے تاب۔ وہ جبروتی حالت میں مستغرق تھے، اور یہ ملکوتی کیفیت میں غرق۔ وہ شاہانہ طبیعت سے آراستہ نظر آتے تھے۔ اور یہ خاکسارانہ رنگ و روپ سے۔ نازانداز، باریک بینی، جزورسی، اور عقل کلی میں بالکل یکساں۔ ہاں ان کا علم ظاہری ان کے باطن کی آبیاری کرتا تھا، اور ان کا باطن ان کے ظاہری علم کو سیراب کرتا تھا۔ اتباع سنت میں یکساں۔ لیکن وہ شریعت حقہ کے لیے جوش میں آکر حدود الٰہیہ قائم کرتے۔ عصائے موسوی سے کام لیتے۔ اور یہ اندر ہی اندر دم عیسوی سے تازگی بخشتے۔ انہوں نے علم ظاہری کی آبیاری میں اپنا تمام زور خرچ فرمایا اور انہوں نے علم باطنی کی سیرابی میں اپنی عمر بسر فرمائی۔

حضرت صاحب کسی غیر متشرع صورت سے نہ الجھتے۔ لیکن حضرت میاں صاحبؒ بے تابانہ اس سے دست بدست ہو جاتے۔ لیکن یہ بھی مد نظر رہے، کہ فناوبقا، یا جلال و جمال کی بلندی اور پستی کا تعلق اللہ تعالیٰ نے اوصاف نفسی کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ جتنے اوصاف نفسی بلند ہونگے، اتنی ہی فناوبقا بلند ہوگی۔ مثلاً غصہ ہو تو کمال کا اور رحم ہو تو انتہا کا غیرت ہو تو غضب کی، اور شفقت ہو تو بلا کی۔ انتقام گیری میں جباری صفت کا، جلوہ ہو۔ اور معافی و بخشش میں غفور رحیمی کی شان ہو۔ الغرض خودی اپنے درجہ کمال نفسی پر ہو، اور اوصاف الٰہیہ کا پورا پورا مظہر ہو، اور ہر صفت جلالی و جمالی کے اندر اپنی نظیر آپ ہو، اور اوصاف الٰہیہ کا کامل ظل ہو۔ کیونکہ فناوبقا کے بعد اس نفسی خودی کا تعلق ذات عارف کے ساتھ بالکلیہ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ خودی بشری آلائشوں سے پاک ہو کر شان الٰہیہ کے ساتھ بتمامہٖ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اور بشری ارادہ سے کچھ نہیں کرتی، بلکہ "بِی یَسْمَعُ وَبِی یُبْصِرُوَبِی یَبْطِشُ" کا حکم رکھتی ہے۔ سوایسی خودی کی فناوبقا دنیا کے اندر لاثانی ہوتی ہے۔ اور اسی فناوبقا کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ ورنہ پست ہمت انسان کی فناوبقا کیا کچھ ہوتی ہے جو کچھ کر دکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مدارج سلوک طے کرنے کے بعد بھی نہ اپنے اندر کچھ دیکھتے ہیں اور نہ اپنے باہر کچھ

دکھاتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اوصاف کاملہ دکھانے کے لیے بعض واقعات و حالات کے ابواب بدل دیئے۔

اس اختصار کے بعد اب ناظرین کتاب سے التجا ہے کہ ولی اللہ کے حالات صرف ظاہری آنکھوں اور ظاہری زبان سے دیکھے اور پڑھے نہ جائیں بلکہ باطن بین آنکھ سے ان کا گہرا مطالعہ کر کے ان کی حقیقت پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اور ہر حال کو کشفی آنکھ سے پرکھنا چاہیے، اور اس کی ناآشنا لذت سے بے انتہا حظ اٹھانا چاہیے۔

خاص کر آپ کی فنا آپ کی بقاء اور آپ کے اوصاف ولایت پر پوری توجہ فرما کر اپنی ہمت کو بلند تر بنانے کی کوشش کی جائے۔ شاید آپ کے اتباع کامل اور محبت واصلہ کی وجہ سے کسی کو اپنی دولت لازوال سے مشرف فرمایا جاوے۔

تو مگو مارا دراں شاہ بار نیست
باکریماں کارہا دشوار نیست

کتاب ہذا کے ابواب ایک علمی تقسیم کے مطابق رکھے گئے۔ اور ہر باب کے آغاز میں حسب ضرورت ایک مختصر حقیقت آموز تبصرہ لکھا گیا، جو اس باب کے حالات پر انشاء اللہ تعالیٰ بصیرت افزا ثابت ہو گا۔ علاوہ ازیں واقعات اور حالات پر تشریحی ذیلی حواشی بھی دیئے گئے تاکہ ناظرین کو زیادہ غور کی تکلیف نہ ہو۔ لیکن حق یہ ہے کہ جو لوگ راہ سلوک میں حالی کیفیات سے سرفراز ہو چکے ہیں، انہیں تو ان حواشی اور ان تبصرات کی ضرورت نہیں، اور جنہیں اس نعمت سے سرفرازی نہیں بخشی گئی، انہیں ان حواشی و تبصرات سے کیا فائدہ؟

آخر میں بارگاہ الٰہیہ میں التجا ہے، کہ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کے صدقے ہمیں وہ کچھ نصیب فرمائے۔ جو سراسر حقیقت ہو، اور جس میں ذرہ بھر نمائش نہ ہو!!! اپنے بیگانے سب نظر آئیں، اور بیگانے یگانے دکھائی دیں۔ اپنے پیر و مرشد حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدم بقدم چلنے کی توفیق عنایت ہو۔ اور آپ کے روحانی

Marfat.com

فیوضات سے دل بھر پور ہو کر آپ کا صحیح نمونہ بننا نصیب ہو! آمین ثم آمین!!!

مکرر ااینکہ بعض احباب کو میری اس دلیرانہ تحریر پر گرفت ہو گی۔ لیکن میں محض مجبور ہوں۔

چناں طوطی صفت حیران آن آئینہ رویم
کہ مے گویم سخن امائے دانم چہ مے گویم

تاہم کوئی فقرہ پسند آجائے، تو دعا سے فراموش نہ کیجئے گا۔ گناہگار ہوں۔ سیاہ کار ہوں۔ اور عمر بھر رسوائیوں میں کھیلتا اچھلتا جارہا ہوں!

البتہ امید ہے تو صرف یہ کہ کسی کے دامن کے سہارے چل رہا ہوں!! اور کسی کی محبت میں جارہا ہوں!!!

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بدان را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

دل میں میں لاکھوں ارمان، لاکھوں حسرتیں ہیں۔ لیکن احباب کی دل تنگی سے خوف کھاتا ہوا رخصت ہوتا ہوں۔ اگر عمر ناپائیدار نے وفا کی، اور مشیت ایزدی نے موافقت فرمائی تو پھر کسی موقعہ اپنا ارمان اپنی حسرت نکال کر اپنا دل ہلکا کروں گا۔

"وللعاشق المھجور ما یتجرع"

سکوت آموز طول داستان درد ہے، ورنہ زبان بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے۔

(مقدمہ "خزینہ معرفت"

مصنف صوفی محمد ابراہیم قصوریؒ

Marfat.com

# حضرت مولانا محبوب عالم سیدویؒ

# اور ان کا مقام

"وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ"

(جو ایمان لاتے ہیں، انہیں اللہ سے بہت محبت ہوتی ہے)(پارہ ۲ رکوع ۵)

(بامحاورہ) ایماندار اللہ کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔

## محبت کی حقیقت

محبت دل کے لگاؤ کا نام ہے۔ جتنا یہ لگاؤ بڑھتا جاتا ہے اتنے ہی اس کے آثار ونشانات ابھرتے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہی آثار ونشانات امٹ ہو کر لازوال حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ محبت کے فریقین مٹ جاتے ہیں۔ لیکن جذب و شوق کی داستان ختم نہیں ہوتی۔ وہ قصے کہانیوں کے ذریعے دنیا کے اندر اپنی مثالی صورت میں قائم رہتی ہے اور آنے والی نسلیں اس چاشنی سے لذت اٹھاتی ہیں۔ پھر اسی چاشنی سے محبت کے تخم پرورش پاکر شگفتہ پھول بن جاتے ہیں، جو دنیا کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے برابر چلتا آیا اور چلتا جائے گا۔ نہ ہم ہوں گے، نہ ہماری دنیا

ہو گی، لیکن رازہائے الفت ہمیشہ سر سبز و شاداب اپنی بہار دکھاتے رہیں گے۔ کیونکہ ؎

سر بازِ عشق زندۂ جاوید ہو گئے
آبِ حیات ہے تری نظر دل کی چھاؤں میں

لیلیٰ مجنوں مٹ چکے۔ ہیر رانجھا ایک عرصے سے مٹی میں پڑے مٹی ہو گئے۔ سوہنی مہینوال دریائے فنا میں غرق ہو گئے۔ لیکن ان کی محبت و عشق کے قصے برابر زندہ ہیں اور ایک دنیا کو زندگی بخش رہے ہیں۔ دراصل وہ محبت و عشق کی آبِ حیات ہیں۔

لیکن جب یہی محبت اپنا حقیقی مقام پیدا کرتی ہے اور اس کا تعلق حیّ و قیوم کی ذات سے جڑ جاتا ہے تو پھر یہی محبت لازوال ہی نہیں ہو جاتی بلکہ اس میں وہ خمار اور مستی بھی آداخل ہوتی ہے کہ جس پر اُس کی آنکھ پڑ گئی اُسے کھا گئی اور وہ مسحور ہو کر اس کے قدموں میں جا گرا۔

## ولی اللہ کیا ہوتے ہیں؟

ہمارے جیسے انسان، ہم جیسی صورت۔ لیکن جب اُن کے دل میں محبت الٰہی اپنا گھر بناتی ہے تو ان کے جسم و صورت میں ایسی جذب و کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر دیکھنے والے پر محبت الٰہیہ کی ایک کیفیت وارد ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا و مافیہا اس کے سامنے ایک تنکے جتنی بھی قیمت نہیں رکھتے۔ جہاں حسنِ ازل کا پرتو پڑ گیا اور جس جگہ اس کی تجلی گری، وہی طورِ سینا ہو گیا۔ ؎

دم عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(اقبالؒ)

محبت اپنا مقام ذات پات سے بلند رکھتی ہے۔ وہ اپنے دل پسند پر کلی اختیار رکھتی ہے۔ دنیا لاکھ طعن کرلے، لیکن اسے پروا نہیں۔ یہ سرمست اپنے خیال میں مست۔

Marfat.com

جس طرح مجازی حسن گھرانے تلاش نہیں کرتا۔ یہ جھونپڑیوں میں ویسا ہی پھلتا پھولتا ہے جیسا شاہی محلوں میں۔ بلکہ جھونپڑیوں میں تو اس کا قد و قامت اور رعنائی زیادہ پسندیدہ صورت میں جلوہ گر ہو کر دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی محبت حقیقی گھرانے کی رہین منت نہیں ہوا کرتی۔ جونہی یہ کسی درد بھرے دل کے اندر آکر بیٹھ جاتی ہے اور نازک آبگینہ اس کے جذب سے چور ہو جاتا ہے تو اس کی دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ یہ ننھا سا دل جام جہاں نما بن جاتا ہے۔ جس کے ایک کونے میں سارا جہاں سما جاتا ہے۔ خصوصاً جب یہ دل محبت ذاتِ اَحدٌلَمْ یلدولَمْ یُوْلَدْ سے چمک اُٹھے، تو یہ دل ساری دنیا کے لئے سورج بن کر چمکتا ہے اور تمام جہان اس کا متوالا ہو کر اس کی روشنی میں چلتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :۔

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تیرے عشق نے بنایا میری زندگی فسانہ

وہ افسانہ جو پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے سے ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی اسے ختم کر پایا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ موت کی گہری نیند سو گئے، بلکہ حقیقتاً جاگ اٹھے اور دوسری دنیا میں ان کی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ کیونکہ عدم، عدم نہیں۔ "یہ تو آئینہ دارِ ہستی" کا دوسرا رخ ہے، جہاں سے زندگی کی کتاب کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست برجریدۂ عالم دوام

حسنِ فطرت کے نظارے اور اس کے غمزے ہر ایک کی قسمت میں کہاں؟ کسی صاحبِ قسمت بلند ہمت پر اگر کچھ نقاب کشائی اور جلوہ ریزی ہو جائے تو زہے قسمت۔

"وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۤءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"

(اور وہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت کے لئے اسے چن لیتا ہے۔ وہ بڑی عظمت والا اور فضل والا ہے)۔

سرمد غم عشق بو الہوس را نہ دہند
ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

Marfat.com

## حضرت توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ ان بلند پایہ ہستیوں میں سے تھے، جن کی فطرت میں ہی توحید کا خمیر تھا۔ جذبۂ عشق پیدائشی طور پر ان کے دامن سے وابستہ تھا۔ بچپن میں ہی مئے توحید سے سرشار تھے اور ہمیشہ وارفتگی کے عالم میں رہتے تھے۔ ایسے پاکیزہ انسانوں کی تربیت قدرت خود فرماتی ہے اور جلالی اور جمالی طریقہ سے اس محبت و جذب کو دو آتشہ سہ آتشہ کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنوں سے بڑھ کر بیگانوں کے لئے محبوب بن جاتے ہیں اور ان کی عقیدت مندی کافر و مسلم کے دلوں میں یکساں گھر کر جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ سے عالم و جاہل، کافر و مسلم، پیر و جواں وغیرہ یکساں فیض اٹھاتے تھے۔

## سالک مجذوب کی تربیت

جذب و مستی کے اندر عرفان و حقیقت کے خدو خال نکھر کر اس طرح سامنے آتے ہیں کہ عقل و ہوش میں آنا محالات سے ہے۔ پھر ایسا مجذوب سالک جب قطبِ ارشاد کی مسند پر جلوہ افروز ہوتا ہے، تو سیاہ دل کی تاریکی ایک ہی نگاہ میں دور کر دیتا ہے اور اسے سراپا نور بنا دیتا ہے۔ جو سالک راہ ہدائت ایسے مرشد کی تربیت میں پورے گیارہ سال گذار دے، محبت و عقیدت کے دریا میں شب و روز غوطہ لگاتا رہے اور اپنے پیر و مرشد کے ارشاد کو مولائے کریم کا حکم جان کر تمام مجاہدہ اسی میں صرف کر دے تو اس کے انوارِ قلبی اور پیر و مرشد کے انوار عکسی میں کیا تمیز ہو سکتی ہے؟ اور پیر و مرشد کا صحیح نمونہ ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟

## حضرت محبوب عالمؒ اور سلوک مجددی

حضرت مولانا محبوب عالم صاحبؒ جو مغربی پنجاب کے ایک گاؤں سیدا تحصیل پھالیہ ضلع گجرات کے رہنے والے تھے، اپنی محبت اور عمل میں تمام اقرانِ طریقت و عقیدت سے بڑھ گئے اور حضرت قبلہ توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

Marfat.com

مسند ارشاد کے شایان شان مرتبہ پا چکے تو حضرت موصوفؒ نے انہیں اپنی زندگی ہی میں مسند ارشاد پر فائز فرما کر رشد وہدایت کی اجازت (مرحمت) فرمائی۔

اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ وہ کیا تھے اور کیا کر گئے؟ مختصر یہی ہے کہ وہ اپنے پیر کامل کا صحیح نمونہ ہو چکے تھے۔ وہی محبت کی وارفتگی اور جذب کے واردات آپ پر بھی چھا چکے تھے۔ اپنے پرائے کی تمیز اٹھ گئی تھی اور وہ وحدت مطلقہ کا زندہ نمونہ بن چکے تھے۔ الغرض مسند ارشاد سے جو دولت آپ کے ہاتھ آئی، وہ کسی کو کم ہی نصیب ہوئی۔

سلوک مجددیؒ میں آپ کو وہ کمال حاصل تھا کہ اس گئے گذرے زمانہ میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ اس راہ میں انہیں اتنا کامل اعتماد حاصل تھا کہ ہر کس وناکس عقیدت مند کو راہ سلوک پر چلا دیتے اور راہ خدا کے سالک کو مقامات وانوار اتنی جلدی طے کرا دیتے کہ وہ حیران ہو جاتا کہ میں اتنی مختصر مدت میں کہاں سے کہاں آگیا اور کیسے پہنچ گیا؟ خوش نصیب سالک آپ کی توجہ سے اس شعر کی عملی تصویر بن جاتے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

زمین و آسمان کی پہنائیاں سمٹ کر آسان راہوں میں بدل جاتیں۔ آپ کی توجہ میں بیٹھنے والے جانتے ہیں کہ ان پر کیفیات کا ورود کس شان سے ہوا کرتا تھا اور وہ پہلی ہی نگاہ میں طالب کے دل کو کس طرح محبت الٰہیہ سے رنگین بنادتے تھے۔

حافظ فضل احمد صاحب رسول نگری کی زبانی معلوم ہوا کہ پیر ومرشد کے وصال کے بعد آپؒ مین پریشانی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے سیر وسیاحت کو چل نکلے۔ دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ یہاں تک کہ بغداد شریف جا پہنچے۔ کافی مدت وہاں قیام فرمایا۔ آخر پھر شیخ کاملؒ کی روحانی توجہ سے طبیعت میں سکون واطمینان پیدا ہو گیا اور مسند ارشاد پر جم کر خلق اللہ کی ہدایت ورہنمائی پر لگ گئے۔ یہاں تک کہ ایک جہان آپ سے فیض یاب ہوا۔

Marfat.com

## قیام سید اشریف

مولا کریم کی مرضی اور اس کی حکمتیں وہی جانتا ہے۔ سید اشریف کو عزت بخشنا منظور تھی۔ ورنہ انبالہ شریف کہاں اور سید اشریف کہاں ؟

### پیر کا عکس مرید میں

میں نے حضرت سیدوی کو دیکھا نہیں لیکن اگر یہ اصول درست اور صحیح ہے کہ درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو حضرتؒ کے چند تربیت یافتہ خدام کی مثال عرض کرتا ہوں جنہیں دیکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔

حضرت مولانا عبداللہ خان ساکن پٹی ضلع امرتسر اور حضرت مولوی حبیب اللہ صاحب گجراتی تو سید اشریف میں آپؒ کی صاحبزادیوں کی شادیوں پر دیکھے۔ اول الذکر استقامت میں تھے اور آخر الذکر پر غلبۂ حال تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ سبحان اللہ کیا نورانی چہرہ تھا۔

تیسرے حضرت اصغر علی صاحب رادوری المعروف جرنیل صاحب کو حضرت خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے روضئہ مبارک پر بتقریب عرس حضرت مجدد علیہ الرحمۃ منعقدہ ۱۹۱۲ء (بمطابق ۱۳۳۲ھ) دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ روضہ کے اندر مع متوسلین ایک حلقہ میں تشریف فرما تھے۔ انوار الٰہی برس رہے تھے۔ گو مجھے اس وقت خاندان مجددیؒ سے نسبت نہ تھی۔ اور نہ کسی میں شمار تھا۔ محض آبائی نسبت کے باعث تلاش حق میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی صورت و سیرت اور حلقہ متقدمین بزرگوں سے ملتا جلتا تھا۔ وہ اگر کچھ دن مسند ارشاد پر رہتے تو متقدمین بزرگوں کے نشانات پھر سے تازہ ہو جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیدویؒ انوار عکسی سے منور ہو کر انوار ذاتی میں داخل ہو گئے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

Marfat.com

## ظل اور عکس

فطری ولایت بہت کم ہوتی ہے۔ عکسی اور ظلی ولایت ہی صیقل ہو کر چمکتی ہے لیکن دھوکہ یہی ہوتا ہے کہ ذاتی ہے۔ پیرومرشد فرمایا کرتے تھے کہ

"کوئی ایک ہی ہوتا ہے"

جس کا مطلب یہ ہے کہ سلسلہ میں عکس محض ایک ہوتا ہے، باقی تمام ظلال ہوتے ہیں۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا، اسے صحیح پایا۔ یہ ضرور ہے کہ مرید اس وقت تک ظل ہی رہتا ہے جب تک ذات مرشد سے چند قدم آگے نہ نکل جائے۔ اور وہ بھی ایک حیثیت سے نہیں، بلکہ ہر صفت میں پیر سے آگے بڑھ جائے۔

حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھئے۔ کہاں سے کہاں نکل گئے؟ اتنے بلند ہوئے کہ سلسلۂ عالیہ میں دوبارہ زندگی آگئی۔ ورنہ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ پیر کو اپنے دادا پیر سے بڑھایا جاتا ہے۔ یا یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت توبالکل اعلیٰ حضرت ہو چکے ہیں۔ جس سے طریقت اگر بدنام نہ بھی ہو، تاہم درخشاں نہیں ہوتی۔ بلکہ حلقۂ مریدین سے باہر برا تاثر لیا جاتا ہے۔ نقل خط اپنے اصل سے کتنا ہی خوبصورت ہو، لیکن پھر بھی نقل ہے۔ وہ جذبہ جو اولاً ان خیالات کا محرک بنا، ایسی عبارت لکھوائی، وہ نقل میں، کہاں! نقل تو محض اس جذبے کے چہرے کا عکس ہے، جسے خامۂ بے حس کی لکریں سمجھئے۔ کیا عکسی موحد کو فطری موحد سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے!

"چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

اگرچہ آسمان بلند ہے، لیکن اسے عرش سے کیا نسبت؟ یہ تقابل تو آفتاب و ماہتاب کا تقابل ہے۔ آفتاب دو ہو ہی نہیں سکتے۔ ہاں! جب خداوند تعالیٰ ماہتاب کو بھی آفتاب کر دے اور اس میں سورج ایسی روشنی اور شان ڈال دے اور پھر اس روشنی سے کئی ماہتاب روشن ہو کر نکلیں، تو یہ اس کا فضل ہے۔ لیکن یہ فضل تو بہت کم لوگوں کو خاصی مدت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

## سوانح حیات کی ضرورت

سوانح حیات کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی غیر معروف، معروف ہو نکلے اور اس کی شہرت اس حد تک پہنچ جائے کہ خاص و عام اس کے حالات کی ٹوہ میں دلچسپی لیں، لوگوں میں ایسے باکمال انسان کے حالات و اوصاف معلوم کرنے کی رغبت پیدا ہو جائے۔ لیکن جب ایک ولی مقتدائے عالم ہوتا ہے۔ اور اس کے سلسلہ میں ایک دنیا داخل ہو جاتی ہے تو متوسلین و مریدین کے اندر اپنے پیر و مرشد کے مکمل حالات دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ان کے پڑھنے سے دل کو سرور اور طبیعت میں خاص ذوق پیدا ہو کر تعلقاتِ روحانی میں اسی قسم کی ترقی شروع ہو جاتی ہے، جو کبھی پیر و مرشد کی محبت سے حاصل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سالک طریقت کے لئے حالات میں ایک رہنمائی ہوتی ہے۔ ہر حال اور واقعہ سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ پھر ولی کا حال تو سبحان اللہ! وہ تو

"ہر ورق و فتریست ز معرفتِ کردگار"

کا نمونہ ہوتا ہے اور اس کے ایک ایک ملفوظ میں خلاصۂ سلوک موجود ہوتا ہے۔ اس وقت کے چند فقرے فقر و تصوف کا آئینہ ہوتے ہیں۔

ہر تصنیف مصنف کا عکس ہوتی ہے۔ کسی مصنف کی کتاب پڑھنے کے بعد اس کی شخصیت کے تمام خدوخال پیش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ "ذکر خیر" اور "خیر الخیر" دونوں حضرت سیدویؒ کی وہ گراں بہا تصنیفیں ہیں جن سے ایک دنیا فیض اٹھا رہی ہے۔ اور اٹھاتی رہے گی۔

یہ دونوں کتابیں مقبولیت عامہ اور بقائے دوام کی حد کو پہنچ چکی ہیں۔ ان کی مقبولیت کے باعث قاری کو شوق پیدا ہوا کہ حضرت مصنفؒ کے ذاتی حالات اور مقامِ ولایت کو زیادہ نمایاں طریقہ پر دیکھا جائے۔ گو ایک بابصیرت انسان ان کتابوں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ایک سالک راہ ہدایت کو مطلوب ہے، لیکن تمام

Marfat.com

قارئین سالک راہ ہدایت نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ خوش عقیدہ اور باذوق ہوتے ہیں جو اہل اللہ کی کتابوں سے لمحا حقہ حظ اٹھاتے ہیں۔ "ذکر محبوب" انہیں حضرات کیلئے تالیف ہوئی۔ سوانح میں سب سے پہلی بات یہ دیکھنا ہوتی ہے کہ صاحبِ حالات پہلے کس ماحول میں تھے۔ اس کے بعد ان حالات نے کس طرح پلٹا کھا کر دوسری طرف رخ کیا، وہ کس طرح دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس سے متنفر ہوئے اور سفر در وطن اور خلوت درانجمن کی عملی تصویر بن کر خالق کائنات کی طرف متوجہ ہوئے؟ اور پھر اس کے کیا اثرات ہوئے؟

اس کے بعد مجاہدۂ سالک پر نظر پڑتی ہے اس سے سالکین کو سبق حاصل ہوتا ہے جس سے ان کی ہمت بڑھتی ہے۔ پھر محبت پیر دیکھنے کی چیز ہے۔ زاں بعد مسند ارشاد اور تربیت مریدین سے راہنمائی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ آخر میں کرامات اور کیفیات کو دکھانا ہوتا ہے تاکہ صاحب سوانح کی ولایت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

## سجادہ نشین صاحب کی اہلیت و قابلیت

عزیز محترم حضرت صاحبزادہ صدیق احمد صاحب سجادہ نشین سے بڑھ کر اس فرض کو انجام دینے کا اہل کون ہو سکتا ہے؟ جہاں آپ عالم با عمل ہیں، وہاں آبائی نسبت کے علاوہ حضرت قبلہ شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے بھی مشرف ہیں اور متواتر کئی سال حضرت شاہ نورالحسن صاحبؒ کی خدمت میں ایک سالک کی صورت حاضر ہوتے رہے ہیں۔ طبیعت میں پہلے ہی سوز و گداز تھا پھر ایسے شیخ کی صحبت اور تربیت میسر ہوئی تو سونے پر سہاگہ کا کام ہوا۔

عرصہ ہوا جب آپ دیوبند میں پڑھتے تھے۔ لالہ پنڈی متصل تحصیل پھالیہ غلام رسول نیلاری کے گھر میں دونوں صاحبزادوں کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ آپ کی طبعی ذہانت و جودت اسی وقت ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن دوبارہ دیکھنے کا موقع حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ، کے چہلم پر ہوا۔ جب آپ نے کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے "پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا" تو دل میں بیٹھ گئے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ صاحب ہیں

Marfat.com

کون ؟ یہاں تک کہ جب انہیں دوسری بار علی پور میں دیکھا تو ایک واقف کار نے بتایا کہ صاجزادہ صاحب سید اشریف کے جانشین ہیں۔ خوشی ہوئی کہ صاجزادگی کے اندر " کچھ " ہے۔ لیکن "دل رابدل رہسیت "کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ جب میری تحریریں "نور اسلام "میں شائع ہوئیں، "کچھ "تو اتحاد خیال کی وجہ سے میری تحریر آپ کو یہاں کھینچ لائی اور تیسری ملاقات بیر بل شریف میں ہوئی۔ بہر حال ہم خیالی کے رنگ میں میرے یہ عزیز میرے خیالات کی بہت قدر کرتے ہیں اور میری تحریروں سے از حد متاثر ہوتے ہیں۔ مجھے جو یہ شکایت ہے کہ کوئی بھی میری تحریر پڑھنے کے بعد نقطہ نگاہ تک نہیں پہنچتا، انہیں میں اس سے مستثنےٰ پاتا ہوں اور جب یہ میرے زاویہ نظر تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو مجھے اس وقت از حد خوشی ہوتی ہے۔

اگرچہ موجودہ تالیف ذکر محبوب آپ کے سامنے آگئی، لیکن باب سیرت کی یہ آخری کڑی نہیں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اسے صرف جلدی کا ناشتہ سمجھئے۔ اگر قارئین کی دلچسپی قائم رہی تو شاید اس کو دوبارہ مکمل کرنے کی پوری کوشش ہو سکے۔ اور وہ سب کچھ تحریر میں آجائے جو اس کتابچہ میں نہیں آیا۔

جیسے لکھا گیا ہے کہ اتحاد خیال کی وجہ سے صاجزادہ صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی طرح اس اتحاد معنوی کی وجہ سے "ذکر محبوبؒ" پر نظر ثانی کی عزت مجھے بخشی گئی۔ گو اب میں اس قابل نہیں۔ نہ دماغ میں پہلی سے ذہانت رہی اور نہ قلم میں وہ جنبش۔ نسیان غالب ہے۔ پڑھنا، نہ پڑھنا برابر۔ گو بعض جگہوں سے کتاب ہذا کا مطالعہ بھی کیا۔ لیکن ذہن کچھ یاد نہیں رکھ سکا۔

خدا کرے کہ یہ کتاب اسی درجہ قبولیت عامہ حاصل کرے جس درجہ آپ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف ہر خاص و عام میں مقبول ہوئیں۔

آخر میں ایک شعر پر رخصت ہوتا ہوں ؎

جس سے ہم کو پیار ہوتا ہے
اس پہ ہر اک نثار ہوتا ہے

(تعارف "ذکر محبوب"
مصنف صاجزادہ صدیق سیدوی)

Marfat.com

# مسلک طریقت

## شکایت

برادران سلسبیل زادھم اللہ شرفاً

السلام علیکم!

ہمیں بڑا افسوس ہے کہ شمارہ اول سے شمارہ دوم بد اور شمارہ سوم بد سے بدتر ہو کر آپ کے سامنے پہنچا، باوجودیکہ ایک ماہ کامل لیٹ ہو کر شائع ہوا۔

یہ کہیں کہ کس کی غلطی ہے؟ کس کی بے توجہی ہے؟ تو یہ بات درحقیقت درست نہیں۔ صرف بات اتنی ہے کہ ٹیم صحیح معنوں میں منظم نہیں اور احساسِ ذمہ داری کا کسی قدر فقدان ہے۔

ایک ذمہ دار شخص اس سے بڑھ کر اچھا کام کر سکتا ہے اور ہو رہے ہیں۔ سینکڑوں رسالے ماہنامے ایسے ہیں جو صرف ایک ہاتھ سے تیار ہو کر مقبول ہو رہے ہیں۔

ہم میں کیا کمی ہے؟ عالم، فاضل، بی۔ اے، ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی، ناظم، مرتب موجود۔ کاتب اپنے، چھاپنے والے اپنے، دفتری اپنے، اور تمام پُر از خلوص۔

ذمہ داری اور احساسِ ذمہ داری کے علاوہ دفتری نظام ایک نہیں۔ میلوں دُور

Marfat.com

دفتری کام کرنے والے احباب رہتے ہیں اور وہ بھی فرائض منصبی میں گرفتار۔ ایسی صورت میں جو کچھ پھٹے لباس میں پیش کیا جارہا ہے، غنیمت ہے۔ لیکن مادی جسم کی عریانی تو حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ مگر معانی کے لباس صوری، الفاظ کی عریانی سے روح کیسے نظر آسکے؟ ایک معنی کے صوری لباس ''الفاظ'' سے ایک لفظ چھوڑ دیا جائے یا ایک حرف بھی اُڑ جائے تو اصل تک سامنے نہیں رہتا یعنی بدل جاتا ہے۔ گو سیاق و سباق سے کوئی صورت نکال لی جاتی ہے، لیکن پڑھنے والے کا ذوق تو اُڑ جاتا ہے اور اس پر ایسی بدمزگی چھا جاتی ہے کہ کتاب کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ یہی حال ہمارے ''سلسبیل'' کا ہے۔ چند سطروں کے بعد ایک ایسا غبار آجاتا ہے کہ پڑھنے والا ضبط اور حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

ایسی صورت میں ہمارا کیا کرایا سب ضائع ہو جاتا ہے اور ایک معیاری رسالہ کی بجائے ایک ادنےٰ رسالہ سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے۔

ایسے حال میں میرا تو یہی مشورہ ہے کہ کسی اچھے مضمون کے شائع کرنے کے بجائے نہ شائع کرنا اولےٰ ہوتا ہے۔ کیونکہ بدظنی کو دور کرنے کے لیے ہم نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ لیکن ایسے حال میں بدظنی بڑھے گی کہ ان کو تو لکھنا ہی نہیں آتا۔

مضامین ''سلسبیل'' بیشک اچھوتے اور بلند، معیار کے لحاظ سے بہت اچھے۔ لیکن ابھی پڑھنے والوں کی کمی ہے۔ جو احباب خریدتے ہیں، وہ کار ثواب سمجھ کر یا کسی دوست کے کہنے پر خریدتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہمارے خریداروں میں چند آدمی بھی ایسے نہیں آئے جو ہمارے مضامین کی حقیقت تک پہنچتے ہوں۔

یہ مضامین دو طرح کے آدمی پڑھ سکتے ہیں۔ یا تو وہ، جو اس راہ تصوف میں پڑے ہوں اور راہ سلوک میں قدم زن ہوں اور ذوق سلیم رکھتے ہوں، دوسرے وہ اہل علم جن کو علمیت کے ساتھ فطرتی ذوق ہے اور جو ہر لفظ اور ہر جملہ کو غور سے پڑھنے کے عادی ہیں۔

سرسری نگاہ سے دیکھنے والے ہمارے ''سلسبیل'' سے اتنا ہی فائدہ اٹھا سکتے

Marfat.com

ہیں جتنا کہ دیگر عام رسائل سے اٹھایا جا سکتا ہے۔

بہر صورت، اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر جال لگا رہے ہیں کہ کوئی شہباز ایسا پھنسے، جو ہمارے خیالات کو پاکستان کے ہر کونے میں پھیلا دے اور ہر گھر "سلسبیل" کے لطف سے حظ وافر اٹھائے، فقر و تصوف کا صحیح خاکہ ذہنوں میں آئے اور شکوک رفع ہو جائیں اور ایمان محکم قائم ہو۔

### مقصد

ادارہً تصوف کا مقصد بہت بلند ہے اور وقت کے تقاضا کے مطابق۔ دین حنیف کی روح، تصوف یا معرفت الٰہیہ ہے۔ جب تک اس روح مقدس کی طرف توجہ نہ اٹھے اور اس کی تلاش اور جستجو کا خیال نہ کیا جاوے اور مشاہدات غیبی کی جہاں تک سیر نہ کر لی جائے، مذہب ایک جال نظر آتا ہے جس کے اندر پھنسے ہوئے انسان بھاگنا چاہتے ہیں۔ انسان اس وقت کامل الایمان ہوتا ہے جب کہ خود محسوس کرے کہ دین کے سوا چارہ نہیں اور دین و مذہب کے اصول و قواعد کے آخری نقطہ پر اس کی نظر جا پہنچے، ورنہ ایک رسم کے سوا کچھ نہیں اور رسومات کا جو انجام ہے وہ دنیا کو معلوم۔ ایسے حال میں معاشرہ کسی صورت خط مستقیم پر نہیں رہ سکتا۔ سینکڑوں نہیں لاکھوں اور کروڑوں ہستیاں ایسی پاک گزری ہیں جو اس راہ بے پایاں پر اپنے ذوق فطرتی کے مطابق چلے اور وہ اس حد تک پہنچ گئے، جہاں سے آگے گزرنا مشکل ہوتا ہے اور روح الامین کے پر جہاں جلتے ہیں اور وہ اس دولت ایمان و ایقان سے مشرف ہوئے جو لازوال حقیقت کی جلوہ آرائی سے حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ خود جلوہً الٰہیہ کے معجزے ہو گئے اور قدرتِ کاملہ کا نمونہ ہو کر دنیا کے رہبر ہوئے اور دنیائے اسلام کے چمکتے دمکتے ہیرے اور لعل بدخشاں ثابت ہوئے۔

ہم انہیں کے نقش پا کو ابھارنا چاہتے ہیں اور انہیں کے احوال و اقوال کو دنیا کے سامنے لانے کے متمنی ہیں، جن کی آخری کڑی ہمارے حضرت قبلہ مرشدم میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہٗ و قدس سرہ العزیز تھے، جن کے

Marfat.com

فیوضات ظاہریہ وباطنیہ سے ایک دنیا کے دل جاگ اٹھے۔ کلمہ گو ہی نہیں، ہر مذہب و ملت کے آدمی ان کی ایک نظر سے سرشار ہو گئے۔

میرے آقا کی نظروں میں سمائی ہے عجب مستی
کہ جس کو اک نظر سے دیکھ لے سرشار ہو جائے

آپؒ سراسر رحمت و شفقت تھے۔ اپنے بیگانے کی تمیز نہ تھی۔ جو آیا بھرپور ہو گیا۔ ذیل کے پنجابی اشعار کا کامل نمونہ تھے ۔

جسدیاں دربار مرشد وچ رسائیاں ہو گیاں
باب رحمت دے کھلے مشکل کشائیاں ہو گیاں
اک نظارے پیر توں بالکل صفائیاں ہو گیاں
دل اندھیری کوٹھڑی تھی روشنائیاں ہو گیاں

پاکستان کا کوئی شہر یا گاؤں ایسا نہیں، جہاں کے آدمی آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر نہ ہوئے ہوں اور اپنی آنکھوں اور اپنے دل سے وہ کچھ نہ دیکھ لیا ہو، جس کو بیان کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔ ایک بحر ذخار کی طرح ایک موج میں فنا تک پہنچا دیتے تھے۔ کسی کو اپنی ہستی کا پتہ تک نہ رہتا، اور کبر و نخوت کے پردے پھٹ جاتے اور انسان اپنے رب غفور کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا۔

زبان سادہ، لباس سادہ، مکان سادہ، نشست و برخاست مطابق سنت، غرض وہی کچھ نظر آتا تھا، جو ایسے اولیاء کی خدمت میں نظر آتا ہے۔

"جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔!"

ہر فرقے، ہر مذہب کے لوگ جب حاضر ہوتے تھے، وہی کچھ ان کو نظر آتا تھا، جو ان کے مذہب کے اندر عین حقیقت ہوتی اور ہو بہو وہی خیالات سامنے آجاتے، جو اپنے پیشوا کے ہوتے۔ جنیدؒ و بایزیدؒ کی صورت سے بڑھ کر سید الاولین والآخرین ﷺ کے عکس جلالی و جمالی کا نقشہ تھے۔ ہر مجلس اور ہر محفل، مجلس رسولؐ اللہ تھی۔ فرقہ بندی گروہ بندی اور تعصب کے بندھن کے توڑ تھے۔ آپ

Marfat.com

"یکساں زیستن اور یکسو نگریستن" کا نمونہ تھے۔ رسم و رسوم طریقت کو جب بے معنی اور بے روح پایا، تو رسم سے بلند ہو کر صرف حقیقت پر ہمیشہ نظر رہی۔ قدموسی، دست بوسی، دست بستگی، تعظیم و تکریم، جو طریقت کی جان خیال کی جاتی ہے اس سے بالکلیہ بیزار تھے۔

تصور شیخ جو سالکِ طریقت کے لیے چلا آرہا ہے۔ وہ بایں الفاظ رد فرماتے تھے کہ سوائے خدائے اقدس کے کس کا تصور جمایا جائے اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے "اللہ" کی صورت بنا کر فرماتے، یہی تصور کافی ہے۔ شجرۂ طریقت جو تمام سلاسل میں مروج ہے اور جس سے ایک تعلق سلسلہ کے اولیاء سے پیدا ہو جاتا ہے، اس کے بارے جب ذکر کسی نے کیا، تو فرما دیتے کہ ہمیں تو صرف ایک شجرہ لا الٰہ الا اللہ کافی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور بس۔ ظاہری اعمال پر ہی بہت نظر نہ تھی، باطن پر بھی توجہ مرکوز رہتی اور عمل کے اندر دیکھتے کہ اس کے اندر روح بھی ہے یا نہیں۔ ہاں اتباع رسالت کا جذبہ اتنا مکمل تھا کہ ہر فعل کو سنت پر دیکھنے کی ہر مسلمان سے خواہش تھی اور اس کے سوا کچھ دیکھنا پسند نہ فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی فرقہ، کسی مذہب کا ایک انسان بھی ایسا نہیں ملتا جسے آپ کی ذات اقدس سے عقیدتمندی نہ ہو اور جسے ایک حرف بھی آپؒ کے خلاف لکھنے کی ہمت ہو۔ جس نے زیارت کی، وہ تو خود ہی سب کچھ دیکھ گیا، لیکن جس نے زیارت نہیں کی، آپؒ کی حالات کے تواتر سے، وہ بھی آپ کا معتقد ہو گیا اور حاضری کا خواہشمند اور مشتاق رہا۔

ہم نے اسی مسلک اور اسی فقر کے احیاء کے لیے "ادارۂ تصوف" قائم کیا اور اسی کی اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ نقشہ شیر محمدی اور شرقپوری ہمارا رہبر ہے اور اسی کی دعوت ہمارا مقصود بالذات ہے۔ ہم کسی فرقہ بندی میں مبتلا ہونا پسند نہیں کرتے۔ اور ہر فرقہ کی پسندیدہ تحریرات جو تصوف کے تعارف میں لکھی گئیں یا تصوف کے اقدار پر لکھی جائیں گی بخوشی شائع کریں گے اور اپنے بیگانے کی تمیز نہ رکھیں گے "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرْ" پسندیدہ اٹھا لیجئے گدلا چھوڑ دیجئے اور اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ

Marfat.com

وَلَا تَنظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ۔ یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے۔ مقصود بالذات تحریر ہے نہ کہ تحریر لکھنے والا۔ اس لیے ہمارے بعض احباب جب ہمارے ''سلسبیل''میں کسی دوسرے فرقے کا نام دیکھتے ہیں اور ہمارے مقصد کی بلندی تک نہیں پہنچتے تو''سلسبیل''کو پھینک دیتے ہیں اور ہمیں برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔

ہم اپنے تمام پیر بھائیوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے، ہماری تحریرات کا مطالعہ کریں۔ پھر اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہ کی ذات والا صفات کے حالات کو سامنے رکھ کر مطالعہ فرماویں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے عین آپ کے خیالات، ہدایات اور معمولات کا صحیح نقشہ ہے یا کچھ اور؟

ہمیں اعتراف ہے کہ ہمارا علمی طبقہ جو دینی علوم کا فاضل ہے، ہمارے ہر عملِ نیک کو بھی شرک سے تعبیر کرتا ہے اور ہمیں مشرک بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے، لیکن ہم اپنے مشرب پر قائم رہتے ہوئے، اپنی باطنی قوتوں سے، اپنی ہمت کو بلند رکھنا چاہئے اور اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ پر نظر رکھتے ہوئے حسنِ خُلق اور محبت کے نمونے سے سبق دینا چاہیے تاکہ وہ خود بخود ہمارے مؤقف اور مسلک پر ایمان لائیں اور ہدایت وارشاد کے طالب بنیں۔

جس طرح نبوت ورسالت اور اولیاء کے متعلق غیر مذاہب سے شہادت پیش کر کے تصدیقِ نبوت ورسالت کی خدمت کی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی اغیار کی تحریرات سے ثبوتِ تصوف، ضرورتِ تصوف وغیرہ امور حقہ کے لیے اپنے سلف اور دیگر اہل تصوف کی تحریرات، عوام و خواص کے سامنے پیش کر کے، اپنے مسلکِ تصوف کو نمایاں کر کے، وہ شکوک و شبہات جو اس دور میں پیدا کر دیئے گے ہیں، خلق خدا کے ذہنوں سے دور کرنا چاہتے ہیں۔

''فکر ہر کس بقدر ہمت اوست''

جو دوست اس انداز فکر تک نہیں پہنچتے، ان سے ہمیں شکایت نہیں۔ وہ معذور ہیں، جو چاہیں ہمارے مسلک کے بارے کہیں۔ لیکن جو صاحبِ طریقت یا صاحبِ علم،

تمام حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود عوام سے خوف کھاتے ہوئے عوام کے ساتھ چلتے ہیں، ہمارے نزدیک وہ اچھا کام نہیں کرتے۔ بلکہ عوام و خواص کو ایک ہو کر دین متین کی خدمت کرنی چاہیے اور طریقت کو ایسے روشن اور واضح مسلک سے منور کیا جائے کہ عوام و خواص کو مرغوب ہو جائے اور اقدار تصوف کو اپنانے پر متوجہ ہو۔

فقر و تصوف کیا ہے ؟ اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں مرنا جینا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، اور کسی سے نہ ڈرنا، غیر کی تکلیف برداشت کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا، لوگوں کی گالیاں سننا اور صرف تحمل سے برداشت ہی نہ کرنا بلکہ حسنِ خُلق سے اُسے اپنا بنانا، حق دینا۔ لیکن اپنے حق سے دست بردار ہو جانا، خواہشات کو روکنا اور سخاوت سے بڑھ کر مال جان تک کا ایثار کرنا، چور گھر آجائے تو اپنا مال اپنے ہاتھوں پیش کرنا اور چور کو قطب بنانا، خود بھوک برداشت کرنا اور دوسروں کے پیٹ بھرنا، خوشامد چاپلوسی سے بچنا، دنیا اور دنیاداری سے بیزار رہنا، مال و دولت کو دھوکا خیال کرنا اور عبادت الٰہیہ کے اندر وقت گزارنا اور فضل الٰہی کا ہر وقت امیدوار رہنا، مخالفت سے درگزر کا شیوہ ہو جانا، اور اپنے پرائے کی تمیز دل سے اُٹھ جانا، غرض اللہ کا ہو رہنا اور اللہ ہی کو اپنا کارساز، اپنا مونس و ہمدم، اپنا مہربان اور اپنا رب خیال کرنا۔

ایسی صورت میں خود غور فرمایئے کہ اس مسلک پر چلنا کوئی آسان بات ہے ؟ لڑنے جھگڑنے والوں کی بہتات ہے۔ اپنے حق کی طالب تو دنیا ہے، کسی کو دینے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ بیگانے چھوڑ اب اپنے استاد اور ماں باپ کی برداشت نہیں۔ زندگی کیا ہے ؟ سراسر خواہش اور طلب۔ رات دن حرص و لالچ کے شکار میں گزرتے ہیں۔ علماء صلحاء تک اس ترازو پر تل رہے ہیں اور اسی کو عین دین خیال کیے ہوئے ہیں۔ لن ترانیاں تصوف اور علم کا شیوہ ہو چکا ہے۔ مسابقت الی الخیر کی بجائے مسابقت الی الشر عام ہو رہا ہے۔ اور یہ کون سی مسلمانی ہے (کہ) عقائد کے نام پر مسلمانوں کو دین سے خارج کیا جاتا ہے ؟

ایسی صورت میں اگر کوئی بیکس اپنی خاموشی میں بیٹھا نظر آئے تو اسے

Marfat.com

کیوں برا کہا جائے اور اسے برادری کے تعلق سے خارج کیا جائے۔ ایک مسلمان کو اپنی ملت اسلام سے کاٹ کر ملت مشرکہ میں داخل کرنا کونسی دینی خدمت ہے ؟اور ایک دینی عالم کو بعض اختلافی مسائل پر بد عقیدہ کہہ کر امت محمدیہ سے الگ کرنا کون سی دینداری ہے ؟

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے اتحاد قائم رکھنے کی کوشش جاری رکھی جائے اور جہاں اختلاف آجائے (اختلاف کا آنا ایک فطرتی معاملہ ہے) ایسے اختلاف کو رحمت خیال کرتے ہوئے اپنی راہ چلنا ہی اولےٰ ہے۔ اس مسلک پر چلنا بڑے جگر گردے کا کام ہے۔ ہر کہ ومہ اس پر نہیں چل سکتا۔ لیکن جو بیچارہ اپنی ہمت اس پر صرف کرے اور چند قدم اٹھانے کی کوشش کرے تو اپنی جہالت اور کمزوریٔ ہمت کی وجہ سے اسے کیوں روکا جائے اور اس کے قدم ڈگمگانے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ اتنا کہہ کر گزر جائے کہ وہ بھی ایک مسلک ہے اور ہم بھی ایک طریقہ پر ہیں دونوں راہ دین کی خدمت گزاری کے ہیں۔

ایک عالم دین منبر پر زیب دیتا ہے تو صوفی اپنے حجرہ میں سجدہ ریزی میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی رہبری اور ہدایت میں مشغول ہے تو یہ اپنے محاسبۂ نفس پر متوجہ ہے۔ وہ ظاہر میں راہنما ہے اور یہ باطن کا راہنما و پیشوا۔ لیکن کیسے ؟ حجرہ کے اندر شہنشاہی کرتا ہے اور عالم سے زیادہ باعث ہدایت و رشد ہے۔ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ یہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

## مسلک

نہ ہم دیوبندی مسلک رکھتے ہیں نہ بریلوی بلکہ ہم مجددی اور شرقپوری مسلک کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے معارف و حقائق اور شغل و عمل آپ کے مکتوبات میں ذرہ ذرہ ملتے ہیں، جو اسی غرض کے لیے

Marfat.com

لکھے گئے۔ اور حضرت شرقپوری نور اللہ مرقدہ کی ذات والا صفات کی نیاز مندی اور غلامی میں سالوں گزارے اور ایک ایک قول، ایک ایک فعل، ایک ایک حرکت اور ایک ایک ادا ہماری روح و جان میں ہر وقت تازہ اور وہی ہماری زندگی کی مشعلِ راہِ ہدایت ہے، جس پر چلنا سعادت دارین خیال کرتے ہیں اور باعث نجات اخروی ہے

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

آداب فرزندی کہیں یا آداب طریقت یا غلامی۔ جو کچھ حاصل ہوا آپ کی ذات والا صفات سے ہوا۔ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ ہماری نجات ان کی اتباع میں ہے اور بس۔

لیکن یاد رہے، وہ عملاً ظاہر علماء کے ساتھ ہر قول و فعل پر تھے تو باطناً وہ پوری طرح صوفیا کی طرح محبت و عشق میں سرمست تھے۔ وہ، وہ کچھ دیکھتے دکھاتے تھے جو اہل ظواہر کی آنکھوں سے دیکھا دکھایا نہیں جا سکتا۔

وہ یا رسول اللہ ہماری طرح نہیں پڑھتے تھے کہ کسی کا دل دُکھے۔ وہ اندھیری راتوں میں اپنی خلوت گاہ میں اپنے رب کریم سے باتیں کرتے تھے۔

يَا حَبِيبَ اللّٰهِ خُذْ بِيَدِی۔ لَيْسَ لِی سِوَاکَ مُسْتَنَدِی

اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
محبت غیر سے میری چھڑا دو یا رسول اللہ
مجھے اپنا ہی دیوانہ بنا دو یا رسول اللہ
لگا تکیہ گناہوں کا پڑا دن رات سوتا ہوں
مجھے اس خواب غفلت سے جگا دو یا رسول اللہ

Marfat.com

اور سالہا سال آپ ﷺ کی محبت میں روتے تھے۔ انہیں پکارتے تھے اور اپنے درد پنہاں کو رو رو کر عرض کرتے تھے۔ رات گزری صبح پھر بدستور ایک عملی زندگی میں استوار تشریف فرما ہوتے اور ہر حاضر کو عملی زندگی، اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالنے کی ہدایت فرماتے۔ کسی سے بیر نہ تھا۔ شفقت ہی شفقت تھی۔ آلودۂ عصیاں کو طمانچے مارتے تھے لیکن اندر رحم و شفقت سے بھرپور ہوتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ پاک دل ہو کر اپنے گناہ آنکھوں کے ذریعہ باہر پھینکتا نظر آتا۔ جن کو ہمارے حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی اور سنی سنائی باتوں پر غلو ہے، ان کا کیا حق ہے کہ حضرتؒ کے مشرب بلند پر تنقید کریں۔ پھر ایسی صورت میں کہ وہ اسی حلقہ کی غلامی کے دعویدار بھی ہوں اور اپنے مشرب کو شرقپوری مشرب خیال کرتے ہوں۔ بہر صورت ہمیں ان سے ان کے مشرب کی شکایت نہیں۔ وہ جانیں اور ان کا مشرب۔ شکایت یہ ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے مسلک کو نشانۂ طعن و ملامت بنا رکھا ہے اور اس پر تنقیدیں ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کتنا ظلم کر رہے ہیں اور نفسی خواہشات کی وجہ سے ایک پاک مسلک کو زیر عتاب بنا رہے ہیں۔ اتحاد پیدا کرنا مشکل ہے۔ اختلاف کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ یہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہی تھی جس نے کائنات انسانی کو دعوت اتحاد دے کر پہلا حکم "کَافَۃً لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَ نَذِیْرًا" پایا۔ اختلاف کی جڑ تو شرک ہے اور اتحاد کی بنیاد توحید ہے۔

ہم موحدین اسلام ہی دنیا کو ایک پلیٹ فارم توحید پر لانے کے لیے چن لیے گئے۔ اور اس صورت میں ہمارا فرض ہے کہ اتحاد کو قائم کرنے کے لیے ان اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ کے حکم پر پختہ عقیدہ قائم کریں اور بہ ارشاد اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ کہ اپنی زبان پاک کو ناشائستہ الفاظ و حروف سے ناپاک نہ بنائیں اور اِنَّمَا! لْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے مطابق ہر مسلمان کلمہ گو کو اپنا خیال کریں۔

آخر میں "ادارۂ تصوف" کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اپنی تنگدستی اور تہی دامنی کے باوجود مختصر عرصہ میں چند کتب اور کتابچہ شائع کرنے کے علاوہ "سلسبیل"

بھی جاری کر لیا ہے اور اس پیمانے پر شائع کرنے کا خیال ہے، جو ایسے رسالہ کے شایان شان ہو۔ حالات مجبور کرتے ہیں۔ موانعات آجاتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی کام بھی ابتدائی حالت میں پورے طور معیار پر اتارا نہیں جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نوجوانوں کی ہمت بلند رکھی تو انشاء اللہ وہ دن جلد آ جاویں گے کہ ادارۂ تصوف کی کتب اور سائل بڑے شوق سے پڑھے جاویں گے۔ دنیا کو پیاس ہے لیکن آب حیات سامنے نہیں۔ جب آب حیات کے چند قطرے بھی سینہ کو ٹھنڈا کریں گے اور اطمینان کا راستہ دکھائیں گے تو ایک دنیا اس آب حیات پر ٹوٹ پڑے گی۔ آپ دیکھتے نہیں کہ اولیاء اللہ کے دروازوں پر کس قدر عوام و خواص کا ہجوم ہوتا ہے اور کسی کو دست بوسی تک کی نوبت نہیں آتی۔ پھر بھی وہ تشنہ لب نہیں لوٹتے۔ آنکھوں سے ہی نشے میں آجاتے ہیں اور آنکھوں سے دل سرور سے بھر جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے ہمارا کام مختصر نہیں۔ بلکہ بہت کچھ کرنا ہے اور بہت کچھ روپیہ کی ضرورت ہے، جس سے ہمارے مقصد کی تکمیل ہو۔ سب سے پہلے ایک بڑے تجارتی کتب خانہ کی ضرورت ہے، جس کی آمدنی سے ادارہ خود بخود چلے۔ اس کے بعد ادارہ کا اپنا مکان ہو جس کے اندر دفتر کے علاوہ صوفیا اور احباب کی قیام گاہ کا انتظام ہو اور لاہور میں آنے جانے والے احباب کے لیے مفت کا قیام و رہائش چند روزہ ہو سکے۔ دفتری نظام کے لیے ایک دو تنخواہ دار آدمیوں کی ضرورت ہے، جو ہمہ تن اپنا وقت اس کار خیر میں لگا سکیں۔ اپنے خیال میں ایک لاکھ روپیہ سے ہمارا کام چل سکتا ہے لیکن پختہ یقین ہے کہ لاکھوں روپے کے اخراجات والے اداروں سے ہم زیادہ کام کریں گے اور ہمیں مشکل کچھ نہیں۔ لکھے پڑھے طبقہ تک اپنے خیالات و افکار کو پہنچانا ہے اور بس۔

اس کے لیے چند ایسے ادیبوں کی ضرورت ہے جن کے اندر محبت الٰہیہ کا جذبہ مکمل ہو اور جو اپنے خیالات کو مکمل طور پر کاغذ پر لانے کی قدرت رکھتے ہوں۔ جن کی تحریر دلربا ہو اور جن کا ادب دل سوز ہو۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلتُ وَاِلَیْہِ اُنِیبُ

Marfat.com

مذہبِ عاشق زمذہبہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

ادنیٰ خادم نیاز مند
محمد عمر کان اللہ لہ
(بیربل شریف، سرگودھا)

## حواشی

(۱) اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحیَایَ وَ مَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِینَ
(سورہ انعام۔ رکوع ۲۰)

(۲) فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِی ٥ (سورہ البقرہ۔ رکوع ۱۷)

(۳) وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُورِ ٥
(سورہ شوریٰ۔ رکوع ۴)

(۴) وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ ٥ (سورہ الاحزاب۔ رکوع ۶)

(۵) وَالْکٰظِمِینَ الْغَیْظَ وَالْعَافِینَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِینَ ٥ (سورہ ال عمران۔ ع ۱۴)

(۶) اِدْفَعْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَالَّذِی بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (سورہ حم سجدہ۔ رکوع ۵)

(۷) فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِینَ
(سورہ شوریٰ۔ رکوع ۴)

(۸) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ٥ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ٥ (سورہ النازعات۔ رکوع ۲)

(۹) وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ
(سورہ الحشر۔ رکوع ۱)

Marfat.com

(١٠) وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (سورہ الحدید۔ رکوع ۲)

(١١) تَرٰاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۝
(سورہ الفتح رکوع ۴)

(١٢) وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝
(سورہ الحجر۔ رکوع ٦)

(١٣) وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا يَرْجُوْنَ (سورہ النساء۔ رکوع ۱۵)

(١٤) قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰنِيْ رَبِّيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ
(سورہ الانعام۔ رکوع ۲۰)

(١٥) فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (سورہ الانعام۔ رکوع ۱۴)

(١٦) وَاصْبِرْ عَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ (سورہ مزمل۔ رکوع ۱)

(١٧) وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (سورہ مزمل۔ رکوع ۱)

(١٨) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۝ (سورہ البقرہ۔ رکوع ۲۰)

(اپریل تا جون ۱۹۹۴)

Marfat.com

# طریقت کا بنیادی تصور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۝ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۝ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَافِى السَّمٰوٰتِ وَمَافِى الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (سورۂ حشر : ۲۲)

وہی خدا ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بادشاہ (حقیقی) پاک ذات (ہر عیب سے)، سلامتی اور امن دینے والا، نگہبان، غالب زبردست، بڑائی والا۔ خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے

Marfat.com

پاک ہے۔ وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق، ایجاد واختراع کرنے
والا، صورتیں بنانے والا۔ اس کے سب نام اچھے سے اچھے ہیں۔
جتنی چیزیں زمین وآسمانوں میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتی ہیں۔
وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

نوٹ :۔ یہ آیات حضرت قبلہ میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ بعد نماز مغرب کئی بار دہرایا کرتے تھے اور اکثر سالکین کو بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

تصوف کیا ہے ؟ یہی نہیں، جو تصور پاک ان آیات بالا نے پیش کیا ہے اور جس کے صفاتِ عامہ وخاصہ نے تمام دنیا کو گھیر رکھا ہے، اور جس کی ذات اقدس کے لیے دنیا بے تاب ہوتی چلی آئی۔ وہی نہیں ؟ ؎ اے جان جہاں کہاں ہے تو مجھ کو تیری تلاش ہے۔ اس کی حقیقت کیا یہی نہیں ؟ یہی تخم دین نہیں ؟ اس پر تمام ادیان کا مدار نہیں ؟

رسالت کیا ہے ؟ اسی تخم کا تنا نہیں ؟ اور برگ وبارِ رسالت اسی تخم سے سرسبز نہیں ؟ اور دین متین اسی تخم کا ثمرہ نہیں ؟ جس سے معاشرہ کا ہر رگ وتار زندہ ہے

اگر ایسا ہی ہے، تو پھر فرمایئے ! اس تخم پاک کے لیے مذہبی دنیا کیا کچھ کر رہی ہے۔ علمی دنیا میں اس کی بابت کیا کچھ تحقیق ہو رہی ہے۔ عمر گذر گئی۔ کتابوں کے ڈھیر پڑھ ڈالے۔ لیکن اس کی صفات وذات کے متعلق کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک قرآن حکیم ہے، جو سارے کا سارا اس دولت بیکراں سے بھرا پڑا ہے۔ اسے پڑھتے ہیں غور کرتے ہیں۔ لیکن کہاں ؟ جہاں اس ذات خاص کی بابت کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ اخلاقیات پر دھیان ہے۔ سیاسیات پر توجہ ہے۔ معاملات کے اذکار کو غور سے پڑھا جاتا ہے کہ کہاں تک قرآن حکیم ان کا احصا کرتا ہے۔ عبادت پر توجہ ہے کہ کیسی ہونی چاہیے۔ قانونِ شریعت پر نظر ہے۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس روحِ خالص کے سوا، جس پر مدارِ زندگی کائنات ہے۔

”جمالیات“ کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ جس کے مصنف نصیر احمد

صاحب ہیں۔ مقدمہ میں ان کے یہ الفاظ لکھا گئے کہ میں حسن کی تلاش میں مفکرین مغرب کے ساتھ ہر میدان میں دوڑ تا رہا۔ لیکن ہر میدان میں جب وہ تھک کر بیٹھ گئے، تو میں بھی ماندہ ہو کر رہ گیا۔ آخر مایوسی کے عالم میں قرآن حکیم کے مطالعہ میں اسے تلاش کرنے لگا۔ یہاں تک کہ جس کی تلاش میں عمریں گزر گئی تھیں اور جس کے جلوہ ہائے بے تابانہ کے لیے بے تاب رہا، اس کے ایک ایک پر تو کی جھلک قرآن حکیم میں پائی۔

لیکن حیران ہوں کہ مفکرین اسلام نے کیوں اس طرح توجہ نہیں کی اور کیوں ایسے مواقع کو نظر انداز کر کے آگے نکلتے رہے۔ اور اسی حیرت میں میں یہ الفاظ قرآن حکیم کے دوہراتا ہوں۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا

اور رسول عرض کریں گے کہ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

میرا مقصد یہ ہے کہ علمائے کرام کے ہر طبقہ نے بہت کچھ قرآن حکیم کے حقائق پر اور معانی پر تفاسیر لکھی ہیں۔ لیکن بلا تردّد۔ آپ ان آیات کا مطالعہ فرمائیے، جن کا تعلق توحید کے ساتھ ہے، تو یہ بالکل صحیح پائیں گے کہ تمام مفسرین ان آیات کو چھوڑ کر ایسے بھاگے کہ ایک حرف تک اس بارے نہیں لکھا۔ مثلاً ان آیات کا مطالعہ فرمایا جاوے، جن کو بطور عنوان دیا گیا ہے۔ ایک ایک لفظ تمام تفاسیر اور تراجم کا دیکھئے۔ لفظی ترجمہ کے سوا کچھ لکھا ہوا آپ نہ پائیں گے۔

دور کیوں جاتے ہیں۔ موجودہ وقت ہزاروں تک رسائلِ دینی شائع ہوتے ہیں اور ہر ملک سے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن دیکھیۓ کسی میں توحیدِ مطلقہ پر کچھ نظر نہ آئے گا۔ رسالت پر مضامین ملتے ہیں، دین اور اس کے تمام متعلقہ اجزا پر مقالے نظر آتے ہیں۔ غرض ہر ہر جزو دین پر مضامین کے انبار نظر آتے ہیں۔ لیکن ہاتھ کچھ نہیں آتا، توحید پر۔ تو ایک لفظ بھی نہیں پڑھا جائے گا۔

ہم نے صرف اسی غرض سے اپنا وحید مقصد تصوف رکھا ہے اور یہ تصوف کیا ہے؟ اوسکی طلب، اور اوسکی جستجو، اوس کا شوق اور ذوق، غرض ایک توجہ ذات حقہ اور بس۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اب ہمارے دوست ہیں کہ ان کی نظر جب بلند نہیں اٹھتی، تو وہ اپنے خیال کے مطابق ادائے امور اور لوازمات محبت کیلئے ہمارے ساتھ گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ علمائے کرام دین متین کے نام پر مرتے ہیں...... اور صلحائے عظام رسالت پر وارفتہ ہو رہے ہیں۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ دین کس کا؟ رسالت کس کی؟ تو آخر وہی جواب نہ ہوگا جس کے لیے ہم یہ حرف لکھ رہے ہیں؟

ہم کسی سے یہ نہیں کہتے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہوں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنے کام میں مصروف و مشغول رہیں اور اپنے زعم کے مطابق دین کی خدمت کریں۔ لیکن ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ایک حسن ظن کے ساتھ ہماری تحریرات پڑھی جائیں اور وہ کچھ دیکھنے کے لیے کوشش کی جائے جو ہمارے دین کا راس المال ہے۔

ہمارے علمائے کرام جو اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں، سینکڑوں کتابیں لکھ چکے ہیں لیکن اگر آپ ان تمام کا مطالعہ کریں گے تو ان میں توحید کے میدان کا ایک حرف بھی سامنے نہ آئے گا۔ آئیگا تو کیا؟ احکامِ توحید کہ یہ شرک ہے، وہ شرک ہے یعنی یہ اعمال مشرکانہ ہیں۔ لیکن شرک سے بچانے کے لیے کوئی اصل صورتِ توحید پیش نہیں کرتا۔ غور فرمائیے جب وہ سامنے آجائیں، تو پھر شرک کی کیا مجال؟ حضور ﷺ پر جب جلوہ آرائی ہوئی تو بے اختیار آپ کی زبان پر آگیا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ ایک طرف خدائی تصور سامنے آیا، دوسری طرف اپنی رسالت کی حقیقت اور اپنے منصب کی اہلیت سامنے آگئی۔ اللہ اکبر! رسالت کے حاضر و ناظر ہونے کا جھگڑا ہے، لیکن ذات اقدس کے حاضر و

Marfat.com

ناظر ہونے کا دھیان تک نہیں۔ فریقین خاموش ہیں، اور زبانی اقرار کے سوا کوئی ایسا فعل موحدین کا نظر نہیں آتا جس سے یہ معلوم ہو کہ امت اسے حاضر و ناظر خیال کرتی ہے اور یقین کرتی ہے کہ ہمارے ہر فعل کو وہ دیکھ رہا ہے۔

ہمیں وہ دولت نصیب نہیں ہوئی، جو پاکباز بندوں کو نصیب ہوتی ہے، جن کے دل و نگاہ سے ایک کافر مسلمان بن جاتا ہے اور ایک مسلمان مومن ہو جاتا ہے اور ایک مومن عارف باللہ ہو کر خلق اللہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ ہمیں ان پاکباز اولیاء اللہ کے جوڑوں اور جوتوں کی پشت کے طفیل، ذوق سلیم عنایت فرمایا گیا اور قلم میں وہ قوت نصیب فرمائی جو بڑے بڑے صوفیاء کو نصیب نہیں ہوئی۔ سالوں گذر گئے۔ بلکہ کامل قرن میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں آیا جس کے قلم سے اسرار الہیہ اور غوامضِ توحید یہ صفحۂ قرطاس پر پھول کی طرح کھلتے نظر آتے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے بعد گو خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعض متبعین کے بعض مکتوب طریقت کے لیے آبِ حیات کا کام دیتے ہیں لیکن مفصل نہیں۔ مجملاً کچھ لکھ دیا گیا، اور ضرورت کے مطابق کچھ جواب دئے گئے۔ تا آنکہ میدان بالکل صاف ہو گیا، اور جو کچھ بھی تصوف و طریقت کی خدمت کے لیے گاہ گاہ کچھ لکھا جاتا رہا، تو وہ بھی تراجم صلحائے امت کے لکھے جاتے رہے ہیں اور وہ بھی اس بے ذوقی سے کہ پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور سالک طریقت کے لیے کوئی مطلب کی بات سامنے نہیں آتی۔

بفضلہ تعالیٰ میں نے ''انقلاب الحقیقت'' لکھی۔ کتاب کیا ہے؟ تصوف و فقر کا نچوڑ ہے۔ حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کی ولایتِ درخشاں کا ایک ایک حال سامنے آگیا۔ گو پڑھنے والے کم ہیں۔ لیکن جس نے غور و فکر سے ایک ورق بھی پڑھا، وہ بھی آپ کے حال سے متاثر ہو گیا اور حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات کی روح سامنے آگئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کے بعد متواتر تحریرات لکھی جا رہی ہیں اور ہر تاثر سے ایک تحریر خود بخود نمودار ہو گئی ہے۔ پچھلے شمارے تک جتنے ہمارے مضامین شائع ہوئے وہ آپ کے

Marfat.com

سامنے ہیں۔ آپ بار بار پڑھ کر غور فرما سکتے ہیں، کہ کیا کچھ ان کے اندر سمایا گیا اور کیسے سمایا گیا۔ صرف فضل الٰہی ہے۔ ہم کیا اور ہمارا قلم کیا؟ خود جو چاہتے ہیں لکھواتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کراتے ہیں۔ وقت کی ضرورت تھی، کسی کو منتخب کرنا تھا تو اس خدمت کیلئے منتخب کر لیا گیا ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ۔

"توحید بحثیت ظہور" کتنا اچھوتا عنوان ہے اور اللہ تعالیٰ نے کس درجہ پر لیا۔ لیکن افسوس اقساط میں آنے کی وجہ سے اور متواتر سلسلہ نہ چلنے کی وجہ سے ذہن پریشان ہو کر دوبارہ متوجہ ہوتے ہیں۔ پھر پچھلی قسط میں تو پوری ایک کاپی کا غپاڑہ رہ گیا۔ کاپی کا ایک حصہ کاتب صاحب کے جزدان کی نظر ہو گیا، جواب ہم شائع کر رہے ہیں۔ یعنی آخری اور تیسری قسط کی درمیانی کڑی اب شائع کی جا رہی ہے۔ درحقیقت یہ مضمون "طریقت کی حقیقت" کا ایک حصہ ہے۔ جو "طریقت" کے ساتھ شائع نہیں ہو سکا۔

اس اشاعت میں "معجزات کے جنازے" شائع ہو رہے ہیں۔ "السعید" ملتان اور "تجلی" دیوبند کے درمیان حضرت رسالتمآب ﷺ کے سایہ ہونے، نہ ہونے پر ایک سلسلۂ مضامین چلتا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر بڑا رنج ہوا کہ یہ ہمارے بزرگ کس مشغلہ میں لگ گئے اور کون سی خدمتِ دین کر رہے ہیں کہ الٹا بنیادِ دین کو گرا رہے ہیں۔ اس تاثر پر یہ عنوان لکھا گیا اور معجزات کے انکار کے نتائج کو واضح کیا گیا، اور معجزات کا وجود نبوت کی کامل نشانی قرار دیا گیا۔

بہر صورت جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ ہم صرف اتنا عرض کر رہے ہیں کہ غور سے پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے، پھر سوچا جائے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ طریقت کی خدمت ہے یا علم کی طرف داری؟

مولانا مودودی صاحب کے ایک جواب کو شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں آپ نے ایک مسلم کو مشرک نہ کہنے پر لکھا۔ لیکن کس عجیب دلیل سے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص جب ایمان دین توحید پر لا چکا ہے، تو پھر اس کو کیوں کر مشرک کہا جاوے، جب کہ اس کا اقراری ایمان توحید پر ہے، خواہ اس سے بعض افعال مشرکانہ بھی سرزد

ہوں۔ کیونکہ ایمان توحید ہی پر ہے۔ یہ دلیل اتنی واضح اور روشن، دلوں کو صاف کرنے والی ہے کہ اس کے بعد کسی اور دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں۔ ہر آدمی خود اس دلیل کو واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اب بھی ہمارے دوست اپنی تنگ ظرفی سے باز نہ آئیں تو پھر یہ ان کی مرضی ہے۔ موقعہ کم ہو چکا ہے۔ ہم خود اسی مسلک پہ ہیں، کہ اہل اسلام کو کافر و مشرک کسی صورت میں نہ کہا جاوے۔

ہم یارانِ طریقت سے عرض کرتے ہیں کہ ہماری طریقت حضرت اعلیٰ مولانا غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ بیر بلوی کی گود میں پلی اور حضرت قبلہ مرشدم جناب میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ سایہ پروان چڑھی۔ اس صورت میں کسی کو کیا گنجائش ہو سکتی ہے کہ ہماری طریقت کے بر خلاف کچھ کہے۔ ہاں رسم و رسومِ طریقت کچھ ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ کوئی صوفی اس سے چھوٹ نہیں سکتا اور اپنے مسلکِ طریقت کو خاص آزاد طریقت کے لیے واگذار نہیں کر سکتا۔

لیکن یہ مسلک بے جان ہیں۔ اگر ان مسالک میں روح ہو، تو پھر چشم ماروشن دل ماشاد، ہم بھی اس روح دار طریقت کے ایک ایک نشان پر سر بسجود ہونے سے گریز نہ کر سکتے۔ ورنہ بے روح طریقت ایک بت ہے۔ اوسکی پوجا کون پسند کر سکتا ہے؟ ہم آپ سے کھلے دل سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ لوگ ہمارے مقالے غور سے پڑھیں۔ یہ وہ مضامین اور مقالے ہیں جن کو علمی دنیا اور مذہبی دنیا اپنے مسلک کے بر خلاف خیال کرتے ہوئے نہ اپنے رسالوں میں شائع کرتی ہے، نہ تنقید کرتی ہے۔ بلکہ صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ ہمارے مسلک کے یہ خلاف ہے۔

اس کے بعد رہے اپنے مسلک کے لوگ، وہ بعض کے کہنے سے بدگمان ہیں۔ نہ وہ لوگ خود مطالعہ کرتے ہیں، نہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، بلکہ دیوبندی فکر کے ترجمان کہہ کر نفرت دلائی جاتی ہے۔ یہ کتنا نقصانِ عظیم ہے کہ اپنے بھی بے بہرہ رہیں۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ ہم ہمت ہارنے والے نہیں۔ انشاء اللہ کسی دن ان خیالات کی قیمت ہو گی اور دنیائے طریقت کے لیے یہ آبحیات کا کام دیں گے۔

Marfat.com

ادارۂ تصوف کا قیام اور "سلسبیل" کے اجراء کا مقصدِ وحید طریقت سے روشناس کرنا اور طریقت کے حقائق عوام و خواص کے اذہان کے مطابق پیش کرنا ہے اور بس۔ اس کے علاوہ کسی شعبۂ دین کے ساتھ تعلق رکھنا ہمارے محدود خیال سے باہر ہے۔ اس لیے میدانِ تحریر بڑا تنگ ہے۔ نہ لکھنے والے ملتے ہیں اور نہ پڑھنے والے پائے جاتے ہیں۔ سالکینِ راہِ طریقت کم یاب ہی نہیں بلکہ اِکا دُکا بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ جو صاحبِ ارشاد مسند ارشاد پر تشریف فرما ہیں سالکین کی تربیت کی طرف ان کا خیال ہی کم ہے۔ اگر کوئی صحیح معنوں میں صاحب ارشاد ہے بھی، تو ہر صاحب ارشاد کے باطن میں وہ سوز و سازِ محبت نہیں، جو ہمارے حضرت قبلہ نور اللہ مرقدہ کی ذات والا صفات میں تھا۔ وہ ہر حاضر کے لیے بے تاب تھے کہ وہ جذبۂ توحید میں سرمست ہو کر نکلے اور شریعت غرا کے لباس میں ہمیشہ کیلیے مزین ہو جائے اور دنیا میں اس طرح گزران کرے جیسے کوئی مسافر گذارتا ہے۔ اور ضروری قوت لایموت سے زیادہ حریص نہیں ہوتا۔ نہ خود آپ کی ذات والا صفات دنیا کو پسند فرماتی تھی، نہ ان سے ملنے والے دنیا پرست تھے۔ ہاں وہ اس لیے نفرت نہ رکھتے تھے کہ فقر کی شان گر جائے۔ یعنی فاقہ مستی بلکہ شریعت غرا کے مطابق کسی کی بے روزگاری پسند نہ فرماتے تھے۔ "سلسبیل" کے پس پشت آپ کے نظریۂ فقر و تصوف کے چوکھٹے آپ کو نظر آئیں گے، وہی آپ کا نظریۂ طریقت تھا۔ لیکن حقیقت سے پرُ ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی اور ظاہر و باطن کے اتحاد کو اسلام خیال فرماتے تھے۔

حروف ضرورت سے زیادہ ہو گئے ہیں اس لیے ہم رخصت چاہتے ہیں اور آپ کی توجہ اور مطالعہ کے امیدوار ہو کر رخصت ہوتے ہیں۔

(گفتنی اکتوبر ۱۹۶۳)

Marfat.com

# طریقت اور اجتماعی جدوجہد

کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فی شَان (ہر آن وہ ایک نئی آن میں ہے)

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بدیگرے پرداخت

الٹ پلٹ، ہیر پھیر، زندگی موت، یہ کیا ہے؟ سرمدی انقلاب یا سرمدی زندگی جو متواتر چل رہی ہے۔ جس کی ابتدا نا معلوم، جس کی انتہا نا معلوم۔ یہ سلسلہ ختم ہو گا یا نہ ہو گا، مذہب بتلاتا ہے قیامت پر ختم ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کو قیامت یا فنا کا نام دیا جائے گا۔ کیونکہ حشر کا نام ہی بتلاتا ہے، کہ زندگی ہے۔

یہ تیری میری زندگی نہیں۔ بلکہ ایک سرمدی (دائمی) زندگی ہے۔ جس پر موت یا فنا کسی صورت وارد نہ ہو گی۔ موت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا۔

ذرے سے ذرہ تک، زمین و آسمان سے بڑھ کر فضا اور خلا تک، جہاں آپ نظر ڈالیں گے یہ سلسلہ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فی شَان نظر آئے گا۔ قرار نہیں، سکون نہیں، ایک حرکت ہے، ایک چال ہے، ایک نیرنگی ہے۔

Marfat.com

لیکن سعدی نے کتنے سادہ الفاظ میں اس کا خاکہ پیش کیا۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

رفت و منزل بدیگرے پرداخت

جو آیا اس نے نئی عمارت بنائی۔ وہ خود چلا گیا۔ تو وہ دوسرے کے حوالہ ہو گئی۔ ذرہ ذرہ تعمیر نو میں مصروف و سرگردان و حیران۔ ایک نیا جہاں تعمیر ہو رہا ہے۔

## تبدیلی اور نقل مکانی

ادارۂ تصوف حاجی فضل احمد صاحب کے مکان میں قائم ہوا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں اس کا دفتر کھولا گیا۔ اور چند دوستوں نے دفتر سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ہاتھ میں کام نہ ہونے کی وجہ سے دفتری حالت ابتر ہوتی گئی۔

ابتدا ہی سے صوفی محمد اقبال صاحب کی طبیعت موزوں پائی گئی تھی۔ لیکن نہ وہ بھیرہ سے نکلنا چاہتے تھے، اور نہ ہی ادارہ ان کے مصارف برداشت کرنیکی استطاعت رکھتا تھا۔ لیکن جب دفتری نظام قائم نہ ہو سکا تو آخر ادارہ کے پاس کوئی چارہ نہ رہا کہ ہر صورت دفتری نظام کے لئے ایک قابل نوجوان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اقبال صاحب کی طبیعت میں ہر گونہ تصوف کی نمائندگی تھی۔ لیکن بہ امرِ مجبوری ہاں نہیں کر سکتے تھے۔ آخر ادارہ نے انہیں مجبور کیا تو وہ دفتر سنبھالنے کے لئے لاہور پہنچ گئے۔

لیکن کسی کونے میں دفتر لے کر بیٹھنا انہیں پسند نہ تھا۔ کہ اگر کچھ کرنا کرانا ہے تو پھر بازار جب تک ہم نہ جا بیٹھیں، تو کون تصوف کی کوٹھری میں ہمت کر کے ہمیں دیکھنے کے لئے آئے گا۔

چنانچہ اردو بازار کے چوک میں حبیب بنک کے اوپر کی منزل میں دفتر کھول کر بیٹھ گئے۔ اب جو اس سڑک سے گزرتا ہے، جو اسٹیشن سے آتی ہے، اور لوہاری دروازہ کے سامنے گزرتی ہوئی بھاٹی دروازہ اور داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جاتی ہے، وہ ادارۂ تصوف کا ایک شاندار بورڈ دیکھتا ہے۔ اور جن کو کچھ بھی فقر و تصوف کے ساتھ

Marfat.com

دلچسپی (موافق یا مخالف) ہوتی ہے، وہ دفتر میں جا پہنچتا ہے۔

جاتے ہی ایک نوجوان لمبے قد اور گورے رنگ، صوفیانہ صورت، تبسم زیر لب نظر آتا ہے، جس کے دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ واقعی ادارۂ تصوف کا دفتر ہے۔ اور جس طرح کے وہ سوالات کرتا ہے، صوفی صاحب اس کا جواب نہایت متانت سے دیتے ہیں، پریشانی کا نام ونشان چہرے پر نہیں آتا۔ سراسر سکون حاصل ہوتے ہی ادارہ کے خط و خال زائر کے دماغ پر اصل صورت میں نقش ہونے لگتے ہیں اور ادارہ کی ضرورت وحقیقت سامنے آجاتی ہے۔

ضرورت ادارہ

ایک زمانہ تھا کہ وحدت کثرت پر غالب تھی اور وحدت ہی تمام اجتماعیت کی مالک تھی۔ لیکن زمانہ بدلتا ہے۔ تازہ گل کھلتے ہیں۔ انقلاب آیا۔ اب کثرت وحدت پیدا کرتی ہے۔ اجتماعیت نے دنیا کو گھیر لیا۔ کوئی کام اجتماعی صورت کے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ گو فطرت اس کے خلاف ہے۔ ہر فکر پہلے ایک ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو متاثر کر کے اپنے اندازِ فکر کے ساتھ شریک کرتا ہے۔ تو اصل وحدت ہی رہی۔ ذات اقدس خود وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس نے کثرتِ پیدا کی اور اس نے کثرت خلق کو اپنی وحدت کے ذریعہ ایک وحدت کے اندر رکھ کر انتظام چلایا، اور چلایا جارہا ہے۔ ایسے ہی نبوت ایک وحدت ہے جو امت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ہماری طریقت بھی ایک وحدت ہے اور اس وحدت نے ہزاروں اجتماعیات بپا کیۓ۔ لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ اب کثرت سے وحدت کا کام لیا جائے، تو کام جلدی نکلتا ہے۔ اور ایک فن پیدا ہو جاتا ہے۔ ورنہ افلاطون، ارسطو اور دیگر حکما ایک تھے اور صرف ایک اور اپنے حکمتی اصولوں سے دفتروں کے دفتر بھر دیئے۔ بہر حال اسی صورت میں ہم نے ادارہ کی بنیاد قائم کی، کہ یہ ایک علمی کام ہے، حالی نہیں۔ حال ایک ہوتا ہے اور اس کے غلبہ میں حال چھا جاتا ہے۔ لیکن علم یہ قوت نہیں رکھتا۔ اس لئے اس میں افراد علمی کی

ضرورت زیادہ ہے۔ اور پھر موجودہ وقت میں اس احساس کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ اور کام کے لئے میدان کھلتا جاتا ہے۔ کوئی کھیل ایسا نہیں، جو اکیلا کھیلا جائے۔ یہ بھی ایک علمی چربہ ہے جو حال سے لیا جاتا ہے۔ مجددی ادوار کے بعد تصوف کے انکشافات قلم پر بہت کم آئے۔ اور جو بھی آئے وہ اکا دکا ہونے کے وجہ سے چھپے رہے۔ لیکن اس خاموشی کے زمانے میں علمی دوڑ نے بڑی ترقی کی اور علم نے ہر چیز کو اپنی علمیت کی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ طریقت کے بحر عمیق میں بھی ڈبکیاں لگانی شروع کیں۔ اور اپنی نارسائی کی وجہ سے جو کچھ ذہن میں آیا، عوام کے سامنے کھلے طور پر کہہ دیا۔ مادی علمیت تو پہلے ہی طریقت کی مخالف تھی اور مذہب کو ایک قید کے سوا کچھ خیال نہ کرتی تھی۔ لیکن ہماری دینی علمیت پر بھی عقل کی پٹی تھی، اور یہ پٹی روحانی مشاہدات تک پہنچنے کے لئے مانع تھی۔ اس لئے جو چیز ان کی عقلیت کے سامنے نہ آئی اس سے انکار کر دیا۔ انکار بھی اس صورت میں کہ یہ منافی مذہب (اسلام) ہے کسی نے رہبانیت کا تصور پیش کر دیا، کسی نے زرتشتی (ایرانی) تصوف کہہ دیا، اور کسی نے ہندی تصورات کا خاکہ بتلا دیا، اور کسی نے جمود سے اسے تعبیر کیا۔

بفضلہ تعالیٰ طبع آزاد پائی اور ہر مشرب سے کچھ نہ کچھ چکھا اور ذوق پایا۔ اور ہر مکتبِ فکر میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ طریقت کی گود سے نکل کر مدرسہ کے صحن میں گئے۔ اور مدارس سے نکلنے کے بعد مغربی افکار کی جولانگاہوں کی سیر سالوں میسر رہی۔ اور ہر انسانیت سے واسطہ پڑا۔ مطالعہ کے لئے لائبریاں موجود تھیں۔ اخبار ورسائل دیکھے۔ لیکن جتنا کسی کو بلند دیکھا، اتنا ہی اندر سے کمزور پایا۔ آخر پھر پلٹے اور طریقت کے دربار میں حاضر ہوئے۔ لیکن جتنا سنا تھا، اس سے بڑھ کر اس کو حقیقت پایا۔ قبلہ حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کی طریقت ندی نالہ کی طرح نہ تھی، ایک بحر زخار کی طرح طریقت موجیں مار رہی تھی۔ تھکا ماندہ مسافر جب چشمۂ حیات دیکھتا ہے اور اس پر سائیہ بھی ہو، تو وہ وہیں ڈیرہ ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی زندگی کی تھکن دور کرنے کے لئے آخری ڈیرہ طریقت کے چشمے پر لگا دیا۔ چند گھونٹ جو پینا نصیب تھا پی کر

ہمیشہ کے لئے اس دربار عالیہ پر معتکف ہو بیٹھے ؎

نہ جہاں میں کہیں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں
قرارے کردہ ام بادل نہ پیچم سر ازیں درگاہ
سر اینجا، بندگی ایں جا، سجود ایں جا، نیاز ایں جا،

لیکن علمی دنیا، جیسے پہلے آوارگی میں تھی اس سے بڑھ کر پریشان پائی اور طریقت کی ہر حقیقت (قدر) پر برستی دیکھی۔ اچھے اچھے عالم، اچھے اچھے قائدینِ ملت اور اچھے اچھے علمی دیندار اپنے تیز دھار ہتھیاروں کے ساتھ طریقت کا پوسٹ مارٹم کرتے دیکھے، دل میں ابال اٹھتا تھا، لیکن ایک ناتواں جان کیا کر سکتی تھی۔ آخر یاران طریقت کو احساس دلایا اور اس فریضۂ طریقت ودین کی دعوت پیش کی جو بفضلہٖ تعالیٰ چند افرادِ طریقت کی ہمت کا باعث ہوئی اور ادارۂ تصوف کی بنیاد رکھ دی گئی۔ بفضلہٖ تعالیٰ دو برس کی قلیل مدت میں ادارہ نے چند کتب اور کئی کتابچے شائع کر ڈالے اور ساتھ ہی سہ ماہی "سلسبیل" جاری کر دیا۔ ادارہ کی تمام تحریرات کو اعتدالی اور معیاری خیال کیا جاتا ہے۔ اور علمی و عملی طبقوں میں قبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ انشاء اللہ اگر خدائے قدوس کے فضل و کرم شاملِ حال رہے تو ادارہ اپنا پورا مقام طریقت میں پیدا کرے گا۔ لیکن اس اخلاص و محبت کے باوجود اسی طریقت کے ہوا خواہ اصل حقیقت کو نہ پاتے ہوئے ادارہ کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتے ہیں، اور بعض مقالاتِ علمی کے لکھنے والوں کے نام سے ہی بدک جاتے ہیں۔ لیکن اس مشہور مقولہ کو مدنظر نہیں رکھتے۔ اُنظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ (بات کو دیکھو، بات کہنے والے کو نہ دیکھو)۔ ہم اپنے مدعا کے ثبوت کے لئے ان لوگوں کی تحریرات شائع کرتے ہیں، جو طریقت میں تو بلند پایہ نہیں رکھتے لیکن علمی دنیا میں ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور جن کو ان کے تلامذہ تسلیم کرتے ہیں، اور جن کے پڑھنے سے ان کے شاگرد متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً گذشتہ شمارہ میں مولانا آزاد کا وہ مضمون جس میں انہوں نے سرمد شہیدؒ کو شہید کہا اور شہادتِ عظمےٰ کے مقام پر بٹھایا، پیش کیا گیا۔ کیونکہ اکثر ان کے ہم خیال، مجاذیب کے

Marfat.com

بارے ایسا خیال نہیں رکھتے اور ان کو کھلے طور پر دیوانہ خیال کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں خیال کیا جائے کہ یہ طریقت کے لئے کتنی اچھی، مفید اور بلند تحریر ہے، جو ہماری طریقت کے لئے ایک سند ہے۔ ایسے ہی کئی مقالے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ امت میں اعتدال پیدا ہو اور تنفر دور ہو۔

رسمی طریقت یا بریلویت کے بھی ہم بدخواہ نہیں۔ وہ جانیں اور اُن کا کام۔ لیکن حقیقی طریقت کی سرپرستی سے محروم رہنا ہمارے لئے کتنے قلق کا باعث ہے اور ان کی کتنی محرومی ہے کہ خالص علمی ٹھوس کام سے انہیں نفرت ہے جو مرور زمانہ کے باوجود تازہ رہے گا، اور ہمیشہ آبدار موتیوں کی طرح چمکتا رہے گا۔ صاحبِ مثنوی چلے گئے۔ مجدد علیہ الرحمۃ تشریف لے گئے۔ صاحبِ "فتوحات" کو گزرے قرنوں گزر گئے۔ لیکن جب ان کی تصانیف سامنے آتی ہیں تو ان کے خیالاتِ بلند بعینہٖ صورت میں کتابوں کے اندر پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ یہ بقا کیسے حاصل ہوئی؟ صرف ان کی تحریرات سے۔ بیشک تصوف کتابیں نہیں۔ لیکن کتابیں تصوف کی انعکاسی صورت کا عکس ضرور ہیں۔ اس لئے ہم جس طرح غیر اہل طریقت سے درخواست کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل طریقت سے بھی درخواست کرتے ہیں۔ غرض موافق اور غیر موافق سے درخواست ہے۔

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہِ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

کچھ نہ سہی۔ ایک تماشہ کے طور پر ہی ہمارے خیالات کو مطالعہ فرمایا جائے۔ اور ہمارے دل باختہ خیالات و تصورات کو دیکھا جائے کہ ہمارا ایمان طریقت پر کیسا ہے اور ہم اسے کس درجہ پر دکھانا چاہتے ہیں۔

## نظامی تبدیلی

مکانی تبدیلی کے ساتھ نظامی تبدیلی بھی کر دی گئی ہے۔ صدر حاجی فضل احمد صاحب اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور علالت طبعی کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ اس لئے تمام انتظامیہ مشینری کے کرتے دھرتے ان کے نائب ڈاکٹر قریشی صاحب

Marfat.com

مقرر کر دیئے گئے۔ تمام انتظام ادارہ کے وہ ذمہ دار ہیں۔ ہاں کسی انتظامی پیچید گی پر حاجی صاحب سے مشورہ کر لیا کرینگے۔ اور اب حاجی صاحب کو انتظامیہ کمیٹی میں شامل ہونا ضروری نہیں رہا۔ ہاں جنرل میٹنگ میں ان کی شمولیت ضروری ہو گی یعنی انتخابات میں۔

لیکن اس کے بدلے ہم نے ان کے سر پر وہ بوجھ ڈال دیا ہے، جو کسی دوسرے سے برداشت ہونا مشکل ہے۔ زمین و آسمان نے جو بوجھ نہ اٹھایا انسان سادہ مزاج نے اٹھالیا۔ وہ کیا ہے؟ ادارہ کی مالی حالت کی درستگی کے لئے ممبر بنانا، عطیے جمع کرنا۔ اور خریدار پیدا کرنا۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں برکت دی ہے۔ جس سے وہ طلبِ مطلب کرتے ہیں، وہ انکار نہیں کر سکتا بلکہ دل کھول کر ان کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔

نظامی تبدیلی کے بعد یہ لکھنا ضروری ہے کہ جہاں نظامِ دفتر مکمل ہو چکا ہے، وہاں اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں اور تقریباً تین صد روپیہ ماہانہ کا خرچ ہو رہا ہے۔ ''سلسبیل'' خود اپنی ذات کا متکفل بھی نہیں۔ اس کی خریداری قریباً چھ صد سے ابھی تک نہیں بڑھی۔ علمی طبقہ میں ابھی تک ہمارے رسالہ کا گزر نہیں ہوا۔ زیادہ تر گھر کے لوگ ہیں۔ مولویوں صوفیوں کا حال تو یہ ہے کہ کسی کتاب کا خرید کر پڑھنا حرام خیال کرتے ہیں۔ اور حقیقی یا رسمی صوفی کو اس کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ ان کی دعوت یہ ہے۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن
روئے خود را جانب دل دار کن

یہ سچ اور سراسر سچ۔ لیکن ایسے عشاق کہاں جو روئے جاناں کے سوا کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اب تو بے وفا معشوقوں کی طرح عشاق کی آنکھ بھی ادھر ادھر پھرتی رہتی ہے، اور ہر آن طبیعت بدلتی رہتی ہے۔

زشرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سر منزلے نہ دارم کہ بگیرم ازو قرارے

Marfat.com

ایک آنکھ میں دس معشوق بستے نظر آتے ہیں۔ یہی حال ہماری خداپرستی کا ہے۔ گو زبان پر ایک خدا ہے۔ لیکن عملاً ہماری ہر خواہش ایک خدا ہے جس کے لئے جان و دل قربان کر رہے ہوتے ہیں۔

اخراجات اور مصارف کا ذکر تھا۔ جیسے اوپر عرض کیا گیا، اخراجات کافی ہیں اور آمدن کم۔ ایسی صورت میں ہر ممبر، ہر اہل طریقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام و خواص سے ادارہ کا تعارف کرائے اور ساتھ ہی ادارہ کی رکنیت کی دعوت دے اور "سلسبیل" کے خریدار بنائے۔

تعارف کے بعد اگر ہمارا معیار بلند سے بلند تر ہوتا گیا، تو خود بخود ادارہ کی مقبولیت عام ہو گی اور تحریرات پر غور کیا جائے گا۔ اور یہ خدمت میرے ذمہ ہے کہ میں اس کی نگرانی رکھوں اور ہر شمارے پر نظر رکھوں اور اعتدال پر قائم رکھنے کی کوشش کروں۔ کیونکہ آج اعتدال اور توازن کے ساتھ بہت کم علمی رسائل شائع ہو رہے ہیں اور جو اپنے مقصد پر جمے نظر آتے ہوں۔ بفضلہٖ تعالیٰ دو سال کے عرصہ میں ادارۂ تصوف کی طرف سے جو کچھ ہماری تحریرات اور سہ ماہی "سلسبیل" میں لکھا گیا، آپ کے سامنے ہے۔ فقر و تصوف کے مسائل کے سوا کچھ نہیں لکھا گیا اور وہ بھی کتاب و سنت کے مطابق۔ کسی ایسے تصوف کو جگہ نہیں دی گئی، جو کتاب و سنت کے برخلاف ہو یا اعتدال کا دامن چھوٹا ہو۔ ہم پختہ ارادہ رکھتے ہیں کہ کسی ایسے مسئلہ پر اپنے قلم کو حرکت نہ دینگے جو اختلاف کا باعث ہو۔ بلکہ اتفاق و اتحاد کی دعوت دینگے۔ جیسے خود وحدہٗ لاشریک دعوت فرماتے ہیں، اور تفرقہ کو خطرۂ دین فرماتے ہیں۔

مشورے اور تجاویز

قارئین کرام کا عام مشورہ ہے کہ سہ ماہی "سلسبیل" کو ماہوار کیا جائے۔ اور اس میں بچوں اور عورتوں کو بھی حصہ دار بنایا جائے، اور اخبارات کی طرح انٹرویو شائع ہوں کیونکہ اس کے بغیر اشاعتِ عام مشکل ہے، اور عام مذاق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام

مشورے مجھ تک پونچائے گئے۔ لیکن میں کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ دنیاوی فوائد کی خاطر اس کا معیار گرایا جائے۔ اور ساتھ ہی اصل مقصد سے ہٹ کر دوسرے مشاغل میں ہم مصروف ہوں، جن کا تعلق ہماری روح سے نہیں۔ جو منافع طلب ہیں وہ ضرور ایسا کرتے ہیں۔ لیکن ہم منافع طلب نہیں، ہم طالب حقیقت ہیں۔ اس ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی طلب کے بغیر ہمارا کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ اور ہم اپنے اس مقصد سے نیچے اترنے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں تو تلخ گھونٹ پینے ہیں جو عشاق کا کام ہے۔

ماہنامہ کے لئے یہ عرض ہے کہ میدان تنگ ہے۔ نہ لکھنے والے ہیں اور نہ پڑھنے والے۔ اور ہم اناپ شناپ سے رسالہ بھرنا نہیں چاہتے۔ فقر و تصوف کی وادی ایمن میں چلنے والے کم اور طور کی سیر کرنے والے نایاب ہیں۔ تمام پاکستان میں کتنے رسالے نکلتے ہیں، جن کا مقصد طریقت کی حمایت ہے۔ لیکن مسائل مختلفہ اور متنازعہ کے سوا اصل حقیقت ذات مطلقہ احدیت پر کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ مانا ہم اس پر کچھ لکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس کے جلووں اور مشاہدوں کی بابت لکھا جا سکتا ہے۔ سب سے بلند پایہ تصوف کا رسالہ تمام پاکستان میں "تاج" کراچی سے نکل رہا ہے۔ لیکن کسی رسالہ کو آپ اٹھا کر دیکھئے بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کے مضامین کے علاوہ اکادکا مضامین تصوف پر ملیں گے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ مضامین کم ملتے ہیں، اور اس موضوع پر لکھنے والے خال خال ہیں۔

## اخبار، رسالہ اور کتاب کا فرق

اخبارات کی زندگی ایک دن کی ہے اور لکھنے والے وقتی تصور جو کچھ لکھتے ہیں، خواہ کتنے پائیدار مضامین بھی اس میں بھرے جائیں، ان کی زندگی ایک روزہ ہوتی ہے۔ بخلاف رسائل کے کہ ان زندگی ماہوار ہوتی ہے، اور اخبارات سے پائیدار۔ اور ان کے مجموعے تیار ہوتے ہیں اور فائل۔ لیکن کتب کا درجہ بہت بلند ہے۔ ایک پائیدار وقت کے لئے کتب لکھی جاتی ہیں۔ پھر ان کی زندگی افکار پر مبنی ہوتی ہے۔ جو افکار دائمی

Marfat.com

ہوتے ہیں، وہ کتابیں ابدی زندگی حاصل کرتی ہیں۔اور جو جتنے وقت کیلیۓ کارآمد ہوتی ہیں اتنے وقت کیلیۓ ان کی زندگی ہوتی ہے۔ سعدی، جامیؒ، رومیؒ وغیرہ مصنفین آج سے پچاس سال پہلے زندہ اور کئی صدیاں زندہ رہے اور ان کی کتب زندہ تھیں۔ لیکن مغربی افکار غالب ہوگئے۔اور ان افکار نے ان کے تمام اوراق کو الٹ کر رکھ دیا۔اور دریابرد کر دیا۔ اب کسی نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان کو سعدیؒ، نظامیؒ، جامیؒ، عطارؒ اور رومیؒ کا پتہ نہیں۔ جب مسلمانوں میں اسلام زندہ تھا، تو صحابہ کرام ہر وقت امت مسلمہ کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ جوں جوں لادینی اور الحاد غالب ہو رہا ہے، اب ابوہریرہؓ تک بھولتے جاتے ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو صحابہؓ کرامؓ اور ان کی زندگیوں سے بھی امتِ مسلمہ بے خبر ہو جائے گی۔ غرض زندگیٔ اقوام اس وقت تک قائم رہ سکتی ہے، جب تک قوم کے ذہن میں وہ افکار جن پر ملت نے قیام پکڑا تھا، زندہ رہیں۔ افکار بدلنے سے اعمال بدلتے ہیں اور اعمال کے بدلنے سے خود قوم و ملت بدل جاتی ہے، اور کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ کس قوم کی پس ماندہ قومیت ہے۔

اسی غرض کے لئے یہ رسائل اور کتب لکھے جاتے ہیں کہ قوم کے ذہن میں وہ افکار جن پر ملت نے قیام پکڑا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں اور روشنی کے مینار کا کام دیتے رہیں۔ اور اسی غرض سے ہم اپنے سہ ماہی "سلسبیل" کو ماہنامہ نہیں بنانا چاہتے تاکہ اس کی افادیت اور پائیداری قائم رہے اور اس کی زندگی سہ ماہی کے ساتھ مستقل فائل بنتے چلے جائیں اور ہمیشہ کے لئے یہ علمی جواہر ریزے محفوظ رہیں۔

اپنی گہری نظر اور باریک مطالعہ سے ہماری تحریرات کو ملاحظہ کریں اور پھر دیکھیں کہ کس محبت سے ہم نے طریقت کی خدمت کی اور کن کن مسائل کو حل کیا۔ اور کس واضح طریقہ سے اقدارِ تصوف اور حقیقتِ فقر کو روشن کیا ہے اور کیسے دلوں میں طریقت کی حقیقت اور عزت پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نوجوانوں کی

Marfat.com

ہمت بلند رکھی تو انشاء اللہ وہ دن جلد آجائیں گے کہ ادارہ تصوف کی کتب اور رسائل بڑے شوق سے پڑھے جاویں گے۔ دنیا کو پیاس ہے لیکن آبِ حیات سامنے نہیں۔ جب آب حیات کے چند قطرے بھی سینہ کو ٹھنڈا کریں گے اور اطمینان کا راستہ دکھائیں گے تو ایک دنیا اس آب حیات پر ٹوٹ پڑے گی۔

## مالی حالت

آخر میں دوبارہ سہ بارہ تمام احباب اور قارئینِ کرام کو ادارہ کی مالی ضرورت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ہمارا کام مختصر نہیں۔ بہت کچھ کرنا ہے اور بہت کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ جس سے ہمارے مقصد کی تکمیل ہو۔ سب سے پہلے ایک بڑے تجارتی کتب خانہ کی ضرورت ہے۔ جس کی آمدنی سے ادارہ خود بخود چلے۔ اس کے بعد ادارہ کا اپنا مکان ہو۔ جس کے اندر لائبریری اور دارالمطالعہ اور دفتر کے علاوہ صوفیا اور احباب کی قیام گاہ کا انتظام ہو اور لاہور میں آنے جانے والے احباب کے لئے مفت کا قیام و رہائش چند روزہ ہو سکے۔ دفتری نظام کے لئے مزید ایک دو تنخواہ دار آدمیوں کی ضرورت ہے، جو ہمہ تن اپنا وقت اس کار خیر میں لگا سکیں۔ اپنے خیال میں ایک لاکھ روپیہ سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ لیکن پختہ یقین ہے کہ لاکھوں روپے کے اخراجات والوں سے ہم زیادہ کام کریں گے۔

اس کے علاوہ چند ادیبوں کی ضرورت ہے جن کے اندر محبت الٰہیہ کا جذبہ مکمل ہو اور جو اپنے خیالات کو مکمل طور پر کاغذ پر لانے کی قدرت رکھتے ہوں۔ جن کی تحریر دلربا ہو اور جن کا ادب دل سوز ہو۔

مذہبِ عاشقاں ز مذہبہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

خود کئی بار سوچ چکا ہوں کہ صوری اولاد کے لئے لاکھوں روپیہ صرف کر دیئے۔ ان کے لئے مکان بنائے، زمین خرید کی تا کہ وہ آرام سے اپنا وقت گزاریں۔

Marfat.com

لیکن معنوی اولاد (اپنی تحریرات اور اپنے افکار وخیالات) کے لئے کچھ خرچ نہ کر سکا، جو ان سے زیادہ بقا کے حامل ہیں، اور جن سے میری زندگی کیا، ایک قوم وملت کی زندگی وابستہ ہے۔ اللہ نے چاہا اور زندگی ہوئی تو بقیہ زندگی میں اس کے لئے وہ سب کچھ مہیا کرنے کا اہتمام کرونگا، جو ایک اولادِ معنوی کے لئے کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

جس کی صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ ادارہ کی حالت مستحکم بنانے کیلئے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کیا جائے۔ ہمیشہ دنیاوی کاروبار، منافع حاصل کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، لیکن بسااوقات اصل سرمایہ بھی گم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں بفضلہٖ تعالیٰ سرمایہ کبھی گم نہ ہوگا۔ دنیادی منافع سے فائدہ اٹھایا گیا تو ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہوگا۔ ورنہ آخرت میں اس کا پھل نصیب ہوگا۔ جس کی اُس وقت ضرورت ہوگی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

(اپریل تاجون ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

# مشائخ طریقت کا اصل فریضہ

نظر تغافل یار کا گلہ کس زبان سے ادا کروں

دو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ سلسبیل کے ذریعہ مختلف عنوانات کے تحت اقدار تصوف کو روشن کیا گیا۔ ہر عنوان اپنی دلچسپی میں اپنا نمونہ آپ تھا۔ مثلاً نظریۂ حیات ''وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْر'' دنیاومافیہاایک دھوکہ ہے۔ خانقاہیت، طریقت، خواہش، سلوک و مقصد سلوک، توحید بحیثیت ظہور، مذہب کی بنیاد، معجزات کے جنازے، کیفیات، اچھا نغمہ، اچھا قاری اور ''تاج'' میں وحدت وجودووحدت شہود، حال و قال جیسے بلند مقالے شائع ہو چکے ہیں اور بعض تحریرات پر علمی سند بھی حاصل ہو چکی ہے، کہ جس میں ہماری طریقت اسے کو ضلالت سے تعبیر کیا جاچکا ہے۔

لیکن ہم حیران ہیں کہ یارانِ طریقت کو اب بھی ہماری عقیدتِ طریقت پر یقین نہیں آیا، اوراپنے متبعین اور متوسلین کو ہماری تحریرات کے پڑھنے کا مشورہ نہیں دیا جاتا۔

ذات اقدس ہی جانتی ہے کہ ہم کس جذبہ سے متاثر ہو کر اٹھے۔ ہر طرف

Marfat.com

سے علمی دنیا ہی نہیں بلکہ دینی علمیت بھی تصوف و طریقت پر برس رہی تھی اور ہر طرف سے طریقت پر ناپاک حملے ہو رہے تھے اور طریقت کے بہترین عمل کو ضلالت کہا جا رہا تھا اور کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس معرکۂ علمی کے لئے اپنی ڈھال سامنے کرے۔ لیکن ذات اقدس پر ہی بھروسہ کر کے اس بحر ذخار میں ہم کود پڑے اور لنگر اٹھالیا۔

احبابِ طریقت کا فرض تھا کہ وہ ہماری روحانی امداد فرماتے اور ہمارے لئے دعائیں کرتے۔ اور ہمیں اپنے مشوروں ہی سے مستفید نہ فرماتے بلکہ اپنے انفاسِ قدسیہ سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ اور اپنے مسترشدین کو ہدایت فرماتے کہ ادارۂ تصوف کی تحریرات کا مطالعہ کیا کریں۔ بیشک ہم رسمی تصوف کی خدمت کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن معنوی صورت و سیرتِ تصوف کو پیش کرنا کوئی آسان بات ہے ؟ اور اس روحی صورت و سیرت کے بغیر کوئی رسمی تصوف آج کی دنیا میں قدر پا سکتا ہے ؟

بلکہ روزانہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سر پھرا موقعہ سے نہیں چوکتا اور بر سر بازار تصوف و فقر سے دو چار ہو رہا ہے اور پھر سنتا کچھ نہیں، سناتا ہی جاتا ہے۔ اخبار دیکھئے۔ رسائل پڑھئے۔ عام گفتگو پر غور کیا جاوے۔ کون سا موقعہ ہے اور کونسا وقت ہے کہ اس غریب طریقت پر برس نہ رہے ہوں۔ حتی کہ دین کی مقتدر ہستیاں جنہیں اپنی تحریرات پر ناز ہے اور جنہیں اپنے علمی استدلال پر فخر ہے، وہ اپنے قلمی رشحات میں سب سے بڑا مشغلہ یہی بے چارہ تصوف خیال کرتے ہیں اور اسی پر کچھ نہ کچھ لے دے کرنے میں ان کو مزا آتا ہے۔

اس لئے مشائخِ طریقت کی خدمت اقدس میں درخواست ہے کہ جہاں بہت سے فرائض طریقت کی سبکدوشی کے لئے آپ ہمہ تن مصروف ہیں، وہاں اپنے چشم التفات سے ہمیں بھی نوازا جائے۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف اور ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

اپنے اور اپنے متوسلین کے ذریعہ اپنے اپنے سلاسل سے دنیا کو روشناس فرما

کر ہمیں شرف و عزت بخشیں اور اپنے سلسلہ کے اکابر کے سوانح حیات، کلمات طیبات اور حالات سے ہمارے "سلسبیل" کے اوراق کو روشنی بخشی جائے تاکہ ہم حسب طاقت وخیال اپنی خدمتِ فقر میں پورے اتریں۔

متاخرین سے خواجہ نور محمد مہارویؒ، حضرت محمد سلیمان تونسویؒ، حضرت شمس الدین سیالویؒ، حضرت گولڑویؒ اور حضرت جلال پوری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے حالات کے ہم سخت منتظر ہیں۔

بعض مشائخ کی خدمت میں عرض اور درخواست بھی کی گئی لیکن نہ معلوم کس مصلحت پر ابھی تک ہمیں منتظر رکھا جارہا ہے۔

نقشبندیہ سلسلہ میں حضرت دوست محمد قندھارویؒ اور حضرت محمد عثمان صاحبؒ خانقاہ موسیٰ زئی اور حضرت چوراشریف اور حضرت تیراہی رحمۃ اللہ علیہ علیہم اجمعین کے حالات شائع کرنے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ پنجاب ان کی برکات سے منور ہے۔

## جمعیت مشائخ پاکستان

عنوان بالا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور دو تین اجلاس بھی ہوئے۔ کراچی اجلاس کی کاروائی بھی پڑھی۔ پنڈی اور لاہور کے اجلاس کی دعوت بھی موصول ہوئی۔ لیکن پست ہمتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی جسمی کمزوری اور پستیٔ ذہن کی وجہ سے حاضری سے معذور رہا۔ جہاں شناسائی ہوتی ہے وہاں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ اور محض آشنائی سے کیا ہوش ہوگا۔

لیکن اتنا عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ طریقت ابوالوقت ہے ابن الوقت نہیں ابن الوقتی تو آج ہر انسان کی فطرت ہو چکی ہے۔ اور کھلے طور پر نہایت ثقہ آدمی اپنی ابن الوقتی کے حق بجانب ہونے کے لئے بر سر عام پڑھ دیتے ہیں۔ زمانہ با تو نسازد، تو زمانہ بساز۔ لیکن طریقت کے کسی دور پر نظر دوڑایئے۔ طریقت نے کبھی یہ وطیرہ اختیار نہیں کیا۔ جب موقعہ آیا اور آن پڑی تو بے لاگ تنقید کی۔ منہ پر وہ کچھ کہا

جو کوئی کہہ نہ سکتا تھا۔ کہنا کیا تھا۔ حکومت کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ آنسو بہنے شروع ہو جاتے تھے۔ لیکن دشمنی نہیں سراسر محبت ہے۔ کبھی دشمن کا مقابلہ بھی نہیں کیا۔ گالی دینے والے کے لئے دعائیں تھیں۔ کسی کی آس نہ تھی۔ کسی کے سایہ کے اندر بیٹھنا حرام خیال کیا جاتا۔ ہاں سایہ ہے تو خداوندی۔ وہی سہارا، زندگی کا اثاثہ، وہی موت کا سرمایہ، بے سروساماں زندگی، پیالہ سرہانے رکھ کر ہمیشہ کی نیند چلا جانا پسند تھا۔

پھر دعائیں ہر کہ ومہ کے لئے ہیں۔ ہر ذرہ ذرہ کیلئے خیر خواہی۔ چہ جائیکہ انسانیت جس سے وہ پیدا ہوئے۔ طمع ولالچ کا تعلق نہیں۔ محبت واخلاص مجسم کھڑا نظر آتا ہے۔ ساری دنیا کے راز کھل جائیں۔ لیکن سرِ الٰہی کو کھولنا حرام خیال کرتے تھے۔

سب کچھ دیکھتے ہوئے سامان قدرت پر بھروسہ تھا۔ ایسی صورت میں جمعیت کو ہر قدم بڑے سوچ بچار کے ساتھ اٹھانا ہو گا، اور فکر کو ارادۂ ازلی کے ساتھ مناسبت دینی ہو گی۔ ظاہری جمعیت کے ساتھ باطنی جمعیت ہونی لازمی ہے۔ پرائی فکر کی جگہ اپنی فکر پہلے ہونی چاہیے۔ دنیا کے فکر یا کسی کا فکر تو ایک عالم دین کے لئے فطرت ہے لیکن ایک صوفی تو اپنی نجات میں غرق رہے گا، تو دنیا کی نجات ہو گی، اور دنیا اس کا پلو پکڑے پار ہو گی۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اپنا طریقہ اور راستہ بھول گئے ہیں۔ لیکن بے فکر، کسی کے کہنے پر ادھر ادھر چلتے ہیں اور اپنے ارادے سے بے خبر بلکہ ارادۂ الٰہی سے لا تعلق۔

جمعیت کا اولین فرض ہے کہ طریقۂ اسلاف کو زندہ کرے، چمکائے، اور وہ اقدارِ روشن تصوف، جس کی چمک سے دنیا کے دل چمکتے تھے، چمکائے۔ اور انسانیت کی زیست بڑھائے اور شرفِ انسانیت کو بلند کرے۔ انشاء اللہ اسی صورت میں دنیائے انسانیت طریقت کے اشاروں پر چلے گی۔ اور شاہِ وقت ہمارے سامنے گردن جھکائے گا۔ قوم وملت ہماری دعاگو ہو گی۔ اس کے علاوہ ہمیں وہ کچھ کہنا چاہیے جو راعی ورعایا کو مقبول و منظور ہو، اور جس کے اختیار کرنے سے تعلقاتِ انسانیت، محبت سے بھرپور ہو جائیں۔

نہیں فقر و سلطنت میں کچھ امتیاز ایسا
وہ نگاہ کی تیغ بازی یہ سپاہ کی تیغ بازی

Marfat.com

انشاء اللہ اور کسی وقت اپنی تجویز حاضر کردی جائے گی۔ جب مناسب وقت ہو گا۔

## پالیسی کی تبدیلی

پہلے "سلسبیل" کی تحریرات صرف فقر و تصوف تک محدود تھیں۔ لیکن اب افادیت بڑھانے کے لئے اور حلقۂ مطالعہ کے وسیع تر کرنے کے خیال سے حقیقت اسلام پر مفکرین اسلام کی تحریرات بھی اب شائع ہوا کریں گی۔ ان کے لئے ہم احباب سے اور محررین سے استدعا کرتے ہیں کہ منتخب تحریرات ہمیں دے کر سلسبیل کی عزت بڑھائی جائے۔

یہ ضروری نہیں کہ مضامین تازہ ہوں۔ بلکہ ٹھوس علمی ہونا ضروری ہیں خواہ کتنی پرانی تحریر ہو۔ مقصود اذہان کو روشن کرنا ہے، اور اسلام کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں اذان کے الفاظ وہی ہیں جو تیرہ سو سال پہلے تجویز ہوئے اور عمل میں لائے گئے۔ نماز کے الفاظ وہی، کلمہ شریف کے وہی۔ نئے انداز میں بعض وقت حقائق تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہاں ایسے نئے مضامین کی بھی ضرورت ہے، جن میں ندرت ہو اور حقیقت سے لبریز ہوں۔

### رفتار زمانہ

زمانہ جس سرعت سے بدل رہا ہے، آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن جب کبھی خانقاہی تصوف کے الفاظ آپ تحریرات میں پڑھتے ہوں گے تو آپ کو ایک تاریک تر زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہو گی اور خیال میں آجاتا ہو گا کہ جنگل و صحرا میں چند پھٹے پرانے کپڑے پہنے، بھوکے پیاسے، بیٹھے اللہ اللہ کرتے ہوں گے، جن کا نگہبان صرف خدا ہو گا، اور معاشرہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ ہو گا، اور اپنے خبط میں مشغول و مصروف ہوں گے۔ لیکن یہ خیال نہیں آتا کہ جب سب کچھ بدل چکا ہے اور بدل رہا ہے تو کیا ایسی صورت میں خانقاہیت پر کوئی اثر اور کوئی تغیر واقع نہ ہوا ہو گا۔ یہ ہمیشہ کے لئے ایسے ہی ہوا کریں گے۔

Marfat.com

ہمیں پچھلے دنوں خانقاہیت کے حلقہ کی ایک شادی میں شمولیت کا فخر حاصل ہوا۔ میں حیران رہ گیا کہ دنیا بدل چکی ہے۔ نہ وہ خانقاہیت تھی، نہ وہ درویش صورتی تھی۔ امیرانہ ٹھاٹھ تھے۔ فیشن تھا۔ نوجوان تھے۔ اپنی صورت و سیرت میں مست۔ نئی تہذیب و تمدن کے چمکارے تھے۔ مجھ جیسے دو چار بوڑھے جو بیٹھے تھے، وہ بھی دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اور کسی کے خیال تک میں نہ آتا تھا کہ ہماری دولت لٹ گئی، ہماری خانقاہیت برباد گئی، اور ہم نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے رہے۔ خانقاہیت کے شاہزادے اب کیا تھے۔ بی۔ اے، ایم۔ اے، پروفیسر، وکیل و ڈاکٹر تھے۔ غرض سجادہ نشین صاحب کے سوا کوئی ایک بھی نہ تھا جسے وہ اپنا پرانا اثاثہ نظر آرہا ہو، یا جس کے ذہن میں اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تصور پاک ہی کسی وقت ڈس رہا ہو کہ کیا تھے کیا ہو گئے۔ یہ تبدیلی مبارک ہے کہ جب وہ ۲ سے نہ ہو اور صورت درویشانہ ہو لیکن یہ تغیر، یہ انقلاب بھی اپنی جگہ بڑی عبرت ہے۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار

آج وہ خانقاہیت زندہ رہ سکے گی، جس کا مربی ابو الوقت صوفی ہو گا، اور جو زمانے کے چھیڑنے کو اپنا مشغلہ خیال کرتا ہو، اور زمانے کے ساتھ عمر بھر جہاد کو افضل الجہاد سمجھتے ہوئے، تہذیب جدید کا محارب رہے گا۔ ورنہ ؎

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

دنیا کی معیت میں اگر وہ تصور پاک ہو اور اس کے صفات کے جلوے چلتے ہوں تو درویشی ہے اور اگر بوریا نشینی اور سجدہ ریزی اس ذات پاک کے تصور سے خالی ہو تو عیاری کے سوا کچھ نہیں۔ دُنیا کب تک ایسے بوجھ اٹھا سکتی ہے۔

"بہر کارے کہ باشی باخدا باش" ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

## ادارت تحریر

ہم ایک بار پھر ادارتِ تحریر کو بدیں طرف متوجہ کرتے ہیں کہ جب تک تحریرات کا معیار بلند نہ ہو، طباعت وغیرہ اشیاء کی نفاست کا کچھ فائدہ نہیں۔ ہر

Marfat.com

صورت تحریرات پر کڑی نظر رکھی جائے، اور وہ کچھ اشاعت میں لایا جائے جو دلوں میں بیٹھتا جائے اور جس کے قبول کرنے کے لئے پہلے ہی دل تیار ہوں۔

انتظامیہ کا یہ فرض ہے کہ اپنے اوقات سے کچھ حصہ نکال کر اس خدمتِ دینی کے لئے وقف کیا جائے اور ہفتہ میں دو تین گھنٹے دفتر کو دیئے جائیں۔

اور صاحبِ ثروت حضرات سے درخواست ہے کہ حتی الوسع ادارہ کی خدمت مالی میں شریک ہو کر ثواب حاصل کریں۔ کام بہت بڑا ہے۔ لیکن توجہ کم ہے۔ ہم ان لوگوں سے ہی توقع رکھ سکتے ہیں جو اس حصۂ دین (تصوف و فقر) سے محبت رکھتے ہیں، اور جو اسے روحِ دین تصور کرتے ہیں۔

## ناظرین

ناظرین سے درخواست ہے کہ تحریرات کو بار بار غور سے پڑھیں۔ جیسے لقمہ چبانے سے اور قرآن حکیم ترتیل کے ساتھ پڑھنے سے لذت پیدا ہوتی ہے۔ انشاء اللہ ہماری تحریرات بھی ایک لذت اور ذوق پیدا کریں گی۔ اور حقیقت کا تصور سامنے آتا جائے گا۔

## حواشی

ا۔ کسی وقت تنقیدی سند اور اس کے ساتھ معذرت کے خطوط شائع کر دیئے جاویں گے۔

۲۔ صوفیت

(فروری ۱۹۶۵)

(ستمبر ۱۹۶۷)

# طریقت کا امتیازی پہلو

نیک وبد، کھرے اور کھوٹے کی تمیز، ایک مومن کا ممتاز خاصہ ہے۔ گو نیکی و بدی میں یہ امتیاز رات و دن کے امتیاز کے برابر ہے۔ لیکن اغراض و مقاصد، اس تمیز کو اٹھانے کے درپے رہتے ہیں۔ اور دل جو تمیز گاہ ہے، اس پر حجاب آجاتے ہیں۔ نیکی بدی کی معیت میں، اور بدی نیکی کی معیت میں اکثر اہل حقیقت کو مشتبہ کر دیتی ہے۔ لیکن 'اتَّقُوافِرَاسَةَ المُوٴمِنِ فَاِنَّهُ یَنظُرُ بِنُورِ اللّٰهِ "(حدیث) مومن کی فراست سے خوف کھاؤ۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔

خاصان خدا کا یہ ہمیشہ ممتاز خاصہ رہا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں پیرودانِ خاصان خدا میں حسن ظن اپنوں کے لیے اور بد ظنی بیگانوں کے لیے بہت بڑھ گئی ہے۔ اپنوں کا ہر فعل و قول پسندیدہ دوسروں کے ہر فعل اور قول سے بد ظن ہیں۔ خصوصا ثبات عمل سے زیادہ بد ظنی واقعی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے بیگانگت بڑھ رہی ہے اور یگانگت کم ہو رہی ہے ورنہ خاصان خدا یگانگت پیدا کرنے اور دلوں کے جوڑنے کے لیے اپنی ذات میں ممتاز تھے۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

Marfat.com

دینی علمیت اور دینی بصارت، دونوں دین کی خدمت گذار ہیں، یا دین کے دو بازو؟ یا دین کے دو جسم۔ لیکن آج یہ دونوں الگ الگ زاویۂ تفریق کے محرک ہیں، اور ایک دوسرے سے بد گمان ہی نہیں، بلکہ دست بگریبان اور ہر حقیقت پر کشمکش۔ اسی صورت کو دیکھ کر ہم نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ اور اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کے مطابق ظن کو صاف کرنے کا ارادہ کیا۔

علمی دنیا اپنے زعم علم کی وجہ سے اہل تصوف کے ہر فعل و عمل پسندیدہ کو ناپسندیدہ نا متشرع دکھانے پر تل گئی، اور ہر ناپاک حملے سے دنیا کو یہ تاثر دینے کے لیے تیار ہو گئی کہ تصوف، اسلام نہیں۔

یہی چیز ہماری محرک ہوئی۔ اور ہم نے ادارہ تصوف قائم کیا۔ جو بفضلہ تعالیٰ اپنا کام نہایت اعتدال سے کر رہا ہے۔ لیکن بد ظنی کی انتہا یہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنوں کا اعتماد حاصل نہیں کر سکے۔ چہ جائیکہ بیگانوں کا اعتماد حاصل کر کے اتحاد کی بنیاد قائم کرتے۔

ہر مذہب کا فقر و تصوف ہی اس دولت محبت سے بھرپور ہے، کہ اپنے بیگانے ایک نظر آتے ہیں۔ اور بیگانے و یگانے ایک نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسے پاک و مقدس امانت الٰہیہ خیال کرتے ہیں۔

اس لیے اگر ہم یہ درخواست کریں تو بے جا نہ ہو گا کہ بیگانے متحد ہوں نہ ہوں، لیکن یگانے ایک مسلک طریقت پر اکٹھے ہو جائیں، اور گھر کی بیگانگت چلی جائے اور یگانگت قائم ہو۔ اگرچہ یہ بھی شکر ہے کہ طریقت میں مقابلہ نہیں بلکہ تسلیم ہی تسلیم ہے۔ اور کسی اختلافی مسئلہ تصوف پر اختلاف باعث دشمنی نہیں بلکہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنٌ پر عمل ہے۔ لیکن موجودہ دور علمی جب علم کے تیر سے تصوف کے جسم کو ناسور بنا رہے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم متحدہ کوشش سے اس جسم مقدس کی حفاظت کریں، اور ان علمی تیروں کو انہی کے ترکش میں لوٹا دیں، اور دعائے خیر سے اور حسنِ سلوک سے ان کے دلوں کو اپنی طریقت کی طرف متوجہ کر لیں۔

(مارچ ۱۹۶۵)

# اہل طریقت کے کرنے کا کام

"سلسبیل"، جس مقصد عظیم کے لئے جاری کیا گیا اس کو کئی بار "سلسبیل" کے ذریعہ واضح کیا گیا اور "گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو" تک نوبت پہنچ گئی۔ لیکن جہاں تک اپنا خیال ہے قارئین کرام اس اہمیت تک ابھی تک نہیں پہنچے، ورنہ ہر طرح کی مالی قربانی دینے کے لئے اور نہیں تو اپنے تو تیار ہو جاتے۔

اہل طریقت بہت کچھ ایثار کا مادہ رکھتے ہیں بلکہ طریقت ایثار کے سوا ہے بھی کیا؟ سب کچھ للہ خرچ کرنا ایثار ہے اور یہی طریقت ہے۔ لیکن یہ باور ہو جائے کہ یہ سب کچھ للّٰہیت کے لئے کیا جا رہا ہے۔ چونکہ دنیا، دنیا طلبی پر اتر آتی ہے، اور خدا جانتا ہے کہ اس کے سوا کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔ بلکہ خود ہمیں بھی دنیا پرستی کے سوا خدا پرستی نظر نہیں آتی۔ تو ایسی صورت میں ہم کتنا ہی واویلا کریں کہ ہم للّٰہیت کے لئے خدمت طریقت سرانجام دے رہے ہیں، تو کون عقلمند تسلیم کر سکتا ہے؟ ہاں وہ لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں کم و بیش وہی اگر ہمیں سچا سمجھتے تو غالباً ادارہ اپنا کفیل خود ہو جاتا، اور ہم عام دنیا سے بے نیاز ہو جاتے۔

ہماری دُعا ہے کہ جس اخلاص و محبت سے ادارہ کا قیام عمل میں آیا اور جس اخلاص سے سلسبیل جاری ہوا خدا کرے جب تک سلسبیل زندہ ہے اور جب تک ہم

Marfat.com

زندہ رہیں یہ اخلاص پر قائم رہے۔

کوئی نیک کام اخلاص کے بغیر شروع نہیں ہوتا۔بلکہ آہستہ آہستہ اخلاص و محبت میں رخنے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نیک کام میں ذرہ بھر بھی اخلاص نہیں رہتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عامل و معمول دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔

آج سے پچاس۔ سو سال پہلے طریقت کی جو صورت تھی وہ کچھ اور تھی۔ اور آج جو طریقت چل رہی ہے اس کی صورت و سیرت اور ہے۔ خط و خال کا فرق بھی، بلکہ کم وکیف کا کامل فرق ہے،اور کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی۔

ایسے حال میں، آپ خود قیاس کر لیویں کہ ایک طرف طریقت کی صورت اور اس کے اقدار بالکلیہ دُوسرا رنگ اختیار کر گئے، اور دوسری طرف اہل دنیا، دنیا پرستی میں اتنے غرق ہو گئے کہ حقیقت سے بیگانہ ہو کر صورتِ مذہب سے بھی نفرت کرنے لگے۔ علمِ دنیا اتنا ترقی کر گیا کہ مذہب کے ہر روشن پہلو کو بھی تاریک بنانا علم خیال کیا گیا اور دینی علمیت بھی اسی سے متاثر ہوئے بغیر پھر کیسے رہتی ؟

ایسی صورت میں طریقت پر مخالفینِ طریقت کو کتنا اعتماد حاصل ہو سکتا تھا۔ جبکہ اپنے اہل طریقت بھی طریقت کے اصول و فروع سے ناواقف ہو کر اور روحِ اسلام کے بغیر طریقت بنانے کا فریضہ اپنا وظیفہ حیات خیال کرنے لگے۔ جتنا نقصان ایسے اہلِ طریقت کے ہاتھوں اس طریقت کو پہنچا، اتنا نقصان کسی دوسرے نے بھی نہیں پہنچایا۔

لیکن جب یار لوگوں کو موقعہ ملتا ہے تو پھر کون چوکتا ہے۔ موقعہ بہ موقعہ نہیں بلکہ ہر موقعہ پر اقدارِ روشنِ تصوف پر بھی برسنا شروع کر دیا اور مذاق اڑائے گئے۔

ان پاک نفوس سے تو ہمیں شکایت نہیں جن کے جوتوں کے صدقے یہ حروف لکھ رہے ہیں اور جو فانی فی الذات ہو کر دنیا و مافیہا سے بے تعلق، ذات ربی کے ہو رہے ہیں اور ایک لمحہ بھی اپنی نگاہ کسی دوسری جانب الٹ نہیں سکتے، ایک لحظہ غافل ہونے کو منزلوں دوری خیال کرتے ہیں، بلکہ ان کی بے نیازی پر ہم اور

Marfat.com

دنیا قربان ہو جائے تو کم ہے۔ یہ جو کچھ دلوں میں گا ہے ذوق کے فوارے چلتے ہیں تو یہ ان کی بدولت چلتے ہیں۔

لیکن ہم جیسے ہوشیاروں کو کیا ہو گیا، جو دنیا کی ہر چیز کو سمیٹنے کے درپے ہو کر مسند ارشاد پر تشریف فرما ہیں اور اپنا کیا کرایا تمام تصوف و طریقت خیال کرتے ہیں؟ اور اپنی زندگی طریقت کی زندگی سمجھتے ہیں۔

کیا ہم دنیا کی نہیں سنتے؟ اور کیا موجودہ دورِ بے دینی سے بے خبر ہیں؟ اور کیا طریقت اور علمیت کی چپقلش سے ناواقف ہیں اور مادیت کے طوفانِ بلاخیز کو دیکھ نہیں رہے کہ ہمیں کیسے بہائے جا رہا ہے اور ہمیں شعور تک نہیں کہ ہم کس رخ چلے جا رہے ہیں؟ ہمارا قبلہ کہیں پیٹ تو نہیں ہو رہا ہے اور دنیا طلبی اور دنیا پرستی کا بھوت تو ہم پر سوار نہیں ہو گیا؟ اقبال مرحوم کو یہ شعر کہنے کی ضرورت پڑی۔

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

فقر کیا ہے؟ صرف خودی۔ خودی کا مطلب بے نیازی ہے۔ فقر کا سرچشمہ بے نیازی سے پھوٹتا ہے۔ لیکن کب؟ جب تمام دنیا سے بے نیازی ہو جائے، اور تمام خواہشاتِ نفس مردہ ہو چکی ہوں یا روزازل سے نہ ہوں اور فطرت صالحہ ہو۔

لیکن صرف بے نیازی کام نہیں دیتی۔ جب تک اس کامل بے نیازی کے ساتھ کامل نیازمندی بدرگاہ رب العالمین موجود نہ ہو ہر آن ہر حال اس بارگاہِ کبریائی پر نظر ہو اور اُسے بے نیازی کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو۔ سبحان اللہ! بلھے شاہؒ کیا خوب کہتے ہیں۔

کی بھرواسا اس آشنائی دا
ڈرلگ دا بے پروائی دا

اس خدائی بے نیازی کو آج کون جانتا ہے کہ ایک طرف دوستی و محبت کی دعوے داری ہے۔ دوسری طرف اُس بے نیازی کا خوف دل و جان کو لرزا رہا ہے۔

Marfat.com

ان سیاستدانوں کا خدا بھلا نہ کرے جنہوں نے ہمیں اپنے تاریک حجروں سے نکال کر بر سر بازار شرمندہ کیا۔ ہم ان تاریک حجروں میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کو نہ پہچانتے تھے۔ نہ ہمارا کوئی ماویٰ و ملجا اُس کے سوا تھا اور نہ ہم کسی کو اُس کا شریک خیال کرتے تھے۔ وہ تھا اور ہم تھے۔ کسی کی نیکی و بدی سے بے پرواہ پیٹ پوجا سے آزاد تھے۔ ہمیں رسوا کیا۔ ہاتھ سے وہ دولت چلی گئی، اور دولت دنیا کا جب وقت آیا تو دھکے مار کر سیاست سے باہر پھینک دیا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے

لیکن اب نکلے کیا۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اب ہم پر آوازے کسے جاتے ہیں اور دنیاداری اور زرپرستی کے طعنے دئے جاتے ہیں۔ لیکن خود کردہ را علاج نیست کا ہم خیال نہیں کرتے۔

## مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور

"مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور" کا تصور مشہور ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ کسے اب اپنی مسلمانی سے شرمندگی نہیں آتی۔ یہی حال فقر و طریقت کا ہے۔ ہمارا فقر ہمیں اپنی شرمندگی کا باعث ہو رہا ہے۔

پھر بھی ہمیں تسلیم ہے کہ بعض اللہ کے بندے اپنی بے نیازی سے دنیا کے پست ہمت کو سبق دے رہے ہیں۔ اور گفتہ اوگفتۂ اللہ بود کا کامل نمونہ ہیں اور عوام و خواص میں مقبول۔ اور "بہ خال ہندواش بخشم سمرقند و بخارا را" انکے حسن و جمال پر قربان ہو رہا ہے فقر و طریقت۔ جس طرح خدائے قدوس سراسر حسن ہے بعینہٖ اُس کے عکس سے یہ لوگ حسن مجسم ہیں۔ جو بھی جاتا ہے، اس حسن مجسم کی دلربائی پر فریفتہ ہو جاتا ہے لیکن بہت کمیاب۔ کم لوگوں کو ان تک پہنچنا آج نصیب ہے۔

اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ فقر و طریقت کی مجسم تصویر و خاکہ و قد آدم دنیا میں صاف ستھرا پیش کر کے عوام و خواص کو زیارت کا موقعہ دیں تاکہ اپنے بیگانے اسے

ایک نظر دیکھ لیویں، اپنے شیدا ہوں، بیگانے حیرت میں انگشت بد نداں ہوں، اور نا آشنا شناسائی حاصل کریں۔ یہ کام دیکھنے کو چھوٹا ہے، لیکن کرنے کو بہت بڑا۔ کلمہ پڑھنا اور مسلمان ہو جانا تو آسان ہے لیکن اُس کے تمام احکامات کو تسلیم کرنا پھر اس پر عمل کرنا کوئی آسان بات نہیں۔

اگر گوئم مسلمانم بلرزم
که دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

خود سوچئے پڑھنا کتنا آسان ہے۔ لیکن لا الٰہ پر عمل کرنا کتنا مشکل ہے۔ آج کون ہے جو حقیقی لا الٰہ کہہ سکے۔ لیکن پڑھنے والے کو یہ احساس کہاں؟

ہم اپنا فرض خیال کرتے ہیں کہ اہل طریقت کو اپنے خیال کی طرف متوجہ کریں اور ان کو بڑے مقصد کے حصول کے لئے دعوت دیں، کہ مشترکہ مقصد کے لئے مشترک قوت کی ضرورت ہے۔

صوفی کچھ مطالبہ اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اگر رکھتا ہے، تو صرف کہو لا الٰہ الا اللہ ہے محمد پاک رسول اللہ۔

(اپریل ۱۹۶۵ء)

Marfat.com

# طریقت کا زوال اور مشائخ

## یادش بخیر

جمعیت مشائخ پاکستان کے تین اجلاس ہوئے۔ اول کراچی پھر راولپنڈی اور آخر لاہور میں۔ آخری دو کی روئداد تو پڑھنے کا موقع نہیں ملا لیکن کراچی کے اجلاس کی روئداد بذریعہ "تاج" پڑھنی نصیب ہوئی۔ روئداد میں بہت سی قرار دادیں منظور ہوئیں۔ کچھ قابل عمل اور کچھ نا قابل عمل۔ پھر معلوم نہیں قابل عمل پر کہاں تک توجہ ہوئی، اور کتنا کام ہوا۔ ہم خلوت نشین کیا جانیں۔

لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ سندھ سے لے کر بنگال تک جو سیلِ روان تصوف چلا اور دنیا کو اُس نے سیراب کیا، اس میں جمعیت کی قوت کے یا انفرادی قوت ایمانی نے کام کیا؟ پھر لاہور، دہلی اور کشمیر پر جو یورش تصوف کی ہوئی وہ سکیم کے ماتحت ہوئی؟

آپ جانتے ہیں جب جان آتی ہے تو اعضاء میں خود بخود حرکت ہوتی ہے۔ اور وہ حرکت بلا ارادہ نہیں ہوتی بلکہ قوت ارادی سے منسلک ہوتی ہے اور ذہن ان حرکات کو منضبط صورت میں متحرک کرتا ہے۔

Marfat.com

خدائے قدوس جس کی یہ محبت خاصہ کا حکم رکھتی ہے وہ اس کو اپنے حکم ازلی سے چلاتا ہے اور ان کو اپنے ارادہ کے مطابق متحرک کر کے وہ کام لیتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے۔

تاریخ ہند کے مطالعہ کرنے والوں سے یہ پوشیدہ نہیں کہ کس بے سروسامانی اور کس عزم پاک اور استقلال سے یہ لوگ گھروں سے نکلے کہ پھر وطن کی طرف مڑ کر نہ دیکھا اور وہیں کے ہو رہے جہاں گئے تھے۔

ان بزرگان دین نے کوئی قرارداد کبھی پیش نہیں کی بلکہ صرف اپنے قلبِ سلیم کو ہی تازہ اور صاف کرنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ اس کی شعاؤں سے دنیا کے قلوب متاثر ہوئے اور شاہ و گدا ایک صف میں کمر بستہ نظر آئے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

غرض شاہ و گدا سیراب ہو کر نکلتے تھے اور ہر کہ ومہ جبہ سائی کو فخر سمجھتا اور ہر ارشاد پر کان ہوتے تھے۔ ایک طرف توجہ شیخ ہوئی، دوسری طرف عمل تمام قوم و ملت میں پھیل گیا۔ جس طرح ایک فقیر اثر سے متاثر ہوتا تھا، اسی طرح ایک شاہ عقید تمندانہ سر ڈالے کھڑا ہوتا۔ غرض اس تیغ بے نیام سے دنیائے ہند متاثر ہو رہی تھی۔ مذہب حقہ میں يَدْخُلُوْنَ فِي دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجاً کے نمونہ اور ذات اقدس ﷺ کے نمونۂ حق پر اسلام بڑھ رہا تھا۔

ہمیں سب سے پہلے اپنے حالات، اپنے قلب اور اپنی عقل کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہمیں کیا کچھ اپنی ذات کے لئے کرنا ہے تاآنکہ سلف صالحین کے نقش قدم پر وہاں پہنچ جائیں، جہاں ہمارے بزرگ پہنچے تھے، جن کے ایک نظارہ سے سینکڑوں مسلمان ہو جاتے تھے، جہاں نہ عقل سے پوچھا جاتا تھا، نہ اپنے مذہب سے دریافت کیا جاتا، نہ صاحب فقر کے مذہب سے واسطہ تھا۔ صرف ایک جذب تھا۔ اور جذب بے اختیار۔ اور رقت چلی آتی تھی۔ اور کلمۂ توحید سے تمام معبودان باطل سے رہائی

Marfat.com

حاصل کر رہے ہوتے تھے۔ اور لَا مَعْبُودَ اِلَّا اللّٰہُ کے نعرے لگتے اور آنکھوں سے شبنم کی طرح آنسو جھڑتے۔

بیشک کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے اب بھی ایسے ہیں کہ ناموافق ہوا میں بھی اپنی ناخدائی سے کشتی دین کو منجدھار میں سنبھالے ہوئے ہیں اور حتی المقدور اپنی کشتی کو بامراد ساحل تک پہنچانے کی فکر میں ہیں۔

لیکن بادِ مخالفِ دین کا یہ حال ہے کہ چو طرفہ ہوا کے بگولے اٹھتے ہیں، اور کشتی دین کو اُلٹ پلٹ کرنے میں پورا زور لگاتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ دولت اب رُوبہ زوال ہے۔

نظام المشائخ کا حال پڑھیے۔ بادشاہوں کے مقابلہ میں ان کی شان بلند تھی۔ حضرت سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت کچھ کیا۔ لیکن کسی کے گھر جا کر؟ لیکن اس سے پہلے بزرگ کوہِ استقامت ہو کر ٹکراتے تھے اور کسی کو چوں کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ کشمیر کو دیکھئے۔ سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت کچھ کیا۔ لاکھوں کو مسلمان نہیں بنایا؟ سارے کشمیر کو وحدت کا سبق ایسا دے گئے کہ آج ان کے فیضان کی گونج آسمان پر پہنچی نظر آرہی ہے۔ جب صبح کی نماز پر ان کے اوراد فتحیہ پڑھے جاتے، تو کوئی متنفس نہیں رہ جاتا جو اس آوازِ ہدایت میں شریک نہ ہو۔ اور ایک ایک لفظ کا ساتھ دیا جاتا۔

اسی لئے آج وہ زندہ ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں کو جامِ وحدت ایک آن میں پلا گئے، جہاں ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ پھر کوئی دلیل نہیں، کوئی برہان پیش نہیں کرتے، کسی کو دعوت نہیں۔ خود آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ہمیں کلمہ پڑھائیے۔ اس کے پیچھے کوئی دولت کا تخیل نہیں، بلکہ بھوک اور سراسر مفلسی کھڑی نظر آتی ہے۔ جس کتاب کو اٹھاؤ وہ اپنے خیال کے مطابق اپنی تعلیم کے دلائل پیش کر رہی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہاں کوئی دلیل نہ تھی۔ بلکہ حق کا مشاہدہ تھا، جو سرتابی کرنے کی قوت سلب کر لیتا تھا، اور بے اختیار جذب ہو کر قدموں میں گرتا تھا، اور بے اختیار اس کے منہ سے کلمۃ الحق نکلنا شروع ہو جاتا۔

آج ہم عقل کی روشنی میں دلائل سے بھرپور ہو رہے ہیں۔ دل ہے کہ انوار

Marfat.com

الٰہی سے خالی۔ دلائل سے دلائل ٹکر کھاتے ہیں۔ اور وجدانی دلائل اپنے مقابل عقلی دلائل سے ٹکر کھا کر گر جاتے ہیں اور باطل پرستی پہلے سے زیادہ سرکش ہو جاتی ہے۔

پیر و مرشد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کئی بار دیکھا کہ ایک دو حرف فرمائے۔ مجلس کی آنکھوں سے فوارے چل گئے اور مجلس دم بخود ہو گئی۔ اور تمام حجاباتِ عقلی دور ہو گئے۔ اور اللہ ھو اللہ ھو ہر طرف نظر آنے لگا۔ نفسِ خبیث جو کبھی کسی دلیل سے مات نہیں کھاتا۔ خدا معلوم کتنی جلدی کافور ہو جاتا اور دل کو خطرات سے پاک کر دیتا۔ ہمارے نزدیک نور کے سوا کچھ نہ تھا جو ظلمات کے پردے اٹھاتا۔ معجزانہ طور سے دل کو روشن کرتا اور اندھیروں کو غائب کر دیتا تھا۔ میں ایک نہیں، سینکڑوں ہزاروں نے تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دلیل کچھ نہیں بلکہ صرف ایک نظر تھی جس پر پڑ جاتی وہ مسلمان ہو جاتا اور حق الیقین کے درجے پر خدائیت سامنے آجاتی۔

اوّل تو تاثراتِ تصوف کم ہو رہے ہیں لیکن بعض بزرگوں کی نظر برکت بھری بھی ہے اور ان کی نظر سے عقیدت مندی پھوٹتی بھی ہے لیکن کسی کو اتنی ہمت دم مارنے کی نہیں کہ ایک دو لفظ بھی کسی بے دین کو دین پر لانے کے لئے کہے جائیں۔ مجھے یہ ذاتی شکایت ہے کہ جن کے دکھ غم ہم ہر روز سنتے ہیں، اور ان کے غم میں ہم بہ دعا شریک ہوتے ہیں وہ لوگ بھی ہمارے غم کی بات سننے کے لئے تیار نہیں پائے جاتے بلکہ سر ڈالے کسی اور فکر میں ہاں، جی ہاں، جی کر رہے ہیں چہ جائیکہ ان کو ہدایت حقہ کے احکام سنائیں۔ وہاں تک تو ہمیں اپنی ضروریات پہنچنے ہی نہیں دیتیں۔

حق وہ آدمی پہنچاتا ہے کہ اپنی خواہشوں سے پاک ہو کر دین حق کے تقاضوں سے بھرپور ہو، اور ہر خواہش سے پاک ہو۔ لیکن آج جب یہ نظریہ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى پیش کیا جائے اور اسی پر تقویٰ کا مدار رکھا جائے، تو اسے رہبانیت کہہ کر ٹھکرایا جاتا ہے اور پورے دلائلِ دنیاداری پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمان دنیا کے لئے ہی پیدا ہوئے، اس کے سوا کوئی مقصد نہیں۔

علمی دنیا جس طرح آج تصوف کے اقدار پر برس رہی ہے۔ اور تصوف کی

Marfat.com

خاموشی ہے۔اور معلوم ہوتا ہے کہ یارانِ طریقت کو اپنے طبقے کے احترام کا احساس تک نہیں رہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت دین کا تصور اٹھ گیا۔اور ہر صاحبِ خیال اپنے خیال کو ہی حق خیال کرتا ہوا، اپنے خیال کی حفاظت کو دین وایمان قرار دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ، ہر سلسلہ اپنے علاوہ دوسرے گروہ کو بیگانہ خیال کرتا ہے، اور اپنے سلسلہ کے لوازمات کو ہی دین خیال کرتا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہر معاشرہ میں طبقات ہوتے ہیں اور ہر طبقہ اپنے پیشہ میں مصروف ہوتا ہے، اور دوسرے ارکانِ افراد طبقہ کے ساتھ ایک ٹیم کی طرح منظّم رہا کرتا ہے اور ہر ایک کو اپنے پیشہ کی ترقی کی فکر رہا کرتی ہے اور پیشہ کی تکمیل کا فرض ادا کرتا ہے۔ یہی حال مذہبی طبقہ کا ہونا چاہئے۔ علمائے کرام بیشک بہت زیادہ نمایاں خدمتِ دینِ اسلام بجالا رہے ہیں، اور اپنے طریقۂ علمی پر جو طریقہ بھی اختیار کریں اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اب علماء نے عام ہدایت کو چھوڑ کر صرف اہل تصوف کے طریقہ پر تنقیدی نظر ڈالنا اور اس پر برسنا اپنا فرض خیال کیا ہے۔ یہاں تک کہ اب عام طور پر اہل تصوف اپنی ناشناسائی کی وجہ سے اپنے طریقہ کو چھوڑتے جاتے ہیں اور تصوف کی اشاعت کے لئے وہی طریقے اختیار کر رہے ہیں جو علماء کے ہیں اور ان کے طریقۂ کار سے مشابہت پیدا کرنے میں مصروف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ تصوف کا فطرتی طریقہ وہی ہے۔ خاموشی اور خلوت۔ اسی خلوت و خاموشی نے وہی کارِ نمایاں کئے جو درازِ زبانِ علمیت نہ کر سکی۔ اب ہمارا ایمان ہے کہ تصوف خلوت و خاموشی سے ہی اپنے قلوب کو صاف کر سکتا ہے۔ علم و عمل جب تک یکساں نہ چلیں کام نہیں بنتا۔ صوفی اپنے علم کے ساتھ اپنے عمل کو ایسے وابستہ رکھتا تھا کہ علم و عمل ایک ہو گئے۔ غرض ایک صوفی سراسر عمل ہی دکھائی دیتا تھا۔ جن لوگوں کو تصو

Marfat.com

ف کی روشنی نہیں ملی وہ جو کچھ کہیں، کہیں۔ لیکن جن پر اہل فقر کی ایک نگاہِ غلط انداز بھی پڑ گئی وہ جانتے ہیں کہ ان کی خلوت و خاموشی کے کیا اثرات ہیں؟

## ادارۂ تصوف

ہم نے علمیت کے متواتر حملوں سے تنگ آکر ادارۂ تصوف قائم کیا اور ماہانہ "سلسبیل" نکالا تاکہ علمی یلغار کے مقابلہ کے لئے ہم بھی دست و پا کو حرکت دیں اور تصوف کے اقدار کو واضح صورت میں پیش کریں۔ لیکن مزعومہ فقر نے ہماری مشکلات میں اور اضافہ کیا۔ اور ہمیں ترجمانِ تصوف کی جگہ کچھ اور ہی علمی صورت دی جا رہی ہے، جس کو تصوف کے پرستار پسند نہیں کرتے۔

## جمعیت کا فرض

ایسی صورت میں جمعیت مشائخ پاکستان کا اول فرض ہے کہ اس اشاعتی زمانے میں اپنا حصہ پریس و اشاعت میں پیدا کریں، جبکہ فریقِ محارب اپنا کامل حصہ پریس کا قابو کئے ہوئے ہے اور سینکڑوں رسالے اور کتب اپنے خیال کی اشاعت کے لئے شائع کر رہے ہیں مگر پاکستان بھر میں طریقت و تصوف کا کوئی پریس نہیں جو پورے طور پر تصوف کی نمائندگی کرے۔ "تاج" کراچی اور "سلسبیل" لاہور اپنی وسعت کے مطابق خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن جو سلوک ان سے ہو رہے ہیں کہ مصارف زیادہ اور آمدن کم۔ وہ کب تک زندہ رہیں گے۔

اس لئے جمعیت مشائخ پاکستان کا اولین فرض ہے کہ پریس قائم کریں اور پریس سے اپنے خیالات حقہ کا اظہار کریں، ایک دوسرے پر لے دے کی روش چھوڑ دیں اور علمی دامن اتنا وسیع کریں کہ ہر کہ ومہ تک تصوف کے حقائق پہنچ جاویں، اور تصوف کے اثرات دکھلاوے کے نہیں بلکہ اصلی حقائق سے مسلمانوں کو متاثر کیا جائے۔

## ترقی پاکستان

پاکستان کی ترقی کے پلان، تجارت، صنعت وحرفت، زراعت اور تعلیم کے

Marfat.com

کتنے پلان شروع ہیں۔ کتنے ارب روپیہ خرچ کیا جارہا ہے۔ غرض مادی دنیا کے جتنے ذرائع درکار تھے، ان کو بروئے کار لانے کے منصوبے تیار ہو کر بڑے پیمانے پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی تک اسلام اور دینداری کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ بلکہ روز بروز اس سے توجہ کم ہو رہی ہے، اور دینی رجحانات ختم کرنے کے بعض سامان تیار ہو رہے ہیں۔

اس لئے جمعیت مشائخ اور دیگر تمام طبقہ ہائے دینی کا فرض ہے کہ اسلامی عملی ترقی اور ذہنی عقیدت اسلامی کے پلان کی طرف حکومت کو متوجہ کیا جائے اور فکر بلند پیدا کرنے کے لئے صرف دار العلوم اور کالج ہی نہ بنائے جائیں بلکہ انتظامی اور تعلیمی پالیسی کو بدل دیا جائے۔ ہر انتخابِ انتظامیۂ حکومت میں سب سے پہلے ذہنِ اسلامی کو درجہ دیا جائے جس کی شہادت کے لئے ذہن اسلام کے ساتھ کردار اسلام کی تکمیل ہو اور اس امر کے حصول کے لئے کسی الگ یونیورسٹی کی ضرورت نہیں، نہ کسی اسلامی کالج کے بنانے کی بلکہ ہر کالج کے نصاب کو دینداری اور اسلامی ذہن کے فکر میں ڈھالا جاوے اور یکسانیت کا درجہ اسلامی علوم کو دیا جائے بلکہ ایک گونہ فوقیت دی جائے اور مقابلے کے امتحانات میں اسلامی ذہنیت کے نمبرات زیادہ رکھے جائیں۔

## ہمارا خیال

اپنا خیال تو یہ ہے کہ طبقۂ دین کے ساتھ دنیاوی تعلیم کا امتزاج پائیں گے تو انشاء اللہ موجودہ ذہنیت سے بہت بلند ذہنیت اور قابلیت پیدا ہو گی، جس پر ملک فکر کرے گا اور جس کے وجود سے قوم و ملت انتظامیہ میں اس درجہ پر پہنچے گی جس پر ملک فخر کرے گا۔ اور پاکستان وہاں پہنچے گا جہاں کوئی ملک نہ پہنچا ہو گا۔ اسلامی ذہن میں قوم کے نونہالوں کو ڈھالنے کے لئے ضروری ہے کہ براہ راست علوم اسلامیہ سے واقفیت دلائی جائے اور عربی تعلیم لازمی قرار دے کر علوم اسلامیہ قرآن حکیم، حدیث پاک اور فقہ کا مطالعہ درسی طور پر کرایا جائے۔

انتظامیہ کے امتحانات کے لئے کسی ایک حصہ میں ایم۔ اے ہونا ضروری ہے۔ یعنی قرآن حکیم کا ایم۔ اے، حدیث کا ایم۔ اے، اور فقہ کا ایم۔ اے۔ لیکن تعلیم

Marfat.com

برابر کی، قرآن و حدیث اور فقہ کی ہونی چاہئے۔ بلکہ افکارِ اسلامی ذہن میں برابر کے ہونے ضروری ہیں۔ دینی علوم دنیوی علوم کے ہر حال میں ہم پلہ ہونے چاہئیں۔

خلاصۃ الکلام

بچپن میں گلستان سعدیؒ میں پڑھا تھا "دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند"۔ ایسے حال میں یہ گدا صفت بادشاہ کیسے کسی جمعیت میں شامل ہو سکتے ہیں؟ آپ سنتے ہوں گے "گدا بادشاہ است نامش گدا" یہ گدا بادشاہ صفت یعنی بادشاہوں ہی کی انانیت سے پُر ہوتے ہیں۔

نخوت و ناموس دارند چوں شہاں
چاکری جوئند از اہل جہاں

ہاں کوئی سلسلہ کا عرس ہو تو پھر یہ خود بخود شامل ہوتے ہیں۔

جلسے جلوسوں میں جانا فطرتِ تصوف کے خلاف ہے۔ گوشہ نشینی اور عزلت نشینی سے یہ پھلتا پھولتا ہے، اور دنیا کی ہوا میں کملا جاتا ہے اور زیادہ روشنی اور ہوائے دنیا میں آجائے تو مر جاتا ہے۔۔ لیکن آج اہلِ تصوف علمی رنگ اختیار کرتے ہوئے، اپنی مسند چھوڑ کر علمی میدان میں چلنے پھرنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور حقیقتاً مسندین خالی ہوتی جاتی ہیں، اور تصوف کے لباس و جسم میں علم آرہا ہے۔

بعض وقت تو صوفیت اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ رسالت کو بھول جاتی ہے اور آدابِ رسالت اٹھا دیتی ہے اور اپنا سکہ جماتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ میاں کے ساتھ زانو ملانے سے پرہیز نہیں کرتی، اور اُسی کا روپ لے کر انا الحق کے آوازے کستی ہے، اور اپنا مٹی ہونا بھول جاتی ہے۔ تاہم بہ حسنِ ظن عوام و خواص کہہ اٹھتے ہیں۔

تھا انا الحق حق مگر اس لفظ گستاخانہ تھا

ایسی صورت میں جمعیت کی داغ بیل ڈالنا کوئی آسان بات نہیں۔

حافظ عطر صاحب

ایک مجذوب سالک بزرگ مٹھہ ٹوانہ ضلع شاہ پور میں ہو گزرے ہیں۔ کسی

Marfat.com

مرید نے اُن سے شکایت کی کہ تمام سلاسل میں پیر بھائی اکٹھے اٹھتے بیٹھے ہیں اور آپس میں محبت رکھتے ہیں لیکن آپ کے مرید ایک دوسرے سے اجنبی رہتے ہیں۔ فرمانے لگے بھیڑ بچے نہیں کہ اکٹھے بیٹھیں، شیر بچے ہیں۔

سو صوفی شیر کے بچے ہوتے ہیں ورنہ پہلے زمانے میں جتنی محبت اہل دل کو ایک دوسرے سے تھی، کسی دوسرے فرقہ میں نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ مطمح نظر ایک تھا، اور اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہ کی تفسیر عینی یہ لوگ ہوتے تھے۔ اپنے تو کجا بیگانوں کو بھی یگانے خیال کرتے تھے اور صرف نظرِ محبت ہی سے نہ دیکھتے تھے بلکہ عملی طور پر ایسے سلوک کرتے تھے کہ کافر مسلمان ہو جاتے تھے اور کفر و شرک کی دھجیاں اُڑتی نظر آتی تھیں۔ کیوں؟ صرف محبت عامہ کی وجہ سے۔ اور یہی تخم محبت آج تک اہل دل میں چلا آتا ہے۔ ورنہ وہ نہیں رہے جو انہیں ہونا چاہیے تھا۔

حضرت قبلہ مرشدم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جب کوئی غیر مذہب حاضر ہوتا تھا، تو وہ ایسی محبت سے پیش آتے کہ ہندو سکھ نے بھی کبھی کسی اپنے ہم مذہب سے یہ سلوک اور محبت نہ دیکھی تھی۔ اور آپ دیکھتے ہی محبت دل میں بھر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اسی در کا ہو رہتا اور ہر چیز سے نظر اس کی اٹھ جاتی۔

## تصوف کی اپنے مقام سے گرنے کی بعض وجوہ

۱۔ مادی دنیا کی ترقی کی وجہ سے روحانی اقدار گر رہے ہیں، اور عام توجہ غفلت میں مبتلا ہو رہی ہے۔

۲۔ جو لوگ متوجہ الی اللہ ہوتے ہیں وہ بھی اغراض دنیا سے خالی نہیں ہوتے۔ زیادہ تر مشائخیت کی سند یا کاروباری صورت کا شوق ہے۔

۳۔ جن لوگوں کو داعیۂ حقیقی محبت الٰہیہ ہوتا ہے، انہیں حقیقی مرشد میسر نہیں آتا۔ ناتربیت یافتہ مرشدوں کے ہاتھ پڑ جانے سے دل سرد ہو جاتا ہے۔

۴۔ سجادہ نشین اور صاحبزادے حقیقی تصوف سے ناواقف ہونے کے باوجود وارث مسند ہوتے ہیں، اور چندے بعد مشائخیت کے دعوے دار ہو جاتے ہیں، اور

Marfat.com

مشائخیت کے خدام کو غلام بے دام جانتے ہوئے مرشدِ کامل بن بیٹھتے ہیں۔

۵۔ تنقید علمی کی یلغار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ ہر کہ ومہ خواہ مخواہ چند الفاظ تصوف کے خلاف بولنے کے سوا آرام نہیں لے گا۔ اور علمیت ہر جائز ناجائز حملہ اپنے علمی پندار کی وجہ سے کرتی ہے۔ حالانکہ خود علم والے علمیت کے سوا اپنا ظرف عموماً تقویٰ واخلاص سے خالی رکھتے ہوتے ہیں۔

اول چار امور پر ہمارا قابو نہیں اور ان کی اصلاح کا قدم دوسرا ہے۔ پانچویں شق کے لئے ہمارا فرض ہے کہ پریس کی طرف متوجہ ہوں اور تصوف کے حقائق سے قرآن وحدیث کی ہم آہنگی کے ساتھ دنیا کو روشناس کرائیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ کئی سال سے ہم اس خدمت کو سرانجام دینے کی طرف متوجہ ہیں۔ لیکن یہ حقیر خدمت ایک وسیع علمیت کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ بے دین علمیت کے ساتھ دیندار علمیت بھی ہم زبان ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس خدمت میں کامیاب ہو رہے ہیں اور علمی تنقید کے سامنے ہماری فصاحت کامیاب ہو رہی ہے۔ اور ایک سلیم الطبع علمیت والا تصوف کے اقدار کو تسلیم کر کے صاف دل ہو جاتا ہے۔ اور معاشرہ کا دل صاف ہو رہا ہے۔

اہل طریقت کا فرض ہے کہ جس طرح وہ اپنی کیمیا نظر سے مسلمانوں کو تصوف کے اندر داخل فرما کر دین حقہ کی خدمت کر رہے ہیں، اسی طرح اپنی تحریرات اور اپنے اقوال سے، تحریراً بھی علمی دنیا کو تصوف سے روشناس کرائیں۔

اور یہ کام اتفاق و محبت کا ہے۔ اور یہی خدمت جمعیت مشائخ کے لئے سب امور سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ عوام و خواص جب حقیقت تصوف سے روشناس ہو جائیں گے، تو طبائع خود جذبہ الٰہیہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے لئے خانقاہیں تلاش کریں گی اور اپنی تربیت قلبی اور تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ ہو کر معاشرہ میں اپنے اخلاق کا بلند معیار پیش کر کے دین ودنیا کی فلاح حاصل کر سکیں گی۔

وآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

(ستمبر واکتوبر ۱۹۶۵)

Marfat.com

# اسرائیل کا غلبہ اور عرب کی مغلوبیت

## طریقت کی نظر میں

اسرائیل کے غلبے اور عرب کی مغلوبیت نے ہر مسلمان کو پریشان کر دیا ہے۔ کثرتِ تعداد، کثرت سامان اور کثرت رقبہ کے باوجود عرب مغلوب ہو گئے اور شکست کھا کر بیٹھ گئے۔

چنانچہ صاحب الرائے اور صاحب فکر حضرات نے اس کے علل و اسباب پر روشنی ڈالی اور مضامین شائع کئے اور ہمیں جو کچھ پسند آیا ہے، قارئینِ کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ان پر اس غلبے کی حقیقت واضح ہو جائے۔

ہمارے نزدیک جو قومیں کسی کے سہارے زندہ ہوں وہ اپنا احساس اور عمل کھو بیٹھتی ہیں۔ در حقیقت جو آرام سایہ داروں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ ظاہراً آرام اور بے فکری ہوتی ہے لیکن باطناً غلامی ہوتی ہے جو ہر قوت فکری و عملی سے محروم کر دیتی ہے۔ اور یہی وجہ حقیقی ہے عربوں کی شکست کی۔ اگرچہ سب سے بڑا کارنامہ عیسائیت کا اس کے پس پردہ ہے۔ ایک طرح سے عیسائیت اسلام کے ساتھ برسرپیکار ہے، اور اسی اسلام دشمنی نے یہودیوں کے لئے اسرائیل کو مقام دیا۔

Marfat.com

بعض احباب شاید شکوہ کریں کہ صوفیت جو سراسر اپنے فکر میں ہے، ایسے مسائل میں کیوں لب کشا ہے۔ لیکن یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ صوفی ہی کا نظریہ یہ ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

اس سے بڑھ کر کوئی دل حساس نہیں ہوتا۔ صرف طریق کار، ہر قوم، ہر ملت اور ہر فرقے کا الگ الگ ہے۔ آپ نہیں دیکھتے کہ آج اسلحہ کی ساخت الگ الگ ہے۔ ایک کا اسلحہ دوسرا نہیں چلا سکتا۔ صوفی ان مجاہدین سے زیادہ کام کرتے ہیں جو منبر پر چڑھ کر وعظ فرماتے ہیں۔ ان کا صوفیا کا جذبہ ان کی اپنی جماعت میں ایک اشارے سے پھیل جاتا ہے اور وہ تدبیر اختیار کرتے ہیں جو ان کے قابو میں ہوتی ہے۔

فرنگی حکومت کے وقت ہجرت کی تحریک اٹھی اور بڑے بڑے زعماء نے اس پر تقریریں کیں اور صوفیوں کو برا بھلا کہا۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ جب کسی ایک کو تکلیف آتی ہے تو کمزور دل روتا ہے۔ لیکن دل گردے والا انسان اپنے وقار کو شرمندہ نہیں کرتا اور خاموش ہو کر صبر و استقلال سے برداشت کر کے اپنا نمونہ آپ ہوتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے۔ کہ اچھے صوفی کم رہ گئے۔ کچھ تو الحاد کا زور اور ماحول کا اثر، دوسرا دنیا اور علوم کی کشش کی وجہ سے کمزوریاں آگئیں

صوفیت میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دین کی وسعت کو پہچانتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ دین ایک وسیع ملک ہے اور مواصلات کے لئے راستوں کی ضرورتیں ہیں۔ ہر فکر بلند راستہ تجویز کرتا ہے۔ جیسے حکومتیں سڑکیں بناتی ہیں اور اس کے نشیب و فراز اور ندی نالوں سے واقف ہو کر پیچ و خم دیتی ہیں۔

بے شک یہ محدودیت ہے۔ لیکن اس وسعت راہ سے ہزار درجہ بہتر، جس پر صرف ایک انسان بھی ڈرتے ہوئے گزرتا ہے اور موت کا پرتو بھی رہتا ہے۔ پہاڑوں پر نہیں دیکھتے کہ چار میل سیدھے راستے کو بارہ میل لمبا کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر صحیح سیدھی سمت رکھی جائے تو صرف ایک میل رہتا ہے۔ لیکن سیدھے راستے پر ایک آدمی بھی نہیں چلتا، اور چار میل پر کئی چلتے ہیں۔ لیکن بارہ میل کی طویل مسافت پر

Marfat.com

انسان چوپائے، موٹریں، بسیں چلتی ہیں۔ دیکھئے!

محدودیتِ سفر کو اس محدودیتِ راہ نے کتنا وسیع کر دیا ہے۔ اب جہاں ایک مہینے میں ایک سو آدمی چلتا تھا، وہاں ایک مہینہ میں ساٹھ ستر ہزار آدمیوں کا گزر ہوتا ہے۔ یہی حال مذاہبِ دینی کا ہے۔ بلند دین وہ ہے جس کے اندر بے شمار کثرتیں سما سکیں اور پروان چڑھ سکیں۔

گروہ بندی ایک فطرتی عمل ہے اور ضروری ہے۔ لیکن اس فرقہ بندی کے ساتھ اس وحدت میں شامل ہونا ضروری ہے، جو تمام فرقوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور ہر فرقہ کو اس وحدت کا ایک فرد شمار کرے۔ بس صوفی کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کسی سے لڑتا نہیں، جھگڑتا نہیں، ہر ایک کو حق سمجھتا ہے۔ دعوت دیتا ہے تو عمل سے۔ زبان سے نہیں بولتا۔ کچھ کرتا ہے، تو اپنے اندر دل کی گہرائیوں سے۔ خدا سے مناجات کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

(نومبر ۱۹۶۷)

Marfat.com

# حصہ چہارم

# شزارات

Marfat.com

تِلْکَ الاَ یَّامُ نُدَا وِ لُھَا بَیْنَ النَّاس

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

# قصور

ڈاک میں ایک کتابچہ "چراغ سنت" کسی مہربان نے ارسال فرمایا۔ کمزوری کی وجہ سے کامل مطالعہ تو کجا، ایک دو ورق سرسری دیکھ لئے گئے۔ مؤلف نے قدیم تعصبی جذبہ کے ماتحت قلم فرسائی فرمائی، اور یہ خیال نہ فرمایا کہ جس جذبۂ تعصب نے میرے دل میں آگ لگادی، پھر میں اسے ہی ہوا دے رہا ہوں۔ تعصب کتنی بڑی بلا ہے۔ جس چیز کو انسان خود ناپسند کرتا ہے جب تعصب کی پٹی دل کی آنکھ پر بندھ جاتی ہے، تو پھر اسی راہ خود چلنا شروع کر دیتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ میں اس گھپ اندھیرے میں گر رہا ہوں، جس سے میں بچنے کے لئے نکلا تھا۔ پھر معاً یہ خیال آیا کہ اس کتابچہ کو میرے ساتھ کیا تعلق، جب کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے راہِ اعتدال عنایت فرما دیا ہے اور میں کسی فریق کی حمایت پر نہیں، اور اختلاف کو رحمت الٰہیہ جانتا ہوں اور فضل عظیم سمجھتا ہوں۔ جیسے کہ خود ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ
وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعَالَمِیْنَ

Marfat.com

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَو لَا دَفعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعضَھُم بِبَعضٍ لَّھُدِّمَت صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ یُذکَرُ فِیھَا اسمُ اللّٰہِ تو میرے سامنے قصور پرنور کا وہ پرانا تعلق سامنے آگیا، جو میرے اسلاف رحمہم اللہ کو تھا، اور جو وراثتاً ان سے میرے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔

میرے لئے اب بھی یہ قصور وہی قصور پرنور ہے، جس کے اندر حضرت مولانا و مرشدنا حضرت غلام محی الدین رحمۃ اللہ علیہ ایک زمانہ مسند ارشاد پر تشریف فرما ہوئے اور ایک دنیائے اسلام کو حقیقی مسلمان بنانے میں مصروف و مشغول رہے، اور جن کے باکمال صاحبزادے حضرت عبدالرسول رحمۃ اللہ علیہ عوام و خواص کے لئے، تمام پنجاب کے لئے، رہنمائے امت ہو کر جلوہ افروز ہدایت رہے۔ اس وقت اُن بابرکت حضرات کی طفیل صرف قصور پرنور نہ تھا، بلکہ مغربی پنجاب کے اضلاع مثلاً لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، جہلم، شاہ پور، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، ملتان اور منٹگمری وغیرہ وغیرہ سراسر نور سے سیراب ہو رہے تھے۔ کوئی تحصیل، بلکہ کوئی گاؤں آپ کی عقیدت مندی سے خالی نہ تھا اور آپ کی عقیدت کی چلتی پھرتی نورانی صورت ہر گاؤں اور قریہ میں نظر آتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے جدامجد حضرت مولانا و مرشدنا غلام مرتضٰی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہِ تصوف اپنے کمال پر تھی، تو کوئی مجلس ایسی نہ تھی، جب اس کے اندر قصور پرنور کا ذکر خیر نہ آتا ہو اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس کو قصور سراپا نور کی زیارت کا شوق دامن گیر نہ ہو۔ باوجودیکہ آمدورفت کے سلسلے محدود تھے، اور ابتداً ایں ریل نہ تھی۔ لیکن سالکین راہ ہدایت چل کر پہنچتے تھے، اور خود حضور قبلہ رحمۃ اللہ علیہ اکثر اپنے مخلصین کی استدعا پر بھی اُن کے گھروں کو شرف بخشتے۔ جہاں سے گزر ہوتا ایسا معلوم ہوتا حضرت خضرؑ گذر گئے۔ گھر تو گھر رہے راستے بھی پرنور ہو جاتے اور دنیا کی آنکھیں اس نورِ جمالِ مطلق سے روشن ہو جاتیں۔

حضرت قصوری حضوری کو غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی، اور اپنی آتش محبت وظیفہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ سے بجھاتے۔ نتیجہ یہ

Marfat.com

ہوا کہ حضرت کے معتقدین کی ایک کثیر جماعتِ علما نے بلا چون و چرا اس وظیفہ کو زندگی بھر نبھایا۔ اُن کے اہل علم دوست جب کبھی اُن سے ملے تو دلائلِ قرآنی پیش کئے۔ لیکن یہ تھے کہ صرف ایک ہی سند اپنے لئے کافی سمجھتے کہ ان کے شیخ نے ان کو پڑھنے کے لئے فرمایا ہے۔ میرے اہل تصوف دوست جب کبھی قال کی تلوار بے نیام سے تنگ آکر مقابلہ کی ٹھانتے ہیں، تو میں ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں کہ قال کے میدان میں جانا تمہارے لئے موت ہے، خاموش رہو، اور کسی اللہ کے بندے کا انتظار کرو، جو تمہارے سوالات کا صرف ایک جواب ہو گا۔ اور وہ ہو گی، اس کی ساحرنہ نگاہ!

نگاہ کی جولانیاں نہ پوچھو، نگاہ حقیقت میں وہ نگاہ ہے
اُٹھے تو بجلی پناہ مانگے گرے تو خانہ خراب کر دے

عالم، محدث، فقیہہ مولوی اس کے قدموں کا سہارا لیں گے اور وہ کچھ تسلیم کریں گے جن کے تسلیم کرنے میں ان کو عار تھی۔ واقف کاروں کو معلوم ہے کہ صرف ایک حضرت قصوریؒ نے کتنے علمی خاندانوں کے دلوں میں اس مسئلہ کو حل فرمادیا، اور کسی کو شک و شبہ تک نہ رہا۔ بلکہ آج کی علمی دنیا جو سراسر خیالاً توحید رکھتی ہے، اور کوئی بشر بھی اس خیالی اور لسانی توحید سے خالی نہیں، تاہم ان کے سلسلۂ ارادت کے شیوخ اور متوسلین برابر اپنے اس وظیفہ کو پڑھ کر اپنا ذوق و شوق پورا کرتے ہیں۔

صوفیت کا مزاج فطرتاً خاموش ہے۔ اس کی جیت خاموشی میں ہے، نہ کہ فصیح اللسانی میں اور یہ جتنی بھی خاموش ہو گی، اتنا اس کا اثر زیادہ ہو گا۔ بلکہ کسی مقابل کے سامنے اس کا بولنا اس کی موت ہے۔ یہ نہیں کہ اس کا علم کم ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کو خاموشی کے ساتھ فطرتاً مناسبت ہے اور اس کی اٹھان خلوتوں میں ہوتی ہے، نہ جلوتوں میں۔ اور اس کی وسعت بے پایاں خاموشی سے پیدا ہوتی ہے، نہ کہ زبان آوری سے۔

اس زمانے میں مولوی غلام دستگیر صاحب نے بعض مختلف فیہ مسائل کے بارے میں بعض رسالے شائع کئے تھے جن کے بہت سے لوگوں نے جوابات بھی لکھے تھے۔ لیکن قصور شریف سے کوئی آواز اس کے برخلاف نہ اٹھی۔ بلکہ تمام قصور اہل

تصوف کا مرکز رہا۔ اُن کی صورت و سیرت نہایت پاکیزہ چلی آئی۔ بڑے بڑے روساء حلقۂ غلامی تصوف میں تھے۔ حاجی حبیب اللہ صاحب گورہ مرحوم جو نہایت متمول خاندان کے سربراہ تھے، وہ ہمارے حضرت جدامجد بیر بلویؒ کے مرید تھے۔ لیکن شکل کیا تھی؟ ایک فرشتہ صورت تھے۔ جب قصور کا رنگ جاتا رہا تھا۔ اور میں مرشد کی تلاش میں قصور شریف بھی حاضر ہوا، تو حضرت صاحبزادہ سید محمد شاہ صاحبؒ کا زمانہ تھا۔ گو وہ بات نہ تھی جس کی شہرت عام تھی اور جس کے نقش اولین حضرت غلام نبی صاحبؒ اور نقش ثانی حضرت مرشدنا و مولانا غلام مرتضیٰ صاحبؒ نوّر اللہ مرقدہٗ بیر بلوی تھے۔ تاہم اثرات ظاہراً وباطناً دکھائی دیتے تھے۔ عام صورتیں اور شکلیں منور تھیں۔ قبلہ حضرت مرشدم شرقپوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زمانے میں قصور کی گلیوں میں بھی نور بھرا تھا۔ بخدا! سچ فرمایا۔ جس کو دیکھئے انوارِ محبت الٰہیہ اس کی پیشانی سے چمکتے دمکتے دکھائی دیتے تھے۔

حضرت قصوریؒ کے بعد حضرت للّٰہی کا دور تھا۔ اور اس کے ساتھ حضرت بیر بلویؒ کا خاص دور قصور شریف کی اپنی محبت خاصہ سے تھا۔ چنانچہ حضرت قبلہ سید محمد شاہ صاحب جب اپنی تعلیم علوم اسلامیہ سے فارغ ہوئے اور اپنے متوسلین حلقہ ارادت سے اپنے لئے عقیدت گاہ کا انتخاب چاہا تو حضرت قبلہ غلام مرتضیٰ کے سوا کسی پر نظر نہ جمی۔ حافظ اور عالم و فاضل تھے، متبع سنت اور فقر میں اپنی مثال آپ تھے، آپ سے بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ کی وراثت اپنے اجداد و اسلافؒ کی حاصل فرمائی۔ اور آپ کی وفات کے بعد حضرت شاہ ابو الخیرؒ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ساتھ ہی حضرت پیر مہر علیشاہ صاحبؒ کے پرتو اور انوار سے قصور خالی نہ رہا۔ اس کے بعد حضرت قبلہ مرشدم شرقپوریؒ کی قصور پر خاص توجہ تھی، اور اہل قصور کو بھی آپ سے خاص انس تھا، اور آپ کا نورانی عکس عوام و خاص پر کھلا نظر آتا تھا۔ شاہ عبدالحق صاحب، صوفی ابراہیم صاحب اور حاجی عبدالرحمٰن رحمہم اللہ تعالیٰ اس آخری دور کے ایک کامل نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے!

Marfat.com

فطرۃ اللہ اور سنت اللہ کے مطابق قصور نے ایک دوسری کروٹ علمی لی۔ کیونکہ صوفیت کی کروٹ کا وقت ختم ہو رہا تھا، اور روحانیت کے چراغ مدھم ہو رہے تھے، تو علمی چراغوں کی طرف توجہ ہو گئی۔ حال و قال کی جنگ بازی کوئی آج کا کھیل نہیں۔ یہ کھیل شروع اسلام سے برابر چلا آتا ہے، اور ہر زمانے میں اس کے اثرات و نشانات کے نقوشِ پا تاریخ اور کتب قوم و ملت میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ فطرتی ہے بناوئی نہیں۔ حال پر حال آزاد، بار شاد كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ ہے اور قال ہر موقعہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ کے مطابق حدود کا پابند خود نہیں بلکہ ہر امر کے لئے اس کے حدود متعین۔ اس صورت میں حال و قال دست و گریباں نہ ہو تو کیوں کر؟

جب کبھی حال آزاد ہو کر تمام قیود کو اڑانے کے درپے ہوا تو قال شریعت حقہ کے ہتھیاروں سے میدانِ بیان میں آ گیا، اور ایسا دھمکایا کہ حال سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ لیکن تھوڑے وقفہ کے بعد جب حال معرکۂ محبت میں داخل ہو گیا تو پھر کسی کو مجال نہ ہوتی کہ اس کے سامنے کوئی سر اٹھائے اور جو بھی سامنے آیا بلا چون و چرا گر گیا اور حال کے قدموں میں سہارا لئے بغیر چارہ نظر نہ آیا۔ يَا شَيْخ عَبْدَ الْقَادِر جِيلَانِي شَيْئًا لِلّٰهِ کا وظیفہ کسے معلوم نہیں کہ مشابہ بہ شرک ہے، یا کم از کم صَاحب علم و ہدایت اس کے جواز پر اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن جب کبھی کسی صاحب حال نے اسے اختیار کر لیا تو ایک دنیا نے اسے پڑھنا شروع کر دیا اور کسی دلیلِ شرعی کی پرواہ نہ کی۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس وادیٔ محبت میں دلیل کوئی نہیں دیکھتا اور نہ کوئی پوچھتا ہے۔ اور جب آخر کار حال کی جگہ قال نے کرسیٔ صدارت سنبھال لی، تو اب قال مسجد و محراب کا مالک ہو کر صوفیت اور حال کے پرخچے اڑانے لگا۔ گو صوفیت اور حال گم ہو چکا تھا، اور قصور زبان حال سے پکار رہا تھا کہ ؎

تیرے اک نہ ہونے سے ساقیا
نہ وہ دور ہے نہ وہ جام ہے
نہ وہ صبح، اب میری صبح ہے
نہ وہ شام اب میری شام ہے

Marfat.com

لیکن حال پرست اور صوفی خیال موجود تھے۔ اس لئے قال کی صدائے بلند کے تقابل کے لئے حال پرست مقابل ہو گئے۔ آخر وہی شہر قصور پاک جو سراسر شہرِ خموشاں تھا، ایک اچھا بھلا اکھاڑہ بن گیا۔ دین اسلام کی تو پرواہ نہ رہی۔ اگر ہے تو صوفیت اور مولویت کی جنگ اور بس۔ لیکن وہی قصور جو سراسر نور تھا، اب سراسر قصور ہو کر رہ گیا، اور قصور کی نور بھری گلیاں بھڑبھونجوں سے بھری دکھائی دیتی ہیں۔ نہ داڑھی ہے نہ مونچھ ہے، نہ دل ہے، نہ زبان ہے۔ اک مورکھ شہر مورکھوں سے آباد ہو رہا ہے۔ نہ مسجدوں کی وہ پہلے کی سی آبادی ہے اور نہ ذکر و شغل کی رونق۔ اور نہ ذوق و شوق کی عبادت، نہ قبرستان کی وہ فاتحہ خوانی۔ کلام پاک کے درس ضرور ہیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سامعین اُٹھتے ہی سب کچھ درس گاہ میں پھینک جاتے ہیں اور خالی دل اور خالی ذہن چل دیتے ہیں۔

بے شک حال قال کے سوا ادھورا ہے لیکن قال حال کے بغیر، صفر اور محض صفر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حال کی مستانہ ادائیں خواہ کتنی غلط ہوں لیکن دل کے اندر بیٹھی چلی جاتی ہیں۔ لیکن قال کی خوش آوازی کتنی بھی کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن دل کے اندر نہیں بیٹھتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قال کچھ نہیں، سب کچھ ہے، احکام الٰہی کا اسی پر دارو مدار ہے۔ لیکن صرف احکام کو کیا کیا جائے، جب دل مطمئن اور قلب سلیم کا ساتھ نہ ہو۔ قلب سلیم سے آواز نکلے یا نہ نکلے لیکن اس کی سلامتی دل کی روشنی خود بخود پھیلتی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے قرب وبعد کی مسافت اٹھ جاتی ہے۔ ہر سامنے آنے والا سر بسجود ہو جاتا ہے، اور تسلیم کے سوا اسے چارہ نہیں ہوتا۔ میرے ایک عزیز طالب علم ملنے کے لئے آئے، تو انہیں انکے استاد صاحب نے کہا کہ اُسے (مجھے) توحید کا علم سکھاؤ۔ عزیز آیا تو اس نے اپنے استاد کا مقولہ دہرایا کہ میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ تو میری زبان سے بے اختیار نکلا، کہ بے شک احکام توحید کے تو عالم ہیں اور ہر حکم توحید کے سامنے ہمارا سر تسلیم خم ہے۔ لیکن توحید کو علمائے کرام کیا جانیں؟ یہ اُن کا حصہ نہیں۔ یہ صرف صوفیت کا وسیع دل ہی توحید کو جانتا ہے۔

Marfat.com

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو

(پنجابی)

معرفت یا توحید کوئی معمولی علم نہیں جو ہر کس و ناکس اور ہر کہ و مہ کے حصہ میں آیا ہو ؎

سر مد غم عشق بو الہوس را نہ دہند
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

جن کے بارے میں سعدیؒ فرماتے ہیں

"کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد"

کیونکہ اس کا حصول سراسر مشاہدات روحانی سے ہوتا ہے۔ جو مجاہدات کثیرہ کے بعد صرف فضل ربی کی عنایات کا ثمرہ ہوتا ہے۔

میرے مہربان مکرم خان بہادر حافظ صاحب کی اور میری اکثر جھڑپیں آپس میں ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ پکے موحد اور میں پکا بدعتی نہیں تو بدعتیوں کے حلقوں کا غلام تو ضرور ہوں۔ اگلے روز ایک لمبی جھڑپ میں میں نے عرض کیا کہ بے شک آپ کی زبان پر تو لا الٰہ ہے لیکن عمل تمام اس کے برخلاف۔ نہ داڑھی ہے نہ مونچھ، کاروباری سلسلہ میں شریعت کی پرواہ نہیں۔ عبادت ہے تو دم کٹی۔ سنت و نوافل سے بیزاری، ذکر و افکار سے غفلت۔ رات بھر سونا۔ بس توحید ہے تو زبان پر ؎

زباں سے کہہ بھی دیا لا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں؟

(اقبال)

اس کے برخلاف ہمیں مشرک کہا جاتا ہے اور بدعتی جیسے غیر موزوں الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن ادنےٰ سے ادنےٰ حلقۂ ارادت کا غلام صوم و صلوٰۃ کا پابند، نماز با جماعت ادا کرنا اولین فرض جانتا ہے۔ فرائض کے علاوہ سنن و مستحبات تک کرنے کا اہتمام حتی کہ تہجد ایک چھٹی نماز بنا رکھی ہے۔ درود و صلوٰۃ اور ذکر و اذکار سے زبان ہر آن

Marfat.com

اور گھڑی تر رکھی جاتی ہے۔ احکام الٰہی پر پوری توجہ۔ تلاوت قرآن پر آنسو باہر نکل آتے ہیں۔ اور سجدہ ذوق سے اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ غرض جان نثاری اور مال بازی ان کا شیوہ۔ وہاں قرآن کی دعوت پر بھی روپیہ دینا مشکل اور یہاں ارشاد نہیں، خیال کی تعمیل پر جان و مال قربان۔ سینکڑوں عالم موجود۔ دعوت قرآن میں مصروف لیکن اُن کے حلقۂ درس کا نقشہ دیکھئے اور دوسری طرف حلقہ ارادت کا دیکھئے، کہ وہ سر اٹھائے ہوئے مالک الملک کے دھیان میں مشغول۔ آخر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ کی توحید کا ثمرہ وہ اور بدعتیت اور مشرکیت کا ثمرہ یہ۔ آخر توحید کا ثمرہ، محبت خدا و رسول کے سوا اور عبادت الٰہیہ کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے؟ اگر یہی ثمرہ ہے تو ہمارے فرقہ میں کئی ہزار درجہ بڑھ کر۔ اور اگر کچھ اور ہو سکتا ہے، تو فرمایئے! کاش کوئی اس قاعدے پر نظر رکھتے ہوئے صوفیت کی حقیقت پر حکم لگاتا۔ لیکن دل کی حقیقتوں سے واسطہ نہیں۔ صرف زبان پر قالوا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللهِ پر حکم لگایا جاتا ہے۔ بے شک اقرار بِاللسان کا درجہ اولین ہے۔ لیکن "تصدیق بالقلب" کا جملہ بھی ایمان کی شرط ہے۔ بے شک بعض امور ایسے بھی ہمارے حال میں آجاتے ہیں، جن کو شریعت حقہ برداشت نہیں کرتی۔ لیکن پھر بھی ہمارے مجموعی نمبر کا مقابلہ کوئی فرقہ ناجیہ نہیں کر سکتا۔ نہ از روئے عقائد نہ از روئے اعمال۔ صوفیت کو یہ درجۂ کمال حاصل ہے کہ ہر آن اور ہر گھڑی خدائے قدوس کے حاضر و ناظر ہونے کا جذبہ پختہ کرایا جاتا ہے، اور اس عقیدہ کو اولین بنیاد قرار دیا جاتا ہے اور اس پر تمام اعمال کا مدار خیال کیا جاتا ہے۔ صرف عقیدہ کو عقیدہ سے تعبیر کرنے سے یہاں نجات نہیں۔ بلکہ عقیدہ دل کی کلی میں جب تک کھلتا نظر نہ آیا، اعمال کی حقیقت کی کوئی قیمت نہیں رکھی جا سکتی۔

تصور دل میں رکھو ذات حق کا
بہر وقت و بہر حال و بہر جا
زباں خاموش ہو پر دل میں جاری
رہے ہر وقت ذکرِ ذاتِ باری

Marfat.com

رَجالٌ لاَ تُلْهِیْهِمْ تِجَارَۃ
وَلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہ

کہنے کو تو مشرک کہہ دیا جاتا ہے لیکن کاش ! کوئی یہ دیکھتا، دنیا انہیں کیا کہتی ہے۔ عالم فاضل موجود۔ اتباع سنت کے دلدادہ سامنے، لیکن کسی کو ولی اللہ کا لقب نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو انہیں لوگوں کو جو کچھ اس کے نام پر قربان ہو چکے۔ دنیا تو دنیا رہی، دین و ایمان بھی اس کے نام پر قربان کر دیا کیا یہ کچھ کم شرف ہے کہ ظفر کا غلام ہوں۔ کے مطابق ولی اللہ کے معزز لقب سے انہیں عزت بخشی جاتی ہے ۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ شاہ کا غلام ہوں
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

(محمد علی جوہر)

اہل اسلام نہیں، اہل کفر کے اندر بھی وہ قابل احترام اور قابل اعتبار اور صاحب ولایتِ عظمی خیال کئے جاتے ہیں۔ دنیا جاتی ہے اور فیضِ ظاہری و باطنی اٹھاتی ہے۔ پھر چال ڈھال دیکھئے، کس سے مشابہت رکھتی ہے ؟ رسالت مآب ﷺ سے یا کسی دوسرے سے ؟ یہ کس کا مقولہ ہے ۔

اندروں از طعام خالی دار
تا دروں نور معرفت بینی

خاموشی کس کا پسندیدہ فعل ہے ؟ خلوت کے انوکھے جلوے کس کے حصہ میں ہیں ؟ کیا یہ اتباع نبوت نہیں ؟ مقولہ مشہور ہے۔ "زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو"۔ صرف بات نہیں، حقیقت ہے۔ اور یہ عین وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا کا مطلب ہے۔ یاد رہے، میرے نزدیک صرف حال اسلام نہیں بلکہ حال وَقال کی یکجائی صورت و سیرت کا نام اسلام ہے۔ میں اس صوفیت کی ترجمانی نہیں کر رہا، جو سراسر قال کے بر خلاف ہے۔ اور اپنے حال کی مستی میں شریعت حقہ سے بیزار ہو بلکہ میں

اس صوفیت کے لئے لکھ رہا ہوں جو سر اسر اسلام ہو، اور حقائق ود قائق دین اسلام سے لبریز اور تقویٰ و طہارت سے سر شار ہو، جس کی ہر ادا ملت اسلامیہ کے لئے قابل فخر اور قابل احترام ہو، اور اس کا ہر فعل اور اس کی ہر ادا صدائے جرس ہو۔ سچی صوفیت کیا ہے؟ ایک بولتا ہوا قرآن، اور ایک جیتی جاگتی سنت کی عملی تصویر! موجودہ دور کی صوفیت سے جتنے میرے دوست بیزار ہیں، میں خود بھی بیزار ہوں، خواہ توحیدی رنگ کتنا ہی غالب کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی موجودہ اس قال سے بھی بیزار ہوں، جو صرف زبان پر ہو، اور دل خالی ہو، اور جس کے اثرات تشتت اور افتراق ہوں، اور تکبر و انانیت سے پر اور عبودیت سے خالی اور نیاز سے بے پرواہ، ادب سے مبرا اور بے باکی سے لبریز، ولی تو ولی رہے۔ جس کے اندر رسول اللہ ﷺ کا احترام بھی توحید کے بر خلاف کیا جاتا ہو، اور جس کی توحید کی تان رسالت کے رگ و ریشہ پر براہ راست ٹوٹتی ہو، اور توحید کے لئے رسالت کی شاہ رگ کاٹنے سے بھی پرہیز نہ ہو، اور توحید بھی وہ جو زبان کی تو تلی پر ہو اور خود زبان بھی اس لذت توحید سے نا آشنا ہو۔

مذہب کی بنیاد مشاہداتِ روحانی اور خوش اعتقادی پر ہے۔ تزکیہ قلب کے حاصل ہونے کے بعد مشاہدات غیبی سے روح کو تازگی پہنچتی ہے، جس سے جذبات توحید پرورش پاتے ہیں۔ اور پھر یہ جذبات توحیدی حال کے رنگ میں عیاں ہوتے ہیں۔ اور جب حال پختہ ہو جاتا ہے، تو توحید اپنے بلند واقع مقام پر پہنچ جاتی ہے پھر توحید اپنے اثرات چھوڑتی ہے اور

اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ

کے مطابق مذہب کا شجرہ طیبہ ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے، اور ہر پیرو کے اندر خوش عقیدتی کے جذبات بھر دیتا ہے۔ لیکن علم والوں پر قربان جائیے۔ مشاہدات غیبی کی حقیقت سے تو انکار نہ سہی لیکن ان کی اہمیت کے گھٹانے پر پورا زور ہے۔ یہاں تک کہ پیروانِ اسلام کے ذہن سے بھی مشاہداتِ غیبی کی اہمیت چھوڑ، خود حقیقت کا خیال

Marfat.com

بھی اٹھ گیا اور خوش عقیدتی کو ایک جامد اور غیر معقول رویہ کہہ کر خوش عقیدتی کے پرخچے اڑادیئے گئے۔ اور عقلی دلائل سے مذہب کو روشن کر کے مذہب کا بقیہ جو تھا روایہ اس کا بھی دیوالیہ ہوتا دکھادیا۔ بھلا استدلال سے بھی مذہب نے کبھی ترقی کی ؟

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
گر بہ استدلال کارِ دیں بدے
فخرِ رازی رازدارِ دیں بدے

جو علم شک پیدا کرے، اور یقین کو اڑا دے، وہ مذہب کے لئے کیوں کر مفید ہو سکتا ہے ؟ بچپن میں مذہبی یقین اتنا تھا، کہ ہر عقیدۂ مذہب میری جان تھا۔ لیکن جوں جوں علم و فلسفہ کا مطالعہ سامنے آیا، تیقن کے اندر شک کی ایک دراڑ نہیں بلکہ سو شگاف پڑ گئے ۔ جب تک فقہ کا مطالعہ تھا، عمل میں عزیمت تھی۔ جب ذرا بلندی حاصل ہوئی، اور اہل علم کی صحبت نصیب ہوئی، تو عزیمت رخصت میں تبدیل ہوگئی۔ اب گاہ یہ بھی خیال تھا، کہ فریضہ الٰہی کو رخصت ہے۔ جیسے بعض علماء کی تحریرات سامنے آرہی ہیں۔ جب کسی مذہب میں عبادت کا ذوق کم ہو جائے، اور عمل کی روح مر جائے، تو خالی عقیدوں کی بنیاد پر مذہب کو ترقی ہو سکتی ہے ؟ حضرت قصوریؒ ایک تھے۔ اور پنجاب بھر میں ان کی برکت سے بتوسط سلسلہ نقشبندیہ اسلام کی وہ پاکیزہ صورتیں پیدا ہوئیں، جن کو دیکھ کر کافر کلمہ پڑھتے تھے۔ ہر عیب سے پاک اور عبادت سے لذت آشنا، سرما کی لمبی راتیں اور گرمی کے لمبے دن تسبیحات و تہلیلات میں بسر ہوتے اور آنِ واحد بھی غفلت میں نہ گزرتی۔

حضرت پیر بلویؒ کی تعریف میں اُن کے دیکھنے والوں نے لکھا ؎

اوہ اک لحظ جدا ہووے نہ رب تھیں
دسے خاموش حیراں اس سبب تھیں

Marfat.com

فرمائیے کس عالم دین کی یہ حالت ہے ؟ پھر وہ صرف صوفی نہ تھے، عالم بھی تھے، حافظ بھی اور محدث وفقیہہ بھی۔اُن کی خانقاہ میں علم کا درجہ پہلے تھا، اور صوفیت و فقر کا بعد میں۔ اپنی اولاد میں علم پیدا فرمانے کی کوشش زیادہ فرمائی اور فقر و صوفیت کو ان کی طبیعت پر چھوڑ دیا۔ بہر صورت آج تک قصوری سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ چل رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے ابھی تک قصور کی عظمت و عزت ہمارے دلوں سے نہیں اُٹھی۔ پہلا سا احترام نہ سہی، لیکن پھر بھی دوسرے قصبات کے مقابلہ میں وہ ہمارے لئے مثل مدینہ طیبہ کے ہے۔ کیونکہ ہماری عقیدت کی پاک روحیں قصور کی سرزمین کی مٹی کے ڈھیروں تلے اب بھی جاگ رہی ہیں، اور ان ڈھیروں کے دیکھنے کی آرزو ہمارے دلوں میں تڑپتی رہتی ہے۔

وہ گئے۔ پانسہ بدلا۔ علمائے کرام کی باری آئی۔ اب قصور صوفیت سے نکل کر مولویت کی شان میں جلوگر ہو رہا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ ایک درجن نہیں، تو نصف درجن ایسے علمائے حق موجود ہیں، جن کو قال اللہ اور قال الرسول پر پورا عبور ہے اور جن کی زبان فیض ترجمان سے روزانہ معارفِ قرآن حکیم و فرقان حمید بصورتِ درس عوام و خواص سنتے ہیں اور نہایت بلیغانہ خطبے جمعہ کو دیئے جاتے ہیں۔ لیکن بغور دیکھا جاوے کہ قصور اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، یا بلند ہو رہا ہے ؟ پنجاب کیا، حوالی و عوالیٔ قصور تک کسی کو موجودہ قصور کے بارے میں اپنے دل میں کو کیا دیکھتے ہیں کہ پہلا قصور شریف اچھا تھا یا موجودہ قصور جب کہ علوم اسلامیہ کے دریا بہ رہے ہیں اور ہر طرف سے زبانی توحید توحید کے آوازے بلند ہو رہے ہیں اور شرک و کفر کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ بے شک زبان پر سب کچھ نیک ہی نیک ہے لیکن ذرا دل ٹٹول کر دیکھیں کہ وہ کس درجہ قرآن حکیم اور توحید پر اتر آیا ہے۔

یہ چند الفاظ اپنی محبت و اشتیاق میں لکھ دیئے۔ اور ایک گونہ مرثیہ اور نوحہ خوانی کے لئے۔ ورنہ کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ میرے دل میں اہل علم کی بڑی قدر ہے۔ جیسے لکھا گیا، خود علمی خاندان میں پرورش پائی۔ اور ہمارے شیوخ کی صوفیت

بالکلیہ علمی خاندانوں کے سلسلہ میں چلی آئی۔ اور علم واہل علم کی وہی قدر ہے، جو فقر و صوفیت کی سلسلہ طیبہ میں ہے۔

آخر میں میں اپنے محبت بھرے پیغام کو قصور کی پاک سر زمین اور اپنے لئے باعث برکت خیال کرتا ہوں اور ان اشعار پر اپنا قلم روکتا ہوں ؎

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى
أُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارِ وَ ذَاالْجِدَارَا
میرا لیلے کے گھر پر گزر ہوا، تو کبھی اس دیوار
اور کبھی اس دیوار کو بوسے دینے لگا
وَمَاحُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي
وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا
میرے دل میں گھر کی محبت تو داخل نہیں ہوئی
لیکن گھر کے رہنے والے کی محبت کھا گئی۔

(مارچ ۱۹۶۵)

# معجزات کے جنازے

دو سال ہوئے ایک ہندوستانی رسالہ اور ایک پاکستانی ماہنامہ میں ایک مدت دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ آیا رسول اللہ ﷺ کا سایہ تھا یا نہیں۔ پاکستانی صاحب سایہ نہ ہونے کے دلائل پیش کرتے تھے اور ہندوستانی صاحب سایہ ہونے پر مصر تھے اور ان کے دلائل پر جرح فرماتے تھے۔ دونوں کے دیکھنے کے بعد یہ تحریر پیش کر دی گئی ہے، امید ہے کہ پورے غور سے مطالعہ فرما کر حقیقت پر پہنچنے کی ہمت کی جائے گی۔

## معجزہ

معجزہ اس کام کو کہتے ہیں جو انسانی قدرت سے باہر ہو اور قدرتِ خدائی خیال کیا جائے لیکن اس کا سبب کوئی انسانی ہستی ہو، ورنہ فطرت اللہ اور عادۃ اللہ کے بر خلاف کسی فعل کا ہو جانا معجزہ نہیں کہلاتا۔ پیدائش میں عجیب الخلقت انسان اور حیوان پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن انہیں معجزہ نہیں کہا جاتا۔ معجزہ وہی ہے جو کسی پاک بلند ہستی تعلق الٰہی رکھنے والی کے ذریعے کوئی اچنبھا ظہور پذیر ہو جو انسانی قدرت سے باہر ہو۔

Marfat.com

## ضرورت معجزہ

انسان اشرف المخلوقات ہے اور کائنات سے بلند تر رتبہ، اپنے احساس ذہنی، عقلی اور روحی میں تمام جانداران کائنات سے ممتاز واعلیٰ ہے، ایک گونہ صفات الٰہیہ میں شریک ہے اور ہر صفتِ ظہور میں شریکِ کارِ خدا تعالیٰ ہے بلکہ اپنی صورتِ باطنی پر پیدا فرمایا گیا۔ جیسے حدیث پاک میں ہے

اللہ تعالیٰ کو اس اشرف المخلوقات سے بڑی محبت ہے کیونکہ یہ اشرف المخلوقات ہی اس کی خدائی کا صحیح تصور اپنے اندر لا سکتا ہے اور اس احساس و علم میں کوئی چیز کائنات کی اس کے ہم پلہ نہیں، حتیٰ کہ نوری فرشتے بھی اسی صفتِ ممتاز میں اس کے شریک نہ ہو سکے اور انہیں اس کے سامنے سربسجود ہونا پڑا، ناری و نوری مخلوقات کو حکم ہوا کہ اس کے سامنے سربسجود ہو جاؤ۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ اپنے رب کا کامل انعکاس لے سکنے کا اہل ہے، اسے خدائی کے ساتھ تعلق ہے اور اس خاص نسبت و تعلق کی وجہ سے تمام کائنات کے ساتھ ایک ربط رکھتا ہے اور ایک مناسبت رکھتا ہے، اور تمام کائنات اس کے احاطۂ قدرت میں آنے کے لیے مستعد، اور یہ اس کو سنبھالنے کا اہل ہے اور کامل اہل ہے۔ ایک طرف یہ رب العزّت کے انعکاسِ کامل تمام کائناتِ ارضی و سماوی پر پھینک سکتا ہے۔ اس لیے رب العزّت نے اسے اپنے لیے انتخاب فرمالیا اور اسے خلیفہ کے نام سے عزت بخشی یعنی اپنا نائب کائنات میں مقرر فرمالیا اور تمام کائنات کی چابیاں اس کے حوالے فرما دیں۔ لیکن یہ رابطہ الٰہی کوئی ایسا نہیں کہ ہر کہ و مہ پر وارد ہو سکے اور ہر انسان اس کا اہل ہو سکے، اور نہ ہر انسان میں اس کی قابلیت اور استعداد ہو سکتی ہے۔

فطرت کا راز اسی میں ہے کہ ہر جنس اپنی شخصیتِ ذاتی میں الگ الگ انواع میں تقسیم ہوتی ہے اور پھر ہر نوع کی تشخصات الگ الگ قائم نظر آتی ہیں۔ یہ ہی فطرۃ اللہ ارتقائی صورت کی مالک ہے۔ اگر تمام ایک ہوتے تو ارتقاء کیسے چل سکتا تھا اور اسے بقا کیوں کر حاصل ہوتا۔ اس لیے رب العزّت نے اپنے لیے ان پاک ہستیوں کو چن لیا، جو اپنی فطرت صحیحہ کی بنا پر اس کے ساتھ ہمکلامی سے ممتاز ہو سکتی تھی، جنہیں وہ اپنا

Marfat.com

رازدان بنا سکتا تھا اور وہ کائنات کے رازدان ہو سکتے تھے۔

اپنی رحمتِ خاصہ سے اپنے پاک بندوں کو اپنی ذاتِ اقدس کے لیے چن لیا، جن کو انبیاء اور رسول کہا جاتا ہے، اور وہ نبی اور رسول ہو کر دنیا میں ممتاز ہوئے۔ پھر ان کے قدم بقدم چلنے والوں کو اسی راہ ہدایت پر چلنے کی توفیق بخشی حتی کہ وہ بھی رازدانِ الفت لہیہ ہو گئے اور ایک عاشق زار کی طرح اس کی محبت میں ہمیشہ سرگرداں رہے، اور اپنی برادری کی پاک روحوں کو اس کی دعوتِ حقہ دیتے رہے اور بلاتے رہے۔ اس کے مشاہداتِ روحی کا باعث رہے۔ آپ خود جانتے ہیں جب کوئی پر تو اپنے اندر آتا ہے تو اس پری جمال کے انوار کی جھلک سے تمام وجود چمک اٹھتا ہے اور اس کے عکس نوری سے تمام وہ صفات پیدا ہوتے ہیں جو ذاتِ حقہ کے اندر جھلکتے ہوتے ہیں اور وہ تاثرات اور افعال پیدا ہو جاتے ہیں جو اس ذاتِ حقہ کے ساتھ خاص طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔

لیکن اندھی دنیا جو فسق و فجور سے اپنے پاک احساس کھو بیٹھتی ہے اور اپنے دل کی بصارت دے بیٹھی ہوتی ہے، اور ان کے کان رشد و ہدایت کے سننے سے بہرے ہوتے ہیں، وہ ایسی پاک ہستیوں کے مقابلہ میں آجاتے ہیں اور ان کے جھٹلانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

ایسی صورت میں فطرت اللہ اپنے انبیاء کو خاص نشان اور امتیاز عنایت فرماتی ہے، جو انسانی قدرت سے باہر ہوتا ہے، اور الہی قدرت کا کرشمہ ہوتا ہے، اور اس سے ظاہری آنکھ والوں کا علاج کیا جاتا ہے اور غیب کے مشاہدات ظاہراً پیش کر کے دعوتِ الہیہ کو حصہ قرار دینے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ کوئی نبی اور کوئی رسول اور کوئی ولی ایسا نہیں گذرا جسے اس نشان الہیہ سے لیس نہ کیا گیا ہو اور ہر وقت کے مطابق یہ امتیاز، یہ نشان اور یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو، جو وقت کی پکار ہو، اور جس کے ظہور سے کائنات کو خدائیت کے انکار کی طاقت نہ رہے اور ہر صاحبِ عقل و ہوش اس کے دیکھنے کے بعد خاموش نہ ہو جائے۔

گو اندھے دل کبھی بھی صاحبِ ہدایت کو تسلیم نہ کریں گے لیکن اندر اندر وہ کامل طور پر تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور يَعْرِفُوْنَ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ

Marfat.com

ایسے نبی کو پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

غرض معجزہ ہی ایک ایسا نشان ہے جس سے نہ صرف نبوت تسلیم ہوتی ہے بلکہ خود خدائیت کا وجود عام طور پر اسی سے تسلیم ہوتا ہے۔ استدلال عقلی کتنا بھی بلند ہو، وہ صرف اپنے لئے ہوتا ہے، کسی دوسرے کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا۔ لیکن مشاہدہ جب اپنی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو پھر آنکھوں والے کسی صورت میں انکار نہیں کرسکتے۔ بلکہ یقین آجاتا ہے، اور یقین میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ معجزہ و کرامت سے صاحبِ رشد و ہدایت ہمیشہ لیس ہو کر دنیا میں تشریف لائے اور عین موقعہ انکار پر وہ کچھ کر دکھایا، جس کو دکھانے یا دیکھنے کا خیال تک کسی کو نہ تھا اور ہر منکر سرنگوں ہو کر رہ گیا۔ اور حیرت میں آگیا اور تسلیم کے سوا اسے چارہ نہ رہا۔

ادیانِ عالم پر نظر دوڑایئے۔ کوئی دین بھی جب دعوتِ الٰہیہ لے کر نکلا تو اس کے شواہد یہی معجزاتِ انسانی ساتھ ہو گئے اور ان معجزات کے ذریعے صاحبِ دین ممتاز ہستی کو شناسائی نصیب ہوئی۔ قرآن حکیم کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کا ایک حصہ انہی معجزات کے لیے وقف رکھا گیا اور جابجا حسبِ ضرورت دین کی تقویت اور سچائی کے لیے یہی شواہد پیش کئے گئے۔

سیلابِ نوح کیا تھا؟ ایک عذاب تھا جس میں خشک زمین کی سوتیں کھول دی گئیں اور ساری زمین پانی ہی پانی ہو گئی۔ منکرین نے دیکھا اگرچہ ایمان نہ لائے، لیکن دوسروں کے لیے عبرت کا باعث ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام پر آتشِ نمرود گلزار ہو گئی اور اسماعیل علیہ السلام کی ذبح ایک دنبہ پر واقع ہو کر باپ کے لیے ایمان کی تازگی کے ساتھ ایک دنیا کے لیے یہ معجزات ہدایت کا باعث ہوئے اور ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

عیسیٰ نے مردوں کو زندہ کیا اندھوں کو بینائی دلائی۔ پھر وہ روح اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے اور ان نشاناتِ الٰہیہ سے کسی کو انکار کی مجال نہ ہوئی۔ اور ایک دنیا ان

Marfat.com

کے مذہب کی پیرو ہو کر واصل الی اللہ ہوئی۔

موسیٰ علیہ السلام آئے۔ پتھر سے پانی، عصا مار کر نکالا۔ دنیا سیراب ہوئی۔ فرعون سے مقابلہ ہوا۔ ایک لکڑی سانپ بن کر تمام بناوٹی سانپوں کو نگل گئی۔ فرعون کی فوج نے تعاقب کیا۔ دریائے نیل سامنے آگیا۔ وقت نازک پر آپ نے اپنی لاٹھی نیل کے پیٹ میں چبھودی اور پانی دوپٹ ہو گیا۔ خشک راستہ نکل آیا۔ وہ اور ان کے پیرو پار نکل گئے۔ اتنے میں فرعون اور اس کی فوج درمیان میں آگئی اور پانی کے دونوں حصے یکدم مل گئے۔ فرعون اور اس کی فوج غرق ہو گئی اور موسیٰ سلامتی سے پار بیٹھے نظارا دیکھ رہے تھے۔

نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے۔ منکرین، کفار بات بات پر جھٹلاتے تھے اور موقعہ بہ موقعہ معجزات طلب کرتے تھے۔ وقت کا تقاضا تھا عرب میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہہ رہے تھے۔ قرآن پاک آیا اور یہ دعوت ساتھ لایا کہ کوئی ایک سورہ تو اس کے مقابل لائے مگر تمام عرب کوئی ایک آیہ تک سامنے نہ لا سکا۔ آخر یہ کلام پاک معجزہ قرار دی گئی۔ عرب و عجم اس کے سامنے گرتے گئے۔

جا رہے تھے۔ کفار سامنے آگئے۔ معجزہ طلب کیا۔ فرمایا! کیا طلب کرتے ہو۔ کہا چاند دو ٹکڑے کر دو۔ اشارہ فرمایا۔ آسمان پر چاند دو ٹکڑے ہو گیا، اور دنیا نے دیکھ لیا۔ منکرین منکر رہے لیکن ایک ایماندار جماعت مسلمان ہو گئی۔

کفار اور منکرین کی کمی نہ تھی۔ جب کبھی موقعہ، مد مقابل ہو گئے۔ معجزے طلب کئے جا رہے تھے، تو ان کے سامنے آگئے اور پوچھا مٹھی میں کیا ہے؟ فرمایا میں بتاؤں یا وہ خود بول اٹھیں۔ کہا وہ بولیں تو اور کیا چاہیے؟ کنکریوں نے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ پڑھ دیا۔ پھر کیا تھا۔ خاموش ہو گئے۔ پاک طبع لوگوں نے سن کر شہادتین کا اقرار کیا۔ کفار متعصب اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے کہ جادوگر ہے۔ جادو سے کنکر بولنے لگے ہیں۔

غرض جب صاحبِ نبوت ورسالت مبعوت ہوتا ہے تو روز آئے دن یہ منکرین پیش ہوتے رہتے ہیں اور ہمیشہ معجزات سے ان کی رہنمائی کرائی جاتی ہے۔ سعید

Marfat.com

روحیں مسلمان ہو جاتی ہیں۔ متعصب اور اُجڈ لوگ جادوگر کہہ کر پہلے سے بھی زیادہ دشمن ہو جاتے ہیں۔

فرعون نے کیا کچھ موسیٰ سے نہ دیکھا تھا، لیکن ایمان نہ لایا۔ یہاں تک کہ پانی میں غوطے کھانے لگا۔ موت دیکھی تو خدا یاد آیا۔ نبی پر ایمان لانے میں نجات سمجھی۔

بچپن میں ہم گھروں میں رات دن نبی کریم ﷺ کے معجزات کے قصے کہانیاں سنتے تھے۔ عام کتب فروشوں (بیچنے والوں) کے پاس سے معجزات کی کہانیاں، معجزہ ہرنی، معجزہ بکری، معجزہ دودھ وغیرہ خرید کیے جاتے تھے۔ بچے بچیاں پڑھتے تھے، مائیں بہنیں انہیں سنتی تھیں۔ نبی کریم ﷺ کی محبت میں گھر جھوم رہا ہوتا تھا، محبت کے آنسو بہہ رہے ہوتے تھے اور ہر دل میں نبی کریم ﷺ کی شان کی جھلک ہی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ آج ساٹھ ستر سال گذر گئے۔ جو سوز و محبت اس وقت دیکھا تھا۔ وہ نہ تو آج کسی منبر پر دکھائی دیتا ہے اور نہ کسی محفل و مجلسِ میلاد میں وہ بات نظر آتی ہے۔ جو کچھ ہے وہ زبان پر ہے اور بس اور اندر محبت و سوز و ایمان سے خالی۔

بچپن کے نشانات کبھی مٹتے نہیں۔ وہ محبت جو اس وقت دل و دماغ پر بیٹھ گئی بدستور قائم ہے۔ گو رات دن اب یہ تنقیدیں مسلمان خود کرتے ہیں کہ یہ معجزات عقل سے باہر ہیں اور ان کے راوی کمزور ہیں۔ یہ ہے اور وہ ہے۔ اعدائے اسلام کہتے تو شاید ان کے الحاد کی وجہ سے بہت کم اثر پڑتا۔ لیکن غضب یہ ہے کہ ملحدوں کے اثر میں ہمارا علمی دینی طبقہ بھی آگیا ہے، اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو پرویز کر رہا ہے یعنی احادیث نبوی کا انکار۔ اس کا انکار کلی ہے اور ان کا انکار جزئی۔ عام دیکھا گیا ہے کہ جب کسی عالمِ دین کے عقائد (خیال) کے برخلاف کوئی حدیث پیش کی جائے تو اس کے ضعیف ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے اور رجال کی تنقید سے کام لے کر کسی ایک راوی کو مجروح کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ضعیف احادیث ہیں اور وضعی بھی ہیں۔ لیکن یہ کیا موقع ہے کہ جب اس حدیث سے کوئی دینی نقصان نہ بھی ہو تو بھی اس کو ضعیف قرار دے کر اپنا دل ٹھنڈا کیا جائے اور مقابل پر اپنا

Marfat.com

غلبۂ علمی ظاہر کیا جائے۔ معجزات کی احادیث کو کمزور کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی کہ یہ معجزہ نبی کریم ﷺ سے صادر نہیں ہوا، جو آپ کی طرف منسوب ہے۔ آخر تمام معجزات سے انکار ہوگا۔ انکار کی صورت میں نبی کی شان کیا ہوئی۔ وہی جو ایک عام آدمی کی قدر و قیمت ہے یعنی بے لاگ تنقید اور ہر رطب و یابس کہنے کا جواز؟ اور سچ کہوں تو یہی ہمارے بعض دینی رہبر چاہتے ہیں کہ جیسے ہم بے قیمت ہیں ویسے ہی ہمارے نبی کریم بھی بے قیمت، اِنَّمَا اَنَا بشرٌ مِّثْلُکُمْ کا نمونہ قائم ہو، نہ وہ کچھ جانتے ہیں اور نہ کچھ پڑھتے ہیں۔ وحی آئی۔ کچھ کان میں کہہ کر چلی گئی کہ الفاظ سنادو۔ بھلا ایسے سنانے کا کیا فائدہ؟ اب قرآن حکیم جو سراسر معجزہ ہے۔ علماو فضلاء کرام سناتے رہتے ہیں مگر ان کے نتائج کیا ہیں؟ مسلمان کے دلِ کو اللہ تعالیٰ کی کلام گرماتی ہے یا پہلے سے بھی زیادہ سرد کر دیتی ہے؟ میں مانتا ہوں علم کے دریا بہنے شروع ہو جاتے ہیں۔ غزالی حیران نظر آتا ہے لیکن قلوب کی حالت کیا ہوتی ہے؟ تَقْشَعِرُّ جُلُودُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ ان کے دل اور جسم اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف سمٹتے ہیں" کا معاملہ بھی کبھی کسی کے ساتھ ہوا، اور کسی کی حالت کوئی بھی بدلی؟ رات بھر قرآن خوانی ہو، لیکن اتنا بھی اثر پیدا نہیں ہوتا، جتنا کہ ایک قوال کی قوالی کا۔ کیوں؟ اس لیے کہ قرآن حکیم سے محبت نہیں، نبی کریم سے محبت نہیں، اور اللہ سے محبت نہیں۔ جن کو محبت ہوتی ہے وہ ایسی بے نقط تنقیدیں معجزاتِ رسالت پر کرتے ہیں؟ محبت میں عیوب بھی محاسن نظر آتے ہیں اور عیب حسن و جمال کا برقعہ پہن لیتا ہے۔ یہ محبت کیسی ہے؟ ایک نبی کریم کو نور کہتا ہے، دوسرا بشر بناتا ہے اور ایک ایک بشری تقاضے نبی کریمؐ کے پیش کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نبی کریمؐ بشر تھے۔ ماں باپ سے پیدا ہوئے۔ ہم جیسے تھے اور ہم جیسوں کے ساتھ رہتے تھے۔ بھلا اس میں کیا خوبی ہوئی جس کی وجہ سے وہ نبی ہوئے، رسول ہوئے۔ آخر نور ہی نے ان کو نبی بنایا اور نور ہی ان کو رسول کہلایا۔ وہ نور کیا تھا؟ اللہ کے نور سے تھا یعنی نُورٌ مِنْ نُورِ اللّٰہِ۔

Marfat.com

لیکن یہاں اس نور و بشر کے جھگڑے نے تمام امت کو مصیبت میں گرفتار کر دیا۔ جو ایماندار محبتِ رسالت میں جان دیتے تھے وہ بھی اب اس اختلاف سے اس محبت میں نہیں رہے جو ایک مسلمان کو اپنے آبائی ورثہ میں ملی تھی۔ کچھ ہے تو زبانی دعویٰ اور بس۔ آج سے پچاس سال پہلے مسلمان گھرانوں میں اسلامی تہذیب اور اسلامی نشان قائم تھے اور اسلامی دل محبت خدا اور سول سے سرشار رہتے تھے۔ مرد ہی نہیں، عورتوں میں یہ جذبۂ پاک زیادہ تھا اور عورتوں سے بڑھ کر بچوں میں یہ سادہ محبت ایسی تھی کہ وہ یہی جانتے تھے کہ جو کچھ ہے خدا اور رسول ہے اور بس۔ دنیا ان کی اور وہ دنیا کے فرمانروا۔ جو کچھ ہے اس کے حکم سے ہے۔ ہر مسلمان کے دل میں نبی کریم ﷺ اور ان کے دین کا احترام تھا۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ ایک لفظ بھی بے ادبی کا کوئی استعمال کر سکے۔ اور کفار اور مشرکین بھی خوف کے مارے نہ بولتے تھے کہ مسلمان کے کان میں کوئی بات بھی نبی کریم کی سبکی یا تخفیف میں یا ان کے بارے میں پڑ گئی تو پھر ہماری شامت آئی اور جان گئی۔

لیکن آج مسلمان نہیں بلکہ ایک عالمِ دین وہ خود کہہ رہا ہے، جس کو ایک ہندو کہنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اگر سن بھی لے تو رام رام کہدے۔

اتنا سوچا ہوتا کہ کوئی امت بھی اپنے نبی کے بارے میں کوئی بے ادبی کا لفظ نہیں سن سکتی تو ہم کیسے اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ رہے ہیں جس سے عرش عظیم بھی لرز جائے۔ سکھوں کا مذہب کل کا مذہب ہے۔ دین بھی نہیں اور ایک تھوڑی تعداد میں ان کا گروہ ہے اور ایک معمولی خطۂ زمین پر بستے ہیں لیکن ان کے گرو بابا نانک کے بارے میں ان کے خیالات کا کبھی جائزہ لیا گیا؟۔ وہ کیا کچھ اس کے بارے میں کہتے ہیں اور کیا ان کے الفاظ سے شرک ٹپکتا ہے؟۔ وہ اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں۔ جبکہ رات دن وہ اس کی تعریف و ثنا میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن وہ نانک جی میں وہ اوصاف بھرتے ہیں جو اوصاف خداوندی سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ خدا ہے بلکہ وہ صاف کہتے ہیں گرو ہے۔ اللہ کا اوتار ہے اور اللہ کے اوصاف سے متصف ہے۔

Marfat.com

بد قسمتی کہئے یا دین کی بربادی کہ اس وقت مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس فتنہ عظیم میں مبتلا ہے کہ ہمارے نبی کریمؐ ایک عام سطح کے آدمی تھے یا ایک برگزیدہ خدائی صفات سے متصف رسول تھے۔ پہلا گروہ اپنے علم کے باوجود وہ کچھ پیش کرتا ہے جو ایک عام سطح کے آدمی کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیا کوئی کسی مولانا کو کہہ سکتا ہے تو کیا ہے؟ تو آدمی ہے، آدمی بن۔ اس لفظ سے کتنا غصہ آتا ہے۔ اس میں کیا شک ہے مولانا آدمی ہیں لیکن اس تحقیر کے ساتھ آدمی کہنا کون پسند کر سکتا ہے؟

معاملہ تو صرف تحقیر و تعظیم کا ہے۔ ایک فریق اپنے رسول کی تعظیم میں وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو اسے نہ کہنا چاہیے تھا۔ اور دوسرا فریق تحقیر میں وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو اس کے علم کی شان اور ذاتِ نبوت کی شان کے منافی چھوڑ، ایک ادنیٰ آدمی کے لیے ایسا کہنے سے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ایسا کہنا دین کی سرخروئی خیال کیا جاتا ہے۔ خود سوچیے یہ جنگ آج سے نہیں ایک مدت سے جاری ہے جب سے زیادہ نو علمِ دین ہمارے ملک میں آیا۔

عام مسلمان اپنے نبی کو بلند سے بلند دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن ہمارا علمی طبقہ یہ گوارا نہیں کر سکتا اور اسے شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کہہ کر اپنا فریضہ خیال کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس شرک سے پاک کیا جائے۔

اسی کے ردِ عمل میں یہ صورت پیدا ہو گئی اور پہلی سطحِ عقیدت سے چند قدم اور بڑھا دیئے۔ اور کلی جزئی نور و بشر کا جھگڑا پیدا ہو گیا۔

دین کے دو جز ہیں، "ایک محبت، دوسرا عمل"۔ ایک فریق محبت کو اصل قرار دیتا ہے اور دوسرا فریق عمل کو نجات خیال کرتا ہے۔ ہمارا اپنا مسلک تو یہ ہے کہ نہ صرف محبت میں نجات ہے اور نہ صرف عمل کام آتا ہے۔ ایمان محبت کا نام اور صالحات عمل کا نام ہے۔ دونوں برابر ہوں تو مسلمانی چلتی پھرتی ہے۔ ورنہ بے جان عمل کس کام کا، اور بے عمل محبت کی کیا قیمت؟ پھر بھی میرے نزدیک اصل محبت ہی ہے اور وہ بے عمل صورت میں زیادہ نہیں تو کچھ موجبِ برکات ضرور ہو جائے گی۔ جیسے خود قرآن

Marfat.com

حکیم شاہد ہے کہ "ایمان پہلے ہے اور عمل بعد میں۔" یہ جھگڑا تو نور بشر کا جھگڑا نہیں، کلی جزئی کا تنازعہ نہیں، بلکہ ذات اقدس کا جھگڑا ہے، نبوت پر وار ہو رہے ہیں۔ معجزات کو اُڑانا نبوت کو اُڑانا ہے۔ اور نبوت پر لے دے خود ذات اقدس جل شانہ پر لے دے ہے، اور توحید پر لے دے ہے۔

میں نے عنوان "معجزات کے جنازے" اس خوف سے دیا کہ مبادا نبوت کی بے ادبی نہ ہو ورنہ اصل عنوان تو یہ ہونا چاہیے تھا۔ "نبوت کا جنازہ"

واقعی مسلمانوں کو علم نہیں۔ معجزات کے انکار اور نبوت کے صفات کے انکار سے دین الٰہی کی کتنی تذلیل ہو رہی ہے اور مسلمان کتنے بد عقیدہ ہو رہے ہیں؟ جو کام ایک ملحد بے دین کے کرنے کا تھا، وہ خود ہم اور ہمارے اہل علم سرانجام دے رہے ہیں، اور اسلام کا جنازہ نکال رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہوش دے۔ وقت ہے کہ اس تعظیم و تحقیر کے مسئلہ کو ختم کر دیں اور دینِ الٰہی کی خدمت کسی اور طریقہ سے سرانجام دیں۔ یہ اللہ کا دین ہے۔ نبوت کی شان بڑھ گئی تو دین میں کمی نہ آئے گی۔ گھٹی، تو پھر دین کے قدم قائم رہنے مشکل ہو جائیں گے۔ جب عقیدتیں بدلتی ہیں تو پھر معاشرے کے ہر حصے میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور وہ وقت آجاتا ہے کہ معاشرہ اپنی شکل و صورت بدل کر ایک بے دین معاشرہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بہر صورت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس فتنۂ عظیم سے بچے اور فتنہ اٹھانے والے سے درخواست کرے کہ وہ دین کی کوئی اور خدمت سرانجام دے۔

تھوڑے دن ہوئے ایک علامہ نے رسول اللہ ﷺ کے سایہ پر خامہ فرسائی کی کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ تھا۔ حالانکہ جب سے اسلام آیا، ہم سنتے آئے تھے کہ آپ ؐ کا سایہ نہ تھا۔ مگر آنجناب نے ایک رسالہ میں کئی اقساط شائع کیے۔ دوسری طرف ایک مدمقابل تھے، خوب لے دے ہوئی لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سایہ کو کیوں کر لے اڑے؟۔

Marfat.com

سایہ نہ ہونے کی صورت میں کون سا شرک پیدا ہو جاتا تھا؟ اگر آپ کی ذات والا صفات پر بادل سایہ کرتے ہوں تو اس صورت میں الوہیت کے ساتھ کیا مناسبت پیدا ہوتی ہے اور کون سا شرک پیدا ہوتا ہے؟ مانا کہ کلی جزئی اور نور و بشر میں آپ کو شرک دکھائی دیتا ہے!

ہمارے خیال میں تو صرف اپنے علم کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ نہ تو اللہ کی محبت ہے اور نہ کسی کے دل میں اس کا خوف ہے۔ دین میں عمل نہیں اور جذبات نہیں رہے، صرف علمِ دین زیادہ ہو گیا ہے اور ہر صاحبِ علم اپنے اپنے علم کو دین خیال کرتا ہے!

ذرا غور فرمایا جائے کہ صفاتِ نبوت کے بغیر صفاتِ الٰہیہ کا کیا ثبوت ہے یعنی دنیا کے ظہور میں صفات الٰہیہ کو کیسے تسلیم کیا جائے جبکہ خود ذات بھی پردہ میں ہے۔ صاحب پردہ کے صفات کو کیسے ظہور میں اس کے ساتھ متصف کیا جائے، جب صاحبِ صفت موجود ہی نہیں، اس کو کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ اور سامنے ہوئی ہی نہیں۔ صفات تو ذات کے ظہور کے بعد تسلیم ہوتے ہیں۔ جب خود ذات عیاں تھی تو صفات کیسے؟

مانا صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ظہور کیسے اس سے متصف کریں جب ہمیں اس کی ذات کا تصور نہیں؟۔ سوچیے، خوب سوچیے اور بتلایئے کہ کیا صفات اس کا نشان دیتی ہیں؟ یہ ظہور صفاتِ نبوت ہی بنیادِ صفات الٰہیہ ہے۔ ان کے ظہور سے ہی صفاتِ الٰہیہ کے نقوش ہمارے ذہن میں اُبھرتے ہیں اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ صفاتِ اس کے ہیں مثلاً صفتِ خلق کو ہم کیسے جان سکتے جب تک نبی علیہ السلام نے پتھر سے ایک اونٹنی ہمارے سامنے کھڑی نہ کرا دیتے۔ مرنے کے بعد ہم کیسے تصور کر سکتے تھے کہ خدا مُردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے تو عیسیٰ نے مُردوں کو زندہ کر دکھایا جس سے یقین پیدا ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ مردوں کو فوراً زندہ کر سکتا ہے، یہ اس کی قوت و قدرت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر سے پانی نکالا اور ساتھ ہی تصورِ خدا پیدا کیا کہ اس کے حکم سے ہے، تو یہ صفت بالذات اللہ تعالیٰ کی سامنے آگئی۔ دریاؤں کو ٹکڑے کر دکھایا تو ٹکڑے کرنیوالے نے یہ نہ کہا کہ میں نے کیے ہیں، بلکہ صاف اعلان کر دیا کہ

اس ذاتِ وحدہٗ لا شریک نے ایسے کیا۔ کیا کسی کو صفاتِ الٰہیہ کا انکار بھی ہو سکتا ہے، جبکہ وہ خود اپنے آپ کو بندۂ خدا کہے اور مسلمان شمار کرے۔

ذات اقدس محمد رسول اللہ ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے کیا۔ کیا انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے کیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ حکم خداوندی نے میری لاج رکھ لی اور ایسے ہو گیا۔

میں تو کہوں گا کہ ہم سمع و بصر اگر اپنے اندر نہ رکھتے اور عقل و فہم ہمارے اندر نہ ہوتا، تو ہم کیسے یہ صفات خدائے قدوس کے لیے تسلیم کر سکتے، جب کہ ہم اپنی صفات سے معرا ہوتے۔ یہی صفات اس وقت اس کے لیے ہم تسلیم کرنے کے لیے مامور ہو سکے جب کہ یہ صفات ہم نے اپنے اندر پائے۔

انسان کی کمزوری ہے کہ جو صفت اس کے اندر نہیں ہے، وہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام صفات مشاہدۂ انسان کے لیے اس کے سامنے کر دکھائے، اور اس کی ذات سے کرائے تاکہ ان کا یقین اسی انسان کو ہو جائے اور تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہ رہے۔

خود ذات اقدس کا ظہور اگر انسان کے اندر نہ آتا تو وہ کیسے خدائی تصور کو قبول کر سکتا تھا؟ ایک نہیں سینکڑوں، ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کے اندر خود جلوہ گر ہو کر اپنی عیانی صورت دکھائی۔ تب جا کر اپنی ہستی کا اقرار انسان سے لیا، ورنہ مالا یطاق امر کے لیے ہم کیسے مجبور ہو سکتے تھے؟

ہمارے علم دوست حضرات اتنا بھی نہیں سوچتے کہ صفاتِ نبوت سے انکار کی صورت، صفات الٰہیہ کی انکار کی ہے۔ جو سراسر شک ہے، اس سے زیادہ شکوک پیدا کر دیتا ہے اور یقین جسے ایمان کہا جاتا ہے کمزور ہو جاتا ہے۔ معجزات کے جنازے صفاتِ نبوت کے جنازے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ توحید کے ڈھنڈورچی اس جنازۂ توحید پر ماتم نہیں کرتے، بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ شرک کی دوئی اٹھائی جا رہی ہے۔

ذرا مذہب کی امتوں پر نظر دوڑائیے۔ خود مسلم امت پر یہ غور کریں کہ

Marfat.com

عقائد الٰہیہ اس شرک کی دوری پر بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ خود صاحبِ علم دوسرے کے اندر نظر دوڑانے کی تکلیف نہ کریں، بلکہ اپنے دل کو ٹٹولیں کہ ان کے اندر توحید کا سیلاب بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے اور ایک نالی کا سا ہو گیا ہے، جس کی ایک رمق سی رہ گئی ہے۔ پانی چلتا ہے مگر احساس تک نہیں ہوتا کہ چل رہا ہے یا کھڑا ہے۔ لیکن جب کہ پانی ختم ہونے لگتا ہے تو ذرا ذرا چلتا ہے۔ ہم تو کھلے دیکھ رہے ہیں کہ امت کا ایمان اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، دل کے مسلمان نہیں رہے۔ جاہل آدمی، ان پڑھ مسلمان، اگرچہ وہ عمل سے عاری ہو چکا ہے اور خدائے قدوس کے سامنے اسے سرخرو ہونے کا خیال تک بھی نہیں رہا، لیکن پرانی روایات پر اس کا ایمان ہے، نبوت کی شان اس کے دل میں ہے، وہ نبی کو نبی مانتا ہے اور تمام صفاتِ نبوت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے ایمان میں ہے کہ جو صفاتِ نبوت مشہور ہیں، وہ سراسر صحیح ہیں، کسی تنقید کی ان پر ضرورت نہیں، کسی راوی پر جرح و قدح بیکار ہے۔ لیکن ہمارے صاحب عقل، نبوت کے دلدادے، توحید کے متوالے، ہر صفتِ نبوت پر تنقید کی راہ کھولے بازاروں میں پھرتے ہیں اور نبوت کی شان کو ننگا کرنے میں ان کو مزہ آتا ہے۔ اور جو نبوت کی عریانی پسند نہ کرے اسے مشرک کے لفظ سے نوازا جاتا ہے، اور خود توحید کے مالک بن کر دنیائے اسلام کو رسوا کیا جاتا ہے۔

ایسی صورت میں ایک مسلمان نہ چیخے تو کیونکر نہ چیخے اور کیسے خاموش بیٹھے؟ وہ یقیناً غصے میں آجاتا ہے اور توہین رسول کو کفر جانتا ہے اور اسے برملا کافر کہہ دیتا ہے۔

آج نہیں، جب سے ہندوستان میں علم کی زیادہ روشنائی ہے یہ فکر شروع ہے۔ پرانے علماء کے عقائد کچھ اور تھے اور نئے علماء دین نئے عقائدِ توحید لے کر مقابل ہو گئے۔ ایک گروہ علمائے قدیم کو مشرک کہتا ہے، اور دوسرا مد مقابل کو کافر کہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ بے دین دنیا علماء اسلام پر جوتیاں برسا رہی ہے، اور ہم اور ہمارے علماء ان بے دینوں کی جوتیوں سے خبردار نہیں ہوتے۔ بلکہ سر ڈالے اپنے خیال میں برابر مشرک و کافر کہہ کر جھگڑا بڑھا رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ سب کچھ اپنا ہی بگاڑ

Marfat.com

رہے ہیں، بلکہ اپنے دین کا سب کچھ برباد کر رہے ہیں اور بگاڑ رہے ہیں۔ لیکن کب تک یہ جھگڑا رہے گا۔ کسی نے خوب کہا ؎

میری تربت پہ سب روئے، نہ رویا پر وہ سنگیں دل
ہزار افسوس دو آنسو نہ چشمِ یار میں آئے

دنیا بدلی، لیکن ہمارے علمائے کرام نہ بدلے۔ مجھ جیسے اعتدال کے لیے ٹھکانہ نہیں ایں سو ماندہ وازاں سو راندہ یعنی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ ایک ہمیں مشرک کہتا ہے، دوسرا وہابی کہہ کر دل ٹھنڈا کرتا ہے۔ آخر جرم کیا ہے؟ یہی نہیں کہ ہم کسی کو کافر و مشرک نہیں کہتے اور دونوں کے خادم کہلاتے ہیں اور دونوں سے تعلق و رابطہ رکھنا اسلام خیال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم اپنے آپ کو بزعمِ انسان رکانی کہہ دیتے ہیں تاکہ کسی کو ہم پر وار کرنے کی جرأت نہ ہو، جو وہ کہنا چاہتے ہیں ہم خود کہہ دیں تاکہ چھٹی ہو، ہم اور وہ آرام سے وقت گزاریں۔ میرے خیال میں تو انتشار و افتراق اسی وقت ختم ہو سکتا ہے، جبکہ ہر فریق اپنے معتقدات کو اپنے حلقۂ عقیدت میں تو پیش کرے لیکن بر سر منبر یا بر سر بازار مقابلہ کے لیے کسی کو نہ کہے اور ہر فریقِ اسلام کو مسلمان کہے، نہ خود کافر بنے اور نہ کسی کو کافر بنائے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ اپنے باپ کو گالی مت دو۔ عرض کیا گیا کون ایسا ہے جو اپنے باپ کو گالیاں بکتا ہے۔ فرمایا جب تم کسی کے باپ کو گالیاں دو گے تو وہ تمہارے باپ کو گالیاں دیگا۔ نقطے در حقیقت یہ گالیاں تم نے اپنے باپ کو دلائی ہیں۔ یہی حال اب ہو رہا ہے۔ ایک دوسرے کے اسلاف پر تبرّے برسائے جا رہے ہیں اور ان کو برا بھلا کہلایا جا رہا ہے اور یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ چھوڑو، یہ کام تو مصلیوں کا تھا جو سب سے نیچی قوم خیال کی جاتی ہے، اور بازاری شہدے یہ کام کرتے ہیں، کوئی شریف اسے نہیں کر سکتا۔

لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ جو قوم، اور ملت کا جو فرقہ اس برتری کو ہی دین خیال کرتا ہو وہ بھلا کیسے اس دین بازی سے باز آئے گا بلکہ جب اس کے گوش گذار کیا جائے گا، اس کا اثر الٹا ہو گا۔

بہر صورت دیوبندی حضرات خود اپنے آپ کو بلند کردار، پرُ وقار اور پرُ علم خیال کرتے ہیں تو کیا ہی اچھا ہو کہ یہی حضرات سبقت لے جائیں اور عہد کریں کہ ہم شرک بازی سے باز آجائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شرک پر کچھ نہ فرمائیں۔ شرک پر اور شرک کی رسومات پر بے شک وہ اپنے وعظ سناتے رہیں لیکن کسی مسلمان کو مشرک کہنا جائز نہ رکھیں۔ جب یہ ہو جائے گا تو یقیناً آوازِ بازگشت خود بخود ختم ہو جائے گی اور دل ایک ہو نکلیں گے۔ قرآن پاک کے یہ الفاظ کیسے بلند ہیں اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِیْهِ کہ تم دین قائم کرو، اس میں تفرقہ اور رخنہ نہ ڈالو۔

یہ ایک جملۂ معترضہ تھا جو آگیا۔ اب ہم اصلی مطلب پر چلتے ہیں کہ جب تک صفت الٰہیہ کا ظہور عالم کائنات میں نہ ہو، اس وقت تک اس صفت سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کیسے موصوف کر سکتے ہیں؟ کیونکہ جب صفت ہمارے ذہن میں نہیں آئی تو اسے کیسے اس سے جوڑ سکتے ہیں؟

عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اللہ تعالیٰ کو کیسے کہہ سکتے ہیں، جب تک غیب کا ہمیں پتہ نہ ہو؟ اور یہ پتہ اس وقت لگتا ہے جب خود انسان میں یہ صفت پیدا ہو جائے۔ ورنہ غیب غیب نہیں بلکہ عدم محض ہے۔ یہ غیب اس وقت ہمارے ذہن میں آسکتا ہے، جب ہم غیب کو پا سکیں اور دیکھ سکیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان غیب کو دیکھ سکے۔ انسانیت کے مشاہدے میں آنا ضروری ہے۔ ہر فرد کے لیے ضروری نہیں کہ ہر علم اسے حاصل ہو اور نہ ہی فطرت ایسی رکھی گئی۔ نبوت میں یہ شان پیدا ہوئی کہ شہادت کے مقابلہ میں غیب سامنے آگیا۔ اب اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ذات اقدس عالم الغیب والشہادۃ ہے اور نفی کی گنجائش کہنے والے کو نہیں کیونکہ وہ خود شاہد ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمے ختم نہیں ہو پاتے، مگر سمندر کے پانی بطور سیاہی استعمال کرنے سے ختم ہو جائیں گے۔ یہ بڑا اعجوبہ ہے۔ لیکن جس انسان کے دل و دماغ کے افکارِ عالیہ ہر آن اور ہر گھڑی بے مثل و بے مثال پھوٹ

Marfat.com

رہے ہوں کیا وہ اس کی تصدیق نہ کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے صحیح فرمایا۔ جب کہ ایک انسان کے افکار ختم ہونے کو نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ کے احکامات کیسے ختم ہو سکتے ہیں ؟ دنیاو مافیہا جس نے پیدا کی بھلا اس کے کلمے کیسے ختم ہو سکتے ہیں ؟ خواہ لکھتے لکھتے سمندوں کی سیاہی ختم کر دی جاوے۔

یہ دکھانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ شرک فی الصفات کا دعویٰ بہت کچھ کمزور ہے۔ صفات تو اسی کے ہیں، جس کے ہیں۔ لیکن عکس اور پرَ تو جو انسان میں دیکھے جا رہے ہیں، ان کے بغیر خود صفات الہٰیہ پر ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ اور کوئی بھی نہیں کہ انسانی صفت کو خدائی صفات کے مقابل ٹھہرائے تا کہ شرک فی الصفات کہا جائے۔ خود صاحب صفت جانتا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یہ صفات فانی ہیں باقی نہیں۔ باقی اس کی ہیں جو خود باقی ہے۔

بشر اور ذات احد میں یہ کم تمیز ہے کہ یہ فانی اور وہ باقی اور ہمیشہ باقی۔ ہاں اگر کوئی ان صفات کو دیکھ کر تعظیم و تکریم انسانی کرتا ہے تو وہ بھی اس وجہ سے کہ صفات الہٰیہ کا یہ انسان مورد ہو رہا ہے۔ کسی کے ذہن تک میں نہیں آتا کہ ان صفاتِ کاملہ کے جانے کے بعد بھی اس کی تعظیم کی جائے گی، کہ صفاتِ گئے تو تعظیم و تکریم بھی گئی۔ کسی نے اس مضمون کو ایک شعر کے ذریعہ کیسے واضح کیا!

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تیرے عشق نے بنایا میری زندگی فسانہ

یہی حال شرک فی الصفات کا ہے۔ کہنے کو تو کہہ دیا جاتا ہے کہ انسان کی تعظیم شرک فی الذات ہے، اور رسول پر قیاس کرتے ہوئے اولیاء اللہ سے استمداد کو شرک فی الذات کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ بتوں کو اللہ تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔ لیکن یہاں خود اللہ تعالیٰ اولیا کو اپنے ساتھ نسبت دے کر خوش ہوتے ہیں اور ان کو سربلند فرماتے ہیں"۔ ہاں اللہ کے ولیوں کو نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم ان پر وارد ہوتا ہے۔ انہیں اللہ پر کامل بھروسہ ہوتا ہے"۔

Marfat.com

بت بے جان ہیں، ان میں عکس صفاتِ الٰہیہ نہیں ہے، لیکن انسان باجان باشعور، ذات ربی کا مظہر۔ ایسی حالت میں بتوں پر قیاس کرنا کیسی نادانی ہے؟

بت اور، اللہ کے ولی اور، تو کیا بت بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رضا سے سرفراز ہیں؟ لیکن ولی اللہ رات دن اس کی ذات وحدہ لاشریک کے سوا کچھ دیکھتے نہیں۔ ہر لحظہ اس کی یاد میں تازہ دم، اور ہر دم اس کی صفاتِ میں گم۔ نہ اپنا پتہ، نہ کسی کا پتہ ؎

ہر لحظہ تیری یاد ستائے تو کیا کروں
دل سے تیرا خیال نہ جائے تو کیا کروں

وہ خود عزّاِسمہٗ ہی ان کو اپنی سرپرستی میں داخل فرماتے ہیں۔ پھر ولی اللہ میں صفاتِ الٰہیہ تمام خیال کیے جاتے ہیں، لیکن بت جیسے خود پتھر کے وجود ہیں، ایسے ہی ان کے صفاتِ بھی پتھر کے ہی موجود ہیں۔ یعنی کچھ نہیں، نہ حس نہ حرکت ہے، نہ نظر ہے نہ فکر ہے، نہ سننا نہ جاگنا ہے۔ اسی وجہ سے بار بار اللہ پکارتا ہے "کہ ان سے کیا لوگے جو خود کچھ نہیں"۔ خلاف نبوت و رسالت کے۔ وہ ذات حقہ کے نمائندے اور اس کے خلیفہ بر حق، اس کے نائب، گزار، ان کی اطاعت خدا کی اطاعت، ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی، جس نے ان سے سرکشی کی اس نے اللہ سے سرکشی کی"۔ یہ میں نہیں کہہ رہا۔ خود اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے۔ قرآن حکیم شاہد ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۝

معجزات، نبوت نہیں ہیں بلکہ معجزات الٰہیہ شواھد الٰھیہ ہیں۔ خود ذات عزاسمہ ان کی تکمیل فرماتی ہے۔ اگر ان سے انکار کیا جاوے یا ان کو ہلکا کیا جاوے تو خود ذات عزاسمہ کو ہلکا کرنا ہے اور اس کی قدرت کاملہ کا ایک گونہ انکار ہے۔

لیکن الحاد و عقل کا برا ہو۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور علمائے کرام سے اٹھوادیا کہ نبی یا رسول مرنے کے بعد ہم جیسے بے شعور اور بے حس ہو جاتے ہیں، ان کو کسی قسم کا علم نہیں رہتا۔ اس صورت میں خیال کیجئے کہ پھر نبوت کے ساتھ ہمارا کیا تعلق رہ جاتا ہے اور عقیدت کیسے بنتی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے نبی

Marfat.com

کی محبت میں سرمست ہوں اور اس کی تابعداری میں اپنی فلاح خیال کریں۔

''میں تم جیسا آدمی ہوں'' کہلانے کا یہ مطلب لینا کہ وہ ہم جیسا، زندگی اور موت کے بعد ہمارے اوصاف سے متصف ہے، جو کچھ ہم ہیں وہ بھی یہی کچھ ہے، یہ سراسر زندیقی ہے۔ گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔ پھر نبوت ورسالت کے اوصاف کہاں گئے اور اطاعت رسول کی طلب کیسی؟ اپنے جیسے کی اطاعت عقل انسانی سے دور ہے۔ مقصود تو ذات حقہ کا یہ تھا کہ ہمارے رسول خدائی دعویٰ نہیں کر رہے تاکہ اوصاف الٰہیہ کے حق تم ان سے طلب کرو۔ پھر تمام سوالاتِ منکرین کا کتنا بلند جواب ہے کہ بھائیو! میں تم ہی سے ہوں مجھ سے کیوں اتنی چھیڑ چھاڑ کر رکھی ہے؟ مجھے وحی کے ذریعے یہ تمام باتیں بتلائی گئیں اور قرآن حکیم پہنچایا گیا۔ اس میں اعجوبہ ہی کیا کہ تم انکار پر انکار کئے جاتے ہو اور بے معنی اور بے مقصد سوالات کرتے ہو۔

ایک بڑے افسر کا کہنا کہ بھائیو! میں تم جیسا آدمی ہوں یا کسی بادشاہ یا صدر مملکت کا کہنا کہ میں تمہارا بھائی ہوں کہ میں تمہارے جیسا آدمی ہوں کتنا بلند اثر سننے والوں پر پڑتا ہے اور پھر اس کے کلام کو کتنی محبت اور کتنے غور سے سنتے ہیں۔ جو عجز وانکساری کی بات کرتا ہے، اسی درجہ پر دلوں میں بات قبولیت پیدا کرتی اور اثر انداز ہوتی ہے۔

لیکن ہمارے یار لوگوں نے الٹا نتیجہ پیدا کیا کہ وہ ہم جیسے تھے، جن میں نہ دین ہے، نہ شعور ہے۔ بھلا کافروں میں کیا دین تھا، کیا شعور تھا؟ کیا آنحضرت ﷺ کے بارے میں اسی مثل سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں؟

مرنے کے بعد اگر یہ نتیجہ ہے تو قبر کی زیارت سے کیا فائدہ؟ اور حاضری اور درود پڑھنے کا کیا مطلب؟ اگر انہیں تسلیم نہ کیا جائے تو پھر فرمایئے احکام الٰہی کیسے؟ اور خدائے قدوس کیسے سامنے آگیا؟ بے ادبی ضرور ہے لیکن خدائے قدوس کی ہستی نبی کی ہستی کے ساتھ وابستہ ہے۔ نبی کی ذاتِ حقہ خدائے قدوس کی ذات حقہ کا آئینہ ہے، جس کے اندر ذات حقہ کے پرتو ہم دیکھ رہے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں۔

آئینہ اٹھالیا جائے تو اپنی صورت آپ کون دیکھ سکتا ہے۔ یہی ذاتِ رسالتؐ

Marfat.com

تھی جس نے خدائی جلوے ہماری آنکھوں کے سامنے کر دیئے ورنہ وہ ذات حقہ لاشریک کروڑوں پردوں میں جلوہ فگن تھی۔ کسی کو پتہ تک نہ تھا۔ ہم آئے، ہمارے نبی آئے؟ نبیوں کے ذریعہ اپنی جلوہ نمائی سے ہمارے دل و دماغ میں جلوہ نمائی شروع ہوئی اور ہم سربسجود ہوئے۔

آخر میں اتنا عرض ہے کہ مضمون چند صفحے لکھنے کا ارادہ تھا تاکہ عام فہم ہو کر عوام میں پہنچایا جاتا، لیکن ناگزیر مطالب کے لیے وسیع و عریض ہو گیا۔ پھر بھی اجمالی ہے۔ صرف اشارات اور نشانات دکھائے گئے ہیں۔ اہلِ حق کے لیے کافی مواد ہے اور منکرین کے لیے یہ کچھ بھی نہیں۔ چند الفاظ ہیں اور بس۔

تاہم اتنا عرض کروں گا کہ توہین رسول سے توہین خدا ہوتی ہے۔ اور توہین خدا سے مذہب کا خاتمہ جاتا ہے۔ اگر دین و مذہب کا خاتمہ منظور ہے تو دہریوں کی طرح کھلے طور پر آجایئے اور ایک غیر مسلم کی طرح کلہاڑے چلایئے، ان سے ہمیں درد ہو گا۔ لیکن مسلمان ہو کر اگر کوئی ایسے وار کرتا ہے تو پھر ہمارے دلوں میں ناسور پیدا نہ ہوں تو کیونکر؟ وآخر دعوانا انِ الحمدُ لِلّٰہ ربّ العَالِمیْن۔

## استدراک

کسی کمی کو پورا کرنے کا نام استدراک ہے۔ مضمون بالا میں کئی کمیاں رہ گئی تھیں کیونکہ پیرانہ سالی کی وجہ سے خیالات مربوط نہیں رہتے اور نسیان کی وجہ سے کوئی نہ کوئی خیال درمیان سے بھول جاتا ہے۔

دیکھنا دکھانا یہ بھی ضروری ہے کہ معجزات صرف منکرینِ خدائیت کے لیے نہیں ہوتے بلکہ قائلینِ خدائیت کیلئے اس سے بڑھ کر ایمان پرور ہوتے ہیں۔ ایک مومن کے لئے اس نبوت تک پہونچنے کے لیے یہ ہی معجزات کام آتے ہیں اور ان کے ذریعہ ایمان روزافزوں ترقی کرتا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم رسول تھے بلکہ امام الرسل۔ بہت کچھ مظاہر قدرت دیکھ چکے تھے اور کامل ایمان (مشاہدہ) پر پہنچے ہوئے تھے لیکن مردہ کو

زندہ کرنے کی قدرت میں حیران تھے کہ کیسے خدا تعالیٰ مرنے کے بعد زندہ فرمائے گا۔ بارگاہ رب العزت میں برملا عرض کر دیا کہ مجھے آپ دکھائیں کیسے مردہ زندہ ہوتے ہیں۔بارگاہ رب العزت سے جواب آیا، کیا اس پر ایمان نہیں لائے؟ عرض کیا ایمان تو لایا ہوں لیکن دل میں اطمینان ابھی پیدا نہیں ہوا۔اس پر فرمایا گیا،۔چار پرندے پکڑو اور اپنے ساتھ ہلاؤ (انہیں مانوس کرو) یعنی تمہارے بلانے پر آجائیں۔ پھر ان کا کچھ کچھ حصہ الگ الگ پہاڑیوں پر رکھ دیں اور اپنے مکان سے ان کو بلائیں۔ وہ بھاگتے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور وہ بھاگے بھاگے حضرت کے پاس چلے آئے اور حضرت مطمئن ہو گئے اور پہلے سے ایمان کامل تر ہو گیا۔اب آپ نے مرنے کے بعد زندگی اور زندہ کرنے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

حضرت موسیٰ کو مردہ زندہ کرد کھانے کے لیے گائے ذبح کرائی اور اس کی دم سے مردہ کو زندہ کر کے اس کے قاتل کا پتہ لیا۔ عیسیٰ آئے تو ایک نہیں کئی مُردوں کو ان کی پھونک نے زندہ کر دیا۔

اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج ایک مردہ دنیا کو آسمانوں پر چلتے پھرتے دکھایا جو عقل میں نہ آسکتا تھا۔

جھکڑ، سیلاب، آندھیاں آتی رہتی ہیں، تاکہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ تاہم نوح، ہودؑ، شعیبؑ سے پہلے وعدہ کر لیا گیا کہ تمہارے جھٹلانے کی وجہ سے ہم ان پر عذاب ڈالیں گے اور وہ عذاب اپنے وقت مقررہ پر آپہونچے گا اور ایک دنیا تباہ و برباد ہو گی۔ تو کیوں کر انبیاء علیہم السلام کا ایمان، مشاہدہ نہ خیال کیا جاوے اور کیونکر ان عذابات کو معجزاتِ انبیاء قرار نہ دیا جاوے بلکہ یہ معاملہ حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا مشاہدہ ہو گا؟

غرض اگر مطالعہ کیا جاوے تو معجزات ہر آن اور ہر حال دنیا پر برس رہے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو دکھانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مقصود صرف ظہوراتِ الٰہیہ ہیں۔

نبوت کے بعد ولایت مسند ارشاد پر آئی تو ولایت نے وہی کچھ کر دکھایا جو

Marfat.com

نبوت نے اپنے اوقات میں دکھایا تھا اور ہر حاضر نے وہ کچھ دیکھا کہ جسے نشاناتِ الٰہیہ کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ سلسلہ برابر آج تک چلا آرہا ہے اور اسی سلسلہ سے خدائیت قائم ہو رہی ہے۔ ورنہ علم پر مدار ہوتا تو دنیا علمی استدال کو ایک مدت سے مٹی کے ڈھیر تلے دفن کیئے ہوئی تھی۔

میرے قبلہ مرشد حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ مجھ ایک نے نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں نے دیکھا۔ ہر ایک دیکھنے والے اور زیارت کرنے والے نے دیکھا کہ عین نبوت کا نمونہ ہے اور ہر حاضر وہ کچھ دیکھ جاتا جس سے کہ نبوت کی یاد تازہ ہو جاتی۔

صرف ادب و آداب نہ تھے، صرف اتباع رسالت نہ تھا، اور نہ جذبات عالیہ سے صرف معمور تھے، بلکہ معجزاتِ الٰہیہ یا کرامتِ الٰہیہ کے فوارے چلتے تھے۔ ہر آدمی اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھتا تھا جو اسے دیکھنے کی آرزو ہوتی تھی اور ہر سیاہ سے سیاہ دل بھی حاضری پر ایک آفتاب ہو کر چمکتا تھا۔ گذشتہ قرنوں کو چھوڑیئے۔ راوی کے ضعیف اور قوی ہونے کے جھگڑے اٹھ جاتے ہیں۔ جب ہم خود مشاہدہ کرتے ہیں تو کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ ہمارے اہل علم جو چاہیں لکھیں، جو دلائل دیں۔ دیں لیکن خدائیت کا وجود دلائل پر نہیں بلکہ معجزات اور کرامات پر ہے۔ جو ظاہری دنیا میں صفاتِ الٰہیہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ باپردہ کو بے پردہ کرتے رہتے ہیں۔ گویا پردہ ہونے کے باوجود بے پردہ ہو رہا ہے۔

حضرت ابراہیم نبی تھے۔ قدرت اور دستِ قدرت الٰہیہ کے قائل تھے بلکہ دل و جان سے تسلیم کرتے تھے، لیکن یہ قدرت کا مشاہدہ طلب کرنے لگے۔ اور ذات الٰہیہ نے وہ سب کچھ دکھادیا جو وہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔

اور کئی اور معجزات قرآنِ حکیم کی محکم آیات میں قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن ذرا موجودہ زمانے کے کسی علامہ کی تفسیر اٹھا کر معجزات الٰہیہ کی تفسیر دیکھی جائے تو کیا نظر آئے گا؟ تاویلات در تاویلات۔ بے جوڑ، بے دلیل، عقل کے مطابق، معجزہ کو ڈھالتے جا رہے ہیں، سر ملتا ہے نہ انجام دکھائی دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عقیدہ میں ہے کہ جو عقل میں نہیں آسکتا وہ ہو نہیں سکتا۔

Marfat.com

بھلا جو عقل انسانی میں آ جائے اور جس پر غور کیا جا سکے تو پھر وہ معجزہ کیسے؟ معجزہ تو وہی ہے کہ عقل سے ماورا قدرت کا ظہور ہو۔ میں نے اکثر تفاسیر موجودہ کا مطالعہ کیا۔ یہ عقدہ کشائی نظر آئی کہ تاویلات سے یا ہر معجزہ کو معجزہ سے باہر کر دکھایا۔ میں خود بھی ایک زمانہ تک اسی خیال پر تھا اور توحید ناقص چھوڑیئے، صرف زبانی توحید ایسے خیالات پر قائم تھا۔ لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ عقل کہتی ہے کہ جو عقل میں آئے وہ معجزہ اور قدرت خدا کیسے؟ اور نشان الٰہی کیسے؟ جس شخص کا ایمان ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے عقل سے نوازا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ظہور عالم خود ایک ایسا معجزہ ہے جو عقل میں نہیں آ سکتا۔

آپ زمین دیکھتے ہیں۔ یہ کیسے بنی اور کب بنی؟ پھر کائنات، جمادات چھوڑیئے، نباتات اور حیوانات حتیٰ کہ انسان اس سے پیدا ہوئے۔ وہ بے جان۔ لیکن درجہ بدرجہ اس کی اولاد باہوش، باشعور اور بااحساس ہے۔ پھر ایک ایک نوع کا مطالعہ فرمایئے۔ ہر نوع اپنی صورت و سیرت اور عقل و رشد میں الگ الگ ہے۔ ویسے تو ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ انسان سے انسان پیدا ہوتا ہے، گائے سے گائے اور اونٹ سے اونٹ، گندم سے گندم، کیا یہ اچنبھا نہیں کہ اس بے حس مٹی سے اشرف المخلوقات جیسی ہستی پیدا ہو جو تمام کائنات کی تسخیر کے لیے بنایا گیا ہو۔

کسی زمانے میں یہ خیال کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا، اچنبھا دکھائی دیتا تھا، اور بڑے دُور کے تصورات پیدا کیے جاتے تھے۔ قرآن حکیم میں بار بار پڑھتے تھے کہ سخت سڑی مٹی سخت سے ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر فرشتوں کے تصور اور بہشت کے تصور میں الجھ کر عقل دنگ رہ جاتی۔ تاہم خدائے قدوس کی قدرت کاملہ پر کامل بھروسہ تھا۔ اب عقل نے یہ گتھی سلجھا دی اور ہر عقلمند آدمی کے سامنے آ گیا کہ انسان مٹی سے پیدا ہوئے۔

لیکن ابھی تک یہ راز سامنے نہیں آیا کہ کیسے مختلف موجودات اسی سے پیدا ہوئے۔ ہر نوع ہر جنس اور ہر شخصیت الگ دکھائی دیتی ہے لیکن سادہ عقل تو اب بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ غلہ یا جانور خود بخود بلا تخم زمین سے پیدا ہوئے۔ وہ تو تخم ہی اصل

Marfat.com

قرار دیتے ہیں لیکن جب آنکھ ذرا اور کھولی جائے اور تخم کے سوال کا مطالعہ کیا جائے تو پھر یہ تخم کہاں سے آیا؟ پرانا عقیدہ تو یہ ہے یہ سب کچھ بہشت سے لایا گیا۔

اس وقت خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ جیسے بہشت میں خدائے قدوس نے اپنی قدرتِ واسعہ سے سب کچھ پیدا فرمادیا۔ کیا یہ اچنبھا نہیں اور معجزہ نہیں؟ ہے اور ضرور ہے۔ لیکن ایک عادی چیز پر توجہ نہیں ہوتی اور عام فطرت کے مطابق خیال کیا جاتا ہے۔

کل ہی میرے خیال میں آیا کہ پرندے کیسے پیدا ہوئے۔ مویشی تو زمین سے پیدا ہوئے۔ لیکن معاً خیال آگیا کہ زمینِ بحر سے انڈے پیدا ہوئے اور پھر انڈوں سے پرندے نکلے۔

غرض آفتاب و مہتاب، زمین و آسمان اور ستارے کیا کیا گنا جائے، یہ سب مظاہر قدرت ہیں اور تمام معجزاتِ الٰہیہ اور ظہوراتِ الٰہیہ ہیں۔ لیکن یہ فطری اور عادی اشیاء معلوم ہونے کی وجہ سے ہماری فکر سے نکل چکے ہیں اور جو چیز ہماری نظر اور وسعت میں نہیں آتی، اس کے ہونے سے اسے معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور حقیقتاً ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ جس سے عقل ماندہ تھی وہ مشاہدہ میں آجاوے۔ جس شخص کا ایمانِ توحیدی آج بھی کامل ہو جائے اور کن فیکون پر عقیدہ راسخ ہو جائے، وہ آج بھی اسی کن فیکون کو، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو حِسّاً دیکھ سکتا ہے اور دکھا سکتا ہے۔ لیکن جس کا ایمان کمزور ہے اور شک میں ہے، وہ خود شکی ہوتا ہے اس لیے اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِی مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ ظن حق کے مقابلے میں نیم مسلمان رہتا ہے اور قدرت الٰہیہ۔ کے خاموشی سے انکار پر ہی رہتا ہے۔ انسان ایسا مجہول مطلق نہیں کہ بن دیکھے، بن سمجھے کسی چیز کا اقرار کرے اور اسے تسلیم کرے۔

انسان کا اقرارِ خدائیت بھی بن دیکھے، بن سمجھے کیسے ہو سکتا ہے؟ پہلے اس کی فطرت سمجھتی یا دیکھتی ہے پھر تسلیم کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی صورت خدائے قدوس کے تسلیم کرنے کے بارے میں ہے۔ یہ جو عام ذہن فلاسفہ کے ہیں کہ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ ہے، لیکن نہ معلوم کیا ہے؟ اور دوسرے یہ کہتے ہیں کہ وہ بے شعور مادہ ہے یا

Marfat.com

جو ہر ہے لیکن جب وہ نظر کرتے ہیں کہ اس کی تخلیق (یعنی مخلوق) کے اندر ہر وہ چیز موجود ہے، جو اس کے لیے ہم تسلیم نہیں کرتے یعنی شعور اور دیکھ بھال، سننا دیکھنا وغیرہ وغیرہ امور مثلاً قدرت، وسعت تولا محالہ حیرانی پیدا ہو جاتی ہے اور فلاسفر کی عقل گم ہو جاتی ہے۔ لیکن مذہب کی بنیادِ حقیقت پر ہے اور دیکھنے سمجھنے پر ہے۔ جب تک وہ خدائی جلوے نہیں دیکھتا، تسلیم نہیں کرتا۔ جب اس کے جلوے اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اس ذاتِ حقہ کو تسلیم کرے اس وقت وہ تسلیم پر آتا ہے۔

پھر صرف جلوے نہیں ہوتے کہ صرف اس کا جلوہ ہو اور کچھ نہ ہو بلکہ وہ اس سے باتیں کرتا ہے مشاہدات غیبی دکھاتا ہے، قول و اقرار کرتا ہے، نصرت فرماتا ہے۔ غرض اپنا اور اپنی ہستی کے رازہائے خفیہ سے مطلع کرتا ہے اور ساتھ ہی اس منظور نظر کے اندرونی خیالات کا اظہار اس کے سامنے کرتا ہے اور اس کے محاسن اور عیوب کو پیش کرتا ہے اور مطلع کرتا ہے تاآنکہ انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ تمام صفاتِ کلیہ کا مالک اسے گردانتا ہے اور اس کے سامنے سجدۂ تسلیم و رضا ادا کرنے میں اپنا فخر خیال کرتا ہے اور توقیر و عزت اور شرفیابی خیال کرتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ خدائیت کی تسلیم کی بنیاد کوئی کمزور بنیاد نہیں بلکہ اتنی مستحکم، کہ جان جائے گی، لیکن یہ تسلیم قائم رہے گی۔ آپ نہیں دیکھتے کہ جو توحید کے قائل ہوئے، جنہوں نے اسے سجدہ کیا پھر وہ عمر بھر اسی کے ہو رہے۔ دنیا تمام مخالف ہو گئی، لیکن انہوں نے دنیا کی پروانہ کی، بلکہ الٹا دنیا کو تنبیہ کرتے رہے۔ غافلو! سوچو خدا سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ برائیوں سے بچو! ورنہ وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ جن لوگوں نے ان کی بات مانی وہ فلاحِ دارین پا گئے اور جن لوگوں نے ان کی بات نہ مانی وہ حسب وعدہ عین وقت پر تباہ و برباد ہو گئے اور دنیا کے لیے سامان و نشانِ عبرت چھوڑ گئے۔

ایسی صورت میں کوئی جاہل بھی یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ خدائے حکیم و قدیر بے شعور و بے حس ہے۔ معاذاللہ، ثم معاذاللہ! دنیا جتنی آگے بڑھ رہی ہے، اتنی وہ پیچھے گر رہی ہے۔ زمانۂ قدیم میں خواہ تصور الٰہ کیسے بھی تھا، لیکن تھا۔ لیکن اب جتنا علم

بڑھ رہا ہے اتنا ہی یہ تصور ختم ہو رہا ہے۔ اگر مذہب میں کچھ تصور اللہ موجود ہے، تو وہ رسماً ہے حقیقتاً نہیں۔

کیوں؟ اس لیے کہ عقل کی آنکھیں دنیا میں مصروف ہیں اور اپنے اندر، اپنی ذات کے اندر دیکھنے سے اور دل کی طرف کبھی دھیان نہیں کیا کہ وہ کہاں ہے؟

آج تک یہی کہتے آئے ہیں کہ انسان کے دل کے اندر وہ مقام رکھا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز خدا کو سمو نہیں سکتی، یعنی زمین و آسمان میں وہ سما نہیں سکتا، لیکن ایک مومن کا دل اسے سمو سکتا ہے۔ اب بھی جو اپنے دل کے آئینہ میں دیکھنے کا عادی ہے وہ خود دیکھے گا اور ضرور دیکھے گا۔

## تواتر

پے در پے کسی دید (مشاہدہ) کے سننے کا نام "تواتر" ہے۔ یعنی ایک واقعہ کی شہرت جب متواتر زبان زدِ عوام و خواص ہوتی ہے اور متواتر راویوں کے ذریعہ اس کی شہرت عامہ ہو جاتی ہے تو اسے تواتر کہا جاتا ہے۔ یقین کے درجے ہیں۔ پہلا درجہ دید کا ہے، دوسرا درجہ شنید کا۔ لیکن شنید وہی درجۂ یقین پر پہونچتی ہے جو درجۂ تواتر پر پہونچ جائے۔ ایسی صورت میں وقوع امر کا شک تو ہرگز نہیں رہتا۔ البتہ کماً کیفاً فرق روایات ہونے سے کم و کیف میں یقین کامل نہیں ہو سکتا۔

مثلاً ہم لندن کے شہر کے بارے میں تواتر سے سنتے ہیں تو اس کے وجود کا ہمیں یقین ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کیا ہے اور کتنا ہے۔ اس کی بابت اختلاف ضرور ہو گا۔ اس لیے کیسے اور کتنے پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

یقین کا پہلا درجہ مشاہدہ یعنی اپنی آنکھوں سے وقوع پر کو دیکھنا یہ کم آدمیوں تک محدود ہوتا ہے۔ وہی چند آدمی یہ یقین حاصل کر سکتے ہیں جو وقوع امر یا حادثہ کے وقت تھے۔ لیکن دوسرا درجہ شنید کا ہے۔ یہ اس سے کئی گنا نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں درجہ وسیع تر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ پہلے درجہ کا تیقن نہیں تاہم اسی کے برابر دوسرے درجے کا یہ یقین بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ وقوع امر پر عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے۔ کسی وقت

کسی امرِ متواتر پر کسی کے ذہن میں شک پیدا نہیں ہوتا۔ لاہور ہمارے ملک کا دار الخلافہ ہے۔ میرے خیال میں ہماری دیہی آبادی کے ایک فی لاکھ کو بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا ہو گا۔ لیکن دونوں شہروں کے وجود کا یقین ہر انسان کو کامل ہے۔ رہے اوصاف یعنی کیسے ہے، اور کتنا ہے، اس کے متعلق کوئی خاص یقین نہیں پایا جا سکتا۔ یہی حال خدائے قدوس کی وحدانیت کا ہے۔ اگرچہ کروڑوں انسانوں نے حضرت رب العزت کی جلوہ آرائی کے جلوے دیکھے اور اس کے جمال جہاں آرا کو مشاہدہ کی صورت میں پایا، لیکن وہ انسانی ہستی کا کروڑواں حصہ ہوں تو ہو۔ تاہم اس مشاہدۂ جمال و جلال کا تواتر اتنا ہو گیا ہے کہ کوئی احمق انسان یا بڑا افلاسفر انسان ہی اس خدائے قدوس کا منکر ہو تو ہو ورنہ عام انسانیت تمام کی تمام تسلیمِ توحید پر مجبور ہے اور اس کے سامنے سجدہ کرنے کو فخر اور عزت خیال کرتی ہے۔

یہی حال معجزات الٰہیہ کا ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی، انبیاء آئے، رسول آئے، ولی پیدا ہوئے۔ اپنے اپنے وقت میں ان سے معجزات اور کرامات ظاہر ہوئے، جو درجہ تواتر سے بھی بڑھ کر ہم تک پھونچے اور اپنے وقت پر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور آنے والی نسلوں کو بتایا۔ اور آج تک دنیا ان کے تسلیم کرنے سے کبھی متردد نہ ہوئی۔

لیکن اب جبکہ روشنی عقل تیز ہو چکی ہے اور مادیت کا زور ہو رہا ہے اور خواہشاتِ نفسی پر ایمان وایقان قربان کیا جا رہا ہے تو توحید اور توحیدی معجزات پر مختلف طریقوں سے انکار کیا جاتا ہے اور عقلی ڈھکوسلوں کو آڑے لایا جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

تواتر سے بڑھ کر جس معجزہ پر قرآن حکیم کی محکم آیات اپنا فیصلہ دیں۔ بھلا ایک مسلمان کو اس سے انکار کی کیا گنجائش؟ لیکن یہاں قرآنی بیان کے بعد بھی تاویلات کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے اور ایسی رقیق تاویلات پیش کی جاتی ہیں کہ عقل بھی ان تاویلات کو تسلیم نہیں کرتی۔

Marfat.com

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ کہ آپ نے مردہ کی زندگی دیکھنے کی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا چار پرند پکڑ کر ان کے اجزاء کو تقسیم کر کے الگ الگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دو۔ پھر ان جانوروں کو بلاؤ تو بھاگتے آویں گے۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور پرندے اپنے اپنے سروں کے ساتھ قدرتِ خدا سے مکمل ہو کر جڑتے گئے۔ واقعی یہ تو خدائے قدوس کی قدرت کاملہ کا معجزہ تھا۔

لیکن علمی حضرات کو عقل سے بعید معلوم ہوا۔ انہوں نے فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ (کہ ان کو اپنی طرف پھیر دو) سے یہ مطلب لیا کہ ذبح وغیرہ نہیں کیے گئے۔ بلکہ ان کو اپنی آواز پر بلانے کا مفہوم لیا۔ پھر ایک ایک پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ دیا۔ اور پھر بلایا تو وہ بھاگ کر واپس آ گئے۔ سوچئے، اس صورت میں حضرت ابراہیم کا سوال کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (تم کیسے زندہ کرتے ہو) کیسے حل ہو گا؟ بلکہ اس صورت میں حضرت ابراہیم اور پریشان ہوئے ہوں گے کہ طلب تو کچھ کیا اور دیکھا کچھ اور، جو عام طریقہ جانور کا ہے کہ پالتو پرندے بلانے پر آجاتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاوے تو عقل کے لیے اس سے پہلے بھی ایسے الفاظ واشگاف موجود ہیں جن سے کوئی عقلمند سے عقلمند بھی کوئی دوسری تاویل پیدا نہیں کر سکتا۔

ایک آدمی ایک ویران گاؤں پر سے گذرا تو اس نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ کیا اس مرنے کے بعد یہ زندہ ہو گا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہیں ایک سو سال کے لیے ڈھیر کر دیا (مار دیا)۔ پھر اسے زندہ فرما دیا۔ اور پوچھا، یہاں کتنے (عرصہ) مرے رہے۔ عرض کیا کہ ایک دن، یا دن کا کچھ حصہ۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں تم تو ایک سو سال مرے رہے اور ذرا اپنا طعام اور پانی تو دیکھو کہ وہ ابھی بد مزہ نہیں ہوا۔ پھر اپنے گدھے کو دیکھو۔ یعنی تمہیں عام آدمیوں کے لیے ایک نشانِ قدرت بنایا ہے۔ ذرا گدھے کی ہڈیوں پر نظر ڈالو کیسے ہم اس پر گوشت پوست چڑھا رہے ہیں (قرآن حکیم)

چونکہ اس آدمی کو اپنے مرنے اور زندہ ہونے کا پورا حال معلوم نہ ہو سکا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گدھے کی ہڈیوں پر گوشت پوست پیدا فرمانا شروع کر دیا، تاکہ اس کو قدرتِ احیا پر کامل ایمان ہو۔ مقصد تو یہ ہے

Marfat.com

کہ جب ہم یہ آیت پہلے پڑھتے ہیں، جس میں موت کے بعد زندگی کی پیدائش خود دیکھی دکھائی گئی، تو حضرت ابراہیمؑ کے معجزات کی تاویل کی سر دردی سے کیا فائدہ ؟ لیکن نہ معلوم علمی آدمیوں کے ایمان میں اتنی کمزوری کیوں آگئی ؟ جب ہر موحد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان رکھتا ہے کہ وہ کُن کے امر سے تمام دنیا کو پیدا فرمانے والا ہے تو پھر معجزات کے ظہور پر کیوں اندھی عقل پر ایمان رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی تاویل بلکہ خاموشی سے انکار پر آجاتے ہیں ؟

اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو ناممکنات ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے امر پر ممکن ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کے اجزا باہم ریختہ ہر چوٹی پہاڑ پر رکھے گئے اور قدرت خدا سے وہ الگ الگ اجزا اپنے اپنے اجزا سے ملتے ہوئے پورے پرندے بن گئے اور اس آواز پر آپہونچے جس کے سننے سے وہ آیا کرتے تھے۔

جب فطرت اللہ سب کچھ پیدا کر سکتی ہے تو یہ ایک عام جزو کائنات کی پیدائش سے ایک عقلمند کیسے حیران ہو سکتا ہے ؟

جوڑں کے لگانے کے کیسے کیسے تجربات ہم دیکھ رہے ہیں۔ لہذا قدرتی جوڑوں کے اعجوبہ کے پیدا ہونے سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے ؟

(اکتوبر ۱۹۶۴)

# توحید اور احکام توحید

سب سے بڑا مغالطہ اہل علم میں یہ پیدا ہو گیا ہے، کہ توحید اور اس کے احکام کو ایک خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ توحید مطلق ایک ذات کا وجدان ہے، اور احکام توحید اس ذاتِ مطلق کے وجدان اور مشاہدہ کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ احکام توحید میں جب تک ذات کو تسلیم نہ کیا جائے، احکامِ ذات کا خیال بھی ناممکن ہوتا ہے۔

پہلے سلطنت قائم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس سلطنت اور بادشاہت کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اگر خود سلطنت کا قیام ہی تزلزل میں ہو تو احکام کی تعمیل میں زیادہ تزلزل ہوتا ہے۔ بعض وقت فرامین جاری ہی نہیں ہو سکتے۔ میں نے اپنی کسی تحریر میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اَرْسَلَہ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کو دو عنایات فرمائی ہیں۔ ایک اَلْھُدٰی دوسرا دینُ الحقّ۔ الہدی سے وہ ہدایت مراد ہے، جس سے ایک انسان توحید کی روشنی سے منور ہو کر توحید کو وجداناً اور روحاً تسلیم کرتا ہے، اور عقل بھی ساتھ رہتی ہے۔ یہ وہ روشنی ہے، جس سے ایک انسان مسلمان بنتا ہے، اور کامل مسلمان بننے کے بعد دین الحق کے قواعد اور قانون اس پر لاگو ہوتے ہیں، اور ان احکام اور قوانین کو وجان تسلیم کرتا ہے،

Marfat.com

اوران کی تعمیلِ میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو سامنے رکھتا ہے، اور دل و جان سے وہ تعمیل ارشاد کرتا ہے۔

فقرا بنیادی طور پر اس الہدیٰ کو مقصدِ دین خیال کرتے ہیں۔ اور علما بنیادی طور پر احکام توحید کو بنیادِ دین خیال کرتے ہیں، اور کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ اصل توحید کا جذبہ مکمل ہونا کتنا ضروری تعمیل احکام کے لئے ہے۔ اور ایسے ہی فقرا توحیدی جذبہ کو بنیاد خیال کرتے ہوئے تمام زور اور کوشش سے اسی جذبہ پاک کے مکمل کرنے کو اپنا ایمان خیال کرتے ہیں، اور تعمیل احکام کو دوسرا درجہ دیتے ہوئے وہ خیال کرتے ہیں کہ اعمال واشغال توحید حقیقی پیدا ہونے کے بعد خود بخود ظہور پکڑ جائیں گے۔ بات ہے بھی صحیح۔ لیکن جذبۂ توحید ایک گونہ نہیں، بلکہ کامل واکمل جذبہ اور ناقص وناتمام جذبہ میں بڑا فرق ہے۔ اور اسی فرق کا اعتنانہ کرنے کی وجہ سے فقر کے پیرو بے عملی کا شکار ہو رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ کچھ پالیا، جس کے پانے کے لئے یہ سر دھڑ کی بازی لگائی گئی تھی۔ لیکن حقیقتاً ایسے نہیں تھا بلکہ ناقص توحید کے ثمرات بھی ناقص ہوتے ہیں۔ اور ناقص ثمرات بے عملی کی طرف راہ پیدا کر دیتے ہیں۔

وضاحت احکامی

وَاعۡبُدُ واللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوابِهٖ شَيۡـًٔا و بالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔

لَاتَسۡجُدُ و الِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُ واِللهِ الَّذِىۡ خَلَقَهُنَّ

نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو۔

شرک نہ کرنا، صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، سورج چاند کو سجدہ کرنا اور اللہ ہی کو سجدہ کرنا، یہ احکام ہیں، خود توحید یعنی ذات عز اسمہ کا کوئی تصور موجود نہیں۔ بخلاف توحید کے۔

Marfat.com

## توحید کی وضاحت

کہ وہ صرف ذات کا نام ہے اور بس۔ یہ تصورِ ذات آسان بات نہیں۔ جو چیز عیاں ہی نہیں، بلکہ اس کے صفات موجود ہیں، تو جب تک صفات کاملہ اس کی ذات کے ساتھ وابستہ نظر نہ آئیں، کیسے تصورِ ذات پیدا ہو سکتا ہے ؟

صفات تو ہر وقت مشاہدہ اور حس میں موجود ہیں۔ لیکن صفات جب تک اپنے محرک، اپنے منبع اور اپنی ذات سے نکلتی کسی کو نظر نہ آئیں، وہ کیسے ذات کا تصور پیدا کر سکتا ہے۔ تقلیداً تسلیم کرنا اور بات ہے، اور مشاہدۃً اور عقلاً، روحاً اور حساً دیکھنا اور بات ہے۔

پھر یہ دیکھنا دو قسم کا ہے۔ ایک صفات سے موصوف کی طرف جانا۔ یعنی صفات پہلے نظر آتی ہیں، اور صفات کے ذریعہ ذات کا جمال نصیب ہوتا ہے۔ اور ایک یہ کہ ذاتِ مقدسہ پہلے نظر آتی ہے، اور بعد میں صفات اس کے ساتھ وابستہ نظر آتی ہیں۔ اور بعض وقت صرف ذات تصور میں ہے، لیکن صفات کا خیال تک نہیں۔ انہیں کے بارے سعدیؒ فرماتے ہیں

کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد!

لیکن یاد رہے کہ۔ کوئی ذات، صفات کے سوا نہیں۔ بلکہ صفات ہی ذات کی شناسائی کا لباس ہوا کرتی ہیں۔ جیسے جسم روح کی شناسائی کا لباس ہے۔ اگر جسم نہ ہو، تو روح کی شناخت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، لیکن عوام کے لئے۔ ہاں خواص عقل و روح کے انسان، ذات کو صفات کے سوا دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اکمل شناخت اسی صورت میں نمایاں ہوتی ہے، جب ذات و صفات اکٹھے دکھائی دیں اور یہ ہی درجہ نبوت کا ہے۔

ولی اللہ جن پر نسبتِ مجذوبیت غالب ہوتی ہے، وہ بلا صفات ذات کے جمال میں غرق ہوتے ہیں، یا جلال میں۔ اور معذور ہوتے ہیں احکام شریعت سے، کیونکہ شریعت نام ہے احکام ذات کا اور یہ احکام صفاتِ ذات میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ صفات ان پر لاگو نہیں ہوتے۔ جو اِن صفات میں داخل نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت ذات حقہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں، وہ نہ دین کے ہوتے ہیں نہ دنیا کے۔ یعنی صفاتی دنیا

Marfat.com

سے الگ اپنا منصب رکھتے ہیں۔

"عاشقاں راندہب وملت خدا ست" والا معاملہ ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کتنا مغالطہ ہے کہ احکام ذاتِ خداوندی کو خود ذات عزاسمۂ کہا جائے۔ نبوت کے وارث دونوں گروہ ہیں۔ پہلا گروہ ہے جو ذات کو مقدم خیال کرتا ہے اور ذات سے صفات کی طرف آتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو صفات (شریعت) کو مقدم خیال کرتا ہے۔ بلکہ صفات میں خود گم ہونے کی وجہ سے صفات کو ہی مطمح نظر رکھتے ہوئے صفات پر ذات کا اطلاق کر دیتا ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ گروہ اول کا تقدم ذاتی ہے، گروہ ثانی کا تاخر ذاتی ہے۔ اس لئے ہر فریق اپنے درجہ کے مطابق اپنے منصب پر بیٹھا ہوا جب نظر آئے، تو یہ ہے اسلام اور عین اسلام۔

صفات سے ذات کی طرف جایا کرتے ہیں۔ پہلے صفات نظر آتی ہیں۔ پھر صفات سے ذات کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں یہ جوڑ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ لیکن اب یہ جوڑ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ صفات کا منبع، ذات کا تصور عام طور پر اوجھل ہے۔ پہلے تقلیداً اصل سے نقل کے طور پر تھا۔ لیکن اب اصل بھی کمزور ہے۔ یعنی بہت کم افراد ہیں جو اس دولتِ شناسائی سے مشرف ہوں، کہ ان کی صفات کی مظہر ذات پر نظر ہو۔ بلکہ عام طور پر صفات بے جوڑ، بے ذات، بے شعور نظر آتی ہیں۔ اسی وجہ سے بے دینی پیدا ہوتی جاتی ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے شاید صفت کا موصوف کے ساتھ یہ جوڑ جو عام مشاہدہ میں ہم دیکھتے ہیں، سامنے آجاتا ہے۔ لیکن ایک صفتِ ظاہرہ کا ایک موصوف باپردہ یا پنہاں سے جوڑ تخیل میں بہت کم آتا ہے۔ بلکہ اس جوڑ کی حقیقت بھی ابھی تک آپ کے سامنے نہ آئی ہوگی۔ اس لئے زیادہ وضاحت کے لئے کچھ امثلہ پیش کرتا ہوں۔

۱۔ زمین و آسمان اپنی جگہ کھڑے ہیں اور اس اعتدال سے کھڑے ہیں کہ کبھی کچھ فرق نہیں آیا۔ ایسے کھڑا رہنے کا باعث کیا ہے؟ ایک عام لفظ جو ہمیشہ استعمال ہوتا ہے، وہ ہے "قدرت"۔ یہ گول مول لفظ ہے۔ خواص تو شاید اس قدرت کی حقیقت

Marfat.com

سے واقف ہوں، لیکن عام خیال میں اس قدرت کے معنی کسی کے تصور میں نہیں۔ اور وہ قدرت کیا ہے؟ خدائے قدوس کی ذات۔ اب ذہن میں کھلے طور پر آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو تھامے ہوئے ہے۔ یہ صفت کا موصوف کے ساتھ جوڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُمسِکُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرضَ اَنْ تَزُوْلَا۔ وَلَئِنْ زَالَتَااِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِنْ بَعْدِہٖ۔

اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو ادھر ادھر ہونے سے تھامے ہوئے ہے۔

اگر وہ ادھر ادھر پھر جائیں تو اس کے بعد کون روک سکتا ہے؟

غرض یہ صفت، تصور علمی و عقلی اور روحی و حسی میں آجائے کہ وہ تھامے ہوئے ہے۔ تو یہ ہے جوڑ صفت الٰہی (کا) موصوف اللہ کے ساتھ۔ فرماتے ہیں ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفسٍ وَّاحِدَۃٍ وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا۔

یہ کارفرمائی ذات اقدس کی ہمارے دل اور وجدان میں مکمل ہو، لَہٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (زمین و آسمان کی چابیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں)۔ تو پہلے مقالید، چابیوں کی حقیقت سامنے آنی ضروری ہے۔ پھر ان چابیوں کا دستِ قدرت میں دیکھنا ضروری ہے، کہ کیسے کسی کا رزق کشادہ کرتا ہے اور کیسے کم کرتا ہے؟ یعنی رزق اور کائنات کے ذرہ ذرہ کا تصرف اس کے دست قدرت میں ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے۔ عِنْدَہٗ مَفَاتِیْحُ الْغَیْبِ لَایَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ۔ کہ غیب (پنہاں) کی کنجیاں اس کے پاس ہیں، اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غیب کی حقیقت کا عیاں ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ اور پھر غیب کوئی ایک نہیں۔ جتنی دنیا سامنے ہے، اس سے کئی گنا زیادہ غیب تصور میں آتا ہے جو موجود نہیں، وہ غیب میں ہے۔ اب اس پر اس کا احاطۂ علمی کیسے تصور میں آسکتا ہے؟ اس کی تفصیل آگے فرماتے ہیں۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے وہ جانتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو زمین پر پتہ گرتا ہے، یا زمین کے اندھیرے یعنی پیٹ میں دانہ گرتا ہے، سب کچھ کتاب مبین میں ہے۔ یعنی

Marfat.com

لوحِ محفوظ میں ہے ایک خدائی علم میں محفوظ ہے۔ اب علم کی یہ وسعتِ بے انداز کا کیسے اس ذاتِ پنہاں کے ساتھ موصوف ہونا تصور میں آتا ہے؟ جب تک یہ تصور کامل کسی کے ذہن اور دل میں نہ آئے، اس وقت تک توحید پیدا نہیں ہوتی۔ اور یہ توحید صرف عارفینِ الٰہیہ کو نصیب ہوتی ہے، جن کے سردار رسول اور نبیؑ ہیں، اور بعد میں ولی۔ وہ اس جوڑ کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے ہم اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، یا کسی اور کو کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

اور یہ حقیقی توحید بھی کم نہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی شناسائی کے لئے یہ جذبۂ فطرتی نصیب فرمایا، کہ ذرہ ذرہ کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اور پھر ان کے مشاہدے اور ایقان کے ذریعے افرادِ انسانی کو اس جذبہ پاک سے معمور کیا جاتا ہے، اور احکامِ الٰہی کے لئے سرنگوں ہونے کی دعوت دی جاتی ہے۔

قرآن حکیم توحید اور احکام توحید سے پُر ہے۔ توحید کی آیات صرف توحید کی صفات پیش کرتی ہیں اور دعوتِ احکام دیتی ہیں، اور آیاتِ احکام کا سرا آخرکار توحیدی صفات کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔ یہ جوڑ چولی دامن کا جوڑ ہے۔ لیکن جب تک پہلے تصورِ توحید قائم نہ ہو، احکام پر توجہ نہیں دی جا سکتی۔ پہلے تصور کو قائم کرنے کے لئے عارفینِ الٰہی کا گروہ منتخب فرمایا گیا۔ اور احکام کی تفصیل سنانے کے لئے دوسرا گروہ علمائے کرام کو چن لیا گیا۔ پہلا گروہ خاموش سرنگوں صورت میں جلوۂ الٰہیہ کا مظہر ہو رہا ہوتا ہے اور دوسرا گروہ مساجد و منبر کی زینت بن کر دعوتِ احکام پر توجہ دلا کر اجرپاتا ہے۔ لیکن تقدم پہلے گروہ کا فطرتی ہے، اور تاخر پچھلے گروہ کا ذاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں گروہوں کو محبت عنایت فرمائے۔!

(نومبر ۱۹۶۵)

Marfat.com

# حال و قال کی جنگ

## ایک بہت بھاری مغالطہ

ہر مسلمان پنج وقتی طور پر چند دفعہ "لا الٰہ الا اللہ کہنے پر فطرتاً مجبور ہے" کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں" اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً اپنے اس عقیدہ کو دہراتا رہتا ہے۔ ویسے بھی فطرتاً اسلام کے اس عقیدے پر رہنا مسلمان اپنے اسلام کی بنیاد جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اعمال صالحہ بھی جیسے کسی کو اللہ کریم توفیق دے ، اسلامی طریقے پر کرتا ہے، اور اپنے آپ کو عباد اللہ میں داخل کرنے کے لئے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ کا نمونہ ہوتا ہے۔

ایسے لوگ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کو اپنا فریضہ جانتے ہیں لیکن صلحائے امت کی قبور سے فیض حاصل کرنے کو مستحسن سمجھتے یا وہاں جا کر مراقبے کرتے ہیں اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں یا قرآن حکیم پڑھتے ہیں، نمازوں کو باقاعدہ جماعت سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن ایک جماعت ان کو مشرک کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتی ہے۔

بزرگوں کے پاس بیٹھنے والے اچھے ہوتے جاتے ہیں۔ بے نماز نمازی بن جاتے ہیں، فاسق فاجر ان کے ہاتھ پر توبہ کرتے ہیں، دنیا ان کو مقبولان الٰہی تصور کرتی

Marfat.com

ہے اور ان کی دعا کے لئے حاضر ہوتی ہے، انکی بد دعا سے گھبراتی ہے۔ لیکن ہمارے دوست صرف اتنا کہنے پر کتفا نہیں کرتے کہ ''ان کا یہ فعل مشرکانہ ہے، یا یہ فاسد عقیدہ ہے۔ بلکہ کھلا ان کے مشرک کہنے کے لئے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ ان کے لئے منہ بھرے فتوے دئے جاتے ہیں۔

لیکن وہ نہ تو صاحب قبر کو الٰہ کا درجہ دیتے ہیں اور نہ ہی اسے نبی گردانتے ہیں بلکہ ولی اللہ یا مقرب الٰہی جانتے ہیں حاجات میں صرف وسیلہ بناتے ہیں، نہ کہ منصرف کلی ان کو جانتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ نام لے لے کر ان کو مشرک کہا جاتا ہے۔ اسلامی امت سے نکال کر ملت مشرکہ میں داخل کرنا صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر کیا لعنت ہو گی کہ اسے مشرک کہہ دیا جائے، اور اسے اپنے دین و ملت سے نکال دیا جائے۔

بیشک بعض امور میں اختلاف کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں فعل اسلامی نہیں اور فلاں عقیدہ مشرکانہ ہے۔ یا یہ خیال ان کے خیال میں شرک سے ملتا جلتا ہے۔ کسی ایک فعل کے مذموم ہونے سے اس کا وہ اقرار جو ہر وقت اس کی زبان اور اس کے جوارح سے برابر ظاہر ہو رہا ہے کیونکر باطل گردانا جا سکتا ہے، اور اس کو ملت مشرکہ میں داخل کیا جا سکتا ہے؟

دنیا کا کوئی مذہب اتنا پست خیال نہیں کہ کسی ایک عقیدہ کی بنیاد پر جس میں اختلافِ ملت بھی ہو یا کسی ایک فعل میں جو اس کا مذہب پسند نہ کرتا ہو اس کی وجہ سے اپنے ایک اچھے پیروکار کو جس کا ایمان اپنے مذہب پر کلی ہو اور جس مذہب کے اندر وہ اپنا معاشرہ رکھتا ہو بیک بینی و دو گوش فوراً باہر نکال دے، لیکن یہاں اِکے دکے کا مسئلہ نہیں ایک امت کی امت اس جہنم میں دھکیلی جارہی ہے، حتی کہ کوئی متنفس اس سے بچ نہیں سکا، نہ بچ سکتا ہے۔

ایک فرقہ اہل سنت و جماعت کے آدمیوں کو بعض اختلافی مسائل کی وجہ سے کافر مشرک کہتا ہوا تھکتا نہیں۔ فاسق و فاجر ہو، زانی ہو، چور ہو اور گزران تمام حرام

سے ہو، یا رشوت خوری سے ہو اس کے لئے ان کی زبان تک نہیں ہلتی۔ اس کے لئے کوئی حکم ان کے ہاں شرع شریف میں نہیں۔ اس کے لئے معاشرہ سے نکالنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی لیکن ایک پختہ دین مسلمان جو رات دن اللہ اللہ کرتا ہے اور اپنا بہترین وقت رضائے الٰہی میں صرف کرتا ہے، درود شریف پڑھنے میں اتنا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہہ کر غائبانہ الفاظ سے اس کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔

بس کیا ہے! مشرک ہے۔ یہ تو رسول خدا کو حاضر ناظر جانتا ہے۔ حالانکہ اس بے چارے کو حاضر ناظر کے معنی بھی نہیں آتے اور نہ وہ اس کیفیت میں خود آیا ہے کہ وہ کہے کہ میں حضور ﷺ کو حاضر ناظر دیکھتا ہوں۔ بلکہ والہانہ اشتیاق وہ یہ پڑھنے کو پسند کرتا ہے جیسے اکابر علما نے جائز لکھا ہے۔ لیکن ہمارے دوست ہیں کہ اس کے لئے فتوے پر فتوے اور اپنا سارا زور اس کے پچھاڑنے پر صرف کیا جاتا ہے۔

### اپنے لیے وہابی کہلانا پسند نہیں کرتے
### اور دوسروں کو مشرک کہنا ایمان ہے

یہ بھی جانے دیجئے یا محمدؐ کا لفظ اللہ کے مقابل کسی نے مسجد کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے مسجد کی پیشانی پر لکھ دیا یا اللہ تعالیٰ کے مقابل اس پاک نام محمدؐ کو دیکھنا پسند آگیا۔ آخر کلمہ طیبہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسولؐ اللہ کہا جاتا ہے۔ بس پھر کیا ہے اس یا محمدؐ کے مٹانے کی فکر ہے۔ دن رات اس کے لکھنے والے کو مشرک بنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن جب امت اس مشرکیت کی وبا سے تنگ آجاتی ہے اور شرک کی مشین چلانے والوں کو وہابی کے لفظ سے تعبیر کرتی ہے، تو پھر وہی ہمارے دوست بول اٹھتے ہیں۔ ہیں! یہ کیا ظلم ہے ہمیں وہابی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ آج دنیا میں وہابی خدا پرست نہیں توحید پرست کو تو کہتے ہیں۔ دیکھئے تو، کسی غریب صوفی کو مشرک کہتے کہتے تھکتے نہیں۔ دوسری طرف اپنے لئے صرف وہابی کے لفظ سے اتنی گھبراہٹ کہ سانس پھولا جا رہا ہے اور دنیا میں جگہ نہیں ملتی۔ اور پھر تمام زور اپنے آپ کو اہلسنت

Marfat.com

والجماعت بنانے میں صرف ہوتا ہے، اور صوفی خاندانوں سے اپنی ارادت کا اظہار کیا جاتا ہے، اور بھولے بھالے صوفیوں سے اپنی صفائی کے برأت نامے حاصل کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے کتنی دنیا کو مشرک کہہ کران کا دل کتنا دکھایا تھا۔

قدرت کے قانون اٹل ہوتے ہیں۔ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے فتوائے شرک دینے والوں میں یک دم ایسی وبائے اختلاف پھوٹی کہ اب ایک دوسرے کے بر خلاف فتویٰ پر فتویٰ ہے۔ اور لطف یہ کہ اپنے گروہ کے سر تاج اور اپنے فرقہ کے اتقی برگزیدہ کے لیے وہی کچھ ہو رہا ہے جو کچھ دوسروں کے لئے کیا جاتا تھا۔ اپنے لئے بھی بعنیہ وہی سامان پیدا ہو گیا جو دوسروں کے لئے پیدا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ہ۔ (پارہ ۱۷ رکوع ۳)

ترجمہ :۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے نہ ہٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے) صوامع اور گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

توحیدِ اسلامی اتنی وسیع المشرب ہے کہ اس کے اندر غیر کے لئے بھی جگہ ہے۔ جس طرح کائنات کا خالق اپنی شان ربوبیت عامہ رکھتا ہے، اسی طرح اس کی توحید کی شان احدی بھی نرالی ہے۔ وہ بیگانوں کو اپنا بناتا ہے، نہ کہ اپنوں کو بھی بیگانہ بنا کر باہر پھینکتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی ہر برائی سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن کسی کو اس کی برائی کی وجہ سے اپنی مخلوق اور اپنی عبدیت سے نہیں دھتکارتا۔ بیشک کافر و مشرک کے الفاظ سے نافرمان کو تعبیر فرماتا ہے۔ لیکن کسی کی روزی اور کسی کے رہن سہن کو اس سے نافرمانی کی وجہ سے نہیں چھینتا۔

اگر وہ ایسی ہی نفرت کرتا جیسے ہم اپنے ہم جنس سے معمولی اختلافات پر

رکھتے ہیں تو ایک متنفس زندہ نہ ہوتا، اور نہ ہی یہ زمین اتنی بھرپور نظر آتی کہ ہتھیلی رکھنے کو جگہ نہیں۔ صوفیت کی فطرت خاموشی ہے اور شریعت و علمیت کی زبان فصیح و بلیغ۔ صوفیت جب اپنے حال میں مست ہو کر شرائع کے آداب کو پوری طرح نگاہ نہیں رکھتی تو شریعت اپنے جوہر آبدار کی زبان لے کر نکل آتی ہے، اور بے دریغ برسنا شروع ہو جاتی ہے، اور کسی اچھے برُے کی تمیز نہیں رکھتی، اور حقیقت حال سے نکل کر ظاہری حال کی اوٹ اور سہارا لیتی ہوئی صوفیت کی شاہرگ پر زخم کاری لگانے سے باز نہیں آتی۔ حتیٰ کہ وہ اتنا بھی نہیں دیکھتی کہ اپنا ہی نقصان ہے، اور اپنا ہی خون ضائع کیا جارہا ہے، جس سے خود اسلام دم توڑتا ہوا نظر آئے گا۔

لیکن صوفیت ہے کہ درماندہ آنکھوں کے سوا اسے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ مار کھاتی ہے لیکن دم نہیں مارتی۔ پھانسی پر چڑھنا آسان ہے لیکن مقابلہ کے لئے ایک حرف بھی منہ سے نکالنا اسے حرام ہے۔ اس کا فیصلہ ہے ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہی مرضی میرے صیاد کی ہے

اس صورت میں مولا کریم کو رحم آجاتا ہے۔ اور صوفیت میں کوئی اللہ کا بندہ اپنے چہرے سے نقاب الٹتا ہے کہ عوام تو عوام رہے خواص تک اس کے قدموں پر مدتوں نثار ہونا فخر جانتے ہیں، اور شریعت حقہ کے علم بردار بھی آخر گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور اس کے قدموں میں سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتے۔ دنیا ہوتی ہے اور صوفیت۔ ہر طرف اسی کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پھر بدمستی آجاتی ہے اور آدابِ شریعت کے تمام حقوق اٹھ جاتے ہیں۔ مولا کریم علما حقہ کو ابھارتے ہیں۔ ان کے جوش بڑھتے ہیں، ان کے دلوں میں طوفانی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور تیغ زبان بے نیام ہو کر باہر آجاتی ہے، اور صوفیت کے ناپسندیدہ اخلاق کو تراشنا شروع کر دیتی ہے۔

ایسے حال میں خود سوچنا چاہئے کہ ہمارے اندر اس قدر تنفر کیوں پیدا ہو گیا۔ جب کہ صوفیت (طریقت) اور شریعت دونوں اسلام کے دو ستون ہیں۔ اور ایک کے

بغیر دوسرا قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلام ان دونوں ستونوں کے سہارے کھڑا ہے اور مولا کریم کے فضل سے آج تک یہ دونوں ستون قائم چلے آرہے ہیں۔ ورنہ جو رسہ کشی بعض اوقات آپس میں شروع ہو جاتی ہے وہ ان کو ہمیشہ کے لئے گرا دیتی۔ لیکن یہ اس خالق ذوالجلال کا فضل ہے جس نے اسلام کو زندہ رکھنے کا فیصلہ ازلی فرمادیا ہے۔ اس لئے ہمارے دل میں ہر مسلمان کے لیے احترام ہونا چاہئے۔ نہ یہ کہ ہر وقت میں میں اور تو تو کا بازار گرم رکھا جائے، اور شرک وکفر کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔

منہ چھوٹا بات بڑی نکل گئی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرماوے۔ آمین!

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(اپریل ۱۹۶۴)

مکتبۂ العلم جامعہ مجددیہ
... آباد۔ فتح گڑھ سیالکوٹ

Marfat.com

Marfat.com